بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرِ منتظم — آذر ریاض

مدیرِ اعزازی — امت الصبور

فلم ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)----700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ----6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا---7000 روپے

مستقل سلسلے

اکتوبر 2017
جلد 32 شمارہ 2
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 2-اے پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع کا اکتوبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

نئے ہجری سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ محرم الحرام، ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ یہ حرمت والا مہینہ ہے۔ اسلامی تاریخ قربانیوں اور شہادتوں سے بھری ہوئی ہے۔ یکم محرم الحرام مراد رسول خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید کیے گئے۔ آپؓ کی شہادت سے امت مسلمہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

دس محرم الحرام کو وہ عظیم انسانی المیہ رونما ہوا۔ جس پر آج بھی امت مسلمہ گریہ کناں اور اشک بار ہے۔ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے چند رفقاء اور اہل خاندان کے ساتھ انتہائی سفاکی کے ساتھ شہید کر دیے گئے۔

حضرت حسینؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو محبوب ترین ہستیوں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت علیؓ کے صاحبزادے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نواسوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے بے حد پیار کرتے تھے۔

سخاوت، دریا دلی اور فضل و کمال کے ساتھ ساتھ حضرت حسینؓ کو شجاعت و بہادری میں بھی بلند مقام حاصل تھا میدانِ کربلا آپ کی بہادری اور استقامت کا شاہد ہے۔ آپؓ کے ساتھ چند رفقاء اور اہل خاندان تھے جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ تو دوسری طرف ہزاروں کا لشکر تھا۔ آپ پر پانی بند کر دیا گیا۔ ایک ایک کر کے خاندان کے تمام افراد کو آنکھوں کے سامنے شہید کر دیا گیا لیکن آپؓ کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی۔ اور آپؓ نے حق و صداقت کی سربلندی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔

حضرت حسینؓ کی شہادت نے اسلامی تاریخ کا وہ باب رقم کیا جس پر تاریخ انسانی ہمیشہ ناز کرے گی۔

آپؓ نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر ثابت کر دیا، باطل کو ماننے والے خواہ تعداد میں کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، حق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے۔

اور

کثرت ہمیشہ حق کی دلیل نہیں ہوتی۔ حق کے ماننے والے تعداد میں کم ہوں پھر بھی حق ہمیشہ حق ہی رہتا ہے۔

سانحۂ ارتحال،

انشاجی کی اہلیہ محترمہ شکیلہ انشا بھی راہی ملک عدم ہوئیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

شکیلہ انشا بردبار، سادہ دل اور نرم خو خاتون تھیں۔ طویل بیوگی کا عرصہ انہوں نے بہت باوقار انداز میں گزارا۔ اپنے دونوں صاحبزادوں سعدی انشا اور رومی انشا کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- مریم عزیز کا مکمل ناول۔ ایک کرن دریچے میں،
- نادیہ احمد کا مکمل ناول۔ یہ جو ریگ دشت فراق ہے،
- سوئی سیف اللہ بٹ کا ناول۔ سنہری دھوپ،
- افشین نعیم کا ناولٹ۔ انت بھلا، سب بھلا،
- عفت سحر طاہر اور صائمہ اکرم کے ناول،
- ایمل رضا، شادیہ جمال طارق، ہما گل، سنیعہ عمیر، سدرۃ المنتہیٰ اور ریحانہ آفتاب کے افسانے،
- خبرناک کی میزبان نزہیرا ذوبی شام سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع ہر ماہ ہم پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں ــــ آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے۔ ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

تجھ ہی سے حرف وصدا کا سفر سلامت ہے
تجھ ہی سے خوابِ دُعا کا سفر سلامت ہے

تیرے ہی نام سے کھلتے ہیں آرزو کے کنول
تجھ ہی سے موجِ صبا کا سفر سلامت ہے

تیرے ہی دم سے ہے قائم یہ روشنی کا بھرم
تجھ ہی سے رنگِ ضیا کا سفر سلامت ہے

تیرے ہی کُن کا کرشمہ ہیں ساری دُنیائیں
تجھ ہی سے دستِ عطا کا سفر سلامت ہے

ہُنر بدلتی ہے مٹی بھی اِذن سے تیرے
تجھ ہی سے آب و ہوا کا سفر سلامت ہے

ڈاکٹر نثار ترابی

یہ ہے شانِ احمدِ مجتبیٰ کہ حبیبِ ربِ انام ہے
وہ رسولِ خلقتِ دو جہاں صفِ انبیاء کا امام ہے

وہ قسیم وہبِ الٰہ بھی، وہی خستہ جاں کی پناہ بھی
وہ سراپا رحمتِ ذوالمنن، وہی صبحِ نو کا پیام ہے

وہ خدا کا لطفِ عمیم ہے، وہ کریم ابن کریم ہے
کبھی اس پہ رب کا درود ہے، کبھی اس پہ رب کا سلام ہے

وہ خدا کے عشق کی انتہا، وہ امینِ جلوۂ کبریا
جو فنائے عشقِ رسول ہو، اسی زندگی کو دوام ہے

یہ کرم شہہِ عرب و عجم! ہے تیری عطاؤں کا سلسلہ
کہ رشید بھی تیری آلؑ کا، ہی غلامِ ابنِ غلام ہے

رشید وارثی

ادارہ

انسان جو کہے اور نقل کرے' اس کی تحقیق کرلے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور اس چیز کے پیچھے مت پڑو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔" (الاسرا۔36)
نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "انسان جو لفظ بھی بولتا ہے تو اس کے پاس ہی ایک نگران فرشتہ تیار ہوتا ہے۔" (ق۔18)

بلا تحقیق بات کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جو سنے اسے (بغیر تحقیق کیے) بیان کردے۔" (مسلم)
فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ ہر سنی ہوئی بات کو تحقیق کیے بغیر آگے بیان کرنا یا اسے صحیح سمجھ لینا درست نہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ جھوٹی ہو اور یہ بھی اسے بیان کرکے اپنے آپ کو جھوٹوں میں شامل کرلے۔ اس لیے پہلے ہر بات کی تحقیق ضروری ہے۔

جھوٹا

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو شخص میری طرف منسوب کرکے کوئی بات بیان کرے' وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔" (مسلم)
فائدہ :
بعض روایات میں کاذبین' تثنیہ کا لفظ ہے' یعنی دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑنے والا اور دوسرا آگے بیان کرنے والا۔ اس میں ان علماء و واعظین کے لیے سخت وعید ہے جو جھوٹی حدیثیں بیان کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! میری ایک سوکن ہے' کیا مجھے اس بات سے گناہ ہوگا اگر میں (اس پر) یہ ظاہر کروں کہ مجھے خاوند کی طرف سے خوب مل رہا ہے جب کہ مجھے وہ چیزیں نہیں دیتا؟"
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو چیز اس کو نہیں دی گئی' اس کا جھوٹ موٹ اظہار کرنے والا' جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔" (بخاری و مسلم)
جھوٹ کے دو کپڑے۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کو جال میں پھانسنے کے لیے خلاف واقعہ تاثر دیتا ہے۔ بایں طور کہ وہ زاہدوں والا یا اہل علم والا' یا اہل ثروت والا لباس پہنتا اور اس کی سی ہیئت بناتا ہے تاکہ لوگ اس کے فریب میں آسکیں' در آں حالیکہ اس کے اندر وہ خوبی نہ ہو (جس کا وہ اظہار کررہا ہے۔) بعض نے اس کے اور معنی بھی بیان کیے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فوائد و مسائل :
1۔ بعض لوگ زاہدوں والا روپ دھار کر اپنے زہد و عبادت کا نقش قائم کرتے ہیں' بعض اہل علم کی سی ہیئت اختیار کرکے اپنی عالمانہ شان منوانا چاہتے ہیں اور بعض اہل ثروت میں اپنے آپ کو شمار کرانے کے لیے

خوش لباسی کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں۔ اگر یہ سب جھوٹ اور فریب پر مبنی ہے تو سخت گناہ ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ جیسا کچھ ہے' ویسا ہی بن کر رہے' اس سے بڑھ کر اپنے کو شمار کرانے کی سعی نہ کرے۔

2 ۔ سوکنیں بھی اپنی بابت ایک دوسرے کو غلط تاثر دینے کے لیے خلاف واقعہ باتیں نہ کریں اور محض دوسری بیویوں کو جلانے اور آتش حسد بھڑکانے کے لیے خاوند سے خصوصی قرب و محبت اور اس کی داد و دہش کا اظہار یا دعوانہ کریں جب کہ ایسا نہ ہو۔ بلکہ اگر ایسا ہو بھی تو خاوند کی اس کوتاہی کی پردہ پوشی کریں تاکہ دوسری بیویوں کا آبگینہ جذبات پاش پاش نہ ہو۔

جھوٹی گواہی کی شدید حرمت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تم جھوٹی بات سے بچو۔" (الحج 30۔)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اس چیز کے پیچھے مت پڑو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔" (الاسرا۔36)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "انسان جو لفظ بھی بولتا ہے تو اس کے پاس ہی ایک نگران فرشتہ تیار ہوتا ہے۔" (ق۔18)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تیرا رب یقیناً" گھات میں ہے۔" (عملوں کو دیکھ رہا ہے۔) (الفجر۔14)

نیز فرمایا: "(اہل ایمان) جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔" (الفرقان۔72)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہ کی خبر نہ دوں۔" ہم نے کہا کیوں نہیں' اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا' والدین کی نافرمانی کرنا۔" اور آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے کہ (سیدھے ہو کر) بیٹھ گئے اور فرمایا: "سنو! اور جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی۔" چنانچہ آپ برابر یہ بات دہراتے رہے' یہاں تک کہ ہم نے کہا: کاش! آپ خاموشی اختیار فرمالیں۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس سے واضح ہے کہ جھوٹی گواہی کتنا بڑا جرم ہے۔ لیکن بدقسمتی سے نام نہاد مسلمانوں میں دیگر کبیرہ گناہوں کی طرح اس کا ارتکاب بھی عام ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

کسی متعین شخص یا جانور پر لعنت کرنا

حضرت ابوزید ثابت بن ضحاک انصاری رضی اللہ عنہ' جو بیعت رضوان کے شرکاء میں سے ہیں' روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص جان بوجھ کر اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی جھوٹی قسم کھائے تو وہ اس طرح ہی ہے جیسے اس نے کہا۔ اور جس شخص نے کسی چیز کے ساتھ خودکشی کی تو قیامت والے دن اسی چیز کے ساتھ اس کو عذاب دیا جائے گا۔ اور آدمی پر اس نذر کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے جس کا وہ مالک نہیں ہے۔ اور مومن پر لعنت کرنا اس کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ کسی اور دین کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس طرح کہے: اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی یا عیسائی۔ اس سے اس کی نیت اگر واقعتاً" یہودیت یا عیسائیت کا اختیار کرنا ہے تو وہ فی الفور کافر (یہودی یا عیسائی) ہو جائے گا کیونکہ عزم کفر بھی کفر ہے۔ اور اگر مقصد اس سے دوسرے دینوں کے اختیار کرنے کی نفی کرنا ہے اور اس کا عزم ہے کہ وہ کبھی بھی دین اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار نہیں کرے گا' تو اس انداز کی قسم بہرحال ناپسندیدہ اور معصیت ہے جس سے استغفار لازمی ہے۔

2 ۔ اس حدیث کے آخری فقرے سے واضح ہے کہ کسی مومن پر لعنت کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ قتل کے برابر جرم ہے۔

لعن طعن کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وہ کسی راست باز (مومن) کے لیے مناسب نہیں کہ وہ لعن طعن کرنے والا ہو۔" (مسلم)

فائدہ : لعن طعن اور سب وشتم 'کمال ایمان و کمال صدق کے منافی ہے۔

لعن طعن کرنے والے

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لعن طعن کرنے والے قیامت والے دن نہ سفارشی ہوں گے اور نہ گواہ۔" (مسلم)

فائدہ : لعن طعن کی عادت انسان کو فاسق بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے شخص کا کوئی مقام نہیں ہوگا۔

اللہ کا غضب

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم ایک دوسرے پر اللہ کی لعنت' اس کے غضب اور جہنم کی آگ کے ساتھ لعن طعن نہ کرو۔"

(اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : اس کا مطلب ہے کہ آپس میں اس طرح بددعا نہ کرو' تجھ پر اللہ کی لعنت ہو' یا اللہ کا غضب نازل ہو یا تو جہنم کی آگ میں جلے وغیرہ۔

مومن کی صفات

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن طعنہ زنی کرنے والا ہوتا ہے نہ لعنت کرنے والا' نہ فحش بکنے والا اور نہ فضول گوئی و زبان درازی کرنے والا۔" (اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے۔)

فوائد و مسائل : یہ مومن کامل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔

1۔ طعنہ زنی سے مراد حسب و نسب کے حوالے سے یا غیبت و بدگوئی کے ذریعے سے تنقیص و تحقیر کرنا ہے۔

2۔ لعان' ہر وقت لعنت ملامت اور سب وشتم کرنے والا' جیسے بعض لوگوں کی عادت ہو جاتی ہے کہ گالی کے بغیر کوئی بات ہی نہیں کرتے۔

3۔ فاحش سے مراد قول و فعل سے بے حیائی کا ارتکاب کرنے والا اور بذی چرب زبان اور زبان دراز قسم کا آدمی' اور بے وقوف اور فضول گو بھی اس میں شامل ہے۔

لعنت

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب بندہ کسی چیز پر لعنت کرتا ہے تو لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے لیکن اس کے ورے آسمان کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ پھر وہ زمین کی طرف اُترتی ہے تو اس کے دروازے بھی اس کے ورے بند کر دیے جاتے ہیں۔ پھر دائیں اور بائیں سمت اختیار کرتی ہے۔ پھر جب کوئی گنجائش نہیں پاتی تو اس کی طرف لوٹتی ہے جس پر لعنت کی گئی ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر وہ چیز اس لعنت کی مستحق ہوتی ہے (تو اسی پر پڑتی ہے) ورنہ وہ لعنت کرنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔" (ابوداؤد)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ کسی پر لعنت کرنا (اسے اللہ کی رحمت سے محرومی یا اس کے عتاب و غضب کی بددعا دینا) ایسا فعل ہے کہ انسان خود اس کا مورد اور ہدف بن سکتا ہے۔ اس لیے اس سے حتی الامکان اجتناب ہی کرنا چاہیے۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی سفر پر تھے اور ایک انصاری عورت اونٹنی پر سوار (اونٹنی سے) تنگ دل ہو گئی تو اس نے اس پر لعنت

کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنا تو فرمایا:
"اس اونٹنی پر جو سامان لدا ہوا ہے وہ اتار لو اور اسے چھوڑ دو، اس لیے کہ اس پر لعنت کی گئی ہے۔"

حضرت عمران رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: گویا میں اب بھی اس اونٹنی کو دیکھ رہا ہوں' وہ لوگوں کے درمیان چل رہی ہے' کوئی اس سے تعرض نہیں کر رہا ہے۔ (مسلم)

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ تنگ دل ہو کر انسانوں کو تو کجا' جانوروں کو بھی بددعا دینا اور ان پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔

لعنت زدہ

حضرت ابو برزہ نضلہ بن عبید اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک نوجوان لڑکی ایک اونٹنی پر سوار تھی۔ اس پر لوگوں کا کچھ سامان تھا۔ اچانک اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا اور لوگوں پر پہاڑ تنگ ہو گیا (غالباً" دشوار گزار راستہ ہونے کی وجہ سے۔) اس لڑکی نے کہا: حل (اونٹ کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے کلمہ زجر) اے اللہ! اس پر لعنت فرما۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ اونٹنی ہمارے ساتھ نہ رہے جس پر لعنت ہو۔" (مسلم)

اس میں یہ نہیں ہے کہ اس کا بیچنا' ذبح کرنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے علاوہ اس پر سوار ہونا منع ہے۔ بلکہ یہ تمام کام اور ان کے سوا دیگر تصرفات جائز ہیں' کوئی ممانعت نہیں ہے۔ صرف اس کی مصاحبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ یہ سارے تصرفات جائز ہیں۔

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں بعض لوگوں کو اشکال یہ پیش آیا کہ اونٹنی کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا' اس کو بار برداری کے کام میں لایا گیا اور نہ سواری کے' جیسے زمانہ جاہلیت میں بتوں کے نام وقف شدہ جانوروں کے ساتھ کیا جاتا تھا' جسے سائبہ کہا جاتا تھا' حالانکہ اس میں اشکال کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اسے سائبہ کی طرح مطلقاً" آزاد نہیں چھوڑا گیا بلکہ صرف لعنت کی وجہ سے اسے اس چیز کا مستحق نہیں سمجھا گیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں رہے۔ اس صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اس پر ہر قسم کے تصرفات کی اجازت تھی۔

معیّن نام لیے بغیر معاصی کے مرتکبین پر لعنت کرنے کے جائز ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "خبردار! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔" (ہود۔18)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "چنانچہ ان کے درمیان ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔" (الاعراف۔44)

بال جڑوانا

اور صحیح (بخاری و مسلم) میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اس عورت پر اللہ کی لعنت ہے جو دوسروں کے بال اپنے بالوں کے ساتھ ملائے' اور اس پر بھی جو کسی دوسری عورت سے بال ملوائے (جڑوائے۔")

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ سود خور پر لعنت فرمائے۔"

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر بنانے والوں پر لعنت فرمائی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جو زمین کی حدوں میں ردوبدل کرے۔"

اور فرمایا:
"اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے جو انڈے چوری کرتا ہے۔"

اور فرمایا:
"اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جو اپنے ماں'

باپ پر لعن طعن کرے۔"

اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے جانور ذبح کرے۔"

اور فرمایا:

"جو مدینے میں کوئی بدعت ایجاد کرے یا کسی بدعتی کو پناہ دے تو اس پر اللہ کی' فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔"

اور فرمایا:

"جو مدینے میں کوئی بدعت ایجاد کرے یا کسی بدعتی کو پناہ دے تو اس پر اللہ کی' فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔"

اور فرمایا:

"اے اللہ! رعل' ذکوان اور عصیہ قبیلوں پر لعنت فرما' انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔"

یہ تینوں عرب کے قبیلے ہیں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے' انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔"

اور آپ نے ان مردوں پر لعنت کی جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور ان عورتوں پر (بھی لعنت کی) جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔

یہ تمام الفاظ (جو مذکور ہوئے) صحیح احادیث میں ہیں۔ ان میں سے بعض تو صحیح بخاری و صحیح مسلم دونوں میں ہیں اور بعض ان میں سے کسی ایک میں ہیں۔

فائدہ :

1 ۔ امام نووی رحمتہ اللہ کی نقل کردہ آیات و احادیث سے واضح ہے کہ اس طرح لعنت کرنا تو جائز ہے' ظلم کرنے والوں' جھوٹ بولنے والوں' قطع رحمی کرنے والوں پر لعنت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کسی ایک شخص کا نام لے کر لعنت کرنا جائز نہیں ہے' چاہے وہ بظاہر ظالم ہو' جھوٹا ہو' قاطع رحم ہو' قاتل ہو کیونکہ کسی کو یہ پتا نہیں کہ جس شخص پر وہ اس کے ظلم یا جھوٹ یا کسی اور گناہ کی وجہ سے لعنت کر رہا ہے' اس نے اپنے اس گناہ سے توبہ کر لی ہو اور عنداللہ وہ ظالم یا جھوٹا وغیرہ شمار نہ ہو۔

اس لیے کسی بھی گناہ گار مسلمان کے لیے' چاہے وہ کتنا بھی بڑا گناہ گار ہو' اس پر اس کی زندگی میں یا اس کے مرنے کے بعد لعنت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے مرنے سے پہلے اس نے خالص توبہ کر لی ہو اور اللہ نے اسے معاف کر دیا ہو۔

2 ۔ صرف یہ کہنا جائز ہے: جھوٹوں پر' ظالموں پر یا فلاں فلاں کام کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

مسلمان پر ناحق سب وشتم کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور وہ لوگ جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بغیر قصور کے تکلیف پہنچاتے ہیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔ 58)

تہمت لگانا

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر فسق یا کفر کی تہمت نہ لگائے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ ہو تو یہ تہمت اسی کی طرف لوٹ آتی ہے۔" (بخاری)

فائدہ : مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مسلمان کی بابت یہ کہے کہ وہ تو فاسق یا کافر ہے در آں حالیکہ وہ فاسق یا کافر نہیں ہے تو خود کہنے والا عنداللہ فاسق یا کافر قرار پا جائے گا' اس لیے اس قسم کے دعووں سے بچنا چاہیے۔

خبرناک کی میزبان

زینیرہ زونی شاہ سے ملاقات

شاہین رشید

خبرناک اس لحاظ سے فنکاروں کے لیے بہت لکی ہے کہ جو بھی اس میں پرفارم کرتا ہے وہ شہرت کی بلندیوں کو چھولیتا ہے' مثلاً "میر محمد علی جن کی شہرت تو پہلے بھی تھی' مگر اس پروگرام نے انہیں شہرت دوام دی۔

آفتاب اقبال جو کافی عرصہ "خبرناک" کے ہوسٹ رہے۔ ان کی پہچان اسی پروگرام سے بنی۔

"شفاعت" جنہوں نے اس بار رمضان نشریات کیا۔

زینب جمیل جواب ڈرامہ آرٹسٹ بن چکی ہیں۔

اور اب جن سے ہم آپ کی ملاقات کروانے لگے ہیں' ان کا نام زنیرہ زونی شاہ ہے جو خبرناک میں مختلف معروف خواتین کی پیروڈی کرتی ہیں۔ بہت خوب صورت' بہت پیاری اور بہت باصلاحیت ہیں۔

"کیا حال ہے زنیرہ زونی صاحبہ؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"گڈ... خبرناک کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں؟ اور کب سے ہیں اس فیلڈ میں؟"

"میں 2012ء سے اس فیلڈ سے وابستہ ہوں اور میں نے پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے چینلز سے کام کیا ہے' جس میں رائل چینل سے لے کر ایس بی این تک اور ایکسپریس نیوز سے لے کر دنیا نیوز شامل ہے۔ تو میں نے تقریباً" تمام چینلز کے ساتھ کام کیا ہے۔ خبرناک میں بہ حیثیت "کوہوسٹ" کر رہی ہوں۔ میں اس پروگرام کی کو ہوسٹ بھی ہوں اور کریکٹر ایکٹرس بھی ہوں۔ اس کے علاوہ میں سیریل' مطلب ڈراموں میں بھی کام کرتی ہوں اور آج کل پی ٹی وی ہوم سے میرا سیریل "کوئی عشق نہ جانے" کے نام سے آن ایئر بھی ہے اور مختلف ڈراموں میں کام کر بھی چکی ہوں۔ میں کمرشلز میں بھی کام کرتی ہوں اور میں فیشن شوز بھی کرتی ہوں اور برانڈز شوز بھی کرتی ہوں۔"

"بہت خوب... مستقبل میں کیا کرنا چاہتی ہیں؟"

"فیوچر کے لیے میری دو خواہشات ہیں۔ جو ابھی بھی کچھ حد تک پوری ہو رہی ہیں' لیکن میں چاہتی ہوں کہ ان کو اور بھی بہتر طریقے سے کرسکوں۔ ایک خواہش تو یہ ہے کہ میں independent (آزادانہ) شو کو ہوسٹ کروں اور ضرور کروں گی کیوں کہ مجھے اندازہ ہے کہ مجھ میں اتنی صلاحیت ہے کہ میں شو کو بہت اچھے انداز میں ہوسٹ کرسکتی ہوں اور اس کے علاوہ دوسری خواہش یہ ہے کہ میں فلم میں کام کروں۔

اور میری خواہش ہے کہ میں فلم میں ایسا کردار کروں جو چیلنجنگ ہو اور لوگ سالوں تک میری پرفارمنس کو یاد رکھیں' میں ایسا کوئی کردار نہیں کرنا چاہتی کہ جس کو کرکے نہ صرف مجھے اپنے گھر والوں سے گالیاں پڑیں بلکہ میرے ملک کے لوگ بھی مجھے برا بھلا کہیں کہ یہ تم کیا کرکے آئی ہو' میں نام تو نہیں لوں گی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ ہمارے ملک کی فلمسٹار اور دیگر لڑکیوں نے جیسا کام کیا' میں ویسا کام نہیں کرنا چاہوں گی۔

میں سستی شہرت کی قائل نہیں ہوں بلکہ جیسا کہ میں نے کہا کہ لوگ مجھے یاد رکھیں اور میری مثالیں دیں۔"

"خبرناک کے حوالے سے جانتے ہیں لوگ آپ کو؟ اور خبرناک کتنا مقبول ہے؟"

"خبرناک دو سو ممالک میں دیکھا جاتا ہے اور بہت زیادہ مقبول ہے اور مجھے بھی لوگ بہت جانتے بھی ہیں اور پسند بھی کرتے ہیں اور اس کا اندازہ مجھے اس طرح سے ہوتا ہے کہ جب میں فیس بک پہ لائیو آتی ہوں یا اپنے فین پیج سے تو دوسرے ممالک کے جو لوگ ہیں وہ کمنٹ کرتے ہیں اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہم آپ کا پروگرام دیکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ جو میرا فین پیج ہے اور جو میرا فیس بک کا پیج ہے تو اس کے ان باکس میں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں میسج ملتے ہیں جس میں لوگ مجھے بتاتے ہیں کہ ان کا تعلق کس ملک سے ہے اور آپ یقین کریں کہ مجھے بعض ایسے میسجز بھی ملتے ہیں جن کی زبان سے ہی ناواقف ہوتی ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں کس طرح جواب دوں.... تو پھر میں اس زبان کو ٹرانسلیٹ کروا کے پھر ان کی زبان میں ان کو جواب دیتی ہوں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"میرے والد کا تعلق آرمی سے ہے اور میرے نانا اور دادا بھی آرمی میں تھے اور آرمی سے ہی ریٹائر ہوئے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ تین بہنیں ہیں ہم اور ایک بھائی ہے' میں سب سے بڑی ہوں اور میرا بھائی سب سے چھوٹا ہے اور جناب' تعلیمی قابلیت یہ ہے کہ میں نے اس سال پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کیا ہے اور اس مضمون میں ماسٹرز کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے جو پروڈیوسر ہیں ذیشان حسین (خبرناک) ان سے میں بہت متاثر ہوں کیوں کہ ان کے پاس معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ علم کا خزانہ ہے اور کسی بھی موضوع پہ وہ بہت مدلل گفتگو کر لیتے ہیں.... تو میں نے سوچا کہ اگر مجھے کچھ بننا ہے اور اس فیلڈ کے حساب سے مجھے کچھ کرنا ہے تو سیاست کے بارے میں مجھے کچھ پتا ہونا چاہیے۔

ملک کے حالات کے بارے میں بھی کچھ پتا ہونا چاہیے تو اس سلسلے میں بھی میں نے ذیشان حسین صاحب سے پتا کیا کہ سر آپ نے کس چیز میں' کس مضمون میں ماسٹرز کیا تھا تو انہوں نے مجھے بتایا اور اس مضمون کے بارے میں کافی معلومات بھی دیں اور مجھے گائیڈینس بھی دی تو میں نے سوچ لیا کہ اس مضمون میں ماسٹرز کروں گی۔

اور ہاں اس سوال کے شروع میں آپ نے والدین کے بارے میں پوچھا تو والد صاحب کے بارے میں تو میں آپ کو بتا چکی ہوں البتہ میری والدہ لیکچرار ہیں۔"

"خبرناک میں آپ نے بہت سے لوگوں کی پیروڈی کی۔ کہیں کوئی مشکل پیش آئی؟"

"مجھے کسی بھی رول کو کرنے میں مشکل اس لیے پیش نہیں آئی کہ میں ایک بار پھر ذیشان صاحب کا نام لوں گی کہ وہ ہمارے پروڈیوسر بھی ہیں' ہمارے ہیڈ بھی ہیں اور وہ ہمیں اتنے اچھے طریقے سے گائیڈ کرتے ہیں کہ ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ کوئی بھی رول کرنے سے پہلے وہ اس رول کی "ٹون" "ٹیمپو" کی تیاری کرواتے ہیں اور جب تک وہ مطمئن نہیں ہو جاتے ہمیں کوئی کردار او کے نہیں کرواتے۔

اور آپ کا یہ سوال کہ کون سے رولز کو کر کے اچھا لگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں ابھی تک ایک ہزار کے قریب مختلف قسم کے رولز کر چکی ہوں اور ان میں سب سے زیادہ جو رول مجھے اچھا لگا۔ وہ "مدھو بالا" کا رول تھا۔ میں "مدھو بالا" بنی تھی اور علی میر نے "کشور کمار" کا رول کیا تھا۔

اس کے علاوہ میری ایک پرفارمنس تھی۔ "مرزا غالب" کی گرل فرینڈ یعنی ڈومنی کے رول میں' میں نے ایک سونگ پرفارم کیا تھا اور یہ بہت ٹف رول تھا یا یوں کہیں کہ ٹف پرفارمنس تھی اور یہ بھی آپ کو بتاؤں کہ یہ "خبرناک" کا میرا پہلا شو تھا اور میں لائیو آڈینس کے ساتھ اتنی فرینک نہیں تھی اور نہ ہی میں نے کبھی اس طرح پرفارمنس دی تھی اور نہ ہی میں آڈینس کے ساتھ فیملیئر تھی۔ تو وہ رول کرنا میرے لیے ایکسائٹمنٹ کا باعث بھی تھا اور ساتھ ہی ساتھ میرے

لیے ایک مشکل جاب بھی تھی۔

اس کے علاوہ "عائشہ گلالئی" کا رول ایسا ہے کہ جس میں مجھے بہت داد ملی اور ملک کے اندر اور باہر کے لوگوں نے مجھے خاص طور پر میسیجز کیے کہ ہمیں آپ کا یہ رول بہت اچھا لگا۔"

"اتنے کم عرصے میں اتنی زیادہ پذیرائی ملنے پر آپ کیا کہیں گی؟"

"بس اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے' میں نے بہت سارے آرٹسٹ ایسے بھی دیکھے ہیں جو کئی سالوں سے یہاں ہیں بلکہ اپنی زندگی کے پچیس' تیس سال اس انڈسٹری کو دیے ہیں' مگر پھر بھی وہ پہچان اور ویسی پذیرائی ان کو نہیں ملتی جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔

بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب آپ ان کے سامنے جاتے ہیں اور آپ کو پتا چلتا ہے کہ وہ بھی آرٹسٹ ہیں تو آپ حیرت سے پوچھ رہے ہوتے ہیں کہ اچھا آپ بھی ایکٹر ہیں... تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک ایکٹر کی موت ہے کہ پچیس' تیس سال اس نے کام کیا اور پھر بھی لوگ اسے پہچانیں نا... مگر الحمدللہ میں تو کبھی لبرٹی چلی جاؤں یا ہائپر اسٹار چلی جاؤں یا کسی بھی پبلک پلیس پہ چلی جاؤں تو لوگ مجھے بہت جلدی پہچان لیتے ہیں۔ میرے ساتھ تصاویر بنواتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں اپنے والد کے ساتھ بڑا شاپ پر گئی تھی اور وہاں جیسے ہی میں اپنی گاڑی میں آکر بیٹھی... لوگوں نے میری گاڑی کو ارد گرد سے گھیر لیا تھا۔ وہ مجھے جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے اور میری سیلفی لے رہے تھے۔ اس وقت میں نے اپنے فادر کو پہلی بار غصے میں دیکھا تھا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ آئندہ میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم نے اپنے آپ کو صرف "خبرناک" تک محدود رکھا ہے... دیگر جگہوں پر نظر نہیں آتیں؟"

"جی ایسا نہیں ہے کہ میں صرف خبرناک تک محدود

ہوں' میں نے جیسا کہ آپ کو بتایا کہ میں سیریلز بھی کر رہی ہوں اور دیگر کام بھی کر رہی ہوں۔ ہر وقت اسکرین پہ نظر نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو بہت محدود رکھا ہوا ہے کیونکہ میرا تعلق ایک "آرمی فیملی" سے ہے اور میری ویلیوز بہت اسٹرونگ ہیں اور میں اپنی ویلیوز پر کبھی کمپرومائز نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی میں کبھی شارٹ کٹ کے ذریعے سے آگے آنا چاہتی ہوں۔

ہماری فیلڈ میں بدقسمتی سے شارٹ کٹ کے ذریعے لڑکیاں آگے آتی ہیں اور چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے لوگ کسی کا ٹیلنٹ یا کام دیکھنے کے بجائے اپنے پرسنل تعلقات کی بنا پر فیور کرتے ہیں اور کام دیتے ہیں جب کہ مجھے اس طرح کی فیور نہیں چاہیے۔ کیوں کہ میں ضرورت مند نہیں ہوں بلکہ ایک اچھی فیملی سے ہوں۔ تو میں وہی کام کرتی ہوں جس میں مجھے لگتا ہے کہ مجھے یہ کام کرنا چاہیے۔ کسی کام میں مجھے ابہام لگے تو میں وہ کام نہیں کرتی۔"

"آپ نے کہا کہ میں یہ فیلڈ وسیع ہونے کے باعث ہر طرح کا اچھا کام کرنا چاہتی ہوں تو گویا آپ آل راؤنڈر بننا چاہتی ہیں؟"

"میں آل راؤنڈر بننا نہیں چاہتی' میں آل راؤنڈر ہوں۔ میں بیسٹ ڈیبٹر آف آل پاکستان ہوں اور پورے پاکستان میں جتنے بھی لیول کی تقاریر ہیں وہ ہمیشہ میں نے جیتی ہیں تو میں بول اچھا لیتی ہوں' میں ہوسٹنگ اچھی کر لیتی ہوں' میں ایکٹنگ اچھی کر سکتی ہوں اور کرتی ہوں۔ پھر میری ہائیٹ بہت اچھی ہے جس کی وجہ سے جب میں نئی نئی اس فیلڈ میں آئی تو مجھے ماڈلنگ کی آفر آئی اور میں تقریباً" پچاس کے قریب فیشن شوز کر چکی ہوں۔

جس میں ریمپ کی ماڈلنگ کی۔ اس کے علاوہ مختلف برانڈز جیسے گل احمد وغیرہ کی شوٹس کروا چکی ہوں' میگزین کے شوٹس کروا چکی ہوں۔ ویکلی میگزین جیسے اخبار جہاں' فیملی میگزین اور دیگر۔۔۔ ان کے لیے شوٹس کروا چکی ہوں اور اخبارات میں تو میری تصاویر لگتی ہی رہتی ہیں۔ سیریلز بھی کر چکی ہوں اور پذیرائی بھی ملی۔ خبرناک کرتے ہوئے مجھے دو سال ہو گئے ہیں۔"

"خبرناک میں کیسے آئیں اور اس فیلڈ میں کیسے آئیں؟"

"پہلے میں آپ کو یہ بتاتی ہوں کہ میں اس فیلڈ میں کیسے آئی۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں بیسٹ ڈیبٹر آف آل پاکستان ہوں اور ہمیشہ ہر تقریری مقابلے میں انعامات حاصل کیا کرتی تھی۔ ایک چینل تھا اور اس چینل کا ایک پروگرام تھا جو لاہور سے باہر تھا' سیالکوٹ سٹی میں تو اس وقت میں سیالکوٹ سٹی گئی تھی' اس پروگرام کا ہوسٹ کسی وجہ سے پروگرام چھوڑ کر چلا گیا تھا اور شو خراب ہونے کا ڈر تھا تو اس علاقے کا جو بیورو چیف تھا وہ مجھے جانتا تھا کہ یہ لڑکی کئی مقابلے جیت چکی ہے۔۔۔ تو اس نے میری مما سے کہا کہ اسے کہیں کہ وہ شو ہوسٹ کرے۔ اس نے ساری صورت حال میری مما کو بتائی مگر میں تھوڑی سی نروس تھی۔

بے شک میں نے تقریری مقابلوں میں حصہ لیا تھا' مگر کیمرہ کبھی فیس نہیں کیا تھا' لیکن پھر میں نے ہمت دکھائی اور شو ہوسٹ کیا تو مجھے سب نے بہت سراہا اور بہت شاباش دی اور اس چینل کے اونر نے بھی میری کافی تعریف کی۔

اس کے بعد عید ٹرانسمشن تھی تب بھی ان کے ساتھ کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ ہوسٹ ارینج نہیں ہو پایا تو انہوں نے مجھے ہی کہا تب مجھے سیالکوٹ سے لاہور بلوایا گیا عید کی ٹرانسمشن کے لیے اور ڈیڑھ گھنٹے کی لائیو ٹرانسمشن میں نے کی بغیر کسی وقفے کے۔ تو انہیں اندازہ ہوا کہ اس لڑکی میں کافی صلاحیت ہے تب مجھے انہوں نے مجھے ایک پروگرام آفر کیا جو کہ ای (E) پلانٹ کے نام سے تھا اور وہ پروگرام ای پلانٹ میں نے ایک سال ہوسٹ کیا اور جس چینل کا میں ذکر کر رہی ہوں اس کا نام رائل (Royal) تھا۔

بس یہاں سے سلسلہ شروع ہوا اور دوسرے

چینلز کے لوگوں نے مجھے دیکھا اور انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا۔ دیگر لوگوں نے بھی رابطہ کیا تو مجھے بہت اچھا لگا اور کام کر کے بھی مزہ آیا اور مجھے لگا کہ جیسے یہ میری ہی فیلڈ ہے اور میں اس فیلڈ کے لیے بنی ہوں اور بہت آسان ہے میرے لیے یہ سب کچھ کرنا اور اس طرح میں اس فیلڈ میں ان ہو گئی۔

اب آپ کے دوسرے سوال کا جواب کہ خبرناک میں کیسے آئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ "خبرناک" میں میری آمد کا ذمہ دار صرف ایک شخص ہے اور وہ ہیں "ذیشان حسین" ذیشان حسین اس پروگرام کے ہیڈ ہیں۔ سینئر پروڈیوسر ہیں اور "جیو" کے ساتھ وہ کافی عرصے سے وابستہ ہیں۔ ذیشان صاحب نے پہلے میرا آڈیشن لیا تھا۔ کافی لڑکیوں کے آڈیشن ہوئے تھے تو جب میں پہلی بار شارٹ لسٹ ہوئی تھی تو اس وقت مجھے چانس نہیں مل سکا تھا اور میری جگہ کوئی اور خاتون اس جگہ پر آگئی تھیں انہوں نے کچھ عرصہ کام کیا۔

اس دوران میں کراچی آگئی اور جب میں کراچی سے واپس آئی تو ذیشان حسین نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ ایک کریکٹر ہے جو آپ پرفارم کر سکتی ہیں لہٰذا آپ آجائیں تو انہوں نے مجھے خبرناک کے ایک ایپی سوڈ کے لیے بلایا تھا اور وہ کردار تھا "ڈومنی" کا جو مرزا غالب کی گرل فرینڈ تھی۔

یہ کردار جب میں نے کیا تو اس کے بعد ذیشان صاحب نے مجھے مزید رولز کی آفر دی اور کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کام کریں تو اس وقت انہوں نے مجھ سے کنٹریکٹ سائن کروایا۔۔۔ جیو کے دیگر پروگراموں میں بھی میں آتی رہتی تھی' لیکن میرا کوئی کنٹریکٹ نہیں تھا۔"

"زنیرہ! آپ بہت اچھا پرفارم کرتی ہیں۔۔۔ گھر والوں نے حوصلہ افزائی کی یا کہا کہ بس شادی کرو اور گھر بناؤ؟"

"جی۔۔۔ میرا نکاح ہو چکا ہے اور ہماری فیملی میں یہ رواج ہے کہ لڑکیاں جب تھوڑی سی بڑی ہوتی ہیں تو ان کا نکاح کر دیا جاتا ہے اور میرے فادر کی یہ شرط تھی کہ تم نے اگر اس فیلڈ میں کام کرنا ہے تو تمہیں نکاح کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ زیادہ تر آپ نے دیکھا ہوگا کہ شوبز میں آنے کے بعد لوگ شادی نہیں کرتے یا وہ ان سیکیورٹی فیل کرتے ہیں یا وہ کسی پہ بھروسا نہیں کرتے' لیکن ہماری فیملی میں ایسا نہیں ہوتا۔

میرا سارا انحصار اپنی فیملی پہ ہے' میں راجپوت فیملی سے تعلق رکھتی ہوں "مسلہری" ہماری کاسٹ ہے۔ تعلق ہمارا سیالکوٹ سے ہے کیوں کہ ہمارے آباؤاجداد کا تعلق سیالکوٹ سے ہے اور وہ ہمیشہ سیالکوٹ میں ہی رہے۔ ہم مائیگریٹ ہو کر نہیں آئے۔ ہماری زمینیں ہیں۔ ہمارا سب کچھ وہاں پہ ہے۔

میری فیملی صرف میرے شوق کو پورا کرنے کے لیے لاہور میں رہ رہی ہے کہ ہماری بیٹی کام کر رہی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹی ہاسٹل میں رہے یا کسی کے گھر میں رہے اور الحمدللہ یہاں لاہور میں ہمارا اپنا ذاتی گھر ہے' میں ایک خوش حال فیملی سے تعلق رکھتی ہوں اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ میں ضرورت مند نہیں ہوں بلکہ اس فیلڈ میں اپنے شوق کی وجہ سے کام کر رہی ہوں۔"

"آپ کے علاوہ بھی کوئی اس فیلڈ میں ہے؟"

"نہیں جی۔۔۔ ہماری سات پشتوں میں بھی کوئی اس فیلڈ میں نہیں ہے۔ اس لیے لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کیوں اس فیلڈ میں آئیں' آپ کچھ اور کام بھی تو کر سکتی تھیں۔۔۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ایک ڈاکٹر بننا ہے تو اللہ نے اس کے نصیب میں لکھ دیا ہوتا ہے کہ اس نے ڈاکٹر بننا ہے۔۔۔ تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ایک آرٹسٹ ہی پیدا ہوئی تھی کیوں کہ میرے اندر اس کام کی صلاحیت ہے تب ہی اس فیلڈ کے ہر شعبے میں کام کر رہی ہوں اور کرنا چاہتی ہوں۔"

"امور خانہ داری سے لگاؤ ہے؟"

"جی۔۔۔ مجھے اچھا کھانے کا شوق ہے' مگر پکانے کا نہیں ہے اور اسی لیے میں کک سے کھانا پکواتی ہوں۔"

اور اسی کے ساتھ ہی ہم نے زنیرہ زونی سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

مہوش حیات

"کیا حال ہے جناب کا؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"کیا بات ہے۔ ڈراموں کو خیرباد کہہ دیا ہے؟"

"ارے نہیں.... کس نے کہا.... ابھی تو ایک سال قبل ایک سیریل کیا تھا "ہمایوں سعید" کے ساتھ۔"

"مگر سال تو بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے؟"

"ہاں.... مگر فلموں میں جو مصروف ہوگئی.... لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں نے ڈراموں کو خیرباد کہہ دیا۔ ڈراموں سے تو یہاں تک پہنچی ہوں' انہیں بھلا کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ ان شاء اللہ ڈرامے بھی کروں گی۔"

"اپنی فلموں کے بارے میں کیا کہیں گی؟"

"بہت شکر گزار ہوں اپنے رب کی کہ اس نے مجھے فلموں میں کامیابی دی اور لوگوں نے مجھے پسند کیا۔"

"اصل کامیابی تو تمہیں "نامعلوم افراد" کے آئٹم سونگ نے دی؟"

"جی۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ "نامعلوم افراد" کی بلی نے مجھے بہت شہرت دی اور اس کے بعد ہی مجھے مزید فلموں کی آفرز آئیں اور "پنجاب نہیں جاؤں گی" اور "جوانی پھر نہیں آنی" کی کامیابی نے مسلسل ہمت بندھا دی۔ اب "جوانی پارٹ 2" کی تیاری ہے۔"

"انڈیا سے بھی آفرز آئی ہوں گی؟"

"آئی ہیں یا نہیں.... لیکن ایک بات تو واضح ہے کہ مجھے انڈین فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ہمارے فن کار شوق' شوق میں چلے تو جاتے ہیں' مگر ہمارے آرٹسٹوں کی وہاں ویسی عزت نہیں ہوتی جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ مجھے میرے ملک نے عزت و شہرت دی اور اس کی وجہ سے میری پہچان ہے۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی کہ میرے ملک کی عزت و وقار پر حرف آئے۔"

"گائیکی کہاں تک پہنچی؟"

"جاری ہے۔ کہیں نہ کہیں تو پہنچے گی۔ ویسے گائیکی جاری ہے' مگر اس کو باقاعدہ وقت نہیں دے پا رہی اپنی مصروفیات کی وجہ سے۔"

"فلمیں تو بڑی اسکرین کی چیز ہیں' مگر ڈراما ڈرائنگ روم کی چیز ہے۔ کیا آج کل کے ڈرامے اس تقاضے کو

نہیں ہے۔ نمبر دو صبح ہی صبح مجھ سے اٹھا نہیں جاتا اور تیسری بات یہ کہ اس کام میں وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ بس یہ ہی وجہ ہے۔ شوق ہو تو ہر مشکل کام کرنے کا مزا آتا ہے۔"

"شوبز کے لوگوں سے گہری دوستی ہے؟"

"نہیں.... صرف سیٹ کی حد تک دوستی ہے۔ سیٹ سے گھر اور گھر سے سیٹ.... ایسا نہیں ہے کہ بالکل بھی دوستی نہیں ہے۔ بس بہت گہری دوستی نہیں ہے۔"

"فارغ اوقات کی کیا مصروفیات ہیں؟"

"اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے فارغ وقت نکال ہی لیتی ہوں۔ مجھے ویڈیو گیمز کھیلنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

پورا کرتے ہیں؟"

"اکثریت ڈراموں کی ایسی ہے جو اس تقاضے کو پورا کرتے ہیں۔ اب ماحول تھوڑا ایڈوانس ہو گیا ہے' اس لیے ڈرامے بھی تھوڑے ایڈوانس ہو گئے ہیں اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ کہانی کو سبق آموز ہونا چاہیے۔ کوئی پیغام ہونا چاہیے' تاکہ ڈرامے کا مقصد پورا ہو جائے۔ بس اپنی روایات کی سرحد کو پار نہیں کرنا چاہیے۔"

"آپ نے شوبز کے ہر شعبے میں کام کیا۔ اچھا کہاں لگا اور جاری کس کو رکھنا ہے؟"

"ہر کام میں مزا آیا اور آرہا ہے اور ان شاء اللہ سب کو جاری رکھوں گی' کیونکہ فن کار کو ورسٹائل ہونا چاہیے۔ اداکاری میرا جنون ہے' میرا شوق ہے۔ اس میں زیادہ کام کروں گی۔"

"مگر اداکاری کام بھی تو مشکل ہے؟"

"اور مجھے مشکل کام کرنے کا زیادہ شوق ہے۔"

"مارننگ شو کو بھی آپ ایک مشکل کام کہتی ہیں' وہ کیوں نہیں کرتیں؟"

ہنستے ہوئے۔ "آپ نے بالکل ٹھیک کہا' مگر سچ بتاؤں کہ ایک تو مجھے مارننگ شو ہوسٹ کرنے کا شوق

ایمن خان

"کیا حال ہے ایمن.... لگتا ہے' بہت مصروف رہتی ہو؟"

"جی.... اللہ کا شکر ہے اور آپ نے بالکل صحیح جانا کہ میں بہت مصروف رہتی ہوں۔"

"کتنا عرصہ ہو گیا اس فیلڈ میں؟"

"جی.... ماشاء اللہ سے کافی سال ہو گئے ہیں۔ اسکول کے زمانے سے کام کر رہی ہوں۔ بلکہ پہلا کمرشل تو آٹھ سال کی عمر میں کیا تھا اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں بڑی ہو کر آرٹسٹ بنوں گی۔"

"اور اگر آرٹسٹ نہ بنتیں تو کیا کر رہی ہوتیں؟"

"جو ہر لڑکی کرتی ہے۔" ہنستے ہوئے.... "پتا نہیں کیا کرتی' کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"جو کام ہر لڑکی کرتی ہے' اس فہرست میں تو آپ بھی شامل ہو گئی ہیں تو کیا شادی کے بعد فیلڈ چھوڑ دیں گی؟"

ہنستے ہوئے.... "والدین کی نظر میں یہ کام بھی بہت ضروری ہے کہ لڑکیوں کی شادی وقت پر ہو جائی

جاہیے۔ منیب بھی اس فیلڈ سے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ وہ مجھے فیلڈ چھوڑنے کے لیے کہیں گے۔ ان شاءاللہ ہم دونوں اس فیلڈ میں اپنی روایات کی حد میں رہتے ہوئے کام کریں گے۔"

"منگنی سے پہلے سیٹ پر تمہارے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا تھا۔ اب کیا منیب ہوتے ہیں؟"

"نہیں... نہیں... منیب تو اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور پہلے امی یا والد صاحب ہوتے تھے مگر اب گزشتہ ایک' ڈیڑھ سال سے کوئی ساتھ نہیں آتا... کیونکہ امی' ابو اب دونوں اس فیلڈ سے واقف ہوگئے ہیں اور اب ان کا خیال ہے کہ ہم بڑی ہوگئی ہیں اس لیے اپنی حفاظت خود کرسکتی ہیں۔"

"ڈراموں میں تو ماشاءاللہ بہت کامیاب ہو۔ فلم سے آفر آئی؟"

"ابھی تو نہیں... شاید فلم کے لیے ابھی میں کم عمر ہوں... اور اگر پڑوسی ملک سے آفر آئی تو انکار کردوں گی۔ کیونکہ مجھے صرف اور صرف اپنے ملک کے لیے کام کرنا ہے۔"

"تو ہیرو کون ہوگا؟"

"مجھے فواد خان بہت پسند ہیں۔ اس لیے اگر وہ ہیرو ہوئے تو کیا ہی بات ہوگی۔ کسی ڈرامے میں بھی اگر وہ میرے مدمقابل ہوئے تو ضرور کام کروں گی۔"

"منیب اجازت دے دیں گے؟"

"ہاں... ہاں... کیوں نہیں... کام تو کام ہوتا ہے۔ ہم تو کتنے لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہیں اور کرچکے ہیں اور کرتے رہیں گے۔"

"آپ منیب کی پسند ہیں یا منیب آپ کی پسند ہیں؟"

"ہم دونوں ایک دوسرے کی پسند ہیں اور جب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا تھا تو ہم زیادہ بڑے نہیں تھے۔ یعنی میں صرف 14 سال کی تھی۔ لیکن میں نے کسی کو بتایا نہیں تھا سوائے اپنی بہن کے۔ مگر لوگ بہت تیز ہوتے ہیں۔ انہوں نے ہماری دوستی کو

بھانپ لیا۔ تب ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ بڑوں کی رضامندی سے دوستی کو رشتے میں بدل دیں۔"

"ہوں... گڈ... اور شادی؟"

"ان شاء اللہ... دو سال تک... اللہ تعالیٰ ہر طرح سے خیر رکھے۔"

"آپ دونوں بہنیں جڑواں ہیں ہم شکل بھی ہیں۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہوگی؟"

ہنستے ہوئے... "مگر اب ہم میں تھوڑا فرق آگیا ہے اس لیے پہچان مشکل نہیں رہی اور یہ رشتہ ڈراموں والا تو ہے نہیں۔ احتیاط کیسی؟ ہم دونوں بہنوں کا آپس میں بہت پیار ہے اور یہ رشتے بھی پیار والے ہیں۔"

"جڑواں ہونے کا کیا فائدہ ہے اور کیا نقصان؟"

قہقہہ... "بہت سے فائدے ہیں اور بہت سے نقصانات بھی... مثلاً" بہت مزا آتا ہے اس وقت جب کوئی مجھے منال سمجھ کر اور منال کو ایمن سمجھ کر ہماری برائیاں کرتا ہے یا ہماری تعریف کرتا ہے۔ ان باتوں کو ہم بہت انجوائے کرتے ہیں۔"

"شکلیں ایک جیسی ہیں اور مزاج؟"

"ہم دونوں کی شکلیں بے شک ایک جیسی ہیں، لیکن مزاج مختلف ہیں' ہم دونوں کے مزاج کافی شاہانہ ہیں۔ جس جگہ میں بیٹھ جاؤں' وہاں اپنی بہن کو بیٹھنے نہیں دیتی اور وہ بھی اسی طرح ہے۔ مجھے اپنی جگہ پر بیٹھنے نہیں دیتی۔"

"اچھا لگتا ہے' ایک دوسرے کی ہم شکل ہو یا دل چاہتا ہے کہ نہیں' ہم مختلف ہوتیں دیگر لڑکیوں کی طرح؟"

"جڑواں کہلوا کے اور ہم شکل ہو کے بہت اچھا لگتا ہے۔ بچپن میں اس چیز کو بہت انجوائے کیا۔ اب چونکہ بڑی ہوگئی ہیں اور میچیور بھی تو شکلوں میں تھوڑا فرق آگیا ہے' مگر بہت معمولی اور یہ تو ہم دونوں کے لیے فخر کی بات ہے کہ ہم جڑواں بھی ہیں اور ہم شکل بھی' ایسا دنیا میں بہت کم ہوتا ہے۔"

"نیب تمہارے کام کو پسند کرتا ہے؟ اور تمہاری تعریف کرتا ہے... کہ تم خوب صورت ہو... یا اچھی آرٹسٹ ہو؟"

"جی۔ میرے کام کی تعریف کرتے ہیں' مگر ہر وقت نہیں۔ جہاں انہیں میرا کام برا لگتا ہے' وہ کہتے ہیں کہ اچھا کام نہیں کیا تھا اور خوب صورتی کی تعریف بھی کبھار ہی کرتے ہیں' ورنہ تو یہ ہی کہتے ہیں کہ تم موٹی ہو رہی ہو۔ اپنا خیال رکھا کرو۔"

"مزاج اور دل کے کیسے ہیں؟"

"مزاج کے بھی اچھے ہیں اور دل کے بھی صاف ہیں۔ کوئی بات ناگوار گزرے تو منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ دل میں بات نہیں رکھتے۔ دوسروں کی مدد بہت کرتے ہیں۔"

"چلیں جی... جب شادی ہوگی تو ان شاء اللہ تفصیلی انٹرویو کروں گی۔"

"ان شاء اللہ۔"

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ذ۔ ڈ

پچیس سالوں سے شعاع کی خاموش قاری ہوں اور اب "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں اپنی 22 سالہ شادی شدہ روداد شامل کرنا چاہتی ہوں۔ سو بائیس سالوں کی کھٹی میٹھی یادوں کو صفحے پر بکھیر کر یہ امید لگا بیٹھی ہوں کہ شاید مجھے بھی جگہ مل جائے۔

س ۔ شادی کب ہوئی؟

ج ۔ 16 اکتوبر 1994ء کو امی ابو کی نصیحتوں، سہیلیوں کے مشوروں کو پلو سے باندھے، سسرال کو اپنا بنانے، ہر قدم پر میاں جی کا ساتھ نبھانے کے ارادے لیے ہم اس میدان کارزار میں اترے۔

س ۔ شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟

ج ۔ شادی سے پہلے ہر وہ کام کیا جو کر سکتی تھی۔ ہم دس بہن بھائی اور امی اکیلی، اس لیے بہت چھوٹی عمر ہی میں گھر کا کام اور چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ یوں چھوٹے بہن بھائیوں کو بہلاتے، فیڈر پلاتے، منہ دھلاتے، بچپن کب گزرا خبر ہی نہ ہوئی۔

میٹرک سے شعاع اور دوسری کتابیں پڑھنے کا چسکہ پڑ گیا۔ گھر کے کاموں سے جو وقت بچتا یا تو سلائی کڑھائی ہوتی یا پھر کتابیں پڑھی جاتیں۔ کہیں آنے جانے کی اجازت بہت کم ملتی تھی۔

س ۔ اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی؟

ج ۔ رشتہ کرنے سے پہلے ابو نے پوچھا ضرور تھا اور میں نے ابو کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ اولاد کے بارے میں والدین کے فیصلے ہمیشہ ٹھیک ہوتے ہیں۔

س ۔ ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور؟

ج ۔ میرے والد ہمیشہ سے میرا آئیڈیل رہے ہیں۔ کیونکہ وہ بہت سلجھی ہوئی اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ آج تک میں نے ہر ملنے والے کو ان کا گرویدہ ہی دیکھا ہے۔ اس لیے منگنی کے بعد ان کا جو تصور ذہن میں بنا وہ ابو سے ملتا جلتا تھا کہ ابو کی طرح اتنا آہستہ بولتا ہوگا کہ کان لگا کر سننا پڑے گا۔

آنکھوں میں ہر وقت ایک نرم سا تاثر ہوگا۔ غصہ کرنا اور ڈانٹنا جانتا ہی نہ ہوگا۔ ہمدرد، خیال رکھنے والا اور ہر ایک کے کام آنے والا ہوگا۔

س ۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟

ج ۔ ہم ٹھہرے ناک کی سیدھ میں چلنے والے بندے، کبھی کسی کا برا نہ کیا نہ سوچا۔ میکے میں صرف امی، ابو اور بہن بھائی تھے اور شادی بھی سب سے پہلے میری ہوئی۔ اس لیے بہو کی چالاکیوں اور ساس کی سیاست سے بالکل ناآشنا معصوم گئے تھے۔ اس لیے سسرال کے بارے میں خیالات بھی بڑے نیک تھے۔ سوچا تھا ساسو ماں اپنی ماں ہوگی اور نندیں اپنی بہنیں مگر سسرال جا کر پتا چلا کہ نہ ساس ماں ہوتی ہے نہ نند بہن ہوتی ہے۔ اور نہ بہو بیٹی بن سکتی ہے۔ ان رشتوں کو خوبی سے نبھانا ہے تو انہیں ان کی جگہ پر رکھ کر ان کے تقاضوں کے حساب سے چلنا پڑتا ہے۔

س ۔ منگنی کتنا عرصہ رہی؟

ج ۔ منگنی دو سال رہی۔ فون گھر میں تھا نہیں اور ان دو سالوں یہ صرف چار پانچ مرتبہ ہمارے گھر آئے۔ عیدی لے کر اور سارا وقت یا تو ابو کے ساتھ رہے یا چھوٹے بہن بھائیوں کے جھرمٹ میں۔ اس لیے ملاقات کا سوال ہی نہیں تھا۔ کچھ ابو کے انتخاب پر اتنا بھروسا تھا کہ کبھی کھڑکی سے بھی نہ دیکھا۔ سوچا اب تو شادی کے بعد ہی دیکھیں گے اور بولیں گے۔

س ۔ شادی کے لیے کوئی قربانی دینا پڑی؟

ج ۔شادی کے لیے تو کوئی قربانی نہیں دینا پڑی۔البتہ اس شادی کو قائم رکھنے کے لیے کئی قربانیاں دینی پڑیں اور قربانیوں کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور شاید عمر بھر جاری رہے گا۔

س ۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج ۔ بائیس سالوں میں ایک دوسرے سے اتنا کچھ کہہ سن چکے ہیں کہ اب یاد کرنا بھی مشکل ہے کہ پہلی دفعہ دیکھ کر کیا کہا تھا۔البتہ پہلے ہی دن سمجھ میں آگیا تھا۔ان کی خوشی ان کے گھر والوں کی خوشی سے جڑی ہوئی ہے۔ان کے گھر والے خوش۔تو یہ خوش' بیوی کیا چاہتی ہے' جانے ان کی بلا۔ہو گا وہی جو اماں چاہتی ہیں سو ہمارے حصے میں پہلے دن سے صبر آیا' جس کے میٹھے پھل کا انتظار اب تک کر رہے ہیں کہ امید پر دنیا قائم ہے۔

س ۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج ۔ تبدیلی تو زندگی کا حسن ہے سو ہماری زندگی اور خود ہمارے اندر بھی بڑی تبدیلیاں آئیں۔میری تنخواہ جو شادی سے پہلے میرے ہاتھ میں تھی۔میاں جی کے ہاتھ میں چلی گئی۔کب آئی۔کب خرچ ہوئی۔اتنے سالوں میں کبھی پتا نہ چلا۔یہ یقین ضرور رہا کہ میاں جی نے صحیح جگہ پر ہی خرچ کی ہو گی۔ابو کی گاڑی کی وجہ سے بہت کم بسوں میں سفر کیا تھا۔شادی کے بعد پتا چلا' کراچی کے شیشے ٹوٹی کھڑکھڑاتی بس کے ڈنڈے سے لٹک کر سفر کیسے کرتے ہیں۔بلاوجہ اور بے بنیاد الزامات سن کر خاموش رہنا۔اپنا دل مار کر دوسروں کو خوش کرنا۔اپنی ہی برائیاں اپنے سامنے سن کر نظر انداز کرنا یہ سارے ہنر ہم نے شادی کے بعد سیکھے۔

سب سے بڑی تبدیلی جو مجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ سسرال کے حالات کو دیکھ کر میرے اندر کی احساس کمتری کی ماری ہوئی بدھو سی لڑکی کہیں غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ایک بااعتماد اور مضبوط اعصاب کی سمجھ دار لڑکی نے لے لی۔میرے یہ مضبوط اعصاب میرے لیے ایک نعمت ہی ہیں کہ پل میں تولہ پل میں ماشہ کا مزاج رکھنے والی ساس "جسے ہر وقت یہ شک ہوتا رہتا ہو کہ بہو مجھ سے بیٹا چھین لے گی" کے ساتھ بائیس سال اور مزید نہ جانے کتنے سال صبر کے ساتھ گزارنا مضبوط اعصاب کے بنا ممکن نہیں۔اتنے سالوں تک ساتھ رہ کر بھی ابھی تک میری ساس کو یقین نہیں آیا کہ ان کی کرسی کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں۔کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے شوہر کی جان اپنی ماں میں ہے پھر بھلا میں ماں بیٹے کے بیچ آنے کی گستاخی کیسے کر سکتی ہوں اور کرنی بھی نہیں چاہیے کہ بیٹے بہرحال ماں کا مان ہوتے ہیں۔بس یہ ہی کہوں گی کہ۔

ان کی نظریں نہ جان پائیں اچھائیاں ہماری محسن
ہم جو سچ میں خراب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے

س ۔شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج ۔شادی کے تیسرے دن میاں جی اور ساس وغیرہ مجھے امی کے گھر چھوڑ کر بغیر دلہن کا ولیمہ نپٹانے گاؤں چلے گئے۔میں نرالی دلہن تھی جو اپنے ہی ولیمے میں شریک نہیں تھی۔پانچویں دن کراچی واپس آئے اور کہاں کی دلہن کیسی کھیر پکوائی' خود ہی پہنچ گئے اور کام کرنا شروع کر دیے۔نہ کسی نے روکا نہ ٹوکا کہ زیادہ چاؤ چونچلے کرنے سے میرے سر چڑھ جانے کا خدشہ تھا۔

س ۔ میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟

ج ۔ سسرال میں سمجھنے اور محسوس کرنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں جن میں سرفہرست میری ساس کا مزاج تھا۔جس کا پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب کون سی بات بری لگ جائے۔بعض دفعہ تو میری طرف سے کی ہوئی کوئی اچھی بات بھی انہیں بری لگ جاتی۔اب میرے فرشتوں کو بھی پتا نہ ہوتا تھا کہ مزاج کس بات پر برہم ہے۔منائیں تو منائیں کیسے؟

میاں جی کی ہر ہفتے گاؤں دوڑ لگانے کی روش سے سمجھوتا کرنا بھی خاصا مشکل کام تھا۔

میکے میں ہم سب بہن بھائی تعلیم یافتہ تھے۔ بات کرنے کی آزادی اور اپنی مرضی ایک حد تک کرنے کی اجازت تھی۔ ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھا جاتا تھا جبکہ سسرال میں ہم میاں بیوی پڑھے لکھے۔ باقی سب ان پڑھ! بات کو تول کر بولنا پڑتا تھا کہ سب کو اپنا مطلب نکالنے میں دیر نہیں لگتی تھی۔ بہو کے جذبات اور احساسات کس چڑیا کا نام ہیں۔ ہماری ساس اس سے نا آشنا ہیں۔ ان کی کہی کوئی بات بہو کو بری بھی لگ سکتی ہے۔ اس کی انہیں پروا نہیں ہوتی۔ ہاں بہو کے منہ سے ایسی کوئی بات نہیں نکلنی چاہیے جو ان کے مزاج پر ناگوار گزرے۔

شروع میں ساس کی تنگ مزاجی کے ساتھ نباہ کرنا بہت مشکل لگا کیونکہ غلط بات برداشت کرنے کی عادت نہیں تھی اور میاں جی بھی اس سلسلے میں کوئی تعاون نہیں کرتے تھے۔ یعنی رہنا ہے تو اسی طرح رہو ورنہ راستہ کھلا ہے۔ جوش میں آکر روٹھ کر میکے چلی گئی۔ ابو کو بتایا تو انہوں نے کہا۔

"تمہاری ساس کی تم سے نہیں بنتی' اس بات پر میں تمہیں نہیں رکھوں گا کیونکہ تمہاری ساس کو تم سے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا کام ہے کہ تم ساس سے کیسے بنا کر رکھو۔ وہ تمہارے شوہر کی ماں ہے اور انہیں اسی کے ساتھ رہنا ہے' ماں اور بیٹے کے درمیان تمہیں اپنی جگہ خود بنانی ہے اور بھائی سے کہا بہن کو اس کے گھر چھوڑ آؤ۔

لو جی گل ہی مک گئی "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔" اس وقت بہت غصہ بھی آیا بہت رونا بھی آیا مگر دل میں پکا ارادہ کرلیا کہ اب چاہے کچھ ہو جائے پیچھے نہیں دیکھنا۔ سو ساری کشتیاں جلا کر کود پڑے اس میدان کارزار میں اور آخر ماں بیٹے کے درمیان اپنی جگہ بنا ہی لی۔ اب سوچتی ہوں اگر ابو اس وقت ایسا نہ کرتے تو شاید میں کبھی اپنے حالات سے لڑنے کا حوصلہ نہ کرپاتی۔

س۔ سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی اور کن پر تعریف؟

ج۔ اپنی ساس کے منہ سے تعریف سننے کے لیے تو بس یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ "حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

میری بڑی خواہش ہے کہ میری ساس کبھی میری تعریف کریں مگر ہائے قسمت کہ انہیں مجھ میں صرف خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں۔ البتہ شوہر اور نندیں وغیرہ کبھی کبھار کوئی تعریفی جملہ بول ہی دیتے ہیں۔

س۔ سسرال والوں نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے۔

ج۔ مقام کوئی کسی کو نہیں دیتا اپنی جگہ خود ہی بنانی پڑتی ہے۔ میرے سسرال میں بھی روایتی سسرال کی طرح فرائض حاضر حقوق ندارد والا معاملہ ہے۔ خاصی قربانیوں کے بعد اب تھوڑا بہت مقام مل ہی گیا ہے باقی میری ساس حق اور مقام کے معنی ہی نہیں جانتیں سو ان کی طرف سے ہم نے صبر کرلیا ہے۔ رائے کوئی نہیں لی جاتی کہ کل کی آئی کو خاندانی معاملات میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ شوہر بچوں کے معاملے میں میری رائے کو ضرور اہمیت دیتے ہیں۔

س۔ سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں۔

ج۔ شادی کے وقت ابو نے سمجھایا تھا کہ اپنا ہر عمل صرف اور صرف اللہ کے لیے کرنا لوگوں سے توقع رکھے بغیر خلوص سے اپنا کام کیے جانا اور اپنا معاملہ اللہ

پر چھوڑ دینا تو بہت سکون میں رہوگی۔ سو اسی بات پر عمل کرتے ہوئے کسی سے کوئی توقع نہیں رکھی۔ بس اپنا کام کیے جاتی ہوں کہ۔

امیدیں توڑ کر کتنا سکون ملتا ہے
توقعات کے غم میں عذاب کتنے ہیں

س ۔ بچوں کی پیدائش عورت کے لیے امتحان ہوتی ہے خاص کر پہلا بچہ؟

ج ۔ جب مجھے ماں بننے کی نوید ملی تو سب کا رد عمل بس نارمل سا تھا۔ کوئی جوش و خروش نہیں تھا کہ میری ساس آدھا درجن پوتے پوتیاں کھلا چکی تھیں اور شوہر اندر سے شاید خوش ہوں مگر لیکن اظہار نہیں کرتے تھے کہ کہیں اماں ناراض نہ ہو جائیں۔ ایسی ساس شاید صرف ڈراموں میں ہوتی ہیں جو بہو کو ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھتی ہیں۔ اس لیے میں تمام کام اسی طرح کرتی رہی جیسے پہلے کرتی تھی۔ آخری مہینہ جوامی کے پاس گزرا تب لگا کہ ہاں بھئی میں بھی کوئی نیا کام کرنے جا رہی ہوں۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد جب واپس آئی تو وہی بکھیڑے میرے منتظر تھے۔ ساس نے اتنا تعاون کیا کہ نوکری کے جو پانچ گھنٹے باہر گزرتے تھے بچی کو سنبھال لیتی تھیں۔ جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوئی کہاں کی دادی، کہاں کی پوتی اپنی اولاد خود سنبھالو۔

دوسری بیٹی اور بیٹے کی دفعہ ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ بتایا جو میں نے کرسی پر بیٹھ کر جھاڑو لگاتے، برتن دھوتے اور کھانا پکاتے کیا۔ البتہ شوہر سے جو ہو سکتی تھی وہ مدد کرتے تھے۔ بیٹے کی پیدائش کے کچھ گھنٹوں بعد میری حالت بہت سیریس ہو گئی تھی اور دوبارہ آپریشن تھیٹر لے جایا گیا، تب شوہر جس طرح پریشان ہوئے، وہ دیکھ کر پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ صاحب کے پاس ہمارے لیے بھی کچھ گنجائش ہے بس ماں کی ناراضی کے خیال سے اظہار نہیں کرتے۔

س ۔ آپ جوائنٹ فیملی سے اتفاق کرتی ہیں؟

ج ۔ ہمارا تو اب وہ حال ہے کہ

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے
اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

اتنا عرصہ ہو گیا ہے جوائنٹ فیملی میں رہتے ہوئے کہ اب اگر علیحدہ ہونے کا سوچوں بھی تو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ویسے بھی ایک "ورکنگ وومین" کے لیے جوائنٹ فیملی ہی اچھی رہتی ہے اگر اپنے اندر تھوڑا سا خلوص، صبر اور درگزر پیدا کر لیا جائے تو آپ تھوڑی سی قربانی دے کر بہت سے مسائل سے بچے رہتے ہیں۔ نانی، دادی کے ساتھ رہتے آپ کے بچے ان کی محبت کو محسوس کرتے ہیں اور آپ بھی اطمینان سے اپنے کام پر توجہ دیتے ہیں کہ پیچھے بچے تنہا نہیں۔ ویسے بھی اصل سے سود پیارا لگتا ہے۔ سو ہمارے ساس سسر ہمارے ساتھ جیسے بھی رہ رہے ہوں۔ اپنے پوتے پوتیوں کے لیے ان کے پاس محبت ہی محبت ہوتی ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کو ان کے بڑھاپے کی اس محبت سے محروم کریں یا اپنے بچوں کو محبت کے اس رنگ سے دور کریں۔

س ۔ آپ نے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کیا کوششیں کیں؟

ج ۔ میں نے اپنی زندگی اور اپنے گھر کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے وہ سب کیا جو میں کر سکتی تھی۔ معاشی طور پر مستحکم ہونے کے لیے ہر قدم پر شوہر کا ساتھ دیا۔ گھر کے ماحول کو خوش گوار رکھنے کے لیے ساس کی تنک مزاجی، کڑوے رویے اور بلاوجہ تنقید کو خندہ پیشانی سے سہا۔ بچوں کے دل میں دادی کے لیے یا دوسرے لوگوں کے لیے نفرت نہیں ڈالی۔ اللہ سے دعا کرتی رہی کہ ساس کے دل کو میری طرف سے نرم کر دے۔ کئی دفعہ اپنا دل مار کر اپنی انا کو پس پشت ڈال کر سسرال والوں کی خوشی کا خیال کیا کہ

منافقتوں کا نصاب پڑھ کر محبتوں پہ کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پر داستان گلاب لکھنا

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ہ۔ف

س ۔شادی کب ہوئی؟

ج ۔شادی ہوئی تھی نومبر 29 اور سن تھا 1997 اب 2017 آ گیا۔

س ۔شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟

ج ۔مشاغل عام ہی تھے پڑھنا' لکھنا' کھیلنا' کودنا' لاپروائیاں' شوخی شرارتیں' سونا' جاگنا' والدین کے ساتھ گھومنا پھرنا غزل نظم پہ فوکس کرنا۔ سفرناموں پہ ان کے ساتھ ۔ ان ہی وادیوں میں گھومنے چلے جانا' خیالی دنیا میں رہنا۔ شادی پہلے ہوئی' بی اے کا رزلٹ بعد میں آیا۔ شادی کے وقت تقریباً" اکیس سال کی تھی۔ جو لڑکیاں جوائنٹ فیملی سسٹم میں نہیں رہتیں۔ وہ اتنی سیانی نہیں ہوتیں۔ ہم اپنے ابو کے ساتھ گورنمنٹ کے کوارٹرز میں رہا کرتے تھے۔ ابو پہلے پروفیسر تھے بعد میں پرنسپل ہوئے۔ ننھیال بڑا آزاد تھا۔ نانا جی ہیلتھ آفیسر تھے اور چھوٹے نانا ابو' ریلوے میں گارڈ تھے۔ ماحول پڑھا لکھا تھا۔ کہانیاں سنتے' خواب بنتے والدین کے گھر وقت گزر گیا۔ دنیا سے دور تھے۔ سورج بھی کم تھے۔

س ۔اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج ۔میرج ارینج تھی۔ میری سہیلی کے توسط سے رشتہ آیا تھا۔ والدین کو اندرونی مسائل کا معلوم نہ تھا مگر سہیلی کا تو گھر تھا۔ اس نے دھوکے کی بنیاد پر شادی کروادی۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ان کا اپنا ذاتی مکان نہیں ہے اور جس بھائی کا رشتہ کرا رہی ہے وہ خروج لگوا کر باہر کے ملک سے آ گیا ہے۔ یہ چار بہنیں تھیں اور ایک بھائی۔ ہم سات بہنیں تھیں بھائی نہیں۔ میں بڑی تھی پھر سہیلیاں تو قارئین خوشیاں دینے والی ہوتی ہیں' یہ تو میری زندہ دلی کو کیش کرا گئی۔ منگنی کے بعد میں نے کافی واویلا ڈالا کہ ان سے کہیں گھر بنائیں۔ تب یہ اپنے ابو کے ساتھ آئی اور کہا کہ ہم چھ مہینے میں گھر بنا لیں گے' آپ شادی کر دیں اور پھر وقت نے لوگوں نے' زمانے نے دیکھا 1997 تا 2017 دس سال تک نہ گھر نہ کاروبار' سارا سونا' زیور ماں کی طرف سے دس تولے جو انہوں نے دیا تھا۔ وہ اپنا سارا اسی سہیلی کے ابو نے شادی کے تین ماہ بعد ہی گروی رکھ دیا۔ اور گھر کا تو انہوں نے صرف دھوکا دیا اور جھوٹ بولا۔ ان پر قرضہ تھا بہت وہ ہی اتارتے پندرہ سولہ سال گزر گئے اور (اللہ کی قسم بہت بڑی چیز ہے) اس سہیلی نے پلٹ کر میری خبر نہ لی۔ اس کے باپ بھائی شہر بدر ہو گئے۔ ڈسکہ سے پتوکی آ گئے۔ آج بھی وہیں ہیں مگر خدا گواہ ہے کہ اس ظالم عورت نے ایک فون اتنے سالوں میں نہ کیا کہ تمہارا کیا حال ہے۔ جو میں نے دھوکا کیا۔ کیسی گزر بسر ہو رہی ہے۔ ایک بار بھی انگلی پر گن کر بھی اس نے نہ مدد کی نہ خبر لی جیسے کسی کو سمندر میں دھکا دے کر مار دیا۔ یہ قاتل ہے میرے سب سنہرے خوابوں کی' اسے پتا تھا میری طبیعت کا' مزاج کا' عادات کا' خوابوں کا' باتوں کا اس نے سب کچھ تباہ کر دیا۔ مجھے' میرے احساسات' جذبات' خیالات سب کا خون کر دیا۔ ذہنی مریض بنا کر لاوارثوں کی طرح چھوڑا اور اب۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

شاعر نے اسی لیے لکھا کرب ناک ماضی' دردناک لمحات' بے درد ماحول کے لیے ورنہ کون کہتا ہے میرا حافظہ چھین لے۔ اس طرح کے لوگ مجبور کر دیتے ہیں ۔ اپنے سفاکانہ' قاتلانہ' ظالمانہ' رویوں سے مظلوموں کو۔ یہ دین دار گھرانے سے تعلق رکھنے

والیاں حقوق العباد کی الف 'ب 'پ سے بھی ناواقف تھیں۔ جان بوجھ کر میں ان کو دس سال تک کہہ کہہ کر تھک گئی مگر بھینس کے آگے بین ہی بجی۔ یہ اکھٹی ہو گئیں سب ہمیں صحرائے زیست میں اکیلا چھوڑ دیا پھراوپر سے اگر چیخی چلائی' بے بسی سے' مصائب سے پریشانیوں سے' کوئی بڑی عمر کی عورت تو نہیں تھی میں۔ الھڑسی لڑکی تھی بیس سال کی اور انہوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کے بوجھ مجھ پہ ڈال دیے خود بری الذمہ

ہوگئیں کہ چلو باپ کا گھر چلاتی رہے گی۔ قرضے اتارتی رہے گی اور پھر آٹھ لاکھ قرض تن تنہا اتارا ابھی پھر سسر نے کہا کہ بیٹیوں سے زیادہ بہو نے ہمارا احساس کیا۔ لیکن مجھے ایوارڈ نہیں چاہیے تھا' محبت' عزت' وقار' مان نہ دے سکیں۔ جو ان سے ناکام امیدیں لگائیں سب خوف درست ہوئے۔ سب ڈر ثابت ہو گئے۔

س ۔ ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا؟

ج ۔ آئیڈیل' نمازی' دیانت دار' نان نفقے کی ذمہ داری اٹھانے والا۔ مشکل اور پریشانی میں خود آگے کھڑا ہو کر بیوی کا نگہبان مگر الٹ ہوا۔ بھائی بھی تو ان ہی کا تھا۔ اب بیٹا شہید ہوا تو سات سال سے سنبھال رہے ہیں۔ اب برسوں بعد معلوم ہوا ہے کہ میں شوہر والی ہوں۔

س ۔ منگنی کتنا عرصہ رہی شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات؟

ج ۔ منگنی ”تقریباً“ سال بھر رہی۔ قدرت کو جوڑا منظور تھا۔ ان بن ہی میں بن بنا گیا البتہ منگنی اعتماد کی بنا پر ہی ہوئی۔ میرے گھر والوں نے تصویر دیکھ کر ہی کر دی کیونکہ یہ جدہ میں تھے۔ شادی سے دس' بارہ دن پہلے آئے۔ بہن کو معلوم ہوا کہ ماموں نے خروج لگوا کر بھیج دیا ہے مگر ہمیں نہیں بتایا کہ بھائی بے کار ہو کر آگیا ہے' اب جا نہیں سکتا۔ دھوکے میں ہی رکھا۔ اعتماد کو چور چور کیا۔

س ۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟

ج ۔ بہت سے خوف تھے کہ گھر نہ بن سکے گا (یہ سچ ثابت ہوا) ہم اردو اسپیکنگ' یہ پنجابی' زبانوں کا فرق۔ اب مجھے کہیں تم پنجابی نہیں بول سکتیں۔ میری زبان پنجابی میں چلتی ہی نہ تھی۔ گھر کا خوف تھا۔ تمام عمر کرائیوں میں دربدر ہوتے گزری اور یہ گھر والیاں اپنے گھروں میں بیٹھ کر ڈوبنے والوں کا تماشا دیکھتی رہیں اور بالکل انجان بنی رہیں جیسے بے خبر اور انجان ہیں۔ اللہ بڑا مہربان ہے۔ اسی نے 2017ء آنے تک ان کا گٹھ جوڑ توڑ دیا ہے۔ اب اپنی آگ میں خود جلنا ہے انہیں۔ ان ہی رویوں کی چوٹ انہیں آ کر لگ رہی ہے جو دوسروں کو' اپنے بھائی' بھابھی کو دے کر اجنبی تھیں۔ میرے ذہن کا ستیاناس کرنے میں پہلا نمبر ہی میری تیسرے نمبر والی نند کا ہے۔ میں ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤں تو اسے اپنے آپ کو ہر طرف اچھا کہہ کر دباتی ہے برداشت کا مادہ کم رکھتی ہے۔ اللہ کے تو سب ہی بندے بندیاں ہیں مگر اللہ نے امیروں' گھر والوں پر غریبوں' رشتہ داروں کے جو حقوق رکھے ہیں اس میں یہ ٹوٹل فیل ہوئی ہیں مگر مانتی نہیں۔ نہ مانیں اللہ خود منوا لے گا۔ اسے بہت اچھا منوانا آتا ہے۔ یہی خوف تھے جو سب بلا بن کر سامنے آئے کئی سال۔

س ۔ شادی سے پہلے آپ کو تعلیم چھوڑنی پڑی یا کوئی اور قربانی دینا پڑی؟

ج ۔ تعلیم تک کوئی قربانی نہ دینا پڑی۔ پڑھنے کا اتنا شوق نہیں تھا۔ اب اکیلی رہ گئی تو پیدا ہوا ہے۔ اللہ کرے ادھوری تعلیم مکمل کر سکوں۔ آمین۔

س ۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی' رسموں کے دوران لین دین پر کوئی بدمزگی تو نہیں ہوئی؟

ج ۔ دودھ پلائی' گوڈا بندھائی' جوتا چھپائی ہم نے سب رسمیں کیں البتہ بارات باجوں کے بغیر تھی کیونکہ علماء کرام شامل تھے۔ تحفے تحائف سب کچھ اے۔ون رہا۔

س ۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو

کیا کہا؟

ج ۔ آفٹر میرج۔

رفتہ رفتہ وہ میری زندگی کا ساماں ہو گئے
پہلے جاں پھر جان جاں پھر جان جاناں ہو گئے

س ۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج ۔ تبدیلیاں! بندی نے رونا زیادہ شروع کردیا۔ ہم مزاج ماحول نہ ملنے پر گھن کی مریضہ بننے لگی۔ اپنی بے قدری پر سسکنے لگی شوہر سے جھگڑنے لگی۔ آہستہ آہستہ بلڈ پریشر کی مریضہ بنی۔ ٹینشن کی دوائیاں لینے لگی۔ قرض' بے روزگاری' مصائب' پریشانیاں' ذلتیں رسوائیاں اور اب آخر یہ تنہائیاں۔

س ۔ کیا میکے اور سسرال کے کھانے کے ذائقے اور انداز مختلف محسوس ہوئے؟

ج ۔ ذائقے ساگ' کریلے' بھنڈی میں ٹوٹلی مختلف تھے۔ میں نے شادی کے بعد کھانا پکانا کیا۔ ساس سے پوچھ کر مچھلی پکانا سیکھی۔ سب نے ہمیشہ تعریف کی الحمد للہ۔ یہاں صبح سادہ روٹی' پراٹھا انڈا' سالن بنتا یا رات کے چاول' سالن' دہی چائے۔ پر اپر بریک فاسٹ بڑی محنت سے تیار کیا جاتا جبکہ ہمارے ہاں سب اسکول کالج جاتے تھے۔ ابو آفس' بریڈ' جیم' مکھن' شہد لسی+ جوس' بسکٹ اور لنچ میں روٹی' سینڈوچز وغیرہ آہستہ آہستہ ان کے جیسے کھانا بنانے' پکانے' کھانے لگی اور میری صفت تھی سخت ناراضی میں بھی گھر کے کام نہیں چھوڑا کرتی تھی!

س ۔ سسرال میں کن باتوں کی تعریف ہوئی اور کن پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟

ج ۔ تعریف۔ تنقید نئی نئی شادی ہوئی تو گھر کو چمکا دمکا دیا۔ ساس سسر خوش رہتے۔ صاف ستھری' ذمہ دار' وقت پہ کام کرنے والی' کچن صاف ستھرا رکھنے والی واش روم چمکانے والی' لانڈری یعنی کپڑے دھونے دھلانے والی' دلہن نصیب ہوئی ہے۔ سسر کے کپڑے پریس کرنا' جوتے پالش کرنا' بستر پر ان کی خدمت کرنا۔ ہاتھ دھلانا' تولیہ لے کر آگے بڑھنا' گلدانوں میں پھول سجانا' جالے ہمیشہ اتارے رکھنا۔ چیزوں کو بے ترتیبی سے بچانا' ترتیب سے رکھنا' ہر ضرورت کی جگہ ڈسٹ بن رکھنا' ٹوائلٹ صاف کرنا جو ہمارے ہاں ہمیشہ سوئپر کرتا تھا۔ برتن ماسی دھوتی تھی ۔ میں نے گھر' برتن دھونا' سلیقے سے رکھنا' سب کچھ شوق سے کیا محبت سے کیا۔ دو کوڑی کا مان نہ دے سکے بدلے میں بہو کو جمعداروں والے کام کروا کر بھی جانتے تھے پروفیسر صاحب کی بیٹی ہے۔ ٹوائلٹ کے لیے سوئپر ہی لگوا دیتے مگر ذات کی شہزادیاں بھی ناقدروں میں ذلیل ہو کر رہ جایا کرتی ہیں۔ تعریف چلیں نہ کریں نندیں مگر ماں باپ کو آکر بھڑکایا تو نہ کریں ناکہ مجھ جیسی ناسمجھ جذباتی لڑکی غصے میں آکر خود کو کوئی بدلے میں نقصان نہ پہنچالے میری خندہ پیشانی' زندہ دلی رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگی جیسے مچھلی پانی سے نکالو تو بس مرگئی۔ تعریف' تنقید بے معنی نہیں ہوتی۔ بے جا تنقید ذہنی مریض بناتی ہے اور اچھی تعریف کام میں دلچسپی پیدا کرتی ہے۔ یہ میرا دو سالہ سسرالی دور تھا اکٹھے جوائنٹ بعد میں تو سب ختم ہو گیا۔

سقراط کے پینے سے کیا مجھ پہ عیاں ہوتا
جب زہر پیا میں نے تب اس کا اثر جانا

س ۔ سسرال سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟

ج ۔ توقعات' پہلے پہل تو لگا جیون یہی رہے گا چند

روزہ خوشیاں سمیٹ کر مکر جلد ہی زندگی کانٹوں کا بستر بن گئی۔ زخم زخم 'انسانی رویے' تکالیف بن کر جلانے لگے' روح وبدن کرلانے لگا۔ کاش میری نندیں بے حد خود غرض' خوشامدی نہ ہوتیں۔ کاش مجھے چھوٹی بہن جان کر زندگی میں ساتھ دیتیں۔ کاش زندگی کا حسن اپنے ناروا سلوک سے خراب نہ کرتیں۔ حقوق العباد نبھاتیں یار تار نہ کرتیں۔ کاش بے خبر نہ رہتیں خیال رکھتیں' ہمدرد ہوتیں احساس کرنے والی ہوتیں 'صرف منہ زبانی اپنے سسرال والوں کے سامنے میرا حال بڑھ چڑھ کر پوچھنے والی نہیں بلکہ سچ مچ حقیقتاً" عملی طور پر محبت 'خلوص کی قدردان ہوتیں مگر کاش۔

س ۔ پہلے بچے کی پیدائش بڑی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس دوران سسرال والوں کا رویہ؟

ج ۔ ایک ہی ہوا وہ 1999ء میں ستمبر کی 29 کو ہوا۔ مالی حالات 'بہت ہی بگڑ چکے تھے۔ کسی نند نے کبھی تسلی نہ دی' کبھی کوئی پاس آکر دلاسا نہ دیا' کوئی ہلکی سی مدد کا اشارہ تک نہ کیا۔ نظارہ دیکھا 'تباہی کا' بربادی کا رسوائی کا' غربت کا ذلت کا کیونکہ ان کی والدہ دنیا سے رخصت ہوئیں تو ان کے والد اچانک مجھے اور میرے شوہر کو ننھے بچے سمیت میری والدہ کے گھر چھوڑ کر پتوکی روانہ ہو گئے۔ حالات کے مارے پھر چند سال بعد میں نے خدا سے دعائیں کر کر کے پیسے اکٹھے کیے۔ قرض اتارنے میں مدد کی 'بہنیں' منہ بند کیے اپنے سسرال میں جوان ہی کا خاندان تھا۔ تایا' چچا' پھوپھو' خاموش بیٹھی رہیں۔ قرضہ اتارنا میری یا میرے والدین کی ذمہ داری نہ تھی مگر (وفاداری ہماری سرشت میں ہے) الحمدللہ شوہر اور سسر کا ساتھ دے کر انہیں مصائب سے نکلنے میں مدد دی پھر چار پانچ سال بعد یہ پتوکی سے لوٹ کر اپنے شہر ڈسکہ آنے کے قابل ہو سکے تو پھر یہ ہی بیٹیاں ملنے ملانے لگیں اور ان کو اپنے گلے شکوے کہ ہمارے پیچھے کوئی نہ آیا۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے مگر ایک کتاب اعمال نامہ بھی ہے۔ جب وہ کھلے گا تو ظالم منہ کہاں چھپائے گا۔ کیا انسان کو تکلیف دینا گناہ نہیں' دل توڑنا گناہ نہیں۔ کسی کے احساسات کچل دینا گناہ نہیں۔ حقوق العباد ادا نہ کرنا گناہ نہیں۔ وہ بھی قرابت داروں سے' پردیسیوں' مسافروں' یتیموں' مسکینوں سے۔

پھر میرے ابو چلے گئے۔ وقت نے انہیں میرے اتنے دکھ دیے' میرے باپ کا دل روتا تھا میرے حالات پر اور ان کی بے حسی پر' بچے سمیت سال بھر میں رہی اور نہ ہمیں اتا نہ پتا کدھر ہیں یہ لوگ؟ زندگی سے ناامید' مایوس۔

لوگ منہ پہ کہتے تھے "آپ اتنے انجان تھے رشتہ کرتے وقت؟ ان پہ تو قرضہ ہی بڑا تھا۔ مکان بک چکا تھا۔ بیٹا بے روزگار تھا۔ حالات خراب تھے۔ آپ نے کیا دیکھا؟ دھوکا دینے والی جب سہیلی ہو تو بندہ کیا دیکھتا ہے؟ انصاف سے یہ خود سوچیں اس کی بیٹی کے ساتھ اسی کی طرح کوئی دھوکا کرے تو اسے کیسا لگے گا۔ کیا یہ اس کے سسرال والوں کا قرضہ اتارے گی۔ اگر شوہر چھوڑ گیا تو احساس کرے گی بچہ سنبھالے گی۔ میں بھی کلیجے کا ٹکڑا تھی اپنے باپ کا ماں کا۔ انہیں میری پریشانیوں سے کالا یرقان ہو گیا۔ کیا ان کے دل کو جو تکلیف اس نے پہنچائی خود بھی اسی کا سامنا کرے گی؟

س ۔ سسرال میں وہ مقام ملا جس کی مستحق تھیں؟

ج ۔ ناقدرے لوگ مقام نہیں دیتے جی' وہ تو اپنا مقام بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ میں تو ان سے جیت نہیں سکی' میں تو سسرال میں ہار گئی جی۔

جوائنٹ سسٹم ہو یا الگ' دونوں بے کار۔ جہاں اپنے منہ میاں مٹھو والی نندیں ہوں وہاں مجھ جیسے کاسئہ دل' خلوص' محبت لے کر جہاں سے خالی کے خالی لوٹیں۔ یہی شکر یں ایک ایسے دوست کے قریب لے آئیں جسے جب پکارا' فریاد سنی گئی۔ ہاں جب اسے بھولی' زندگی میں ان سے ملنے والی تکلیفیں ابھر ابھر کر نمودار ہوئیں۔ دماغ جھنجلا جھنجلا کر ماضی کی طرف گیا مگر جب چوٹوں پہ چوٹیں پڑیں تو خوابوں کی پامالی' خوابوں' خواہشوں' آرزوؤں کا قتل یاد آیا۔ چاہے کوئی مانے نہ مانے مظلوم تو مظلوم ہے اور ظالم ظالم۔

☆

عفت سحر طاہر

ستر ہویں قسط

مہر ماہ کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔
مردانہ بے لچک لہجہ مہر ماہ کو شناسا سا لگا۔ مگر فی الحال اس کے پاس یہ یاد کرنے کا وقت نہیں تھا کہ یہ آواز اس نے کہاں سنی تھی۔
"کون ہو تم اور کیا بکواس کر رہے ہو" وہ بے اختیار کہنی کے بل پر ذرا اونچی ہوتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔
"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں نمیر آفندی کے بارے میں وہ سب بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتیں"۔ دوسری طرف سے اطمینان سے کہا گیا۔
"میں کیسے مان لوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو" مہر ماہ کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔
"ثبوت یہ ہے کہ تم جب کہو گی ملوا دوں گا تمہیں نمیر آفندی سے۔" وہ نڈر لہجے میں بولا۔
"مجھے کیا کرنا ہے اس سے مل کر۔۔" وہ اول لمحے میں تو گڑبڑا کر ناگواری سے کہہ گئی۔ مگر جب وہ توقف کے بعد بولا۔
"او کے۔۔۔ تو پھر ساری عمر دو کشتیوں کی مسافر بنی رہو۔ مگر منزل تک کبھی پہنچ نہیں پاؤ گی"
"تم بس اس کا ایڈریس دے دو اگر اتنا ہی شوق ہو رہا ہے خدمت خلق کا" دھڑکتے دل کے ساتھ وہ تیزی سے بولی مبادا وہ فون بند کر دے اور نمیر آفندی کو ڈھونڈنے کا یہ راستہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔
"ہاہاہا۔۔۔" وہ ہنسا۔ "صرف پتا نہیں دوں گا بی بی۔ بنفس نفیس اس سے تمہاری ملاقات کرواؤں گا۔ مگر اسے خدمت خلق مت سمجھو۔ فی زمانہ مفت میں کون کسی کی مدد کرتا ہے" مہرو کے بدترین خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ یہ شاید نمیر ہی کا کوئی ساتھی تھا اور اسے بلیک میل کر کے روپے اینٹھنا چاہ رہا تھا۔ یا خود نمیر ہی ہو۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مہرو نے نا جانے کیا کیا سوچ ڈالا۔
"کیا چاہتے ہو تم؟"
"پہلے تم بتاؤ۔ تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے جیسے مہر ماہ کو کریدنا چاہا۔
"میں نمیر آفندی سے ملنا اور بات کرنا چاہتی ہوں" بہت کچھ زبان تک آیا مگر مہرو ایک تیسرے شخص کو انتہائی حد تک اس معاملے میں شامل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اسے شک تھا کہ یہ سب وہ نمیر ہی کی زبان سے کہہ رہا ہے۔ مگر اپنی طرف سے وہ اس انجان شخص کو کوئی ڈھیل نہیں دینا چاہتی تھی۔
"ٹھیک ہے۔ مگر اس ملاقات کے لیے تمہیں کچھ قیمت ادا کرنا ہو گی۔ میں نمیر سے تمہاری ملاقات طے کروا سکتا ہوں" وہ اطمینان سے بولا تو مہر ماہ کا اطمینان اڑنے لگا۔ وہ کہاں کی لینڈ لارڈ تھی۔ ابو یا امی سے جتنی پاکٹ

منی ملتی اسے پوری ایمانداری سے کھا اُڑا دیتی۔
"کیا قیمت ہے تمہاری؟" اس کا لہجہ آپوں آپ تیکھا ہو گیا۔
"ایک ملاقات کا۔ ایک لاکھ روپیہ" وہ آرام سے بولا جیسے ایک روپیہ کہہ رہا ہو۔ مہر ماہ کا خون کھولا۔
"اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم روپے لے کر فرار نہیں ہو جاؤ گے؟"
"اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد کون بھاگتا ہے بھلا" وہ ہنسا۔
"دیکھو میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ مجھے گھر والوں کو بتانا پڑے گا۔" مہر ماہ اصل بات پر آئی۔
"نہیں" وہ تیزی سے بولا۔ "صرف تم ملو گی اس سے۔ یہ بات یاد رکھنا۔ ورنہ ساری زندگی ڈھونڈتی رہو اسے"
"تم کون ہو؟" مہر ماہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"اور تمہارے کہنے پر نمیر آفندی کیوں مجھ سے ملاقات پر راضی ہو گا؟"
"آم کھاؤ بی بی۔ پیڑ گننے کا کام مت کرو" وہ معنی خیز انداز میں بولا تو مہر ماہ نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ "اب یہ بتاؤ منظور ہے تو میں جگہ بتاتا ہوں کہ کب اور کہاں پیسہ پہنچانا ہے" وہ کہہ رہا تھا۔ مہر ماہ کو لگا کہ آج اگر نمیر آفندی ہاتھ سے نکلا تو دوبارہ کبھی نہیں ملے گا۔ لاکھ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ یہ اس نے نہیں سوچا۔ فی الفور بولی۔
"ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ کہاں ملے گا وہ مجھے؟"

☆☆☆

"ملاحہ۔۔۔ تمہارے پاس کل ملا کر کتنی جمع پونجی ہو گی ابھی؟" مہر ماہ نے ملاحہ کو کال کی تھی۔ ابھی منہ ہاتھ دھو کر واش روم سے نکلی تو ناشتے کے لیے جانے کے بجائے اس نے موبائل اٹھا کر ملاحہ کو کال ملائی۔
"نئے پرانے کوئی پندرہ سوٹ ہوں گے اور ساتھ جیولری۔ جوتوں کے کل ملا کر آٹھ جوڑے ہیں" وہ حیران سی ہو کر سوچ کر بولی۔ تو مہر ماہ نے تحمل سے کہا۔ "بے وقوف! پیسوں کی بات کر رہی ہوں میں"
"او۔۔۔ اچھا۔ وہ تو کافی ہوں گے۔ آٹھ دس ہزار ہیں میرے پاس۔ آپی تمہیں چاہئیں کیا؟" وہ خجل ہوئی پھر خلوص سے پوچھا تو مہرو کا دل بجھ گیا۔ ایسے بھلا ایک لاکھ کیسے جمع ہونے تھے۔
"مجھے تو کچھ زیادہ ہی چاہئیں" وہ بڑبڑائی۔ مگر ملاحہ نے سن لیا۔
"کیا بات ہے آپی! کچھ خریدنا ہے تو ابو سے کہوں یا امی سے؟ کتنے پیسے چاہئیں؟"
"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔ امی یا ابو سے ذکر بھی مت کرنا۔" مہر ماہ نے سنجیدگی سے کہا۔ تو وہ تشویش زدہ لہجے میں بولی۔
"ٹھیک ہے آپی۔ ان سے ذکر نہیں کروں گی مگر پھر تم کیا کرو گی؟"
"دل تو کر رہا ہے ایک آدھ زیور ہی بیچ دوں۔ کر لوں گی مینج" مہر ماہ نے انداز میں لاپروائی کا عنصر شامل کرتے ہوئے کہا۔ تو ملاحہ کو اس کی ذہنی کیفیت پر شک ہونے لگا۔ جو شادی کے چند روز بعد ہی زیور بیچنے پر آ گئی تھی۔
"کوئی بڑا مسئلہ ہی لگ رہا ہے آپی" اس نے ٹھٹک کر کہا۔ تو وہ سنبھلی۔
"ارے۔۔۔" وہ زبردستی ہنسی۔ "بڑا مسئلہ کیا ہو گا۔ اپنی ذاتی ضروریات کے لیے پاکٹ منی چاہیے مجھے۔ میں موحد سے جیب خرچ نہیں لینا چاہتی۔ اور ظاہر ہے امی ابو تو مجھے اب دیس نکالا دے چکے۔ اس صورت میں ان سے کچھ لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" مہر ماہ نے بمشکل لہجے کو معتدل رکھا۔ ملاحہ کو یکایک یاد آیا۔ تو وہ بے اختیار بولی۔
"آپی۔۔۔ آغا جان نے تمہارا حق مہر بھی تو رکھوایا تھا تین لاکھ" مہر ماہ کو اس کی بات سن کر برا لگا۔ ناگواری سے بولی۔

"جس نکاح کی کوئی حقیقت ہی نہیں اس کا حق مہر کس کھاتے میں آتا ہے بھلا"۔
"اچھا سوری۔ ایسے ہی مجھے خیال آیا تھا۔ لیکن آپی تم موحد بھائی سے مدد تو لے سکتی ہو نا۔ ان کے پاس تو ماشاءاللہ خزانے کی کنجی ہے۔" وہ نادم سی ہوئی پھر ساتھ ہی ایک نئی راہ بھی سجھادی۔
"ہوں۔۔۔" مہرماہ نے گہری سانس بھری۔ "دیکھتی ہوں کیا کرنا ہے۔"

☆☆☆

وہ آج بہت خوش ہے۔ دودن پہلے موحد آفندی نے گویا اسے دھتکار کر اپنے آفس سے نکلوایا تھا۔ مگر آج وہ خود کو کامیاب تصور کر رہا تھا "اب تم نمیر آفندی کی اصل پاور دیکھو گے موحد آفندی" وہ موحد کے آفس میں آنے تک اس کا موبائل اٹھا کر نجانے کیا چیک کرتا رہا تھا۔ باہر آکر بڑبڑایا۔
"اتنی بڑی جائیداد پر اکیلے تو عیاشی نہیں کرنے دوں گا تمہیں"۔
اور آج دودن بعد اسے لگ رہا تھا کہ قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہونے والی تھی۔ موحد آفندی کے روپے کو وہ بہت اچھے جواب کے ساتھ اسے، واپس لوٹانا چاہتا تھا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتا وہ ایک بار بر شاپ میں چلا گیا۔ اچھے سے ہیئر کٹ اور تروتازہ شیو نے اس کی وجاہت بڑھادی تھی۔
"نمیر آفندی۔۔۔" شیشے میں دیکھ کر چہرے پر ہاتھ پھیرتا وہ مسکراتا ہوا سرگوشی میں بولا۔
"مہرماہ آفندی کا نمیر۔۔۔"

☆☆☆

ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے ساتھ ٹی وی لاؤنج سب کا مشترکہ تھا۔ ورنہ آفندی ہاؤس کی تعمیر اور کمروں کی تقسیم ایسی تھی کہ ثمرہ، سائرہ اور تائی جان کے پاس ایک ایک پورشن تھا۔ مگر وہیں بڑا سا ایک کچن مشترکہ ہی تھا۔ تو۔ مہرماہ لاکھ ماں سے ناراض سہی مگر کھانے کی میز پر تو لامحالہ ان سے سامنا ہونا ہی تھا۔ کاٹن کے ہلکی سی کڑھائی والے سوٹ میں ملبوس۔ کان، ہاتھ گلا بغیر کسی زیور کے ثمرہ ناشتے کے بعد اب اخبار کھنگال رہی تھیں۔ تائی جان کو آہستہ آواز میں سلام کر کے مہرماہ ناشتے کے لیے بیٹھ گئی۔ ملاحہ اس کے لیے ناشتا بنانے چلی گئی۔
"تم کیا خالی ہاتھ کان لے کر چلی آئی ہو۔ بندہ ذرا سا لپ اسٹک لگا کر بال وال ہی بنالیتا ہے۔ پتا بھی ہے سائرہ کتنا نوٹ کرتی ہے ان باتوں کو۔" تائی جان اسے ٹوکے بنا رہ نہیں پائیں۔ تو مہرماہ نے بس سلگتی نظروں سے ماں کو دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا اور کپ میں چائے نکالنے لگی۔ تائی جان نے ثمرہ کو دیکھا وہ اخبار میں مگن تھیں۔
"اب تم ہی سمجھانا اسے ثمرہ! میری بات تو اس کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔" انہوں نے اپنائیت دکھاتے ہوئے ثمرہ کو درمیان میں گھسیٹا۔ تو انہوں نے ایک نظر پہلے تائی جان کو دیکھا اور پھر اخبار لپیٹتے ہوئے رسان سے بولیں۔
"مہرو ماشاءاللہ سے خود بہت سمجھ دار ہے۔ اور آپا ویسے بھی آپ جانتی ہیں مجھے دھونس اور زور زبردستی بالکل بھی پسند نہیں۔ میری طرف سے تو یہ اپنی مرضی کی مالک ہے جو چاہے پہنے اوڑھے"۔
(ہونہہ۔۔۔ اچھا طریقہ ہے اپنے زیور کو تجوری میں بند رکھنے کا) تائی جان نے دل میں ہی دانت کچکچائے بیٹی کی بے وقوفی کا تو انہیں پتا ہی تھا۔ زیور اور کپڑے لتے کی اسے پرواہ ہی نہیں تھی۔ اور اگلے چند لمحوں کے بعد وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا۔ مہرو ناشتا کر رہی تھی جب سائرہ "آج کیا پکائیں" کا مشکل ترین سوال لے کر آگئیں۔ مگر مہرماہ کو دیکھ کر ٹوکے بنا نہ رہ سکیں۔
"تم کیا سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھی ہوئی ہو۔ کوئی آ ہی جاتا ہے گھر میں۔ کسی کو کیا پتا تمہارے دل کی حالت۔ اور ویسے بھی سہاگنوں کے ہاتھ کان خالی اچھے نہیں ہوتے۔ برا شگن ہوتا ہے "لو جی۔۔۔ انہوں

نے تو سارا فلسفۂ حیات ہی کھول کر رکھ دیا۔ مہرماہ کا دل چاہا چائے کا کپ زور سے پٹخ کر یہاں سے اٹھ ہی جائے۔ اوپر سے تائی جان کی "دیکھا میں نہ کہتی تھی" والی نظریں۔

"ابھی تو اٹھی ہوں ناشتے کے لیے چچی جان۔ اب کیا نو لکھا ہار پہن کر سیدھی ناشتے کی ٹیبل پر آجاتی۔" سادہ سے انداز میں کہا۔ پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد اضافہ کیا۔ "آنٹی نے بہت کچھ گفٹ کیا ہے مجھے۔ پہن کر دکھاؤں گی آپ کو۔"

"ہاں بھئی۔ ثمرہ کا تو اپنا ہی زیور کم نہیں تھا۔ ظاہر ہے اکلوتی بہو کو ہی چڑھائے گی نا۔ اور اب تو موحد نے بھی دیا ہوگا کچھ تحفہ" اب وہ بات کو گھما کر اندر سے کیا نکالنا چاہ رہی تھیں۔ یہ مہرماہ کی سمجھ میں اچھی طرح آرہا تھا۔ مگر وہ لب بھینچ گئی۔ دنیا تو یہی جانتی تھی کہ وہ موحد کے نکاح میں ہے۔ اب کسی کو کیا پتا اس نکاح کا تو کوئی وجود ہی نہیں جو موحد آفندی سے ہوا ہے۔ اصل حقیقت جس نکاح کی تھی وہ تو دنیا نے ہوتے ہوئے دیکھا ہی نہیں تھا۔

مگر کبھی کبھار سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کچھ "اپنے" سنگ دلی میں پرایوں سے بڑھ جایا کرتے ہیں۔ ثمرہ نے مہرماہ کی دلی کیفیت کو خود پر گویا وارد ہوتے محسوس کیا تو وہ سائرہ کا دھیان بٹانے کو بولیں۔

"آپ یہ بتائیں آج پکا کیا رہی ہیں؟"

گفتگو کا موضوع بدل چکا تھا۔ ملاحہ بہن کے سپاٹ چہرے کو تفکر سے دیکھ رہی تھی۔ جو چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی نجانے کس سوچ میں گم تھی۔

☆☆☆

تزئین کو گھر میں پا کر طلال کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ آگئی۔ ادھر وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ لیکن یوں ایک دم سے الٹ پڑنا بھی صحیح نہیں تھا۔ وہ جا کر پہلی فرصت میں اپنے پی اے کو فارغ کرتا تو آئندہ کے لیے طلال کے بارے میں۔ رپورٹ ملنا بند ہو جاتی۔

مگر اگلے روز آفس جانے سے پہلے وہ عقل کا اندھا خود ہی تزئین سے الجھنے کا سامان کر بیٹھا۔

"اب آگئی ہو تو گھر سنبھالنا شروع کر واپنا۔ کچن کی ذمہ داری لو۔ میرا اپنا ناشتا تو کم از کم خود بنا لیا کرو"

"ہو تو رہا ہے سب کچھ۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے چیزوں میں گھس کر زبردستی اپنی جگہ بنانے اور ذمہ داریاں لینے کی" وہ صفاچٹ بولی۔

طلال کے لیے تو اس پل دل و دماغ میں محض غصہ بھرا ہوا تھا۔ ورنہ شاید ٹھنڈے دل سے اس کی بات پر غور کر ہی لیتی۔

"کسی کے دل میں جگہ بنانی ہو تو پہلے گھر اور گھر کے کاموں میں اپنی جگہ بنانی پڑتی ہے۔ ہر بار میکے جا کر واپسی کا دروازہ کھلا ملے گا، یہ بھول ہے تمہاری"۔ وہ تند لہجے میں بولا تو تزئین نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"اور اب یہ بار بار وہاں جا کر تماشا کرنا چھوڑ دو۔ ان کو سکھ کا سانس لینے دو۔ ان کا مستقل سر درد میں جو اپنے سر لے چکا ہوں" وہ اسی جلے کٹے انداز میں کہہ رہا تھا۔ تزئین کے تو گویا زخموں پر کسی نے نمک کا ڈبہ انڈیل دیا۔ وہ تو کل سے یوں بھی بھری بیٹھی تھی۔ پھٹ پڑی۔

"میں جانتی ہوں کن ذرائع سے تمہیں یہ خبریں ملتی ہیں اور کون ہے جو تم سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے ہے۔ وہاں کی رپورٹ دینے کے لیے۔ مگر کبھی اپنی محبوبہ کو یہ بھی شرم دلاؤ کہ تمہارے ساتھ تو بے وفائی کی ہی تھی۔ اب کم از کم اپنے شوہر کی تو وفادار رہے۔"

اب طلال اسے ساری عمر بتا نہیں سکتا تھا کہ مہرماہ نے "اللہ کا واسطہ ہے، میرا پیچھا چھوڑ دو۔" کہنے کے

لیے کال کی تھی۔
"تم اپنا سوچو۔کیسے مر رہی تھیں مجھ سے شادی کرنے کے لیے۔خود کو میرے سامنے پیش کر دیا تم نے حالانکہ تب میری اور مہرو کی شادی طے تھی۔ ہو نہ سکی، وہ ایک الگ بات ہے۔ مگر تم۔ نے بھی شب خون مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور اب دیکھو۔! ایسے بی ہیو کرتی ہو جیسے احسان عظیم کیا ہو مجھ سے شادی کر کے۔" وہ حقارت سے کہہ رہا تھا۔
تزئین کا خون کھول اٹھا۔مگر وہ خون کے گھونٹ پینے پر مجبور تھی کیونکہ طلال کا کہا ایک بھی لفظ غلط نہیں تھا۔
"میں بھی اپنا گھر بنانا اور سنوارنا چاہتی ہوں۔تمہارے دل و دماغ پر اپنا خیال نقش کرنا چاہتی ہوں۔مگر تم میرا ساتھ دو تب نا۔"
"اپنے انداز پر خود ہی غور کر لو۔میں کہوں گا تو شکایت ہو گی۔" وہ کاٹ دار انداز میں کہتا بریف کیس کھول کر چیک کرنے لگا۔
"تم اپنی زندگی میں کھلنے والا مہرو نام کا دروازہ ہمیشہ کے لیئے بند کر دو تو ہمارا گھر بھی جنت بن جائے۔" تزئین نے طنز کیا۔
"اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو تم دیکھ لیتیں کہ مہر ماہ نام کے دروازے کو مجھ پر اللہ نے بند کیا ہے۔اور وہاں سے بند ہونے والے دروازے ہماری چاہت کی چابی سے نہیں کھلا کرتے بیوقوف عورت۔" وہ سلگ کر کہتے ہوئے آفس کے لیے نکل گیا۔مگر تزئین کے دل میں جو آگ لگی تھی وہ بجھی نہیں بلکہ مزید بھڑک اٹھی۔اس نے سوچ لیا تھا کہ اس آگ کو اس کے صحیح مقام پر لگا کر ہی دم لے گی

☆☆☆

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پر وہ چونکا۔پرفیوم رکھ کر پلٹا۔"یس۔۔"
مہر ماہ کو اندر آتے دیکھ کر وہ ذرا حیران بھی ہوا۔ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ آفس سے آیا تھا اور اب اسے کسی دوست کی طرف جانا تھا۔لیکن مہر ماہ کا اس کے کمرے میں آنا کوئی عام بات نہ تھی۔
"مجھے ایک کام تھا تم سے۔۔۔ اگر تم کر سکتے ہو تو۔" وہ بنا کسی تمہید کے بولی تو وہ حیرت کو اندر دباتے ہوئے شانے اچکا کر بولا۔
"یہ تو کام کی نوعیت پر ڈیپینڈ کرتا ہے۔میں اندھے وعدوں کا قائل نہیں۔"
مہر ماہ نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے جیسے ہمت مجتمع کی۔اور پھر مدھم لہجے میں بولی۔" مجھے کچھ پیسے چاہئیں"
"ہوں۔۔۔کتنے پیسے؟" وہ عام سے انداز میں بولا۔
"تم پوچھو گے نہیں کہ میں امی یا ابو کے بجائے تم سے کیوں مانگ رہی ہوں؟" مہر ماہ نے جواباً سوال کیا۔
"اٹس ویری سمپل۔ظاہر ہے تم ان سے نہیں لینا چاہتیں تب ہی مجھ سے کہہ رہی ہو۔" وہ آرام سے بولا۔
مہر ماہ نے ایک نظر اس پر ڈالی۔وہ نک سک سے کہیں جانے کو تیار مگر اس لمحے پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔
"لیکن تم اس کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتاؤ گے۔" مہر ماہ اسے پکا کرنا چاہتی تھی۔اگر بات کھل جاتی تو بات بننے سے پہلے بات کے بگڑنے کا اندیشہ تھا۔اب کی بار موحد کی پیشانی پر بل پڑے۔
"دیکھو۔۔ یہ لڑکیوں والی قسمیں اور قرآن میں نہیں اٹھا سکتا۔اور نہ ہی اتنے تھوڑے دل کا مالک ہوں کہ

ایسی فضول باتیں سب کو بتاتا پھروں۔تم بولو کتنے پیسے چاہئیں۔؟" اس نے گھڑی پر اچٹتی نگاہ ڈال کر گویا اسے وقت کی تنگی کا احساس دلایا۔

" آہم۔۔" وہ کھنکھاری۔عزت نفس گوارہ تو نہیں کر رہی تھی کہ وہ موحد سے پیسوں کی درخواست کرتی مگر مصیبت ہی کچھ ایسی آن پڑی تھی کہ کمبخت انا کے سر پر پیر رکھنا پڑ گیا تھا۔

"تم یہ بھی مت سمجھنا کہ شاید میں اس کاغذی نکاح کا ایڈوانٹیج (فائدہ) لے رہی ہوں"۔

"الحمدللہ۔۔۔میں اتنا ذہین نہیں ہوں۔تم اماؤنٹ بتاؤ"۔وہ تپ کر بولا۔

تب وہ ایک دم سے بولی۔

"بس ایک لاکھ روپیہ چاہیے مجھے"۔

وہ جو بیس یا تیس ہزار کا سوچ رہا تھا۔حیران ہوا۔"اتنے پیسوں کا کیا کرو گی؟"

"ضرورت ہے مجھے موحد۔بس اور کچھ مت پوچھنا۔اینڈ ڈونٹ وری۔میں یہ قرض کے طور پر لے رہی ہوں۔لوٹا دوں گی تمہیں آہستہ آہستہ "اسے تسلی دی۔

اس نے تیکھی نظروں سے دیکھا۔"بالکل لوٹا دینا۔ورنہ تو میں فٹ پاتھ پر آجاؤں گا"

"جس کے پاس ہوا سے تو لاکھ بھی سو روپے ہی لگتے ہیں۔مجھ سے پوچھو جسے مانگنا پڑ رہا ہے" وہ اندر سے سخت آزردہ تھی۔

موحد سے تو وہ ہمیشہ برابری کی سطح پر مقابلہ کرتی آئی تھی۔یوں اس سے ایک سیڑھی نیچے کھڑے ہو کر بات کرنا اسے اپنی نظروں میں گرا رہا تھا۔مگر کیا کرتی۔؟موحد کے علاوہ جس سے بھی اتنی رقم مانگتی وہ بال کی کھال اتارتا۔

"اگر تم شاپنگ کرنا چاہتی ہو تو ماما سے کہہ دیتا ہوں میں"۔موحد نے کھوجتی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔میں نے کہا ہے نا کہ۔تم کسی سے بھی اس بارے کوئی بات نہیں کرو گے۔مجھے شاپنگ نہیں کرنی موحد۔مجھے یہ روپے چاہئیں بس۔اگر تم بنا وجہ پوچھے دے سکتے ہو تو بتاؤ"۔وہ فی الفور بولی۔تو موحد نے لحہ بھر اسے دیکھ کر گہری سانس بھری۔

"اب اگر تم اس دعوے اور یقین کے ساتھ آئی ہو تو۔۔۔" وہ کہنے لگا تھا کہ اس کا مطلب سمجھ کر اس نے بیچ ہی میں اس کی بات کاٹ دی۔

"جی نہیں۔مجھے ایسا کوئی دعوا نہیں تم پر۔۔۔تم مجھ سے زیادہ امیر ہو بس اس لیے سوچا تم سے ہی مانگ لوں"۔

موحد نے اسے ہلکا سا گھور کر دیکھا۔"ویسے تو میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں اتنے پیسوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔مگر اب جبکہ تم میرے پاس آئی ہو تو مجھے تمہاری یہ ریکویسٹ ماننا ہی پڑے گی۔شام تک کا ویٹ کر لو بس"۔

"بہت شکریہ۔"

موحد نے اس کا چہرہ کھلتا دیکھا۔تو وہ ٹھٹکا۔"سب کچھ ٹھیک تو ہے نا مہر۔۔؟

وہ گڑبڑائی۔"کک۔۔۔کیا مطلب؟ ہاں بالکل۔سب ٹھیک ہے"۔

"اگر کوئی پرابلم ہے تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہو تم" موحد نے بغور اسے دیکھا۔جب وہ آئی تھی تب اس کا چہرہ پژمردہ سا تھا۔مگر ایک لاکھ ملنے کا سن کر وہ کھل اٹھی تھی۔

"اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ڈونٹ وری۔"

"اور یہ یقین تمہیں کس نے دلایا ہے؟" موحد سنجیدہ تھا۔
"میرے دل نے۔" وہ بے اختیار بولی۔ پھر اسے دیکھا۔ "کیا شام تک یہ رقم مجھے مل جائے گی؟"
"ہوں۔۔۔مل جائے گی"
"تھینک یو سو مچ موحد!" وہ متشکر تھی۔ واپس پلٹی تو موحد کی آواز پر بے ساختہ ٹھٹک گئی۔ "یہ رقم خرچ کرنے کے بعد تو تم مجھے ضرور بتاؤ گی کہ یہ پیسہ کس مصرف کام میں آیا ہے"
"ضرور۔۔۔پھر تو خود ہی سب کو پتا چل جائے گا" وہ اطمینان سے کہہ کر اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔
موحد پرسوچ انداز میں وہیں کھڑا اس ایک لاکھ کے مصرف کے بارے میں اندازے لگا تا رہ گیا۔ اس کی پیشانی پر شکن تھی۔ وہ کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی اسی خیال میں تھی کہ آگے کیا ہوگا۔ اب موحد پر اتنا بھی مان نہیں تھا کہ اس کی بات پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیتی کہ وہ ان ایک لاکھ کی بابت کسی کو بتائے گا۔ ماضی میں اس کے ساتھ مہرماہ کے تعلقات بہر حال اتنے خوش گوار کبھی بھی نہیں رہے تھے۔
وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ثمرہ اندر ہی موجود تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔ مگر وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ بلکہ دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گئی۔ (بھلا یہاں کون سے زندگی میں دھنک کے رنگ بکھر گئے تھے کہ وہ مسکرا مسکرا کر ہر لمحے دنیا کو اپنا خوش ہونا باور کراتی رہتی) ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں ان کے پاس بستر کے کنارے ٹک گئی۔ انہوں نے مہرماہ کے آزردہ سے انداز کو اچھی طرح محسوس کیا۔
"سائرہ کی بات پر افسردہ ہو؟" انہوں نے اس کی اداسی کم کرنے کی خاطر پوچھا۔
"ان کی باتوں پر اداس ہونا شروع کر دوں تو زندگی میں شاید کبھی خوش ہو ہی نہ سکوں۔" وہ خفگی سے بولی۔
"تو پھر کیا پریشانی ہے؟" انہوں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ایک ثانیے کو کچھ سوچنے کے بعد مہرماہ نے پوچھا۔ "آپ نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ میں نمیر کے متعلق غیر جانبداری سے سوچوں۔۔۔میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کو نمیر سے اتنی ہمدردی کیوں ہے"۔
انہوں نے چونک کر مہرماہ کو دیکھا۔ "کیا مطلب تمہاری کوئی بات ہوئی ہے نمیر سے"۔
"اس شخص نے میری زندگی عذاب کر دی ہے آنٹی! اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ کیا یوں ہی ساری عمر موحد اور نمیر کے درمیان کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی رہوں؟"
"بس اتنا کرو گی کہ اس کے خلاف آفندی ہاؤس والوں کے دماغ سے مت سوچو"
"وہ میرے ساتھ کون سی نیکیاں کر رہا ہے جو میں اس کے متعلق اچھا اچھا سوچتی رہوں"۔
"وہ اتنا برا نہیں ہے مہرماہ جتنا کہ یہ لوگ اسے بنا رہے ہیں"۔
"وہ اتنا اچھا بھی نہیں جتنا کہ آپ سوچ رہی ہیں۔ 14 سال پہلے کے بچے اور آج کے نمیر آفندی میں بہت فرق ہے آنٹی!" وہ بے دلی سے بولی۔ اب ان کو کیا بتاتی کہ کیسے وہ اسے بلیک میل کر کے پیسہ بنانے والا ہے۔
اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس مشکل وقت میں موحد اس کا صحیح معنوں میں مددگار ثابت ہوا تھا۔
"بہر حال تم اپنا حلیہ ــــ ذرا درست رکھو۔ تاکہ نہ تزئین کو طعنے دینے کا موقع ملے اور نہ ہی سائرہ کو تمہاری بے رونقی کھٹکے۔" انہوں نے ناصحانہ انداز میں کہا تو مہرماہ نے شاکی نظروں سے ان کو دیکھا۔
"موحد سے نکاح ہوا نہیں اور نمیر نے جو کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اب آپ بتائیں، ان میں سے کس کے لیے چوڑیاں کنگن پہن کر بیٹھ جاؤں؟"
"جن پر کڑی آزمائشیں آتی ہیں انہیں انعام بھی بہت خوب صورت ملا کرتا ہے مہر!"

اپنی ہی سوچوں میں گم مہرماہ نے غائب دماغی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
وہ گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ اسی وقت اس کا موبائل مسلسل بجنے لگا۔
"تزئین کالنگ"
"اف۔۔۔ایک یہ مس پرابلم۔" موحد نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے ہی کال اٹینڈ کر لینا مناسب سمجھا۔ دوسری طرف تزئین گویا بارود سے بھری بندوق بنی ہوئی تھی۔
"کہاں ہو تم اس وقت؟" چھوٹتے ہی تیکھے لہجے میں پوچھا تو اس کے لب و لہجے کی تندی پر غور کیے بنا وہ نیم مزاحیہ انداز میں بولا۔
"یہ طلال نوید کا نمبر نہیں ہے محترمہ۔ شاید آپ غلط نمبر ملا بیٹھی ہیں۔"
"یہ بد عادت تمہاری بیوی میں پائی جاتی ہے مسٹر۔ اسے ہی عادت ہے اپنے شوہر کے علاوہ ہر کسی کے شوہر کا نمبر ملانے کی۔"
موحد کا دماغ گھوم سا گیا۔ "واٹ ڈاہیل آر یو ٹاکنگ اباؤٹ؟ (تم کس کے متعلق بکواس کر رہی ہو)"
"تمہاری بیوی۔۔۔ مہرماہ موحد آفندی ہی بنی ہے نا نکاح کے بعد وہ؟ یا ابھی بھی نمیر آفندی کے حوالے سے جانی جاتی ہے۔" وہ اس کے بھڑکنے کی پرواہ کیے بنا کاٹ دار لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
"شٹ اپ تزئین۔ صاف اور سیدھی بات بتاؤ ورنہ میں فون بند کر رہا ہوں۔"
"مہرماہ سے کہو۔۔۔ اللہ کا واسطہ ہے زندگی سے تو طلال کو نکال دیا ہے، اب دل اور خواہش سے بھی نکال دے۔ اس کا کیا حق بنتا ہے کہ وہ میرے شوہر کو آفس میں فون کرے۔ یہ کون سی محبت ہے جو نفرت بھگتانے کے بعد بھی نبھائی جا رہی ہے۔" وہ پھٹ پڑی۔ موحد کی کنپٹیاں سلگیں۔
"اور یہ کہانی تمہیں یقیناً تمہارے عزت مآب شوہر نے سنائی ہوگی کہ مہرماہ ابھی بھی اسے فون کر کے "چھیڑتی" ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔ "حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مہرماہ جس مصیبت کا شکار ہے وہاں اسے طلال سے الگ ہونے کا دکھ بھی بھول چکا ہے۔"
"یہ بات مجھے اس کے آفس بوائے سے پتا چلی ہے موحد۔ طلال موبائل کال کا رسپانس نہیں دے رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس وقت مہرماہ سے لینڈ لائن پر بات چیت میں بزی تھا۔"
"فضول باتیں مت کرو تزئین۔"
"کاغذوں میں ہی سہی مگر وہ تمہاری بیوی ہے موحد۔ تم اس سے پوچھنے اور اسے ٹوکنے کا حق رکھتے ہو۔ کم از کم میرا گھر تو برباد نہ کرے" وہ چلا رہی تھی۔
موحد نے کال کاٹ دی۔ اس کی رگوں میں دوڑتا خون تپ اٹھا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں تزئین کی باتیں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆

شام کی چائے بناتے ہوئے وہ یوں ہی اپنی زندگی کی بھول بھلیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جب ملاحہ نے آ کر اطلاع دی۔
"آپی۔۔۔ آغا جان بلا رہے ہیں تمہیں۔"
وہ چونکی۔ "کیوں۔۔۔؟"
"وہ کون سا کسی کو کچھ بتاتے ہیں آپی۔"

ملاحہ نے گہری سانس بھری۔ پھر مسکرا کر اضافہ کیا۔ "ہاں اور موحد بھائی بھی وہیں بیٹھے ہیں
" لو جی۔۔۔ گئی بھینس پانی میں۔"
مہر ماہ کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔ اگر موحد نے ایک لاکھ والی بات آغا جان کو بتا دی تھی تو پھر اسے آغا جان کے پاس جانے سے پہلے کوئی کہانی سوچ لینی چاہیے۔
آہستہ قدموں سے اسٹڈی کی طرف بڑھتے ہوئے وہ تمام ممکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔ جن کا بہانہ بنا کر وہ اپنی جان بچا سکتی تھی۔ اس نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔ موحد سامنے ہی آغا جان کے ساتھ والی کرسی پر براجمان تھا۔ نیوی بلیو ٹی شرٹ اور وائٹ ٹراؤزر میں ملبوس وہ بڑا ہینڈسم لگ رہا تھا۔ مگر مہر ماہ نے سوچا بھاڑ میں جائے ایسی وجاہت جو کسی کی جان نہ بچا سکے۔
" بیٹھو۔۔۔ " آغا جان نے اسے اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے وہاں بیٹھ گئی۔
اس کے اور آغا جان کے درمیان کشن سے سجی ایک تپائی رکھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار آغا جان تھک کر اس تپائی پر ٹانگیں لمبی کر کے سستا لیتے تھے۔ انہوں نے اسی تپائی پر پانچ پانچ ہزار والے بیس کڑکڑاتے نوٹ رکھے اور منتظر نظروں سے مہر ماہ کو دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔
اس نے بے حد شکایتی نگاہ موحد پر ڈالی مگر وہ سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا رہا۔
کمینہ۔۔۔ فوراً شکایت لگا دی۔ جیسے میں اس کی پوری جائیداد پر قبضہ کرنے والی ہوں۔ ذرا جو ندامت ہو چہرے پر۔ وہ اندر ہی اندر کلسی۔
" یہ پورا ایک لاکھ روپیہ ہے۔ اب بتاؤ کس لیئے چاہیے تمہیں؟" آغا جان کی نظروں میں محسوس کن سختی تھی۔ مہر ماہ کو اپنی سانس تنگ ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر ذرا توقف سے آغا جان کو دیکھا تو چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت آمیز خفگی تھی۔
" آغا جان۔ آپ نے خود اپنی مرضی سے مجھے اس آدمی کے نکاح میں دیا ہے۔ اب کیا ہر بار جیب خرچ مانگنے پر یہ آپ سے شکایت کرنے آیا کرے گا۔" آخر میں منہ بھی بسور لیا۔
" اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔۔" موحد نے بے اختیار سیدھا ہوتے ہوئے اس ڈرامہ کو دیکھا۔ جو صبح اسے باور کروا رہی تھی کہ وہ اس نکاح کا ایڈوانٹیج لینے کی کوشش نہیں کر رہی۔ آف وائٹ اور ریڈ کلر کے کپڑوں میں ملبوس تمتمایا چہرہ اور معصوم سا سوال۔ اب کی بار آغا جان نے پلٹ کر موحد پر ایک سنجیدہ سی نگاہ ڈالی۔ وہ ذرا سا گڑبڑایا۔
" آغا جان۔۔۔ ایک لاکھ روپیہ پاکٹ منی نہیں ہوا کرتی۔ " گویا انہیں یاد دلایا۔
" حق مہر تو ہوا کرتا ہے نا جو تم نے ابھی تک ادا ہی نہیں کیا مجھے۔" وہ اس قدر آرام سے بولی کہ آغا جان سے بات کرتا موحد بے اختیار اسے پلٹ کر بے یقینی سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔
" سوری آغا جان۔ مجھے افسوس ہے۔ میں بھی شاید اس حق مہر پر میرا حق ہے جو آپ نے لکھوایا تھا میرے لیے" وہ کامیاب اداکارہ تھی۔ افسردہ لہجے میں بات ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جیسے جانے کی اجازت چاہ رہی ہو۔
" یہ۔۔۔ " آغا جان نے درمیان میں رکھی رقم کی طرف اشارہ کیا۔ " لے جاؤ مہرو۔ یہ تمہارے ہی ہیں۔" وہ مسکرائی تک نہیں بس سنجیدگی سے نوٹ یوں اٹھائے جیسے دل پر پتھر رکھ کر ان کی بات مان رہی ہو۔
موحد اس کی ہوشیاری پر اش اش کر اٹھا۔ وہ چلی گئی تھی۔ آغا جان نے استفہامیہ نظروں سے موحد کو دیکھا تو

اندر ہی اندر جھنجلاتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایسے انداز میں بات ختم کر کے گئی تھی کہ وہ مزید کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ شا نے اچکا دیے۔

"دھیان رکھا کرو ذرا۔ وہ بہت مشکل سے نئی زندگی کی طرف لوٹی ہے۔ اس طرح ذرا ذرا سی بات پر گرفت کرو گے تو رشتہ خراب ہوگا۔" آغا جان نے سمجھایا تو اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔

وہ سر ہلاتا باہر نکلا تو رخ سیدھا ثمرہ کے کمرے کی طرف تھا۔ (اس کی تو ایسی کی تیسی) وہ تو بلی کو تھیلے سے باہر نکلنا چاہ رہا تھا ادھر وہ اسی کو چونا لگا گئی تھی۔ دھاڑ سے دروازہ کھولا۔ تو سامنے اپنے سیٹ کیے بیڈ پر اطمینان سی ٹانگیں لمبی کیے بیٹھی مہر ماہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"ایٹی کیٹس۔۔۔ مینرز وغیرہ۔۔۔ کبھی یہ الفاظ تمہاری نظروں سے گزرے تو ہوں گے" بڑے تحمل سے طنز کیا۔ تو وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"تم نے آغا جان کے سامنے جھوٹ کیوں بولا؟"

"میں نے ایک بار بھی تم سے پوچھا ہے کہ تم نے یہ معاملہ آغا جان کو کیوں بتایا؟" مہر ماہ نے الٹا پوچھا۔

"اب تم مجھ سے حق مہر لو گی۔۔۔ پوچھ سکتا ہوں کس حق سے؟" وہ چبا چبا کر شرمندہ کرنے والے انداز میں بولا۔ مگر وہ قطعاً شرمندہ ہونے کے موڈ میں نہیں تھی۔

مہر ماہ نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ "مانگا تو ادھار ہی تھا۔ مگر تمہاری وعدہ خلافی کے جواب میں یہ بہانہ بنانا پڑا۔ اور شکر ہے بہت اچھی طرح چل بھی گیا۔" موحد پسلیوں پر ہاتھ جمائے چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر جو سوال پوچھا اس نے گویا مہر ماہ کے سر پر چھت الٹا دی۔

"تم نے طلال کو کال کی تھی؟"

"تمہیں کس نے بتایا؟" وہ بے اختیار سیدھی ہوئی۔ تو موحد کی آنکھوں میں تاسف اتر آیا۔ اس نے تو یوں
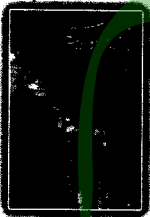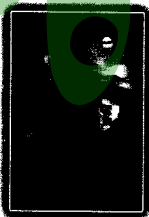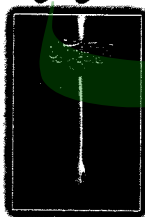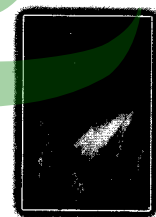
ہی پوچھا تھا۔مگر مہرماہ کا سوال اس کے سوال کا جواب بن گیا تھا۔
مہرماہ نے خفیف سا ہو کر اسے دیکھا۔پھر ڈھٹائی سے بولی۔"تم مجھ سے اس طرح کے سوال جواب کا حق نہیں رکھتے۔"
"چہ خوب۔"وہ تلخی سے بولا۔"یعنی تم اس کاغذی نکاح نامے کا سہارا لے کر مجھ سے حق مہر وصول کر سکتی ہو اور میں اسی کاغذی رشتے کے بل پر تم سے ایک سوال تک پوچھنے کا اختیار نہیں رکھتا۔"بہت کڑا طنز تھا۔مہرو بلبلا اٹھی۔
"لعنت بھیجتی ہوں میں اس فیک نکاح نامے پر۔اگر تم آغا جان کے سامنے بھانڈا نہ پھوڑتے تو مجھے یہ مکروہ کام نہ کرنا پڑتا۔"
"تم کسی مصیبت میں پھنسیں تو مجھے مت بلانا۔سمجھیں"سنجیدگی سے کہہ کر وہ باہر کی طرف بڑھا۔دروازہ کھولا تو مہرماہ نے آواز دے لی۔
"موحد۔"اس کا ہاتھ ناب پر تھم سا گیا۔"پہلے تو ادھار کی مد میں یہ رقم لے رہی تھی مگر اب چونکہ حق مہر والی ہے تو واپسی کا سوچنا بھی مت۔"اس کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ لب بھینچے، دروازہ کھول کر دھاڑ سے مارتا ہوا چلا گیا۔
مہرماہ نے گہری سانس بھری۔اس کی پیشانی پر شکن تھی۔موحد کے اس قدم نے نہ چاہتے ہوئے بھی مہرماہ کو وہ حق استعمال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔جس پر اس کا اصولاً اور شرعاً کوئی حق نہیں تھا۔(لیکن تم یہی سزا ڈیزرو کرتے ہو موحد) وہ ذہن کو کل کے دن کی طرف فوکس کرنے لگی۔جب اس کی ملاقات نمیر آفندی سے طے ہوئی تھی۔اور اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی نہ کوئی تدبیر کر ہی لے گی۔

☆☆☆

کبیر مؤدبانہ اس کے سامنے موجود تھا۔
"تم سے ایک کام ہے کبیر۔۔۔لیکن راز داری شرط ہے۔"موحد نے کہا تو کبیر نے احتراماً سر کو ہلکی سی جنبش دی۔موحد نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔
"آج سے تم مہرماہ بی بی پر نظر رکھو گے۔اسے کہیں ڈراپ بھی کیا تو واپس لوٹنے کے بجائے تم اس کے آس پاس رہو گے۔نظر رکھو گے تاکہ کوئی اسے نقصان نہ پہنچائے۔"
"بالکل ٹھیک۔میں سمجھ گیا سر۔"
"اور تمہاری سب سے بڑی کامیابی ہوگی مہرماہ کی نظروں میں نہ آنا۔"
"رائٹ سر۔"
"سر۔۔۔؟"موحد نے بھنویں اچکائیں۔"چھوٹے ہو مجھ سے شاید۔۔۔موحد بھائی کہہ سکتے ہو۔"یہ کسی امیر کی غریب پر مہربانی تھی۔کبیر مسکرا دیا۔"عادت نہیں ہے موحد صاحب۔"
"ہو جائے گی۔۔۔"وہ مسکرا دیا۔"اینی ویز۔اپنی ڈیوٹی کو اچھی طرح سمجھ لو۔کامیاب ہوئے تو تمہاری مرضی کا انعام ملے گا۔"وہ معنی خیزی سے مسکرایا تو کبیر بے ساختہ اسے دیکھنے لگا۔موحد نے اثبات میں سر ہلایا۔تو وہ مطمئن ہو کر اعتماد سے بولا۔
"آپ فکر مت کریں۔میں جان لڑا دوں گا اپنی۔شاید اسی طرح پچھلی کوتاہی کا داغ دھل سکے۔"
"اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی کبیر۔قسمت اپنی کھینچی ہوئی لکیروں پر چلتی ہے نا کہ ہماری سوچ کی سیدھ پر۔"موحد نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔کبیر کے جانے کے بعد موحد نے

ذہن میں ملاحہ کی بتائی گئی باتوں کو دہراتے ہوئے اندازہ لگانا چاہا کہ آخر اتنی ایمرجنسی میں اسے ایک لاکھ روپوں کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ ویسے تو وہ ادھار کی مد میں یوں ہی اسے رقم دینے والا تھا۔ یہ ملاحہ ہی تھی جس کی باتوں سے اسے لگا کہ اندرون خانہ معاملہ کچھ اور ہی تھا۔

★ ★ ★

اگلے دن مہر ماہ نے وقت پر ناشتا کیا۔ اور سب کے ساتھ بڑی معتدل مزاج کے ساتھ رہی۔

"آنٹی! مجھے اپنی ایک دوست کی طرف جانا ہے ذرا اسے شاپنگ کرنی ہے۔" اس نے گھڑی کی طرف چور نظروں سے دیکھتے ہوئے ثمرہ سے اجازت طلب کی۔ تو وہ مسکرا دیں۔ انہیں خوشی ہوئی کہ وہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔

"موحد سے کہوں وہ آکر تمہیں ڈراپ کردے گا" انہوں نے کہا تو وہ جلدی سے بولی۔

"نہیں نہیں آنٹی! میں کبیر خان ہی سے کام چلا لوں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ کبیر کو واپسی کا ٹائم بتا دینا پھر۔"

"جی ٹھیک ہے" وہ مؤدبانہ بولی۔ تو ان کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ کاش۔۔۔ وہ واقعی اسے اپنی بہو بنا سکتیں۔

اس نے اچھا سا لباس پہنا مگر چہرہ شفاف ہی رکھا۔ روپے پرس میں ڈالے اور پرس کو شولڈر بیگ میں ڈال لیا۔ دل تو چاہا آغا جان کا ریوالور بھی چرا کر بیگ میں رکھ لے اور آج نمیر آفندی کا قصہ ہی تمام کر ڈالے۔ مگر۔۔۔ ہنہ۔ وہ گہری سانس لے کر دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے لگی۔

کبیر خان کے ساتھ وہ فون پر نمیر کے بتائے پتے پر پہنچی۔ یہ شاپنگ مال تھا۔

"تم جاؤ کبیر! واپسی پر میں تمہیں کال کر دوں گی۔" مہر ماہ نے کبیر کو فارغ کیا۔ تو وہ متامل ہوا۔

"آپ کی دوست کو آلینے دیں بی بی! پھر میں جاتا ہوں۔"

"وہ اندر ہی ہے شاپنگ مال میں کبیر۔ مجھے شاپ کا نام پتا ہے۔ تم اطمینان سے جاؤ۔" اندر مچی کھدبد پر بمشکل قابو پاتے ہوئے مہر ماہ نے اسے ٹہلایا۔

"میں آج بالکل فارغ ہوں مہر بی بی! آپ آرام سے شاپنگ کر کے آؤ۔ میں گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔" کبیر نے جتنی بھی شرافت سے کہا ہو مہر ماہ کھٹک گئی۔

دانت پیس کر پوچھا۔ "اور یہ کس کا آرڈر ہے؟"

"یہ مت پوچھیں بی بی! ملازم تو ملازم ہوتا ہے۔" وہ خفیف سا ہو گیا۔ ایک تو آفندی ہاؤس کی بیبیاں "لائق" بہت تھیں۔

مہر ماہ نے نتھنے پھلائے۔ "میرا کیا ہے۔ خود جب چار پانچ گھنٹے سڑنا پڑے گا گاڑی میں تب پتا چلے گا۔ خود تو تمہارا صاحب اے سی والے آفس میں اطمینان سے بیٹھا ہوا ہوگا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر کی طرف بڑھی۔

کبیر مطمئن سا ہو کر گاڑی میں آبیٹھا اور موحد کو موبائل کال پر رپورٹ دی۔

"بہت اچھے۔۔۔" وہ ذرا ریلیکس ہوا۔ تو وہ واقعی شاپنگ کے لیے گئی تھی۔

"مگر تم باہر ہی رکنا۔ بی بی کو لے کر واپس آنا۔"

"جی سر۔۔۔" کبیر نے لائن ڈراپ کرتے ہوئے اے سی چلایا اور ریلیکس ہو کر سیٹ سے ٹیک لگالی۔

وہ شاپنگ مال میں موجود نمیر کے بتائے ہوئے چھوٹے سے ریسٹورنٹ کی ریزروڈ ٹیبل پر آبیٹھی۔ جس پر

این۔اے کا کارڈ رکھا ہوا تھا۔
"ہوں۔۔۔نمیر آفندی۔۔" مہر ماہ نے اس کارڈ کو نخوت سے دیکھتے ہوئے سیٹ سنبھالی۔وہ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ویٹر جوس کا گلاس اس کے سامنے رکھ گیا تھا۔ریسٹورنٹ میں اکا دکا ہی لوگ تھے۔ان کی ٹیبل قدرے ہٹ کر کونے میں تھی۔آدھے پونے گھنٹے کے بعد مہر ماہ کا ضبط جواب دینے لگا۔وہ مضطربانہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔اسی وقت اس کا موبائل بج اٹھا۔مہر ماہ نے موبائل اٹھایا۔نمیر کی ہی کال تھی۔
"میں یہاں پہنچ چکی ہوں مسٹر۔اب اگر ہمت نہیں ہورہی اپنا بزدلانہ چہرہ دکھانے کی تو بتادو۔" کاٹ دار لہجے میں کہا تو وہ دھیرے سے ہنسا۔
"کو دا تیرے گھر میں یوں دھم سے نہ ہوگا۔"
وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا"
وہ ذومعنی انداز میں کہتا مہر ماہ کا حلق تک کڑوا کر گیا۔
"اب اگر تم ٹیلی فونک مشاعرے کا سوچ رہے ہو تو میرے خیال میں مجھے چلے جانا چاہیے" وہ تلخی سے بولی۔
"ارے نہیں نہیں۔۔۔یہ غضب مت کرنا۔میں یہیں ہوں۔تم نے ڈھونڈا ہی نہیں ڈھونڈنے والوں کی طرح" وہ کہتے ہوئے جس طرح موبائل کان سے لگائے ایک دم سے ٹیبل کے پاس آیا،مہر ماہ کا موبائل کان سے لگائے ہوئے ہاتھ بے جان سا اس کی گود میں آگرا۔وہ کال منقطع کرتا ہوا کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ رہا تھا اور مہر ماہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ایک وحشت سی اس کے حواسوں پر طاری ہونے لگی۔
یہ وہ شخص تھا جس نے مہر ماہ کی زندگی کے سارے مہرے پیٹ کر ہار اس کا نصیب کردی تھی۔یہ چہرہ۔۔۔ہاں یہی وہ چہرہ تھا۔وہ اسے تمام عمر نہیں بھول سکتی تھی۔وہ مسکرا رہا تھا۔وہ ایک وجیہہ شخص تھا مگر مہر ماہ کو غلاظت میں لتھڑا نظر آیا۔
"پہچان تو گئی ہو گی۔۔۔۔نمیر آفندی۔۔" وہ مسکرایا۔
مہر ماہ نے لمبا سانس اندر کھینچا۔وہ اذیت کی انتہا پر تھی۔
"اپنے برے وقت کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔"
"اور میرے لیے الٹ ہوا۔تم میرا اچھا وقت ثابت ہوئیں۔رقم لائی ہو۔؟" وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا تو مہر ماہ کو اس سے گھن آئی۔ابھی بھی ثمرہ چچی کو نمیر آفندی سے ہمدردی محسوس ہوا کرتی تھی۔
"بہت خوب۔۔۔مجھے یقین تھا کہ یہ گھٹیا حرکت تمہاری ہی ہوسکتی ہے" مہر ماہ کا چہرہ تپا۔
"حقدار ہوں زمین و جائیداد کا۔اب سیدھے سبھاؤ سے نہیں دو گے تو ٹیڑھی انگلی کرنی پڑے گی مجھے۔" وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔
"مجھے طلاق چاہیے نمیر آفندی۔۔۔ورنہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" وہ دانت پیس کر بولی۔
تو اس نے بھنویں اچکائیں۔"تم دھمکی دے رہی ہو مجھے؟"
"عمل بھی کرسکتی ہوں" مہر ماہ نے اسے گھورا۔
اس نے گہری نظروں سے مہر ماہ کو دیکھا۔
"تھوڑی سی نرمی اختیار کرو تو ہم ایک اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔"
"شٹ اپ۔۔۔" وہ غرائی۔"خبردار جو مجھ سے اخلاق سے گری کوئی بھی بات کرنے کی کوشش کی

تو۔حرام کھانے کی عادت ہے نا تمہیں۔۔" اس نے بیگ میں سے پرس نکالا۔اندر سے روپے نکال کر گویا اس کے منہ پر دے مارے۔

"یہ ہے تمہاری اوقات۔۔اب بتاؤ۔طلاق کتنے میں دو گے بکاؤ انسان۔" وہ مارے غصے اور طیش کے کپکپا رہی تھی۔تمام ڈر اور خوف کہیں دور جا سویا تھا۔

وہ اثر لیے بغیر نوٹ اٹھا کر گننے لگا۔اس کے چہرے کی چمک دیدنی تھی۔نوٹ گن کر ان کے اصل ہونے کی ساری نشانیاں دیکھنے کے۔بعد مطمئن ہو کر جیب میں ڈالے اور مہر ماہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"بیس لاکھ۔۔۔پورے بیس لاکھ لوں گا تمہیں آزاد کرنے کے۔" وہ ساتھ ہی کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور ایسے ہی کسی کو بتائے بغیر کام کرو گی تو فائدے میں رہو گی مہر ماہ آفندی! ورنہ ڈھونڈتی رہو گی ساری عمر نمیر آفندی نام کے بندے کو۔" وہ سفاک لہجے میں کہہ کر فوراً ہی وہاں سے نکل گیا۔سُن سی کیفیت میں بیٹھی مہر ماہ کا سکتہ موبائل کی رنگ سے ٹوٹا۔اس نے دیکھے بنا موبائل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"مہر۔۔کہاں ہو تم۔۔کبیر باہر ویٹ کر رہا ہے تمہارا۔" دوسری طرف سے موحد کی پر تشویش آواز آئی تو وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میری نمیر آفندی سے ملاقات ہوئی ہے آج‘ موحد اس نے وقت دیا ہوا تھا ملنے کا۔"

"نمیر۔۔آ۔۔فندی۔" موحد کے حواس گویا جواب دے گئے۔اس کی آواز لڑکھڑائی تھی۔

گھر آتے ہی اس کا سامنا موحد سے ہوا۔وہ ابھی ثمرہ کے کمرے سے نکلا تھا۔شاید اسی کے بارے پوچھنے آیا ہو۔تپتا سلگتا وہ جانے اس کی کال سنتے ہی لوٹ آیا تھا۔اس کے نا قابل فہم تاثرات دیکھ کر مہر ماہ الرٹ تو ہوئی مگر وہ اس کے کچھ سمجھنے سے پہلے اس کا ہاتھ تھام کر گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں لے گیا۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ۔۔" وہ اس کے ہاتھ چھوڑتے ہی چلائی۔

"تم بتاؤ۔۔کہاں گئی تھیں اور کس سے مل کر آ رہی ہو؟" وہ متوحش سا تھا۔مہر ماہ کو غصہ آیا۔

"بتایا تو تھا تمہیں۔۔۔پھر اس تماشے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیوں۔۔۔؟ کس سے پوچھ کر گئی تھیں تم؟" وہ غصے سے بے حال اونچی آواز میں بولا تو مہر ماہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"میں کسی کی پابند نہیں ہوں۔اور تم۔۔۔تم کس حیثیت سے مجھ پر رعب ڈال رہے ہو؟"

"مہر۔۔۔" وہ مٹھیاں بھینچے دانت پیستا آگے بڑھا تو وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"نجانے کون تھا اور تم نمیر آفندی سمجھ کر منہ اٹھائے اس سے ملنے پہنچ گئیں۔" وہ گرجا۔پھر دفعتاً اسے خیال آیا۔

"اور وہ پیسے بھی یقیناً تم نے اسی کے بلیک میل کرنے پر دیے ہوں گے۔" وہ بے یقین نظروں سے مہر ماہ کو دیکھ رہا تھا۔

"شکر نہیں کرتے کہ اسے ڈھونڈنا نہیں پڑا اور وہ خود ہی سامنے آ گیا۔اپنے لالچ ہی کے لیے سہی۔اور میں اچھی طرح پہچانتی ہوں اس کمینے انسان کو۔اغوا کے بعد دیکھا ہے میں نے اس کو اور بازار میں بھی وہی ٹکرایا تھا مجھ سے۔" مہر ماہ نے جھلا کر کہا تو موحد اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

"کیا۔۔۔اور کیا کہا ہے اس نے تم سے؟"

"اس ملاقات کے لیئے اس نے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔اور ساتھ ہی کسی کو نہ بتانے کا وعدہ۔میں نے سوچا ایک بار وہ اپنے بل سے باہر تو آئے۔لاکھ روپے کے بدلے ہی سہی" وہ اپنے کارنامے پر مطمئن تھی۔

موحد کی آنکھوں میں تو جیسے خون اتر آیا۔بے اختیار اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔" دماغ تو خراب

نہیں ہو گیا تمہارا۔ یہ کیا کرتی پھر رہی ہو۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو؟"

مہر ماہ کو موحد کی حالت دیکھ کر خوف آیا۔ کسمسا کر اپنے شانے اس کی گرفت سے چھڑائے۔ اور درشتی سے بولی۔ "کوئی کچھ نہیں کر سکتا میرے لیے۔ آغا جان تک نے اس کو ڈھونڈنا ملتوی کر دیا ہے۔ وہ تو بس میرا دوسرا نکاح کر کے گویا سارا مسئلہ حل کر چکے ہیں۔ مگر میں۔۔۔۔ فقط میں جانتی ہوں کہ میں ابھی تک کس دلدل میں کھڑی ہوں۔ مجھے ہر حال میں اپنا پہلا نکاح ختم کرنا ہے موحد۔"

"اور اس کے لیے تم اس رذیل شخص سے ملو گی ہمیں بتائے بنا۔" وہ خود پر سے قابو کھو کر چلایا۔

"زندگی میری خراب ہو رہی ہے تو ظاہر ہے میں ہی ملوں گی اس سے۔ اور تو کسی نے آج تک نمیر آفندی نام کے بندے کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔" وہ تلخی بھرے طنز سے بولی۔ مگر موحد آفندی کے تو جیسے پیروں تلے کسی نے جلتے کوئلے بچھا دیے تھے۔ جھنجھلایا ہوا۔۔۔ طیش سے مٹھیاں کھولتا بھینچتا۔۔۔ ادھر ادھر پھیرے لگاتا وہ شدید ٹینشن کا شکار تھا۔

"آئی کانٹ بلیو دس۔۔۔ وہ تم سے ملا۔ اس کی اتنی جرأت کہ وہ تمہیں بلیک میل کرے۔ اف" اس کا بس نہ چلتا تھا۔

اپنے بال نوچ لیتا یا اگر نمیر سامنے ہوتا تو اسے گولی سے اڑا دیتا۔

"گھٹیا شخص ہے وہ بہت۔۔۔ ثمرہ آنٹی اس کی تعریفیں کرتی ہیں مگر مجھے تو اس میں قابل تعریف کچھ نہیں لگا۔ ساتھ زندگی ساتھ گزارنے کی آفر کر رہا تھا ذلیل انسان۔" وہ موحد کا غصہ دیکھ کر بے ساختہ کہہ گئی مگر جس طرح موحد کو کرنٹ لگا وہ دانتوں تلے زبان دبا کر رہ گئی۔

"تم۔۔۔ آئندہ گھر سے باہر نکلیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔" وہ لال آنکھیں لیے غرایا۔ تو مہر ماہ کی سوئی انا انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔

"تم ہوتے کون ہو مجھ پر یہ بے وجہ کا رعب ڈالنے والے۔ نکاح میں نہیں ہوں تمہارے جو اتنی دھمکیاں دے رہے ہو۔ سمجھے تم۔"

موحد کا دل چاہا ایک تھپڑ رکھ کر اسے لگائے۔ وہ سر جھٹکتی باہر نکلنے لگی۔ جیسے اسے جتا رہی ہو کہ وہ اس کے غصے کی پرواہ نہیں کرتی۔ مگر موحد نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے تھام کر روک لیا۔ مہر ماہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"دنیا دکھاوے کو ہی سہی مگر تم میرے نکاح میں ہو مہر۔ اور جب تک یہ کاغذی رشتہ باقی ہے۔ تم نمیر سے نہیں ملو گی۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ غرایا تھا۔

مہر ماہ کو اس کی خواہ مخواہ کی جذباتیت پسند نہ آئی۔ "مجھے پتا ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں موحد۔۔۔ مجھے اس شخص سے چھٹکارہ پانا ہے۔ کیسے بھی سہی۔"
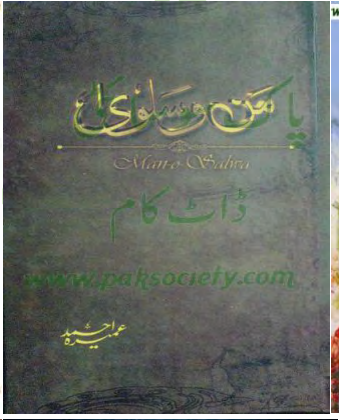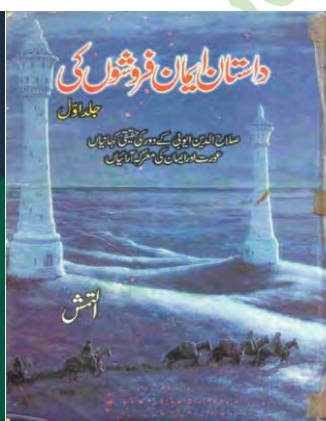
"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" وہ تیزی سے بولا۔

"تم لوگوں کے سامنے نہیں آیا وہ تو کیا میں ساری عمر ایسے ہی گزار دوں گی؟" مہر ماہ نے غصے سے بازو جھٹک کر چھڑایا۔

"زبردستی ہی کا سہی۔ مگر محرم ہے میرا وہ۔ میں خود بات کر کے یہ معاملہ نمٹاؤں گی۔ تم بیچ میں مت آؤ۔ وہ مجھے طلاق دینے پر راضی ہے۔" مہر ماہ نے اطمینان سے کہا مگر اگلے لمحے میں موحد کے تھپڑ نے اس کو ششدر کر دیا۔

موحد کی آنکھوں میں گویا خون اتر آیا تھا۔

باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سدرۃ المنتہیٰ
جب وقت آجائے گا

اماں نے کبھی سوئی میں دھاگا نہ ڈالا تھا۔ سوئی اور دھاگے کی وجہ سے ان کی خوب صورت آنکھوں پر عینک چڑھ گئی تھی۔ میں نے تب شام میں پسی سے کہا تھا کہ عینک یا تو سوئیوں میں دھاگے ڈال کر چڑھتی ہے یا پھر خشک کاغذ پر گیلا قلم پھیر کر لگ جاتی ہے۔

عینک لگنے کی میرے پاس تب صرف دو وجوہات تھیں مگر اب تیسری بھی ہے۔ جب مجھے عینک چڑھی تھی اور بعد میں پسی کو بھی وہ دراصل اب کاغذوں کے اندر گم ہو گئی ہے۔ عینک لگنے کی تیسری وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اس نے اپنی خوب صورت آنکھوں کے گرد گھیرا ڈالتے ہوئے پلکوں کو ڈھانپ لیا ہے۔

خدا جانے اسے دیکھنے کے بعد میری نظر اس قدر تیز کیسے ہو جاتی ہے کہ میں پہلا جملہ بولنے کے دوران ہی عینک اتار کر اس کی میز پر رکھ دیتا ہوں۔

سیل فون رکھتے، قلم کا ڈھکن بند کرتے اور عینک اتارتے ہوئے میں نے سوچا۔

کاش محبت بھی اسی طرح کسی کے سامنے اتار کر رکھ دی جاتی، اٹھا کر بٹوے میں ڈال لی جاتی۔

یا پھر کھینچ کر بے کار ہونے پر ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی۔ جب جی چاہے جیب میں بھر لیا جاتا۔

اور جب جی چاہے سنبھال کر رکھی جاتی۔

محبت بھی اگر استعمال کی چیز ہوتی؟

محبت اگر چیز ہوتی
احساس نہ بن پاتی
میراث نہ بن پاتی
حوالہ نہ ہوتی... اور زندگی نہ بن پاتی

✱ ✱ ✱

سردیوں کے موسم کی جاتی ہوئی گہری شام تھی۔

یونی ورسٹی کا آخری پیریڈ بھی ہم نے بنک کیا تھا اور کیفے میں آج پہلے سے زیادہ شور تھا۔ آخری دن پر ہر کوئی اداس تھا۔ زبردستی مسکرانے ہنسنے لگتا۔ باتیں عروج پر تھیں، باتوں کا دور دورہ تھا۔ چار سال کہیں گھوم پھر کر غائب ہو گئے تھے۔ جیسے کسی نے چابی گھما دی تھی۔

تھرررر... ررررر... چابی زوں... کی آواز کے ساتھ گھوم جاتی تھی۔ لوگ، باتیں، جگہیں، میز کرسیاں، سب جیسے گھوم پھر کر... اسی وقت ایک جگہ پر آ رکے تھے۔

وقت قلابازیاں کھا رہا تھا۔ لمحہ کسی کی پکڑ میں نہ آتا تھا۔

پہلا دن بھی اسی کیفے میں تھا۔ پہلے دن کی اجنبیت، نئے چہرے، اجنبی، مدھم مسکراہٹیں... اور اب کھلکھلاہٹیں، دوستیاں اور رونقیں۔ اب بھی یہی میز، یہی کرسیاں...

فرق صرف مسکراہٹ سے کھلکھلاہٹ کا تھا۔

فرق صرف اجنبیت سے دوستی کا تھا۔

فرق آپ اور تم کا تھا۔

آپ سے تم تک اور پھر تو آنے میں کبھی کبھار بڑا وقت لگ جاتا ہے۔ ہمیں بھی چار سال لگ گئے تھے۔

اور ہم آج تم تھے۔ وہ تم تھی۔ میں تو تھا۔ اس کا وقت بڑا خوب صورت تھا۔ چاندنی جیسی روشنی تھی، سورج دمکتا تھا تو کیفے کی کھڑکیوں کے ادھ کھلے پٹ کے شیشے سے ٹکراتی روشنی رنگین ہو کر آتی تھی اور چاروں اور گھوم جاتی۔ روشنی سروں پر منڈلاتی جاتی تھی۔ چائے کے کپ کے ساتھ انوکھی باتیں تھیں۔

ساری باتیں ہی آنکھوں میں ہوا کرتی ہیں۔

آنکھیں جو کہہ دیں... پر ہم نے کہا کہ اب کوئی وعدہ نہیں۔

ہم کوئی وعدہ نہیں کریں گے۔

کوئی نہیں۔

روزگار کی پریشانی میں بندھے اور کہیں روایتوں کی زنجیر پہنے ہوئے لوگوں کو اتنے بڑے وعدے اور اس قدر بڑے بول زیب نہیں دیتے۔

اس لیے ہم نے کہا۔ کوئی وعدہ نہیں چلے گا۔

کوئی جھوٹا پیمان نہیں ہوگا۔

ہم حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ اور اپنے مقدر کی ڈوری قسمت کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں۔

مگر پھر... چار سال کا ساتھ...
دوستی اور چاندنی... روشنی... اور چائے کا کپ...
بات صرف محبت کی تھی۔
بات آپ سے تم تک... اور تم سے تو کی تھی۔
بات صرف محبت کی تھی۔
بات تم اور تو کی ہو تو آپ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ جس طرح محبت میں وعدے کی۔

☆ ☆ ☆

ہمیں تب پتا لگا تھا کہ رستے الگ ہیں۔ مگر ہم نے کہا۔
کہیں نہ کہیں آملیں گے کسی نہ کسی دن...
کہنے لگا وہ دن چاندنی جیسا ہوگا۔
میں نے تو کہا تھا کہ دیکھو وقت بیچ میں آجاتا ہے۔
وقت حیثیت رکھتا ہے۔
جہاں یہ آجائے وہاں دوریاں آجاتی ہیں۔
جہاں یہ آجائے وہاں فاصلے آجاتے ہیں۔
جہاں یہ آجائے وہاں جدائی آجاتی ہے۔
مگر کہنے لگا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
وقت... وقت ہے... اور ہم ہم ہیں۔
دل تو آخر دل ہوتا ہے۔ یہ نہیں بدلتا۔
اس پر وقت کا زور نہیں چلا کرتا۔
کہنے لگا وعدہ کرو ایک دوسرے کو وقت کا شکار نہ ہونے دیں گے۔
فاصلہ کبھی جھگڑے کی بنیاد نہ بنے گا۔
باتیں کبھی رخ نہیں بدلیں گی۔
لہجہ تم سے آپ تک نہ آئے گا۔
تم میری تم رہوگی۔
میں تمہارا تو رہوں گا۔
بیچ میں وقت بھاگتا دوڑتا پھرے گا۔
چھلانگیں مارے گا۔
اڑانیں بھرے گا۔
ہم ایک سے دو ہوجائیں گے۔
مگر دل ایک ہی ہوگا۔
تم میری تم رہوگی۔
میں تمہارا تو رہوں گا۔
کہانی وہ ہی تھی جیسی ہوتی ہے۔
کہانی وہی تھی... محبت بھی وہی تھی۔
بس کوئی وعدہ نہ تھا۔
ایک صرف تم کا۔
اور ایک تھا تو کا۔

☆ ☆ ☆

سالوں بعد اچانک ٹکراؤ۔
میں ون لائینو لے کر آیا تھا اور وہ کانٹینٹ ہیڈ کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ میں اس اچانک ملاقات پر مسکرایا اور وہ ہنس پڑی یہ کہتے ہوئے۔ "بتاؤ حسین ڈرامے کب سے لکھنا شروع کیے تم نے؟"
"جب سے زندگی ڈراما بن گئی ہے تب سے..."
میں اس کے چھوٹے سے کمرے میں چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ میز کے پیچھے لگی بڑی سی گلاس ونڈو کے ساتھ چپکے ہوئے درخت کے پتوں کو... بائیں جانب چھت تک جاتی ہوئی کتابوں کے ریک کو پھر چار کرسیوں سے ٹکرا کر اس کی میز۔ ایک طرف میں... ایک طرف وہ... بیچ میں میز... میز پر کاغذوں کا ڈھیر اور ڈھیر میں کئی سارے مسائل...
"باتوں میں تمہارا کوئی جواب نہیں ہے۔" وہ مسکرائی ڈرامے والی بات پر...
"کیسی ہو؟" عینک اتار کر میز پر رکھ چکا تھا میں۔
"اچھی ہوں۔" اس کی آنکھوں پر عینک جمی تھی۔
"اس کا تو مجھے بھی پتا ہے۔" پھر مسکراہٹ...
مدھم سے گہری۔
"تم کیسے ہو؟"
"میں برا ہوں۔"
"اس کا بھی مجھے پتا ہے۔" ہنسی تھی۔
"کیا کرتی رہتی ہو؟" وہی بے معنی سوال۔
میز پر دھرے کاغذوں کے ڈھیر کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگی۔

"تم...؟"
"کچھ نہیں... " میرے پاس جیسے کچھ نہ تھا۔
"اس کے علاوہ تم؟" میں نے کاغذوں کے علاوہ پوچھنا چاہا۔
"اس کے علاوہ میں؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ جیسے خود کو دریافت کرنے میں لگی ہو۔
"اس کے علاوہ بس گھر... " خود کی دریافت مشکل تھی "بچے اور گھر... "
"شادی ہوئی؟" بظاہر مسکرا کر سوال کیا تھا۔
"ہاں ہوئی... دو بچے ہیں۔"
"اچھا... میرے تین ہیں۔"
"تم جیت گئے۔" میری بات پر پھر ہنس پڑی۔
"پڑھتے ہیں؟"
"ہاں... دو بیٹے ہیں' چوتھی میں... ایک بیٹی ہے' پہلی میں... اور تم نے کب شادی کی؟"
"بس یہی پانچ چھ سال ہو گئے۔" (لہجہ سال کو صدی کہہ رہا تھا۔)
"بیٹی پڑھتی ہے بیٹا چھوٹا ہے ڈھائی سال کا اپنے ابو کے ساتھ بہت اٹیچڈ ہے۔ اس لیے مجھے مسئلہ نہیں ہوتا۔"
"میاں؟" میں یہ سوال نہ چاہتے ہوئے بھی کر گیا۔
"اچھا ہے وہ بھی۔ میاں برا کب ہوتا ہے؟"
"بالکل سب سے بڑی ضمانت ہے کہ وہ میاں ہے' پھر برا کیسے ہوا۔" میں بھی مسکرایا۔
"بیوی...؟" اب باری اس کی تھی سوال کی۔
"بیویاں بہت بری ہوتی ہیں۔" میں نے منہ بسورا تو پھر ہنسنے لگی۔
"تم مرد لوگ بڑے ناشکرے ہو۔"
"یہ بھی ہے۔"
"اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا کہانی لائے ہو۔" میرے ہاتھ میں رکھے کاغذ پر آ گئی۔ میں نے کاغذ اسے تھما دیا۔ چشمہ ٹکا کر پڑھنے لگی۔ عینک بھی تو کہانیاں پڑھتی ہے۔ بس کہنے نہیں دیتی۔ آنکھوں کو چھپا کر رکھنا چاہتی ہے۔ عینک کہانی پڑھنے لگی۔

منہ بنایا...
"نہیں یار!" سر جھکا کر کاغذ رکھا۔ "مزا نہیں آیا۔ کچھ نیا لکھو نا۔ یہ کہانی تو سو بار چل چکی ہے۔"
"کیا؟"
"کچھ بھی... کچھ نیا... اچھوتا سا منفرد سا۔"
"ایک بات بتاؤ۔" میرا لہجہ ڈوب کر ابھرا تھا۔
"ایسی کون سی کہانی ہے' جو پہلی بار لکھی جا رہی ہے۔ یہ سارے ڈرامے جو تم لوگوں کے چینل پر چل رہے ہیں۔ یہ سینکڑوں بار تو چل چکے ہیں۔ مسائل وہی... سوچ وہی... جب تک مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ تب تک دہرایا جاتا ہے۔"
"ٹھیک کہتے ہو۔ مگر اب ہم کچھ نیا سوچ رہے ہیں۔"
"نیا مسئلہ کیا؟" جی چاہ رہا تھا' ہنسوں پر ہنس نہ سکا۔
"دیکھو اب یہ تو تمہارا کام ہے۔ کچھ نیا کر کے لاؤ' اگر سب ہمیں ہی کرنا ہے تو ہم پھر کہانی کیوں خریدیں... خود ہی لکھیں... خود بنائیں۔" اس کے پاس اچھا جواز تھا۔
"جانے دو یہ بھی۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم لوگ کوئی ایک اسٹوری لائن اٹھا کر ناک نقشہ بدل کر میک اپ کر کے پیش کر دیتے ہو۔"
وہ بے بسی سے مسکرا دی۔ پرانی عادت تھی۔ تلخی پر مسکراتی تھی۔
"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ دیکھو اتنے نئے لکھنے والوں کو متعارف کروایا ہے۔ سب کو کام ملا ہے۔ آخر اتنی خواتین گھر بیٹھی تھیں۔ مرد کالم تک محدود تھے۔ سب اٹھ کر الیکٹرونک میڈیا تک آئے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے انہیں فائدہ ہوا ہے۔ تو ٹی وی والوں کو ماننا چاہیے کہ انہیں پرنٹ میڈیا کے مزدوروں نے سہارا دیا ہے۔ پہلے ان کے پاس چار مخصوص ستارے تھے۔ اب مزدوروں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔"
ہمیشہ کی طرح تلخیوں سے باز نہ آنا۔ جو سوچتی تھیں وہ کہنے لگی ہو اب۔"
"فائدہ تو ہم لوگوں کو بھی ہوا ہے۔ مزدور کو مزدوری

نہیں ملتی تھی اب ملنے لگی ہے۔ میلہ لگا ہوا ہے۔ یہ ون لائنر دیکھ رہے ہو۔" کاغذوں کو الٹنے پلٹنے لگی۔

"یہ سب مختلف علاقوں سے آتے ہیں۔"

"ہاں بالکل... جتنے مزدور بڑھیں گے، ٹھیکے دار بھی اتنے آئیں گے۔ ٹھیکیداروں کا بھی تو فائدہ ہے۔ مال بنے گا۔ بکے گا۔ منافع لائے گا۔ کمپنی چلے گی۔" وہ کہنے لگی تھی سر جھٹک کر میری بات پر۔ پھر سے تلخ۔

"مجھے یونیورسٹی کے دوران کامریڈی کے قصے یاد ہیں۔ تمہارے حسین... وہ لمبی لمبی تقریریں... سیاسی سماجی بحثیں (میز کے گرد ہوئی آنکھوں والی باتیں بھول گئی۔ سیاسی سماجی قصے یاد رہ گئے۔)

"اس کے بعد بھی میں نے تمہارے کالمز پڑھے اخبار میں۔"

"اوہ... تو تم وہی تھیں جس نے نام بوجھا تھا میرا ایک سلسلے میں۔" وہ مسکرا دی۔

میں بھی مسکرایا۔ تلخی کو مسکراہٹ نے ہضم کر لیا۔

"پہیلیاں بوجھنا تو تمہارا کام ہے حسین۔"

"اور کون بوجھ سکتا ہے بھلا۔ مگر تم نے بھی یہ کام سیکھ لیا۔"

"اچھا بتاؤ۔ نئی کہانی کہاں سے لاؤں۔" میں بھی اسی طرح آمادہ ہو گیا جیسے مزدور بیوپاری کے سامنے ہار جاتا ہے۔

"پانچ پائی نہ سہی دو پائی ہی... روزگار بڑی اوکھی شے ہے۔ بندے کو کاروباری بنا کر رکھتی ہے۔"

"کاش محبت بھی کاروبار ہوتی۔"

"خدا جانے اتنے مسائل کے اندر یہ محبت ہی کیوں میرے سوال کا کبھی پہلا تو کبھی آخری حصہ بن جاتی ہے۔"

✡ ✡ ✡

یہاں تک تو وہ بھی ٹھیک تھا۔ کاروبار کو محبت سے ماپتا تھا۔ پہلے محبت کو دوستی سے ماپتا تھا۔ اس کے بعد اب کاروباری ہو گیا۔ تقریر مگر اب بھی ایسی ہی کرتا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بولتا تو پچھاڑ کر رکھ دیتا۔ ہارتا تو ہرا دیتا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا کہ وہ نہ بولا تو پھر کہانی کیسے بولے گی۔ کہانی بدلنے کے لیے حالات بدلے جاتے ہیں۔ حالتیں جب بدلیں تو کہانیاں بھی بدل جاتی ہیں۔

مگر ہماری دنیا میں اسے کون سمجھائے کہ کردار بدلنے سے بہت کچھ بدل جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ صرف کردار ہی تو بدلے ہیں۔

اب وہ نئی کہانی دریافت کرلے تو بات بنے گی۔ ورنہ باتوں کی بات آئے تو بات بڑی دور نکل جاتی ہے پہنچ سے۔

✡ ✡ ✡

پی نے مجھے فون کر کے بلایا تھا۔ "حسین صاحب! آپ کا نیا آئیڈیا اچھا ہے۔ ہمیں پسند آیا ہے۔ ہم اس پر مل کر کام کریں گے۔ آؤٹ لائن وہی ہوگی۔ بیچ میں گھپلا کریں گے۔ کہانی بدل کر رکھ دیں گے۔"

"اوہ... تو روزگار مل گیا۔" ایک شکر کا سانس میرے اندر سے برآمد ہوا۔

کچھ دن بعد ہم سیٹ پر تھے۔ گاڑی چلنے لگی تھی۔ مزدور خوش تھا۔ ٹھیکے دار کا کام ہو رہا تھا۔ ٹھیکدار بھی خوش تھا۔

ایک جملہ تھا اس کا۔ "کہانی بدلیں گے۔"

ایک میرا تھا اس سے "حالات بدلے جاتے ہیں اور کہانی خود ہی بدل جاتی ہے۔"

میں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ بیچ میں بہت بڑا گھپلا تھا۔ بیوپاری، ٹھیکے دار مل کر کانٹریکٹ بن گیا۔ کردار بدلے۔ لوکیشن بدلی۔ میز کرسیاں بدلیں۔ مگر کونے میں کہیں وقت جیسے دبک کر بیٹھ گیا۔ لمحے نے خود کو جیسے دہرایا تھا۔ بات وہی بس طریقہ بدلا تھا۔ مکان اور فرنیچر بدلا۔ سیٹ تیار تھا۔

میں کاغذ تھامے کھڑا تھا۔ کیمرہ مین کے پیچھے وہ کھڑی تھی۔ آگے کردار تھے۔

مکالمے میرے ہی لکھے ہوئے مگر مجھ سے جیسے دور

کھڑے تھے "کچھ چیزوں کی سمجھ بہت دیر سے آتی ہے۔"

"آپ خود کو نہیں جان پاتے۔" محبت کے بڑے بڑے دھوکے کرنے والے میرے ضمیر نے مجھے للکارا۔

"مگر میں نے کہاں۔ کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔"

سین اوپن ہو چکا تھا۔

وہ میرے برابر میں کھڑی تھی۔ کیمرہ مین نے اسٹارٹ کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ صرف کرداروں نے بولنا تھا۔

"آپ نے بڑا اچھا سین لکھا ہے حسین صاحب۔"

اس کی ہلکی سرگوشی۔

میں نے کہا "بس شکریہ جی۔" کردار نے جملہ بولنا شروع کیا۔

لڑکا۔ "میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ کوئی نہیں۔ کوئی جھوٹا وعدہ نہیں۔ بس اتنا کہ میں تمہارا "تو" رہوں گا۔ اور تم میری "تم" رہو گی۔

میری آنکھیں نم نہ تھیں تب بھی سب کچھ دھندلا تھا۔

لڑکی۔ "مجھے پتا ہے تم بدل جاؤ گے۔ وقت بیچ میں آجائے گا۔

جہاں یہ آجائے۔ وہاں دوری آجاتی ہے۔ جہاں یہ آجائے وہاں فاصلہ آجاتا ہے۔ جہاں یہ آجائے۔"

کہنا کس قدر مشکل تھا۔ جیسے دل پہ آرا چلتا تھا۔

لڑکا۔ "میں جب بھی لوٹوں گا۔ تم سے وعدہ نہیں کرتا مگر بس اتنا کہ میرا بھروسہ رکھنا۔ میں تمہارا (تو) رہوں گا۔ تم میری (تم) رہنا۔"

بات تو صرف آپ سے تم تک کی تھی۔

"بڑا زبردست سین لکھا ہے حسین آپ نے۔"

اس نے دہرایا۔

"دیکھا ہم نے کہانی کو بیچ میں بدلا ہے۔ گھپلا کیا ہے۔"

چابی پھر سے گھومی۔ گھرر۔

کاش محبت ایک ون لائنر ہوتی۔

ردی کی جاتی۔ ڈراما ہوتی۔ ختم کی جاتی۔

محبت تو کہانی ہے۔

جو بدل بھی جائے۔ مگر چھپتی ہے۔

میں نے تمہیں کہا تھا نا۔

وقت بیچ میں آجائے گا۔

اور دوری پیدا کر دے گا۔ سارا قصور ہی اس کا ہے۔

یہ جہاں آجائے۔ وہاں۔

"اسے بیچ سے نکال دو۔"

مجھے روزگار مل گیا۔

چھوٹے چھوٹے کاریڈور کی طرف بڑھتے قدم۔

"مجھے روزگار مل گیا۔"

کہانی کو بدلا گیا۔

کہا تھا نا۔ کہا تھا کہ آپ سے تم تک نہ آنا۔

تم میری تم رہو گی

میں تمہارا تو رہوں گا

کہانی یہی ہے

اور انتساب اس دن کے نام جب ہم پہلی بار ملے تھے۔

☆

اکمل رضا

وسخ آندھی

پرانی حویلی جس کی بیرونی دیواروں پر گہری سیاہ دراڑیں بل کھاتی ناگنوں کی طرح زمین سے اٹھتی اوپر آسمان کی اور بڑھتی جاتی تھیں۔ جتنی پرانی تھی اتنی ہی جاہ جلال والی...... حویلی کا بڑا چوڑا پھاٹک ...... جو بوسیدہ تو بہت لیکن کسی قلعے کی طرح ابھی بھی رعب دار تھا۔ اسی سے منسلک دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آؤ تو بالکل کونے میں ایستادہ تھا وہ...... "انار کا درخت"...... جو کہ اب ٹنڈ منڈ ہو چکا تھا۔ مُڑ تُڑ گیا تھا، بھدا، کالا سیاہ سا ہو گیا تھا۔ جس کی بھر کس نکلی سوکھی شاخیں پرانی دیوار کی اندرونی دراڑوں کا ہی حصہ لگتی تھیں۔

کہنے کو انار لیکن قسمت ایسی بے یاوری اور وجود ایسا بے حیثیت کہ ایک بار دیکھنے سے نظر نہیں آتا۔ دو بار کے دیکھنے سے بھی نہیں آتا تھا۔ پرانی دیوار کے اور اس مردہ درخت کے وجود کو الگ الگ دیکھنے کے لیے بڑا غور کرنا پڑتا ہے۔ اور اس بیمار کی حالت فی الفور ایسی نہیں تھی کہ ایسی توجہ طلب فیاضی کی مستحق ٹھہرا۔

انار کے درخت بھی بھلا کبھی ایسے ہوئے ہیں......؟ ضعف سمیٹے، دق اگلتے، وہ اگر اپنی کلیوں کو پھل میں بدلنے سے روک لیں تو نجانے کتنے ہی پھول دار پودوں، درختوں کو مات دے دیں۔ ایسی قسمت تو کلر اور شورش زدہ علاقوں کے درختوں والوں کی بھی نہیں ہوتی جیسی اس کی تھی۔

ان تیس سالوں میں نجانے کتنی ہی خوفناک آندھیاں آئی تھیں۔ کتنی ہی طوفانی بارشیں ہوئی تھیں۔ چھتیں گری تھیں۔ دیواریں ڈھے گئی تھیں۔ ان بارشوں کے باعث کتنے ہی مر کھپ گئے تھے۔ لیکن اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ گھر والے بھی نہیں۔ وہ روشنی کے پرانے مینار کی طرح غیر ضروری مگر زندہ وجاوید ہی کھڑا رہا تھا۔ کسی نشان عبرت کے طور پر۔

ویسے کسی کی اس پر اس طور نظر ہی نہیں پڑی تھی کہ کوئی اسے اکھاڑ کر باہر پھینکنے کے بارے میں سوچتا عمر رسیدہ غیر اہم بوڑھوں کی طرح وہ بھی ایک کونے میں کافی عرصہ سے پڑا کھانس رہا تھا۔ اول تو حویلی کے اس کونے میں کوئی آتا ہی نہیں تھا۔ دوسرا اس کے سوکھنے کے بعد سے اس کے ساتھ کے ایک دو اور درخت بھی سوکھ گئے تھے۔ اور حویلی کا وہ پورا کونہ ہی بنجر نظر آتا تھا۔ اب ہنستے بستے گھر کے خوش باش مکینوں کو کیا ضرورت پڑی ہے بنجر حصوں میں جانے کی......؟؟

ہاں بس ایک چودھرائن تھی جو آتے جاتے کبھی کبھی اس کو نظر بھر کے دیکھ لیا کرتی تھی۔ عید تہوار وغیرہ پر اس کا اس انار کے درخت کے پاس آنا باقاعدہ ہوتا تھا۔ ان راتوں میں بھی جب وہ تہجد سے فجر پڑھتے پڑھتے اللہ کے آگے روتے روتے شکوہ کرتے کرتے صبح کر دیتی تھی۔

ایسے وقتوں میں وہ اس کے پاس آتی تھی۔ غصے، غضب اور غور سے اس کی برادہ جھاکالی سوکھی مڑی تڑی ٹہنیوں کو دیکھتی تھی۔ کبھی کبھی چھو بھی لیتی تھی۔ اور ایسے وقت میں چودھرائن کی آنکھوں میں ایک دکھ ابھر آتا تھا۔ حسرت جھانکنے لگتی تھی۔ سو جنگیں ہار جانے جتنا ماتم اس کی آنکھوں سے عیاں ہوتا تھا۔

اس کا دل کرتا تھا کہ وہ اس بنجر پر تھوک دے۔ یہ اب بھلا اور کیا چاہتا تھا۔؟ تیس سال گزر گئے

تھے۔ یہ اتنا ڈھیٹ تھا کہ اب بھی گرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تلخی، دکھ، غم سے سوچتے سوچتے چودھرائن پار سالوں کے وقتوں میں کھو جاتی......

ہاں...... کبھی اس پر بھی انار لگتے تھے۔ سرخ سرخ...... اور کلیاں لگتی تھیں، نارنجی نارنجی......

چودھرائن دکھ سے سوچتی......

لیکن اب تو ان باتوں کو سالوں گزر چکے تھے۔ اس وقت کی تو کہاوتیں بھی دم توڑ گئیں۔ کوے مر کھپ گئے...... اس وقت کا تو بان بھی جل گیا اپنے تمام تر بلوں سمیت...... گھر والے بھول بھال گئے کہ کبھی اس درخت کے پھل انہوں نے چکھے بھی تھے کہ جس پر چودھرائن نے ململ کے کپڑے کی پوٹلیاں باندھی تھیں۔ نظر بد سے بچانے کے لیے اور انار کے پھل کو اچھی طرح سے پکانے کے لیے۔

کاش وہ شانو کو بھی ایسی ہی کسی مخملی پوٹلی میں باندھ کر اسے سب کی نظروں سے بچا سکتی۔ اسے قسمت، بیماری، روگ، محبت کے مہا جال اور پھر موت کے فرشتے سے چھپا سکتی۔

پوٹلیاں اس نے شانو کی وجہ سے تیار کروائی تھیں۔ بڑی بے صبری ہو رہی تھی وہ انار کا پھل کھانے کے لیے۔ ورنہ اس سے پہلے چودھرائن کو کہاں یاد تھا کہ حویلی کے کونے میں کوئی انار کا درخت بھی لگا ہوا ہے۔ پانی دیا سو بارش نے، کھاد دی سو گرد نے۔ پھر پھل کیسے لگتا۔؟ اب شانو نے ہی دیکھ بھال کی تھی تو اس پر نارنجی کلیاں نکل آئی تھیں۔

چودھرائن نے ملازمہ سے کہہ کر انار کی ساری کلیوں پر پوٹلیاں چڑھوادی تھیں۔شانو تو پھل کو پکنے ہی نہیں دے رہی تھی یا شاید اسے انار کی کچی کچی کلیاں توڑنے میں مزا آتا تھا۔جھولی بھر لیتی تھی وہ نارنجی کلیوں سے......خود جب پیدا ہوئی تو بالکل ان کے جیسی ہی تو تھی۔نارنجی نارنجی......پوری انار کی کلی۔

چودھرائن اسے چھپائے چھپائے پھرتی، جیسے کلی کی پتیاں اتر جانے کا ڈر ہو۔پانچ بیٹوں کے بعد پہلی بیٹی پال رہی تھی ناں وہ......نہیں جانتی تھی کہ پتیاں اترتی ہیں تو پھل پکتا ہے اور پکے پھل کی رکھوالی اس کے بور، اس کے آغاز سے بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے۔

اور وہ پھل کیسا لال سرخ تھا۔بیج بیج رس سے بھرا ہوا......بیاہی ماں کو پھر سے کنواری ہونے جیسی فکریں اور پریشانیاں ہی تو لگا دیتی ہیں جوان بیٹیاں......

رانگلے ریڑھے کا سہارا لے کر چلنے والی ننھی شانو کب اتنی بڑی ہوئی کہ پوری حویلی میں فراٹے بھرنے لگی چودھرائن کو پتا ہی نہ چل سکا۔ہائے......وقت اتنی جلدی گزر گیا۔اس وقت نے کون سے گھنگھرو باندھ رکھے تھے۔جو اپنے جانے کی کچھ خبر دیتا۔ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب چودھرائن راتوں کو اٹھ اٹھ کر اسے دیکھا کرتی تھی۔وہ ایسے سو رہی ہوتی تھی جیسے جنت میں پہنچی ہو۔

اسے دیکھتے چودھرائن خود بھی جنت میں ہی گم ہو جاتی......اسے یقین ہی نہ آتا کہ اللہ نے اس کی سن لی ہے۔اسے دعا کی قبولیت میں بیٹی دے دی ہے۔اسے شانو سے اتنی محبت تھی کہ اسے لگتا اس محبت پر قبر کی مٹی بھی نہیں بند باندھ سکتی......

کاش کوئی قسمت کو جان سکتا......پھر نہ دودھ سے جلتا نہ چھاچ کو پھونک مارتا......

اب وہی ننھی چودھرائن اس بوڑھی چودھرائن کے پاس آکر اسے دیکھا کرتی تھی۔جس کی نظر میں وہ ابھی بھی بچی تھی۔

''دودھ نہیں پیاناں......؟ سارا ٹھنڈا ہو گیا۔اب کیا فائدہ پینے کا۔پنجیری بھی ویسے ہی رکھی ہے۔'' وہ غصے سے کہتی......

''ارے پی لیا بابا......پی لیا۔'' چودھرائن بلاوجہ ہی منہ پھیر کر سونے کی کوشش کرتی......

''اور وہ سکینہ مردود جو اپنا منہ صاف کرتے ہوئے نکلی ہے وہ......''

''تھوڑا سا بچ گیا تھا میں نے اسے کہا تھا کہ پی لے......''

''ایک گلاس ہی تو تھا۔بالٹی تو نہیں جو اسے دینا پڑا''۔شانو ڈانٹتی، چودھرائن ہنسنے لگتی۔ایسی حرکتیں اب وہ مستقل طور پر اسی لیے تو کرنے لگی تھی کہ شانو اسے ڈانٹا کرے۔اس کی پیار بھری ڈانٹ چودھرائن کے لیے دودھ سے بھی زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی تھی۔

پانچوں بھائیوں کے کام بھی وہ ایسے ہی بھاگ بھاگ کر کیا کرتی......بھیا لالہ کہتے کہتے نہ تھکتی، گھر میں کتنے نوکر چاکر تھے۔پھر بھی ان کے کام کرتی وہ ایسے ہلکان ہوتی پھرتی، گویا وہ نہ کرے گی تو سب ادھورا رہ جائے گا۔ان کے میلے کپڑے دھوبی کو خود دیتی، استری کروا کر الماری میں بھی خود لگواتی، چودھرائن لاکھ منع کرتی، پر وہ کام کیے جاتی، کیے جاتی، حقہ چاہے جو مرضی بناتا پر اپنے بھائیوں کے آگے شانو ہی رکھتی تھی۔ملازمہ سے ان کے ہاتھ منہ دھلواتے وقت بھی وہ اس کے سر پر کھڑی رہتی۔شکار پر جاتے تو ان کے لیے خاص کھانے تیار کرواتی......سیخ، پروتی، چاولوں میں دم لگاتی، ان کے سامنے نکال کر رکھتی......ان کے شکار کیے جانوروں کو خود مسالہ لگاتی......تلتی، بھاپ دیتی۔کسی ملازم کو نہیں ہاتھ نہ لگانے دیتی کہ جیسے ملازم نے شکار کیے جانور کو ہاتھ لگا لیا تو کھانا ناپاک ہو جائے گا۔

سیوا کرواتے پانچوں بھائیوں کو کبھی خبر ہی نہ ہوئی کہ پیار سے سیوا کرنے والے کو اور کچھ نہ سہی پیار کے دو بول تو درکار ہوتے ہی ہیں۔کبھی سر پر پیار

نہ دیا، منہ سے دو بول چاہت کے نہ ادا ہوئے۔ وہ اس بات سے غافل رہے اور شانو یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتی رہی کہ جب گاؤں کے سارے مرد ہی ایسے ہیں تو وہ اپنے بھائیوں کی سرد مہری کا شکوہ کس سے کر سکتی ہے۔ بلکہ انہیں ہر وقت رعب اور ہتھیاروں سے لیس دیکھ کر شانو کو ان پر مزید فخر ہوتا...... ان کے ہتھیاروں کو وہ ایسے دیکھتی جیسے لڑکیاں اپنے داج کے سامان کو دیکھا کرتی ہیں۔

ایسے وقتوں میں چودھرائن کو اپنے گھر کی خوشیوں پر بڑا ناز ہوتا تھا، وہ اللہ سے اٹھتے بیٹھتے اپنے گھر کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی...... لیکن چودھرائن کی دعاؤں میں شاید کسی خاص عنصر کی کمی رہ گئی تھی۔ اس کی آرزو تو سچی تھی پر شاید رقت میں وہ خلوص نہ تھا جو دعا کی قبولیت کے لیے درکار ہوتا ہے، جو سارے پھل پر کڑواہٹ چھا گئی۔ چودھرائن دیکھتی ہی رہ گئی اور انار اس کی آنکھوں کے سامنے سوکھتا چلا گیا۔ سوکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

اکرم حمید...... گاؤں کے ایک اور وڈے جاگیردار عارف حمید کا بیٹا تھا۔ ولایت میں پڑھتا تھا۔ سالوں گزرے گاؤں والوں نے کبھی اس کی شکل نہ دیکھی۔ وہ کیسا ہے، کیسا دکھتا تھا، اب کیسا دکھتا ہے، کسی کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ خود چودھرائن کو بھی بھلا وہ کہاں یاد تھا۔ ہاں جب وہ پیدا ہوا تھا تو بڑا گورا چٹا تھا۔ اس کی ماں چودھرائن کی سہیلی پروین جیسا...... جب چودھرائن پانچ ہزار روپے چھوٹے گول مٹول سے اکرم کی گود میں ڈال رہی تھی تو تب اکرم کو غور سے دیکھتے ہوئے ایک بار اس کے دل میں یہ خیال آیا ضرور تھا کہ یہ بچہ جوان ہو کہ بڑا سوہنا دکھے گا۔ اور چودھرائن سوچنے لگی تھی کہ اگر اللہ نے مجھے کوئی بیٹی دے دی تو خود منہ سے اس کا ہاتھ مانگتے بالکل بھی نہ جھجکوں گی۔

اللہ نے چودھرائن کی سن لی...... اسے ایک بیٹی دے دی، شانو...... لیکن وہ منہ سے اس کے لیے اکرم کا ہاتھ نہ مانگ سکی...... شانو کی پیدائش ایسے الجھے جالوں میں ہوئی کہ اس کی بچپن کی سہیلی پروین پانچ بیٹوں کے بعد اس کی پہلی بیٹی کا چہرہ دیکھنے بھی نہ آسکی نہ ہی منہ دیکھنے کا پانچ ہزار واپس کر سکی۔

دونوں خاندانوں کے درمیان جو بات باری کے پانی کو لے کر شروع ہوئی تھی وہ بڑھتے بڑھتے قتل و غارت تک پہنچ گئی۔ پہلے کمی کمین مرے...... سوان کے تاوان بھی آدھی بوری گندم، پوری بوری گندم کے عوض ادا ہوتے رہے۔

بات جب زمینداروں کے گلوں تک پہنچی تو پورے گاؤں کو گویا آگ لگ گئی۔ جو بات باری پانی سے شروع ہوئی تھی وہ پانی بہتا رہا...... اور اس پانی میں مل گیا بہت سا خون، سیراب ہو گیا، غصہ، اکڑ، ضد اور انا......

چودھرائن اور پروین...... دونوں اپنے اپنے گھروں میں بند روتی رہیں، باہر مرد لڑتے رہے۔ سہلایا پچھوٹا، بہنایا بھی اور جو رشتے داری کرنے کا خواب تھا وہ بھی بھیانک لگنے لگا۔

خون خرابے کے بعد مسئلہ حل ہو گیا لیکن رویے جوں کے توں رہے۔ دونوں گھرانے چکی کے پاٹوں کی طرح ایک جیسے تھے۔ جب آپس میں بجے تو کمی کمین پس گئے۔ اس چکی کی وزنی سلوں کی کھنک سالوں کھنکتی رہی...... چودھرائن بھول بھی گئی کہ اس کی کوئی سہیلی پروین نام کی بھی ہے۔

مدتوں بعد شانو نے چودھرائن کو یہ بات یاد کروائی۔

”تیری کوئی سہیلی ہوتی تھی اماں؟ پروین نام کی؟ آج رخسانہ بتا رہی تھی۔“

”ہاں......“ ہنکارا بھرتے ہوئے چودھرائن کو بھی جیسے یاد آیا۔

”بڑا سوہنا ہے اس کا بیٹا...... آج میلے پر دیکھا میں نے اس کو......“ شانو املی کھانے کا سا چٹخارہ لیتے ہوئے بولی......

”ہاں چودھرائن جی...... اس وڈے کمہار نے

کیا بنایا ہے اسے...... اور پھر کیا میٹھے آوے میں پکایا ہے۔ نہ وہ کچا نہ کٹ پکا...... " ملازمہ بھی بولی جس کے ساتھ ہی شانو میلے پڑ گئی تھی۔

چودھرائن پتہ نہیں سانس کو اندر کھینچ رہی تھی یا باہر کر رہی تھی۔ سن کر وہ ایسے ساکت و جامد ہو گئی۔ جیسے پہاڑ سے تراشی ہوئی ہو۔

جو ماضی میں سوچا تھا اسے یاد بھی نہ کر سکی۔ جو ذہن میں آیا اس کے زیر اثر اس کی آنکھیں عجیب صورت اختیار کر گئیں۔ شانو سے کچھ نہ کہہ سکی اور چپ کر گئی۔ مخملی پوٹلی پھل پر چڑھانے کے بجائے شاید چودھرائن اپنی آنکھوں پر باندھ بیٹھی تھی۔ نہیں دیکھ رہی تھی کہ پھل پک گیا ہے جو ڈال سے خود نہ اتارا تو نیچے گر جائے گا۔

اچھا ہوتا جو چودھرائن اسے کچھ کہہ دیتی...... سمجھا دیتی کہ بعض طوفانوں کو دور سے بھی نہیں دیکھتے کہ ان کی وحشت پتھر کا کر دیتی ہے۔ تیز ہوا کی چماٹ کھانے کا کیا فائدہ بھلا......؟

جو بات چودھرائن اب سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ شانو کر گزری......

دوسری ملاقات کب ہوئی، تیسری کب ہوئی، کچھ خبر نہ ہو سکی...... خبر تب ہوئی جب شانو "چپ" اور "چارپائی" دونوں سے جا لگی

وہ بیمار بھی ہو سکتی ہے' چودھرائن نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ ایسے میں جبکہ وہ چارپائی سے جا لگی تھی فکر مند کیوں نہ ہوتی...... ملازمہ نے ہی پھر اپنے لب کھولے۔ چودھرائن کانپ کانپ گئی۔ اسے وہ وقت یاد آ گیا جب اس کا شوہر، شانو کا باپ...... پروین اور اس کے شوہر کے خلاف بولا کرتا تھا۔ کچھ تو اس جنم جلی شانو نے بھی سنا ہوتا......

"کیا کر لیا تو نے شانو...... یہ کیا کر لیا تو نے؟"

چودھرائن نے اس کے پاس جا کر دہائی دی شانو کو خود بھی اندازہ تھا کہ اس نے جنگلی چھوٹی مکھیوں کے کھگے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ بھائیوں کے ہتھیار دیکھتے دیکھتے وہ یہ کیوں بھول گئی کہ یہ ہتھیار بھائیوں نے نمائش کے لیے نہیں رکھے ہوئے۔ وہ ان کو اس فخر سے چلاتے ہیں جن میں لڑکیاں اٹھا لینے جیسا گھمنڈ ہوتا ہے۔

"بول شانو...... کیوں دشمنوں کے گھر اُن کا دودھ گرا آئی ہے۔ میرا تو پلو خراب ہو جائے گا صاف کرتے کرتے۔"

"میں تو خود نہ جان سکی ماں کہ یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ پر تجھے تو کوئی واسطہ نہیں دیتی پھر تو کیوں ہلکان ہوتی ہے۔ چند دنوں کا تاپ ہی سمجھ لے۔"

پر محبت بخار تھوڑی تھا جو چڑھتا اور پھر اتر جاتا...... محبت تو وہ جان لیوا زہر ہے جس کا تریاق ہو بھی جائے تو جسم میں کہیں نہ کہیں موجود رہتا ہے۔

آہستہ آہستہ بات سارے گھر میں پھیل گئی۔ بہت سے دن تو موسمی بخار کا بہانہ کرتے گزرے۔ پھر رفتہ رفتہ گندم کے گھن تک سب ہی جا پہنچے۔ پانچوں بھائیوں نے ماں کی خبر لی......

"کون ہے وہ......؟" پانچوں کی بھڑک فائر کی طرح گونجی۔

چودھرائن اور گونگی ہو گئی۔ کیا بولتی...... جھوٹ وہ بول نہ سکتی تھی اور سچ بتانے کی ہمت خوف کے آٹے میں گھل مل گئی تھی۔ چودھرائن تندور کی راکھ کی مانند ہی تو ہو چکی تھی۔ جس میں نہ اب تپش تھی اور نہ ہی چنگاری۔

"اکرم...... پروین کا پتر......" بڑی دیر جیسے سالوں بعد چودھرائن نے کہا۔ پانچوں نے سنا، ایک دوجے کو دیکھا، آنکھیں چڑھیں، نتھنے پھولے، ماتھے غصے سے تیورا گئے اور پھر سب ہی خاموش ہو گئے۔

جیسے اندر ہی اندر کوئی فیصلہ ہو گیا ہو۔

"ٹھیک ہے۔ ختم کر دیتے ہیں اسے...... پتا نہیں کتنے کمیوں کے بدلے ابھی باقی ہیں۔" سب سے بڑا شیراز اپنی بندوق زمین پر مار کر بولا۔ جیسے اب فیصلہ ہو گیا ہو اور کوئی اس پر اعتراض کرنے کی

اہلیت نہ رکھتا ہو۔

''نہیں وڈے چودھری نہیں...... ایسا نہیں کرنا...... دشمنی ختم ہو چکی ہے۔ ناراضی چاہیے صدیوں چلے......''

چودھرائن نے رعب اور بڑے پن سے شیراز سے کہا...... بیوہ ہو جانے کے بعد سے وہ اپنے بڑے بیٹے کو ہی وڈا چودھری کہتی تھی۔

''ناں تو پھر کیا کرنا ہے۔ رشتہ کرے گی تو وہاں''؟ وہ غصے سے چلایا۔

''میں شانو کو سمجھا دوں گی۔'' چودھرائن بے بسی سے بولی...... اسے پتہ تھا شانو کو سمجھانے سے وہ اپنی تقدیر کا جبر تو سہہ لے گی لیکن صبر نہیں کر سکے گی۔

''تا یہ جرات اکرم نے کر کیسے لی۔؟'' وڈا چودھری مونچھوں کو مروڑ دیتے ہوئے بولا...... اس سے آج تک کوئی شکار نہیں بچ سکا تھا۔ وہ نشانہ لگانے کا بہت ماہر تھا۔ اب اس کے گھر پر کسی نے نشانہ لگایا تھا وہ تاؤ کیسے نہ کھاتا۔

''تجھے سمجھایا بھی تھا اماں کہ اب وہ جوان ہو گئی ہے۔ نگاہ رکھ اس پر...... پر تجھے تو اس کے جوان ہونے کی کچھ خبر ہی چاہیے تھی ناں......'' وڈے چودھری سے چھوٹے والا غصے سے بولتا چلا گیا۔

''اسے کہہ بھول جائے اسے......'' تیسرے والے نے بھی ہانک لگائی۔

''زندہ دیکھنا چاہتی ہے تو دوبارہ نام بھی نہ لے اس کا......'' چوتھا بولا۔

''اکرم کو تو ہم نبڑ لیں گے۔'' سب سے چھوٹے والا کیوں چپ رہتا......

چودھرائن بے چاری حویلی میں ابھی ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ اس کی ساری زندگی گاؤں کی لڑکیوں کی شادیاں کرواتے، ان کے داج بناتے، ان کی ماؤں کے مسئلے سلجھاتے گزری تھی۔ یہ سیدھی سادی کٹھ پتلی سمجھ ہی نہ سکی کہ بیٹوں کے غصے کے پس پردہ کیا ہے۔ بھائیوں کو اکرم سے رشتے داری کرنے میں کچھ ایسی بھی خار نہیں تھی۔ جتنی تپ انہیں جائیداد کے بٹوارے کی چڑھی تھی۔ جو شانو بڑی ہوئی تھی تو وہ کون سا چھوٹے رہ گئے تھے۔ ان کا باپ باری کے پانی پر لڑا تھا اور ایسا لڑا تھا کہ ابھی تک گاؤں کے کتنے ہی گھر یتیم اور بناولی کے زندگی گزار رہے تھے۔

ان کی رگوں میں اسی باپ کا خون تھا۔ وہ اب قطرے قطرے پر بھی لڑنے لگے تھے۔ مربعوں میں مربعے ملاتے وہ اب مرلوں سے بھی دل ہار بیٹھے تھے۔

پانچوں باری کے پانی پر بڑی بڑی لڑائیاں لڑ بھی چکے تھے۔ جائیداد کے بٹوارے پر تو وہ سب جنگیں بھی لڑ سکتے تھے۔

''اور اب سمجھا دینا اسے کہ حویلی کی بات گاؤں میں نہ پھیلے...... ملازموں کے بھی منہ بند کر دینا......''

چودھرائن نے شانو کو سمجھا دیا۔ سب کے منہ بند کر دیے۔ لیکن پھر بھی بات پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ اکرم اور شانو...... دو نام کپاس کے روئیں کی طرح چاروں طرف پھٹ گئے۔

پرانی روئی دھنکی گئی...... ان پر نئے استر چڑھے۔

لیکن شانو چارپائی سے نہ اٹھ سکی...... چودھرائن نے دودھ پیا ہے کہ نہیں اسے کوئی پرواہ نہیں...... بھائیوں کے کام کون کر رہا ہے، کیسے کر رہا ہے۔؟ وہ ہر چیز سے غافل ہو گئی۔

''کیا تجھے اسی لیے جنم دیا تھا میں نے شانو۔ میرے درد زہ کی تکلیف کا یہ بدل دے رہی ہے تو مجھے......؟؟'' مجبور ماں بیٹی کے آگے اپنی اس تکلیف کی آڑ بنا کر کھڑی تھی جو دنیا کی ساری مائیں ہی جھیلتی ہیں۔ نہ جھیلی جھیلنے کے لیے دن رات اللہ سے دعائیں مانگتی ہیں۔

''خاموشی سے درد ہی تو برداشت کرتی جاتی ہوں اماں...... کیا تجھ سے کوئی شکوہ کیا کہ مجھے وہ لا دے......؟ بھائیوں سے زیادہ عزیز نہیں ہے وہ مجھے۔''

''پھر چارپائی سے کیوں لگتی جاتی ہے بدبختے۔''

''کیا کروں اماں...... دل کو لگی ہے۔ چارپائی کو تو لگنا ہی ہے ناں......''

''کچھ سوچ لیں چودھرائن جی...... کہیں۔ کہیں

قبر کو ہی نہ جا لگے۔" کسی ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ چودھرائن اس کا منہ نوچ لیتی جو وہ خود بھی یہ ہی نہ دیکھ رہی ہوتی تو۔

"کچھ اُپائے کرو وڈے چودھری...... وہ منہ سے تو کچھ نہیں کہتی مگر اندر ہی اندر مری جاتی ہے۔"

وڈے چودھری نے حسب عادت مونچھوں کو مروڑا دیا۔ نظریں دور کسی غیر مرئی چیز پر ایسے گاڑیں جیسے وہ اکثر اپنے اس شکار کو دیکھا کرتا تھا جس پر اس نے فائر کرنا ہوتا تھا۔

"دصلح کر لیتے ہیں اماں! پھر ہم ان لوگوں سے" شیراز نے کہا۔ چودھرائن حیرت سے وڈے چودھری کو دیکھنے لگی۔

"او کر لیتے ہیں رشتے داری پھر...... سکون ہو جائے گا۔ گاؤں میں بھی...... تجھے بھی اور تیری بیٹی کو بھی......" شیراز نے ہلکا سا مسکرا کر کہا۔ چودھرائن نہ سمجھ سکی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو اپنی ہم نسل بیٹی کو نہ جان سکی تھی۔ مخالف جنس کے ارادے کیسے جانتی۔

☆☆☆

دونوں سہیلیاں ایک دوجے کے گلے لگ کر اتنا روئیں اتنا روئیں کہ پورا گاؤں ہی رو پڑا۔ نئی رشتے داری، سچے آنسوؤں کی بلی چڑھا کر شروع کی گئی۔ اکرم سوہنا نکلے گا چودھرائن جانتی تھی۔ پر وہ ایسا شہزادہ روپ ہو گا چودھرائن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اور اب تو یہ شہزادہ اس کی شہزادی کا ساتھی تھا۔ اسے اچھا کیسے نہ لگتا۔

جس دن نیچے بڑے کمرے میں منگنی کی تقریب ہو رہی تھی۔ اور شانو لجائی لجائی اپنے ہونے والی ساس کے ہاتھوں انگوٹھی پہن رہی تھی۔ اسی وقت چھت پر پانچوں بھائی اپنی اپنی بندوقوں کی نال دیکھتے ہوئے جوڑ توڑ کرنے میں مصروف تھے۔

اکرم سے رشتے داری صرف یہ ہی سوچ کر کی گئی تھی کہ جس کی محبت میں چار پائی سے جا لگی ہے اس کی موت پر تو قبر سے ہی جا لگے گی۔ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی اور ناگن بھی مر جائے گی۔

"نا اب کیا کرنا ہے۔"

"شیرازے...... جو کرنا ہے جلدی کر...... شادی کروا کر مربعے منتقل کروا کر کچھ کرے گا کیا......؟"

"کرنا کیا ہے۔ وڈ دیتے ہیں یا وڈ وا دیتے ہیں۔" ماہر نشانے باز کے پاس ایک ہی حل تھا۔

"اتنا آسان نہیں ہے شیرازے وڈ دینا۔ اب ابا جی والا زمانہ نہیں رہا۔ کمی بھی اتنے وفادار نہیں رہے۔ خون کا چھپ جانا بڑا اوکھا ہے شیرازے......" دوجے والا بولا۔

"شکار پر لے چلتے ہیں۔ کہیں گے سانپ نے وڈ لیا ہے۔"

"نہ جنگل میں اتنے کون سے زہریلے سانپ آ گئے جو جان لے لیں۔ پھر جسم نیلا کون کرے گا۔ بال کون جھاڑے گا۔ تب ہی تو یقین کرے گا نا کوئی کہ ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔" تیجے والے کو غصہ آیا۔

"میلے پر لے جاتے ہیں۔ راستے میں جو کنواں آتا ہے، وہاں مار کر گرا دیں گے کہیں گے کہ پاؤں پھسلا اور یہ نیچے گر گیا۔"

"وہ کنواں سوکھا پڑا ہے۔ سب جانتے ہیں۔ کوئی پانی لینے کیوں جھکے گا وہاں پر......" یہ چوتھے کی آواز تھی۔

"بے ہوش کر کے گھوڑے میں نال پھنسا کر گھوڑے کو چابک دکھا دیتے ہیں۔"

"سارا گاؤں جانتا ہے کہ اکرم وحشی گھوڑے کو بھی ایک دبکے سے قابو میں کر لیتا ہے۔ میں کہتا ہوں سارا شک ہم پر جائے گا۔"

"پھر؟......" شیراز اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بندوق کو دائیں کندھے سے بائیں پر منتقل کیا۔ آنکھوں میں آگ سی جل رہی تھی۔ "پھر اسے اپنا بیلی بنا لیتے ہیں۔"

"ناں...... اس سے کیا ہو گا۔؟" باقی چاروں بھڑکے۔

"وہ مجھ پر چھوڑ دو......" شیرازے نے غرور سے کہا۔ اور بالکل ٹھیک کہا۔

منگنی کی رات پانچوں بھائیوں اور ان کے نئے بیلی اکرم نے ایک ساتھ نئی رشتے داری کا جشن منایا۔ سارے گاؤں کے مردوں نے دیکھا کہ یاور کے پانچوں بیٹے کیسے اپنے جوائی کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ کیسے اس کی سیوا کر رہے تھے۔ سب سے نکی بہن کے ہونے والے شوہر سے ایسے ہنسی ٹھٹھول کر رہے تھے کہ شرم کی ساری حدیں ہی پار ہو گئی تھیں۔

بڑوں نے کہا جوائی سے پیار ہو تو بس ایسا......"

صبح تک اکرم سمیت سات آٹھ کمیوں کی لاشیں بھی ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور پورا گاؤں باؤلا ہو گیا تھا۔

شیرازے نے خود اکرم کے جنازے سے پہلے پہلے کالونائی کو پورے گاؤں کے سامنے گاؤں بدر کیا تھا۔ جس نے ایسی زہریلی شراب بنائی تھی کہ اس نے گاؤں کے آٹھ ہٹے کٹے مردوں کی جان ہی لے لی تھی۔ کالونائی ہاتھ جوڑ تا رہ گیا کہ شراب زہریلی نہیں تھی۔ اس نے خود بھی پی ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ سب سے پہلے مرتا۔ لیکن شیرازے نے اس کی ایک نہ سُنی......کالونائی کو گاؤں بدر کرنے کے باوجود بھی خود شیرازے کے آنسو نہ رکتے تھے۔

شانو اتنا روئی اتنا روئی کہ خود اکرم کی ماں اپنا رونا بھول گئی۔ نامحرم ہونے کے باوجود وہ میت سے ایسی لپٹ لپٹ گئی کہ پورا گاؤں مشترکہ طور پر آنسو بہانے لگا۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ ایسی چپ جیسے زندگی میں ایک لفظ بھی نہ بولا ہو اور نہ ہی اب بول سکتی ہو۔ جیسے قُدرت نے اسے بولنے کی قوت دی ہی نہ ہو یا چھین لی ہو......

چودھرائن کو دہرے غم آ لگے۔ اس کی سہیلی کا بیٹا مرا، اس کی بیٹی کا ہونے والا شوہر مرا، اس کا داماد مرا...... اتنے غموں کو سہتے سہتے وہ دنوں میں ہی بوڑھی ہو گئی۔

"قدرت کو منظور نہیں تھی نا یہ نسبت چودھرائن جی...... دیکھ لو صلح بھی ہو گئی پر بات نہ چل سکی......"

چودھرائن کی چپ تب ٹوٹی جب اسے لگا شانو اب کبھی نہیں سنبھل سکے گی۔

"کوئی ایا یئے کر وڈے چودھری......"

"خود ہی ٹھیک ہو جائے گی اماں......" وڈے چودھری نے ایسے کہا جیسے کمیوں کو جوتی پہنانے کا کہتا تھا۔ "اس کا منگیتر نہیں مرا......اس کا شوہر مرا ہے۔ عدت پوری کرے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

خود شیراز خلاؤں میں دیکھنے لگا کہ عدت پوری ہونے سے پہلے ہی مر جائے گی۔ یعنی پھر سے کفن دفن کا گنج وج کے انتظام کرنا پڑے گا۔ اور ہوا بھی تقریباً تقریباً ایسا ہی......لیکن تھوڑی دیر سے......اس کی موت کا انتظار بھائیوں پر بڑا طویل ثابت ہوا......

چودھرائن تسبیح کے دانے سے جڑے دن بڑی مشکل سے پار کرتی رہی......عدت پر عدتیں پوری ہوئیں لیکن شانو ٹھیک نہ ہوئی۔ لاکھ سمجھایا لیکن وہ کھجور کے پتے کی طرح سخت ہوتی گئی۔ چودھرائن نے کوئی حکیم نہ چھوڑا۔ کوئی دوائی جو اسے کہی گئی وہ سرحد پار سے بھی منگواتی رہی۔ لیکن شانو نے کسی دوائی کا اثر قبول کیا نہ دعا کا۔

"قسمت میں یہ ہی تھا شانو......نہ لڑ قسمت سے۔"

"قسمت سے کون لڑ رہا ہے اماں......اللہ کی امانت تھی اس نے لے لی......مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ جو پل اس کی یاد میں گزرے وہ کافی ہیں۔"

"پھر میری جان لینے پر کیوں تلی ہے......"

"اپنی جان اپنے بس میں نہیں رہی اماں! تیری کی کیا پرواہ کروں۔"

شیراز خوش تھا کہ بس تھوڑی دیر کی ہی بات ہے۔ شانو کے ساتھ ساتھ ساری فکریں بھی قبر میں چلی جائیں گی۔

لیکن پھر......ایک عجیب بات ہو گئی۔ پانچوں بھائیوں کی آس پر پانی پھر گیا۔

جاہ و جلال والی حویلی کے بڑے بوسیدہ پھاٹک پر ایک پُرنور چہرے والا بابا آ گیا۔ حق ہو کرتا، ہاتھ میں پکڑی اپنی ڈانگ کھڑکاتا ہوا۔

چودھرائن تو آگے ہی ایسے بابوں کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ فوراً ملازمہ کو باہر بھیج کر پرات بھر آٹا بھجوایا......پر

بابا جی نے آٹا لینے سے انکار کر دیا اور بولے۔
"گھر کے اندر جا کر دعا کرنی ہے۔"
ملازمہ نے پوری بات تو نہ بتائی۔ بس اتنا بتا دیا کہ بابا جی نے آٹا لینے سے انکار کر دیا ہے۔
چودھرائن شتابی سے باہر نکلی...... کہ سوالی خالی ہاتھ ہی نہ لوٹ جائے۔ اس کی پوری زندگی میں تو ایسا ہوا نہ تھا کہ کوئی سوالی خالی ہاتھ لوٹے۔ بابا جی سے ان کی غرض پوچھی......
"دعا کرنی ہے۔" بابا جی بولے
"کس کے لیے بابا جی......؟" چودھرائن نہ سمجھی۔
"وہ جو بیمار ہے۔" بابا جی بولے۔ چودھرائن ہکا بکا ان کی صورت دیکھنے لگی۔
"دھی رانی کیسی ہے۔؟" بابا جی نے دہلیز پار کرتے ہوئے پوچھا۔ چودھرائن فوراً ان کے قدموں میں گری۔
"کوئی حل نکالیے بابا جی...... ایک ہی ایک دھی ہے میری...... اکرم مر گیا۔ اس کے مرنے کا دکھ کسے نہیں۔ مگر اس نے تو روگ لے لیا ہے۔"
بابا جی چودھرائن کی تقلید میں چلتے ہوئے شانو کے پاس آئے۔ چودھرائن نے جھٹ موڑھا کرسی قریب کی لیکن بابا جی شانو کے قریب ہی چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھ گئے۔
سب کو باہر بھیجا، سر پر ہاتھ رکھا، سمجھایا، بتایا کہ مرے ہوئے کا سوگ تین دن سے زیادہ مناؤ تو اپنے آپ ہی اللہ کے پاس شکوہ پہنچ جاتا ہے۔ شانو سنتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ مروارید کی تسبیح کے دانے گھماتے بابا جی نے لمبے لمبے وعظ کیے۔ چودھرائن اتنے میں نجانے کیا کیا بابا جی کو پیش کرنے کی تیاری کر چکی تھی۔
لیکن بابا جی نے کھانے کا ایک لقمہ بھی منہ کے اندر نہیں کیا۔ دھیلا پیسہ، کپڑا لتا کچھ بھی نہ لیا۔
"یہ جو تو پیسے مجھے دے رہی ہے یہ شانو کے سر سے وار کر خیرات کر دیے۔ اللہ شفا دے گا۔" چودھرائن رونے لگی۔

جاتے جاتے بابا جی نے اپنے گلے کی مالا کا موتی نکال کر چودھرائن کو دیا۔
"کوئی درخت ہے حویلی میں......؟"
"بہت سے ہیں بابا جی...... بکائن، سفیدا، کٹھل......"
"نہیں...... کوئی پھل دار......؟"
"ہاں...... ہے بابا جی...... انار کا درخت ہے۔"
جھکڑ سے چلے اور یہ بات انار کے درخت تک بھی پہنچا گئے جو کہ اب ٹنڈ منڈ ہو چکا ہے۔ مڑ تڑ گیا ہے، بھدا، کالا سیاہ سا ہو گیا ہے...... جس کی بھر کس نکلی سوکھی شاخیں پرانی دیوار کی اندرونی دراڑوں کا ہی حصہ لگتی ہیں۔
بابا جی نے گہرا سانس بھرا۔
"بیٹیاں بھی انار کی کلیاں ہی تو ہوتی ہیں۔ نازک، کچے رنگوں والی...... ایسے ہی تو نہیں پرانے زمانے میں لوگ ان پر کپڑے کی تھیلیاں بنا کر باندھ کر انہیں پکایا کرتے تھے۔"
بابا جی نے توقف کیا۔ "اس موتی کو اس انار کی جڑ میں دبا دے۔ اللہ کے فضل سے جوں جوں انار سوکھتا جائے گا ویسے ویسے تیری دھی بھلی چنگی ہوتی جائے گی۔ یہ چرند پرند، درخت پودے انسانوں کی خدمت کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔ جب خیر سے بھلی چنگی ہو جائے تو اس کی شادی کر دینا...... انکار نہیں کرے گی۔ میں نے سمجھا دیا ہے۔"
یہ کہہ کر بابا جی حویلی سے نکل گئے اور ان کے جانے کے بعد بہت سی کہانیاں ان سے منسوب ہو گئیں۔
کچھ نے کہا "بابا جی نے گاؤں پار بھی نہ کیا تھا کہ غائب ہو گئے۔"
کچھ نے کہا۔ "بابا جی کے ساتھ ساتھ کوئی روشن چیز چل رہی تھی۔"
کچھ کا خیال تھا کہ وہ خوشبو آج تک کسی نے کہیں نہیں سونگھی جو بابا جی کے گاؤں میں داخل ہونے پر ان کے ساتھ آئی تھی۔
پتا نہیں بابا جی سچے تھے کہ جھوٹے...... اللہ

جانے اللہ کے کچھ معجزے اس کے کن کن نیک بندوں کے سہارے ہوتے ہیں۔

نجانے کتنی آیتیں اور کتنے وظیفے پڑھنے کے بعد...... موتی انار کی جڑ میں دبا کر چودھرائن نے سختی سے ملازموں کو تاکید کر دی کہ خبردار کوئی انار کو پانی نہ ڈالے۔ جوں جوں اس نے سوکھنا ہے توں توں شانو نے ٹھیک ہونا ہے۔

ممتا کی ماری نادان ماں نہیں جانتی تھی کہ جس درخت نے زندہ رہنا ہو، وہ تو صحرا میں بھی سو سال جی جاتا ہے۔ چودھرائن پانی ڈالے یا نہ...... انار کی قسمت میں جیسے اب سوکھنا لکھا جا چکا تھا۔

پورا گاؤں اپنی آنکھوں کے آگے معجزہ دیکھ رہا تھا۔ جوں جوں انار سوکھ رہا تھا۔ توں توں شانو بھلی چنگی ہو رہی تھی۔ چوتھے دن جب شانو نے اپنے منہ سے دودھ مانگا تو چودھرائن نے پورے گاؤں میں لڈو بانٹے۔ خوشی سے باؤلی ہوئی تھی چودھرائن اس دن......

''لے وڈے چودھری...... منہ مٹھا کر...... بہن بھلی چنگی ہو رہی ہے۔'' چودھرائن نے شیراز کے منہ میں لڈو ٹھونسا اور باری باری سب بھائیوں کے منہ میں جو ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

مہینے بھر بعد چودھرائن نے داج کے بستر پھر سے نکال لیے۔ برتن آ رہے ہیں۔ سامان بن رہا ہے۔ کپڑا لتا زیور...... سب تیاریاں پھر سے شروع ہیں۔

''یہ سب کیا ہے اماں......؟'' وڈے چودھری کی شہ رگ پر جیسے کسی نے ہاتھ ڈالا تھا یا شاید خنجر ہی تو رکھا تھا۔

''بابا جی نے کہا تھا کہ جیسے ہی بھلی چنگی ہو اس کی شادی کر دینا۔'' سیدھی سادی ماں نے سادہ سا جواب دیا۔

اگلے دن انار پورے کا پورا گنجا تھا۔ سارے پتے اتر چکے تھے۔ ٹہنیوں کی مضبوطی تھی بس...... اور شانو بھلی چنگی ہو چکی تھی۔ چودھرائن کا دودھ پھر سے دیکھنے لگی تھی۔ بھائیوں کا حقہ پھر سے بھرنے لگی تھی۔ فراٹے نہ سہی...... لیکن حویلی میں چھلانگیں ضرور مارنے لگی تھی۔

''ناں اب کس کو مارنا ہے۔ ماں تو اس کے بیاہ کی تیاری کرنے لگی ہے۔'' پانچوں پھر سے سر جوڑے کھڑے تھے۔

''کس کس کو ماریں گے ہم......؟''

''سیانے کہتے ہیں کہ فساد کو نہ ختم کرو۔'' شیراز پھر کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

''تو......؟؟'' چاروں یک زبان بولے۔

''فساد کی جڑ کو ختم کرو۔'' شیراز نے کہا۔ اور حقے کی گڑ گڑ خوف زدہ ہو کر چلم کے اندر ہی کہیں دب گئی۔

اگلے دن وہ ایک تعویذ لے آیا...... تعویذ لا کر شانو کے ہاتھ میں رکھا۔

''لے اسے پانی میں ڈال کے پی لے شانو!'' اور اتنے پیار سے کہا کہ اگر وہ زہر بھی شانو کے آگے کرتا تو شانو وہ بھی بلا چوں و چرا پی جاتی......

''یہ کیا ہے وڈے چودھری......؟'' چودھرائن بھی وہاں آئی۔

''اماں! وہی بابا جی ملے تھے...... دوجے گاؤں انہوں نے کہا ہے کہ یہ تعویذ شانو کو عشاء کے وقت پلا دو۔ اچھا رشتہ ملے گا۔''

چودھرائن جھٹ پانی سے بھرا گلاس لے آئی اور جلدی سے شانو کو پلانے لگی جیسے دیر کی تو بابا جی کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔

عشاء کے وقت شانو نے تعویذ پیا...... فجر کے وقت اس کے منہ سے جھاگ نکلے اور وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔

چودھرائن ایسے پتھر ہوئی جیسے اب کبھی پگھل سکے گی نہ ہی ٹوٹ سکے گی۔

بھائیوں نے شانو کی میت، کفن دفن کا انتظام اتنا اعلا کیا کہ گاؤں والوں کو لگا کہ بھائی برسوں سے اس میت کی تیاری کر رہے تھے۔

شانو کو اکرام کے ساتھ دفن کیا گیا۔

''ہائے ربا...... یہ کیا ہو گیا میرے ساتھ۔؟''

چودھرائن چلاتی ہی رہ گئی...... بابا جی کو اتنی گالیاں

دیں۔ اتنا برا بھلا کہا کہ سننے والوں نے کانوں میں انگلیاں دبا لیں۔ کوئی اس کی اس دہائی کا جواب دینے کو آگے نہ بڑھا...... کسی کے پاس کوئی جواب تھا ہی کب۔

دن سونی آغوش بن گئے اور راتیں بانجھ ہو گئیں۔ راتوں کے پاس دن کی آغوش میں ڈالنے کو کچھ باقی نہ رہا......

انار جو سوکھ رہا تھا سوکھا ہی رہا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اب وہ پھر سے ہرا بھرا ہو جاتا۔ ایک جیتے جاگتے بندے کو اپنی کھاد بنالیا تھا اس نے...... لیکن دوبارہ پھر کبھی اس پر پھول تو کیا۔ پتیاں بھی نہ اُگ سکیں۔

☆☆☆

چودھرائن کے لیے کوئی خوشی خوشی نہ رہی۔ پانچوں بیٹوں کی شادیاں ہوئیں۔ ان کے بچے ہوئے۔ لیکن چودھرائن کے چہرے پر کبھی سچی خوشی نہ پھوٹ سکی۔ ساری زندگی وہ اسی سوال کی جمع، تفریق، ضرب، تقسیم کرتی رہی کہ قدرت نے اس کے ساتھ کون سا کھیل کھیلا ہے۔ اس کی خوشی کو کس کی نظر لگی ہے۔ جب شانو بھلی چنگی بھی ہو گئی تھی تو اس ایک تعویذ میں ایسا کیا تھا جو وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔

اپنے ہی دکھ میں جلتی چودھرائن نے باقی ساری زندگی کڑھتے ہوئے ہی گزار دی۔ کبھی وہ انار کے درخت کو دیکھتی اور سوچتی یہ اب کیوں نہیں ہرا بھرا ہوتا۔ اب اسے کیا چاہیے۔ خود چودھرائن بھی تو اسی انار کی طرح ماس بوٹی جھاڑتی کملا گئی تھی۔ تیس برس بیت گئے۔ پورا گاؤں اور اس گھر کے مکین بھی بھول گئے کہ اس گھر میں ایک لڑکی شانو نام کی بھی ہوا کرتی تھی۔ اور ایک درخت انار کا کہ جس کے پھل انہوں نے کبھی چکھے تھے۔ سوائے چودھرائن کے...... اسے آج بھی ایک ایک بات اس طرح یاد تھی جیسے آج صبح کی ہی بات...... پر اب اس سب کا کیا فائدہ تھا بھلا...... ماسوائے اذیت کے...... اب تو ان باتوں کو سالوں گزر چکے تھے۔ اس وقت کی تو کہاوتیں بھی دم توڑ گئیں۔ کوے مرکھپ گئے...... اس وقت کا تو بان بھی جل گیا اپنے تمام تر بلوں سمیت......

پانچوں بیٹوں نے کبھی نہ سوچا کہ بوڑھی ماں کون سے الاؤ کے گرد بیٹھی دھواں نگلتی کھانستی ہے۔ ان کی اپنی اپنی زندگیاں خوب پنپ رہی تھیں۔ سب کے بچے جوان ہو چکے تھے۔ وہ اپنے اپنے خاندانوں میں مصروف تھے۔ ان کے بیاہ کی فکریں کرنے لگے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ چودھرائن ان کی خوشیوں میں شریک نہیں ہوتی تھی۔ بس ایک دل ہی تو تھا نا جو خوشی میں خوش ہونا بھول گیا تھا۔

شیراز کے بیٹے کی منگنی تھی۔ چودھرائن نے شانو کے داج کا بنا سارا زیور اس کی ہونے والی بیوی کو چڑھا دیا تھا۔ ایک بوجھ تھا جس سے وہ ہلکی ہو گئی تھی۔

منگنی سے ٹھیک ایک رات پہلے وہی بابا جی اس کے خواب میں آئے تھے۔ چودھرائن نے ان سے شکوہ کیا تھا کہ انہوں نے کیوں ایسا تعویذ دیا جس نے بھلی چنگی ہوتی شانو کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ بابا جی آگے سے مسکرا دیے تھے۔

"شانو کی ہی ماں نکلی ناں تو بھی...... مرے ہوئے کا سوگ تین دن سے بھی زیادہ بلکہ تیس سال سے بھی زیادہ منایا تو نے...... تو تو اسے روکتی تھی ایسے سوگ سے......"

"نہ اسے قرار آتا تھا نہ ہی مجھے آتا ہے۔"

"اس کی یادوں کو سینے سے لگا لیکن اس کی یاد دلانے والی چیزوں کو خیرات کر دے۔ اللہ سکون دے گا۔"

اور چودھرائن کو ویسے تو بابا جی سے لاکھ نفرت ہو چکی تھی لیکن پتا نہیں کیا بات ہوئی اس نے ان کا کہا مان لیا۔ اگلے دن صبح ہی اٹھ کر چودھرائن نے شانو کی یاد دلانے والی ساری چیزیں خیرات کر دیں۔ زیور کپڑا لتا بانٹ دیا اور توقع کے برخلاف اسے سکون ہی ملا۔ جیسا بابا جی نے کہا تھا۔ تیس سال بعد چودھرائن نے جیسے نیا جنم لیا۔

☆☆☆

شیراز کے بیٹے اسلم کی شادی کی تیاریاں چودھرائن

نے ایسے کیں۔ جیسے تیس سال پہلے شانو کی شادی کی کی تھیں۔ پوری حویلی میں بچی خوشی پھیل گئی۔ کہ اچانک......

اسلم کے تین سالے ایک دن حویلی کے دروازے تک آئے...... سر جھکائے...... ان کے جھکے سروں میں سلطنت لٹ جانے کا سا غم تھا۔

''کیا ہوا......؟'' شیراز جو کسی سے پیر دبوا رہا تھا ،اچانک اٹھ کھڑا ہوا...... پتا نہیں کیا ہوا کہ ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی نجانے کیوں شیرازہ ہذیان بکنے لگا تھا۔

''میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا؟ اسلم کہاں ہے۔؟ تمہارے ساتھ شکار پر گیا تھا ناں......؟''

''اسلم...... اسلم......'' تینوں میں سے کسی ایک نے بولنے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں...... کہاں ہے اسلم......؟'' شیراز نے اسے گریبان سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑتے ہوئے اتنی گرج دار آواز میں پوچھا کہ ہوا بھی ایک لمحے کو رک گئی۔

''اسلم...... کنویں میں گر گیا۔ اس کا پاؤں پھسل گیا تھا'' ایک منمنایا۔

شیراز ان کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے کسی بھوت کو دیکھ رہا ہو...... ہزاروں آندھیاں ایک ساتھ چلیں اور گاؤں کے سارے درختوں کو اکھاڑ لے گئیں۔ دھوپ سے گاؤں کی زمین تپنے لگی اور شیراز کا بدن جلنے لگا۔

''راستے میں کنواں کہاں......؟'' اس کی آواز کہیں سناٹے سے آئی...... اس آواز کو بمشکل ہی سنا جا سکتا تھا۔

''چل کر دیکھ لو......'' دوجا جلدی سے بولا۔

''ابھی نیا ہی کھدا ہے۔''

''ہاں...... مہینہ پہلے......'' یہ تیسرے کی آواز تھی۔

''مہینہ پہلے......؟'' وڈا چودھری ایک دم سے بہت چھوٹا، بہت ہی چھوٹا ہو گیا تھا۔ ''مہینہ پہلے...... جس دن اسلم کی منگنی تھی۔ ہے ناں......؟ اس دن کنویں کو کھدوانے کا سوچا ہوگا تم نے......'' وہ جیسے سورج کے پار دیکھتے ہوئے بولا تھا اور کچھ بہت کچھ یاد کرتے ہوئے بھی۔

''کیا...... کیا بات کر رہے ہو چچا......'' پہلا ہکلاتا ہوا بولا تھا۔ گھر کی عورتیں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ کسی انہونی کے پیش نظر ان کے چہرے بھوبھل کی مانند ہو رہے تھے۔

''یہ بھی سوچا ہوگا کہ اسے شکار پر لے چلتے ہیں۔ وہاں مار کر کہیں گے کہ سانپ نے کاٹ لیا۔'' شیرازہ جیسے آنکھوں سے اندھا ہو گیا تھا اور بولنے سے گونگا۔ تینوں تھر تھر کانپنے لگے۔

''گھوڑے کے نعل میں پاؤں پھنسانے کا بھی سوچا ہوگا۔ لیکن پورا گاؤں جانتا ہے کہ اسلم تو گھوڑے کو سدھانے کا ماہر ہے۔''

''چچا......!'' تینوں کی مری مری آواز آئی۔ چچا نے گریبان چھوڑا اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔

اسلم کی میت اُٹھ جانے کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ ایک ہی بات چلا رہا تھا۔

''اس آخری تعویذ میں زہر تھا۔ اس آخری تعویذ میں زہر تھا۔ وہ باباجی نے نہیں دیا تھا۔ شانو کو میں نے مارا ہے۔''

چودھرائن لوگوں میں مرگ کے چاول بانٹ رہی تھی۔ بھری پرات جھٹ سے چودھرائن کے ہاتھ سے گری۔ پہلے وہ وڈے چودھری کے سرہانے کے قریب آئی اور پھر یہ بولتے ہوئے کہ ''یہ کیا کیا تو نے وڈے چودھری...... یہ کیا کیا تُو نے......'' اس کی چارپائی کے قریب ہی ڈھے سی گئی۔

اسلم کے مرنے کے بعد وڈا چودھری پورے تین دن تک زندہ رہا۔ تین دن چارپائی پر پڑے پڑے ۔روتے روتے وہ ایک بس ایک ہی بات دہراتا رہا کہ اس آخری تعویذ میں زہر تھا۔ تین دن کے بعد وہ بھی اپنے بیٹے اسلم یا شاید بہن شانو سے جا ملا۔

جاہ جلال والی بڑی حویلی ایسی اجڑی کہ پھر دوبارہ نہ بس سکی۔

اور انار......؟؟

کہتے ہیں جوں جوں وڈا چودھری مرتا جا رہا تھا توں توں انار کا سوکھا درخت پھر سے ہرا بھرا ہوتا جا رہا تھا۔

☆

افشین نعیم

ناولٹ

"سیمی! ذرا کنگھا پکڑا مجھے جلدی سے۔" اماں نے ازار بند نیفے میں ڈالتے ہوئے سیمی کو پکارا۔

سیمی بغیر کچھ کہے چھوٹے کمرے میں گئی اور وہیں سے آواز لگائی۔ "اماں! سنگھار میز پہ نہیں ہے کنگھا۔"

"اری، تو استری کی میز پہ دیکھ لے۔" اماں ازار بند ڈال کر شلوار کو لے کر اسٹور میں گھس گئیں۔

"اماں، وہاں بھی نہیں ہے۔" سیمی نے دوبارہ ہانک لگائی۔

"اری، پوچھ ان کم بخت مڈ حراموں کی فوج سے، کس نے آخری بار کنگھی کی تھی، کس کے ہاتھ ٹوٹ رہے تھے کنگھا جگہ پر رکھتے ہوئے۔" اماں اسٹور سے ہی چلائیں۔

"اماں! کسی کو نہیں پتا۔" سیمی نے ان سب سے پوچھ کر اپنا فرض ادا کر دیا۔

اماں، جو ویسے ہی لیٹ ہو رہی تھیں۔ چیل کی طرح چھوٹے کمرے پر جھپٹیں، جہاں ساری فوج ظفر موج باجماعت بیٹھی فلم دیکھ رہی تھی۔

"او بے غیرتو، بتاتے کیوں نہیں ہو، کس نے کی تھی آخری بار کنگھی۔" اماں ان کے سروں پہ پہنچ کے دہاڑیں، ساتھ ہی ہاتھ سے ٹی وی کا تار کھینچ دیا۔ نکموں کی وہ فوج جس پر اماں کی دہاڑ کا چنداں اثر نہ ہوا تھا۔ ٹی وی کے بند ہونے پر خاصی بے مزہ ہوئی۔

"چل رانی اٹھ تو نے کیا تھا وہ سر کو کنگھا۔ جا دیکھ کر دے اماں کو، گڈو تو تار لگا۔" بلی نے بیٹھے بیٹھے چھوٹے بہن اور بھائی کو حکم دیا۔

رانی بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آئی، بھاگتی ہوئی گئی الماری کے نیچے ہاتھ مار کر کنگھا برآمد کیا اور لا کر اماں کے ہاتھ میں دیا۔ گڈو نے بغیر کسی تاخیر کے حکم پر عمل کیا اور تار لگا دیا۔ اماں کی زبان کو بھی کنگھا ملتے ہی بریک لگ گیا۔ جلدی سے بال کھول کر کنگھی کی۔ برقع پہنا، چپل پاؤں میں اڑسی اور جاتے جاتے تاکید کی۔

"یہ فلم دیکھ کر ٹی وی بند کر دینا دوسری لگا کر نہ بیٹھ جانا۔ بلی! تو فادی کو بھیج کر کوئی دال منگوا کر پکا لینا۔ طاری میرے ساتھ جا رہا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" بیلی نے ٹی وی پر نظریں جمائے جمائے اماں کو تسلی دی۔
اماں طاری کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

اماں اور طاری جا چکے تھے۔ اماں کی خالہ جو کہ اماں ' ابا دونوں کی خالہ تھیں۔ اسپتال میں آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ ابا کا فون آیا تھا۔ سارا خاندان اسپتال میں جمع تھا۔ ابا کسی بڑی مصروفیت میں پھنسے ہوئے تھے۔ سو' اماں کو جانے کا کہہ دیا۔ حالانکہ بیلی نے کہا بھی۔
"اماں؟ تم سے پہلے اگر عزرائیل پہنچ گیا تو تمہارا جانا تو بے کار جائے گا۔ ایک ہی بار جنازے میں منہ دیکھ لینا خالہ کا' پھیرا بچ جائے گا۔"
اور اتنے مفید مشورے کے جواب میں اماں نے وہ بے بھاؤ کی سنائی تھیں بیلی کو کہ اللہ کی پناہ۔
"کم بخت! کچھ خدا کا خوف کر' ہر کسی پہ آنا ہے یہ وقت۔ کل کو تیرے گھر کوئی مرنے لگے گا تو ایسی ہی باتیں کریں گے لوگ۔"
"رہنے دو اماں' مرتی ورتی تو ہیں نہیں تمہاری خالہ۔ صفیہ ممانی پتا نہیں کس آس پر پورا خاندان اکٹھا کر لیتی ہیں۔ کوئی تیسری بار ہو رہا ہے یہ تماشا۔" سونی نے بھی گرہ لگائی۔
"مجھے تو لگتا ہے اماں؟ اس بار اگر خالہ نانی نہ مریں نا تو صفیہ ممانی (خالہ کی بہو) نے خود گلا گھونٹ کے مار دینا ہے ان کو۔"
"او بے غیرتو! چپ ہو جاؤ۔ لگام دو ان گز گز بھر لمبی زبانوں کو۔"
خیر قلق تو اماں کو بھی بہت تھا اس وقت جانے کا۔ یوں تو اماں بہت سوشل خاتون تھیں گھر میں کم کم ہی ٹکتی تھیں۔ پر اس وقت جانا ان کی طبیعت پر خاصا گراں گزر رہا تھا۔ ان کا پسندیدہ ڈراما آنے والا تھا۔ نہ جانے کی صورت میں خاندان بھر کے سامنے نمبر کم ہونے کا امکان تھا۔ سو دل پر پتھر رکھ کر' ڈرامے کی قربانی دے کر اماں نکلی تھیں۔
اماں کے جانے کے بعد سیمی نے رسالہ پڑھنے کا شغل جاری رکھا جو اماں کی پھیلائی ہوئی افراتفری کی وجہ سے وقتی طور پر منقطع ہوا تھا۔ سونی اپنے حسن کی سیوا میں مصروف تھی۔ باقی ماندہ لوگ ذوق و شوق سے فلم کا اختتام دیکھ رہے تھے۔ اور اماں کی ہدایت کے عین مطابق فلم ختم ہونے کے بعد انہوں نے دوسری فلم نہیں لگائی تھی۔ بلکہ ڈراما لگا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

تیئس برس ہو گئے تھے اماں' ابا کی شادی کو۔ ان تیئس سالوں نے ان دونوں کو نو پھول جیسے پیارے پیارے بچے دیے تھے۔ شروع کے پانچ بچے گھر میں دائیوں کے ہاتھوں اور آخر کے چار بچے اسپتال میں پیدا ہوئے تھے۔
سب سے بڑی سیماب زہرہ' جن کو پیار سے سیمی کہا جاتا تھا۔ پھر رباب زہرہ جو کہ پیار سے بیلی کہلائی جاتی تھیں۔ اس کے بعد عمران آفتاب جو کہ گڈو کے نک نیم سے جانے جاتے تھے۔ اس کے بعد رانیہ کنول اور سونیا کنول جو کہ رانی اور سونی پکاری جاتی تھیں۔ یہ تمام لوگ بڑے بچوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ پھر نازیہ جبین اور مریم جبین جو کہ نازو اور میری تھیں۔ سب سے آخر میں فواد آفتاب اور طاہر آفتاب یعنی کہ فادی اور طاری۔ بس ابھی تک اماں' ابا کی ہمت یہیں تک پہنچی تھی۔ خیر! مستقبل کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔
طاری کی پیدائش پر سیمی انیس برس کی تھی' بیلی سترہ اور گڈو پندرہ برس کا۔ طاری کی پیدائش سے یہی کوئی دو' تین ماہ پہلے سیمی کی سہیلی رابعہ کے ہاں بیٹا ہوا تھا اور طاری کی پیدائش پر وہ کچھ ایسے شرمندہ تھی گویا یہ اسی کی غلطی ہو۔
گڈو نے تو باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے سیمی کے

سامنے۔ "سیمی! اللہ کا واسطہ ہے تجھے 'اماں' ابا سے کہہ اب بس کر جائیں۔ میرے دوست مذاق اڑا اڑا کر میرا جینا حرام کر دیں گے۔"

سیمی تو خود اتنی شرمندہ تھی وہ اس نے رابعہ سے ملنا جلنا ہی ختم کر دیا۔ باقی تین بڑیوں کے بھی کچھ اسی قسم کے تاثرات تھے۔ ہاں چھوٹے بہت خوش تھے۔ رہ گئے اماں ابا وہ تو اپنے اس کارنامے پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ خاندان بھر میں مٹھائی تقسیم کی۔ پھر بھی دل کے ارمان پورے نہ ہوئے تو پورے محلے میں مٹھائی بھجوائی۔ اور تو اور اماں کو بستر میں پڑے پڑے سیمی کی دوست رابعہ بھی یاد آ گئی۔

"اے سیمی! پلیٹ میں مٹھائی ڈال کے رابعہ کے گھر بھی بھجوا دے۔ اس نے بھی اپنے بیٹے کی مٹھائی بھجوائی تھی۔"

اس نئے حکم پر سیمی سخت جز بز ہوئی۔ "اماں! اس نے اپنے بیٹے کی مٹھائی بھجوائی تھی۔" بیٹے پر خاصا زور ڈالا تھا سیمی نے۔ انداز کچھ جتاتا ہوا' کچھ شکایتی سا تھا۔ (گویا کہہ رہی ہو اس نے اپنے بیٹے کی مٹھائی بھجوائی' اور میں بھائی کی پیدائش کی خوشیاں مناؤں)۔

اماں نے جواباً" کہا "ہاں تو ہم بھی تو بیٹے کی ہی مٹھائی بھجوا رہے ہیں۔ کون سا بیٹی کی خوشی منا رہے ہیں۔" سیمی تو کچھ بولنے جوگی ہی نہ رہی اس بات پہ۔

بہر حال کچھ بھی تھا۔ آج چار برس گزر گئے تھے طاری کی پیدائش کو اور اماں ابا اسٹاپ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ بات بڑے بچوں کے لیے خاصی اطمینان کا باعث تھی۔

☆ ☆ ☆

آخر جب اماں کے واپس آنے کا خطرہ سر پہ منڈلانے لگا تو بلی کسلمندی سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھی۔ کہ اماں اب کسی وقت بھی آ جاتیں اور کھانے کے آثار نہ ملنے پر وہ صلواتیں سناتیں کہ بس' بلی کو سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی۔

"کیا مصیبت ہے۔۔۔؟ سارے برتن گندے پڑے ہیں۔۔۔ ہانڈی کس چیز میں چڑھاؤں۔۔۔؟" بڑبڑاتے ہوئے گند اکگر نکالا۔ دھونا شروع ہی کیا تھا کہ یاد آیا مہینے کا سودا تو ابھی آیا ہی نہیں ہے۔ اور اماں نے کہا تھا' دال دکان سے منگوا کر پکا لینا۔ اف' اب اس وقت اماں آ گئیں تو نیا ڈراما شروع ہو جائے گا گھر میں۔

"فادی! اٹھ میرے بھائی بھاگ کر جا' ملک صاحب کی دکان سے کالی مسور لا دے۔" بلی نے فادی کی منت کی۔

"کیا ہے آپا۔۔۔؟ کتنی دیر سے تم لوگ اپنی مرضی کی چیزیں دیکھ رہے تھے۔ اب میرے کارٹون کا ٹائم ہے۔ میں نہیں جا رہا۔"

"جا' میرا پیارا بھائی' دو منٹ لگیں گے' تو بھاگ کر واپس آ جانا۔" بلی فادی کو منانے کے ساتھ ساتھ گڈو کو بھی دل ہی دل میں گالیاں دے رہی تھی جو جانے کس وقت گھر سے کھسک گیا تھا ورنہ اسی سے منگوا لیتی دال۔ فادی کسی طور کارٹون چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھا۔

"اچھا! تو دکان سے اپنے لیے چیز بھی لے لینا۔" چیز والی بات پر فادی کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ لاؤ دو پیسے اور زیادہ پیسے دینا۔ زیادہ چیز لوں گا۔" بلی نے دانت پیستے ہوئے پیسے پکڑائے اور جا کر کچن سمیٹنا شروع کیا۔

کھانا پکانے اور برتن دھونے کی ذمہ داری شروع سے بلی کی تھی۔ سیمی آٹا گوندھ کر روٹی پکاتی تھی ساتھ ساتھ گھر صاف کرنا بھی اسی کے ذمے تھا۔ رانی اور بی ہفتے کے ہفتے مشین لگا کر کپڑے دھوتی تھیں۔ پھر کپڑے تہہ کر کے الماریوں میں رکھنا رانی کا کام تھا۔ جب کہ استری کا کام سونی کے ذمہ تھا۔

رہ گئیں اماں تو انہوں نے ساری زندگی بس دو ہی کام دل لگا کر کیے تھے ایک تو بچے پیدا کرنا' دوسرے گھر گھر پھرنا۔ باقی ہر قسم کے کاموں سے وہ آزاد تھیں۔ گھر کے کام لڑکیوں کے ذمے تھے۔ باہر کے کام گڈو اور ابا کرتے تھے۔ چھوٹے موٹے دکان کے چکر وغیرہ فادی لگاتا تھا اور طاری اماں کے ساتھ سارے زمانے میں مٹر

گشت کرتا تھا۔
سیمی اس گھر کا سب سے اعلا تعلیم یافتہ بچہ تھی یعنی کہ میٹرک فیل۔ اعلا تعلیم یافتہ یوں کہ وہ گھر کا واحد بچہ تھی جو میٹرک تک پہنچا تھا ورنہ باقی سب تو راستے میں ہی ادھر ادھر لڑھک گئے تھے۔ ببلی نے آٹھویں میں دو بار مسلسل فیل ہونے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔
گڈو اس سے ایک درجہ اوپر تھا' مطلب اس نے دو' دو سال ہر جماعت میں لگا کر آٹھویں تو پاس کرلی تھی۔ پر نویں میں جو لڑھکا' تو بس پھر لڑھکا ہی رہا۔ ابا کی بازار میں چلتی ہوئی کپڑے کی دکان تھی۔ اسے اپنے ساتھ وہیں لگا لیا۔ کچھ دن تو وہ باقاعدگی سے جاتا رہا۔ پھر اکتا گیا۔ کپڑا بیچنا اس کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کا دھیان کام پر کم 'لڑکیوں کو تاڑنے میں زیادہ رہتا تھا۔
ابا کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کپڑے کی دکان پر کام نہیں کر سکتا سو اپنے ایک دوست کی ورک شاپ پر موٹر سائیکلوں کا کام سیکھنے بٹھا دیا۔ اب دو تین سالوں میں' وہ خود چھوٹا' موٹا استاد بن چکا تھا۔ رانی نے ساتویں اور سونی نے آٹھویں میں فیل ہو کر اسکول چھوڑا تھا۔
باقی رہ گئے نازو' میری اور فادی تو وہ ابھی ابتدائی جماعتوں میں تھے۔ ان کے ہر سال آنے والے سالانہ نتائج چیخ چیخ کر اعلان کرتے تھے کہ یہ تینوں بھی پڑھائی کے معاملے میں اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور بڑے ہو کر خوب نام روشن کریں گے۔ طاری ابھی چھوٹا تھا۔ اس لیے وہ اسکول نہیں جاتا تھا۔ اماں کے ساتھ سیر سپاٹوں کو جاتا تھا۔
خوب صورتی کے معاملے میں اس خاندان کو قدرت نے خوب نوازا تھا۔ صفورہ اور آفتاب یعنی کہ اماں اور ابا دونوں ہی بے حد خوب صورت تھے اور خوب صورتی ان کی ساری اولاد کو ورثے میں ملی تھی۔ نو کے نو بچے ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور خوب صورت۔
یہی وجہ تھی کہ صفورہ کی لڑکیوں میں کوئی خوبی نہ ہونے کے باوجود ان کے رشتے خوب آیا کرتے تھے جن کو شروع شروع میں تو صفورہ بغیر دیکھے ہی کیڑے نکال کر رد کر دیتی تھی۔ ہاں طاری کی پیدائش کے بعد اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ اب وہ رشتہ دیکھ سن کر اچھے طریقے سے 'چھان بین کر کے' پوری تسلی کرتی تھی' اس کے بعد رد کرتی تھی۔ اب اللہ جانے صفورہ رشتے ہونے کی صورت میں ہونے والی مہمان داریوں سے گھبراتی تھی یا اس کو بہت ہی شاندار بر چاہیے تھے بیٹیوں کے لیے۔ بہرحال کچھ بھی تھا اب تک باقاعدہ رشتے کی بات چلنے کی نوبت نہیں آسکی تھی۔
صد شکر کہ اماں کے آنے سے پہلے پہلے کھانا تیار ہو گیا۔ اماں' ابا ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ ابا دکان سے سیدھے اسپتال پہنچے اور وہاں سے اماں کو لیتے ہوئے آئے تھے۔
"لگتا ہے خالہ نانی لڑھکیں نہیں ابھی تک۔" سونی نے ببلی کے کان میں سرگوشی کی۔
ببلی نے سونی کو غصے سے گھورا۔ انداز میں تنبیہ تھی۔ ابھی جو اماں سن لیتیں تو وہ لیکچر شروع ہوتا کہ.... ساتھ ہی اماں سے پوچھا۔ "اماں! کیسی طبیعت ہے خالہ نانی کی....؟"
"اف' بڑی مشکل میں ہیں بے چاری۔ بس اللہ رحم کرے۔"
کیمی نے دسترخوان بچھا کر کھانا لگایا اور سب کو کھانے کے لیے آواز دینے لگی۔ ابا دسترخوان پر آکر بیٹھے تو گڈو نظر نہیں آیا۔
"گڈو کدھر ہے....؟ کھانے کے لیے بلاؤ اس کو۔" (ابا کو گڈو کا گھر سے باہر نکلنا بہت کھلتا تھا لہٰذا پانچ بجے ورکشاپ سے چھٹی کے بعد اس کے گھر سے نکلنے پر پابندی تھی)۔
"وہ... ابا... گڈو..." ببلی نے اٹکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
جملہ ابھی اس کے منہ میں ہی تھا کہ گڈو سیٹی بجاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ سیٹی پر وہ کسی فلمی گانے کی دھن گنگنا رہا تھا۔
(اف اس کم بخت کو بھی ابھی گھسنا تھا گھر میں۔

تھوڑی دیر اور دفع نہیں رہ سکتا تھا گھر سے باہر) سمی نے تلملاتے ہوئے سوچا۔

سیٹی بجاتے بجاتے اچانک ہی گڈو کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوئی تھیں۔ اپنی طرف سے کم از کم وہ ابا کی آمد سے پہلے تشریف لے آیا تھا۔

"کہاں سے آرہا ہے تو....؟ میں نے تجھے منع کیا تھا کہ ورک شاپ کے بعد کہیں نہیں جائے گا تو۔" ابا غصے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے۔

ادھر گڈو کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔ ابا کا گرجنا برسنا ابھی ابتدائی مراحل ہی میں تھا کہ فادی اندر سے بھاگتا ہوا آیا۔

"اماں، اماں! احسنات ماموں کا فون تھا۔ خالہ نانی فوت ہوگئیں۔"

"ہائے میرے اللہ۔" اماں دل پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئیں (گویا کوئی انتہائی ناگہانی جوان موت ہوگئی ہو۔)

ابا بھی گرجنا، برسنا بھول بھال کر کمرے کی طرف بڑھ گئے اور خالہ نانی کی وفات پر کم سے کم دو افراد نے تو دل و جان سے شکر ادا کیا تھا۔ ایک گڈو اور دوسرے غالباً "نہیں یقیناً" صفیہ ممانی۔

✲ ✲ ✲

"گڈو، اٹھ بھی جا اب.... دو دن سے تو کام پر نہیں جا رہا۔ ابا کو پتا چل گیا تو طوفان اٹھا دیں گے۔" ببلی کوئی تیسری بار اسے اٹھانے آئی تھی۔ ابا والی دھمکی کارگر رہی۔ وہ مندی مندی آنکھوں سے بہن کو دیکھتا کسلمندی سے اٹھ بیٹھا۔

"غسل خانے سے فارغ ہو کر جلدی آجا، ناشتا تیار ہے۔"

جتنی دیر میں گڈو غسل خانے سے فارغ ہوا، سمی گھر صاف کر چکی تھی۔ ببلی نے پلاسٹک کی میز گڈو کے سامنے دھری، اس پر ناشتا لا کر رکھا۔ ساتھ ہی خود بھی موڑھا کھینچ کر بیٹھ گئی۔ سمی بھی ہاتھ دھو کر ادھر ہی ٹک گئی۔

"رانی، سونی، اماں سب لوگ کدھر ہیں؟" گڈو نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ چھوٹوں کا تو پتا ہی تھا اسکول گئے ہوں گے۔

"خالہ نانی کا سوئم ہے آج.... اماں، طاری کے ساتھ وہیں گئی ہے۔ رانی، سونی پچھلے صحن میں مشین لگا کر کپڑے دھو رہی ہیں۔"

گڈو ..... ا کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دو تین نوالے پراٹھے کے لیے، ساتھ میں چائے کا گھونٹ بھرا۔ نظر اٹھا کر ببلی کو دیکھا۔ وہ اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

"ببلی! میں تجھے بہت یاد کروں گا۔" نوالہ چباتے ہوئے بہن کو مخاطب کیا۔ سمی نے اس بے تکی بات پر حیران ہو کر گڈو کو دیکھا۔

"کیوں....؟ میں مرنے لگی ہوں....؟" ببلی نے ابرو اٹھا کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "یا تو پردیس جا رہا ہے....؟"

"نہ، نہ ایسی باتیں نہ کر۔ میں تو کہہ رہا تھا۔" اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ "تیری شادی ہو جائے گی تو ایسے ایسے شاہکار پراٹھے کون مجھے بنا کر دے گا۔ یہ دیکھو، یہ آدھے جلے، آدھے کچے، موٹے موٹے کناروں والے پراٹھے۔" اس نے پراٹھا اٹھا کر نمائشی انداز میں لہرایا۔ "اور پھر چائے کے نام پر یہ پھیکا، سیٹھا، کاڑھا۔ آخر کون بنا کر دے گا۔" وہ سرد ھنتے ہوئے کہتا جا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ ببلی جوابی حملہ کرتی، سمی میدان میں کود پڑی۔ "نہ میرے بھائی، تجھے کوئی ضرورت نہیں ہے پریشانی سے اپنا سر سفید کرنے کی۔ نہ اماں نے ہماری شادیاں کرنی ہیں نہ تجھے ان لذیذ نعمتوں سے محروم ہونا پڑے گا۔" یہ سن کر ببلی نے جواب دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔

"یعنی کہ نہ تم پہاڑیاں، بلکہ نہیں پورے پورے پہاڑ سر کو گے نہ میرا نمبر آئے گا۔" گڈو نے افسوس سے سر ہلایا۔

"بالکل!" سمی نے انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ "نہ ہماری شادیاں ہوں گی، نہ ہی تیری شادی ہوگی۔"

ببلی تو بلبلا کر رہ گئی اس بات پہ۔ اس کا بس چلتا تو ابھی کے ابھی اپنے ہاتھ خود ہی پیلے کر لیتی۔

"انسان کی شکل اچھی نہ ہو تو کم سے کم بات اچھی نکالنی چاہیے منہ سے۔ کوئی قبولیت کی بھی گھڑی ہوتی ہے۔ مجھے بڑا شوق ہے ناکنوارہ رہنے کا تو تو سڑنا اس قبر میں، میں تو بھاگ کر شادی کرلوں گی۔" وہ بولتے بولتے ہانپ سی گئی۔

شادی کا ذکر ببلی کی کمزوری تھی اور اس موضوع پر وہ یوں ہی جذباتی ہو جایا کرتی تھی۔ سیمی اور گڈو اس کو جان بوجھ کر چھیڑتے تھے۔ یہ اور بات کہ وہ چھڑ بھی جاتی تھی۔

"ہیں...!" سیمی نے ہیں کو کھینچ کر تھوڑا سا لمبا کیا۔ ساتھ ہی اسے ستانے کا شغل بھی جاری رکھا۔

"بھاگ کر شادی کرے گی...؟ کس سے کرے گی...؟"

"ڈھونڈ لوں گی بندہ بھی..." گڈو اور سیمی کی ہنسی اس کے غصے کو ہوا دے رہی تھی۔

"اچھا! تو بندہ بھاگنے سے پہلے ڈھونڈے گی یا بھاگنے کے بعد۔" اب کے گڈو نے مداخلت کی۔

"گڈو..." چیخ کی صورت یہ نام ببلی کے منہ سے برآمد ہوا ساتھ ہی اس نے چائے کا کپ مارنے کے انداز میں اٹھا کر گڈو کا نشانہ لیا۔

گڈو نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔

☆ ☆ ☆

اماں حسب توقع خاصی دیر سے واپس آئیں۔ پر اماں کے پیچھے بے جی کو دیکھ کر ان سب کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سیمی تو یوں بے جی سے لپٹی کہ الگ ہونا ہی بھول گئی۔ خواہ مخواہ ہی رونا آرہا تھا۔

"چل اب ہٹ بھی جا اور کبھی نہا بھی لیا کر۔ اتنی بو آرہی ہے تیرے پاس سے۔"

سیمی جلدی سے پیچھے ہوئی۔ دوپٹے سے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ سب بچے جذباتی ہو رہے تھے۔ بے جی سے مل کر۔

"لڑائی تو اپنی بیٹی سے تھی نا۔ ہمیں کیوں اتنی لمبی سزا دی۔" ببلی نے شکوہ کیا۔

"مجھے لگ رہا ہے صفورہ! تیرے بچے ٹی وی بہت دیکھنے لگے ہیں تب ہی ایک سے ایک ڈراما یہاں موجود ہے۔" بے جی نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ان کو چھوڑو اماں' اپنی کہو' اتنے برس بیٹی کے بغیر گزار دیے۔ کبھی خیال نہ آیا میرا۔ اب بھی جو خالہ نہ مرتیں تو تم نے تو قسم ہی کھالی تھی فیصل آباد نہ آنے کی۔ حالانکہ کوئی اتنا دور تو نہیں ہے کراچی' فیصل آباد سے۔" ماتم والے گھر میں تو ماں سے گلے شکوے کر ہی نہ سکی۔ اب سوئم کے بعد زبردستی لے آئی تھی صفورہ اماں کو منا کے۔ اماں نے تو قسم کھائی تھی کہ اب صفورہ کے گھر قدم نہیں رکھنا۔ پر تھوڑی بہت تو بیٹی کی معافی تلافی کی وجہ سے قسم تو ٹنی پڑی اور زیادہ اس وجہ سے کہ اتنی دور اتنا کرایہ لگا کر بہن کا مرا منہ دیکھنے آتو گئی تھی اماں پر اتنی جلدی واپس جانے کا ارادہ نہیں تھا کہ چالیسویں پر پھر خرچہ کرکے آنا پڑتا اور رہ گئی بہن کی بہو صفیہ تو اس سے تو کچھ بعید نہیں تھا کہ سامان اٹھا کر چوتھے ہی روز چلتا کر دیتی۔ ایسے ہی اعلا اخلاق کی مالک تھی وہ۔ سو اماں نے تھوڑے بہت نخرے دکھا کر مان جانے میں ہی عافیت جانی۔

اور اماں کی ناراضی کا قصہ کچھ یوں تھا کہ صفورہ کو سکندر (صفورہ کا سب سے چھوٹا بھائی) کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا کہہ رکھا تھا اماں نے۔ صفورہ' دل و جان سے اماں کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گئی۔ روز کسی نہ کسی گھر جاتی' دعوتیں اڑاتی۔ ہاتھ جھاڑتی' لڑکی ناپسند کرتی واپس آجاتی۔ زندگی میں ایسا وی آئی پی پروٹوکول نہ ملا تھا جواب مل رہا تھا۔ پر قدرت کو ان کی یہ عیاشی پسند نہ آئی' سو وہ بھائی جس کے لیے وہ لڑکیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نڈھال ہو رہی تھی اس نے خود ہی ایک لڑکی پسند کرکے نکاح کر لیا۔ چونکہ اس کو پورا یقین تھا کہ اس کی پسند اس کے گھر والوں کی پسند کبھی نہ بنے گی سو نکاح کے بعد جا کر اماں کو خبر کر دی۔

"نکاح میں نے کر لیا ہے پر رخصتی تمہاری رضا سے ہی ہو گی۔"

اماں کو تو لڑکی کا حدود اربعہ پتا چلتے ہی غشی کے دورے پڑنے شروع ہوگئے۔

"تو جھگیوں میں جا کر نکاح کر کے آگیا کم بخت، سارے زمانے کی لڑکیاں مرگئی تھیں کیا....؟"

"بس اماں! عشق پر زور نہیں۔" سکندر نے فلمی انداز اپنایا تھا۔

جب صفورہ کو پتا چلا تو وہ بتھے سے اکھڑ گئی۔ فوراً" اماں کو گھر چھوڑ کر اپنے ہاں آنے کو کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ سکندر کو دھمکی دے ڈالیں جب تک اس کلموہی کو طلاق نہیں دے گا، میں گھر واپس نہیں آؤں گی۔ پر اماں دوراندیش خاتون تھیں۔ سب سے چھوٹا بیٹا تھا اسی کے پاس رہنا تھا۔ اب یہ حرکت تو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف تھی سو صفورہ کو انکار کر کے، دل پر پتھر رکھ کر رخصتی کے لیے تیار ہوگئیں اور صفورہ کو میاں اور بچوں سمیت شادی میں شرکت کے لیے دعوت دی۔

اس بات کو صفورہ نے انا کا مسئلہ بنالیا۔ اماں نے بھی صاف کہہ دیا۔ "اب تیرے گھر کبھی قدم نہ رکھوں گی جو تو شادی میں شریک نہ ہوئی۔"

اب صفورہ نے بھی موقع غنیمت جانا، تم روٹھے ہم چھوٹے کے مصداق بائیکاٹ کر ڈالا۔ ایک تو شادی پر جانے کے لیے پوری پلٹن کے کپڑے تیار کرنے پڑتے پھر شادی میں لینا دینا، راستے کا کرایہ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے صفورہ اماں کے ہر سال پورے ماہ کے لیے آنے پر کچھ زیادہ خوش بھی نہیں ہوتی تھیں۔ اماں ہر بات پر روک ٹوک کرتی تھیں۔

"تو بچوں پر دھیان نہیں دیتی، گھر میں ٹک کر بیٹھا کر۔ یہ کیا لور لور پھرتی ہے ہر وقت۔" صفورہ اس ایک مہینے میں بندھ کر رہ جاتی تھی، سو شکر کر کے اماں کو ناراض کردیا۔

آخری بار اماں طاری کی پیدائش پر آئی تھیں۔ اس کے بعد اب چار برس بعد بہن کے مرنے میں آئی تھیں فیصل آباد۔ صفورہ نے خوب رو رو کر معافی مانگی اور سوئم والے دن اماں کو گھر لے آئی۔ اب چالیسویں تک اماں کو یہیں رہنا تھا۔

✡ ✡ ✡

بے جی اور اماں صحن میں پلنگ پر بیٹھی تھیں جب بے جی نے بات شروع کی۔ "صفورہ! تو نے سیمی ببلی کا رشتہ کیوں نہیں کیا اب تک۔ میں تو اتنا عرصہ انتظار ہی کرتی رہ گئی کہ اب سیمی کی شادی کی خبر آتی ہے۔ اب ببلی کے رشتے کی خبر آتی ہے پر تیری طرف تو سناٹا ہی سناٹا ہے۔"

اندر باورچی خانے میں کام کرتی ببلی اور سیمی دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔

بے جی نے بات جاری رکھی۔ "ببلی، سیمی کی عمر کی خاندان کی تقریباً" سب ہی لڑکیاں بیاہی گئی ہیں۔ جن کے بیاہ نہیں ہوئے کم سے کم رشتے تو ان کے بھی طے ہوگئے ہیں۔ تو کس بات کا انتظار کررہی ہے صفورہ....؟"

"اب کوئی ڈھنگ کا رشتہ بھی تو ہو اماں۔ ایسے ہی تو لڑکیاں اٹھا کر نہیں پھینک دینی نا۔" صفورہ اس موضوع سے بہت چڑتی تھی۔ باہر کا کوئی بندہ بات کرتا تھا تو صفورہ وہ کرارا جواب دیتی کہ دوبارہ اس بندے کی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی پر سامنے اماں تھیں۔ اب ان کو تو باتوں سے بہلایا نہیں جاسکتا تھا۔

"نہ تو کس طرح کا رشتہ ہوتا ہے ڈھنگ کا۔ جمیلہ کی بہو نے اپنے لڑکے کے لیے سیمی کا ہاتھ مانگا، تو نے اس کے بات کرتے ہی انکار کردیا۔ آخر کیا برائی تھی اس میں؟ اتنا اچھا کھاتا کماتا لڑکا، گھر ان کا اپنا، بہن بھائی سب شادی شدہ اور کیا چاہیے ہوتا ہے لڑکی والوں کو....؟" بے جی سوالیہ نظروں سے صفورہ کو دیکھ رہی تھیں۔

اس بات پر صفورہ سخت جز بز ہوئی۔ "اماں! خالہ جمیلہ بجائے میت کو کچھ پڑھ کے بخشنے کے یہ باتیں تمہارے کانوں میں انڈیل رہی تھی۔ لوگوں کو بھی پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ محل بس الٹی سیدھی ہانکتے ہیں۔" صفورہ خفت زدہ سی تیز تیز بول

رہی تھی۔

"ہاں تو جو میت کو پڑھ پڑھ کے بخش رہی تھی نا' وہ بھی دیکھا تھا میں نے۔" بے جی نے طنزیہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ "اب تو ادھر ادھر کی ہانکنا چھوڑ' سیدھی بات بتا مجھے۔ کیوں لڑکیوں کے رشتے نہیں کر رہی؟ خاندان کا شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس نے تیرے گھر سے رشتہ نہیں مانگا ہوگا۔"

"خالہ جمیلہ نے بے جی کی اچھی خاصی برین واشنگ کی تھی غالباً"۔ (یہ سیمی کا خیال تھا' جو اس نے بلی کے کان میں انڈیلا)

"لوگ کہتے ہیں تو لڑکیوں کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی اور بھی جانے کیسی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ تو بتا مجھے کیا چل رہا ہے تیرے دماغ میں۔ میں ایسے ٹلنے والی نہیں۔" "بے جی' جے آئی ٹی بن گئی تھیں آج۔

(بلی اور سیمی کا تو پورا جسم گویا کان بن گیا تھا)

"کیا ہے اماں....؟" صفورہ کچھ بے زار نظر آرہی تھی (دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہی تھی جب اماں کو یہاں لانے کا سوچا تھا)

"ساری زندگی تو بچے پیدا کر کے' ان کو پالنے میں گزر گئی۔ اب اللہ اللہ کر کے زندگی میں کچھ سکون آیا ہے۔ لڑکیاں کچھ کام کاج جوگی ہوئی ہیں تو ان کو اٹھا کر اگلے گھر بھیج دوں تو پھر میں جو ساری زندگی سے مشقت کر رہی ہوں اولاد کے پیچھے میرے سکون کا کون سا ٹائم ہوگا۔" صفورہ نے گویا بلی تھیلے سے باہر نکالی۔

"بلے بھئی بلے۔ تو اور مشقت کر رہی ہے بچوں کے پیچھے....؟ جیسے میں تجھے جانتی نہیں ہوں۔ کھانے اور سونے کے علاوہ ساری زندگی اگر تو نے کوئی کام کیا ہے نا تو وہ لور لور پھرنے کا ہے۔ تو اور تیری مشقت سب جانتی ہوں میں۔" (بے جی کے اس وعظ پر کچن میں بیٹھی بلی اور سیمی سر دھن رہی تھیں)

"اور بچے پیدا کرنے کی بھی تو نے خوب کہی۔ اب بچیوں کی شادی کی عمر میں تیرے اپنے چاہ پورے نہیں ہوں گے اور تو بچے پیدا کرنے میں لگی رہے گی تو یہ بچیوں کا قصور تو نہ ہوا۔ طاری جس وقت پیدا ہوا تھا نا تب بھی تیری بلی' سیمی شادی جوگی تھیں۔ پر نہ جی اولاد کا کیوں سوچنا ہے۔ بچن اپنے ہی چاہ پورے کر لیں کافی ہے۔ میں تو کہتی ہوں تو' تو ہے ہی شروع کی کم عقل' اور تو نے میاں کا دماغ بھی بند کر دیا ہے۔ اس کو بھی لڑکیوں کی گزرتی عمریں نظر نہیں آرہیں۔"

اس کے بعد بھی بے جی خوب خوب بولیں۔ ٹھیک ٹھاک لتے لیے اور بلی کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ بے جی کا منہ چوم لے جا کے۔ آخر بے جی بول بول کر ہانپ گئیں۔

"بلی پانی لا کر دے اماں کو۔" بلی بھاگتی ہوئی پانی لے کر آئی۔

"اماں بس کر دو' طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی مجھے تمہاری۔" صفورہ بولی۔

"میری طبیعت کو چھوڑ' تو اپنا "بھیجا" ٹھیک کر۔ نہ تو نے بچے پڑھائے نہ کوئی گن سکھایا۔ ایک اچھی شکل کو دیکھ کر لوگ ہاتھ مانگتے ہیں تو اس پر بھی تو کوشش کر رہی ہے لڑکیاں تیری ناز برداریاں کرتی رہیں۔ عمر گزر گئی تیری' پر عقل نہ آئی تجھے۔ تف ہے صفورہ تجھ پر۔" اور کچن میں بیٹھے بیٹھے سیمی نے بے جی پر ایک فضائی بوسہ اچھالا۔

"میں تجھے بتا رہی ہوں صفورہ!" بے جی نے شہادت کی انگلی تنبیہہ کرنے والے انداز میں صفورہ کی طرف کی۔ "میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک بلی' سیمی کا رشتہ نہیں ہو جاتا۔"

"یا ہو....." بلی نے ایسا بے ساختہ نعرہ مارا اور ساتھ ہی دونوں بازو ہوا میں لہرائے کہ برتنوں کا اسٹینڈ نیچے جا گرا اور فضا میں کانچ کے برتن ٹوٹنے سے جلترنگ سی بجنے لگی۔

"کیا ہو گیا کم بختو....." صفورہ کا بھاشن شروع ہو چکا تھا۔

پر آج کا دن خوشی کا دن تھا سو بلی نے اماں کے کوسنوں کا قطعاً "برا نہ مانا۔

✲ ✲ ✲

بے جی کی بہن کو گزرے دسواں دن تھا آج۔ بہن

کی یاد بھلانے کو بے جی شبنم اور ندیم کی فلم دیکھ رہی تھیں۔

"ہائے ہائے! کیسا زمانہ تھا ہم ساری بہنیں مل کر سینما جاکر فلم دیکھ کر آتیں۔ اماں 'ابا' کو بازار جانے کا کہہ کر تین گھنٹے کی فلم دیکھ کر آتے تھے۔ اللہ جنت نصیب کرے بہشتن (بہن) کو۔ سب سے زیادہ اسی کو شوق تھا فلمیں دیکھنے کا۔" اب کہ بے جی نے دوپٹا منہ پر رکھ کر پھپک پھپک کر رونا شروع کر دیا۔

فادی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کارٹون لگالیا کہ جس دن سے بے جی آئی تھیں ٹی وی پر بس فلمی چینل ہی چلتے تھے۔ بے جی سارا دن فلمیں دیکھتی تھیں' وہ بھی سن ستر کی دہائی کی۔ ساتھ ہی ساتھ بچوں کو بتاتی بھی جاتی تھیں کہ کون کون سی فلم انہوں نے کون کون سے سینما میں اور کس کس کے ساتھ جاکر دیکھی تھی۔

چینل تبدیل ہوتے ہی بے جی فارم میں آگئیں۔

"چل فادی! فلم لگا' اینڈ چل رہا ہے۔" آنکھیں دوپٹے سے پونچھ کر صاف کیں۔ فادی نے برا سا منہ بناکے چینل لگادیا' خود اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"وسیمی ذرا پانی میں روح افزا گھول کر دے مجھے دل گھٹ رہا ہے۔" بے جی کا ہر آدھ پون گھنٹے بعد دل گھٹتا تھا اور ان کو کھانے پینے کو کچھ چاہیے ہوتا تھا۔

فلم بالکل اختتام کے قریب تھی جب لائٹ چلی گئی۔ "اف! آخری سین تھا۔ پتا نہیں ولن مرے گا کہ نہیں۔۔۔" بے جی اختتام نہ دیکھ سکنے کا افسوس کرتیں' واپڈا والوں کو باتیں سناتیں صحن میں آکر بیٹھ گئیں۔ صفورہ بھی کمرے سے نکل کر باہر آگئیں۔

اتنی دیر میں کھلے دروازے سے سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی ہاتھ میں پلیٹ پکڑے اندر آتی دکھائی دی۔

"اے اے' کون ہے تو' کہاں منہ اٹھائے گھسی چلی آرہی ہے۔" بے جی ایک دم چوکنا ہوئیں۔

"اماں! ساتھ پڑوس والی سکینہ کی لڑکی ہے صائمہ۔" صائمہ نے جھٹ سلام جھاڑا۔

صفورہ نے بلی کو آواز دی۔ "بلی' یہ صائمہ کے ہاتھ سے پلیٹ لے۔ دیکھ کیا لائی ہے۔"

بے جی اتنی دیر میں صائمہ کا بغور جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ "صفورہ! پچھلی بار جب میں آئی تھی تب تو یہ چھوٹی سی دکھتی تھی۔ خوب قد نکالا ہے لڑکی نے۔" صائمہ کچھ شرما سی گئی۔ بے جی مزید گویا ہوئیں۔ "سوکھی سڑی تو پہلے بھی تھی پر اب تو بالکل ہی زرافہ بن گئی ہے۔ اوپر سے رنگ بھی باپ کا چرایا ہوا لگتا ہے۔ ماں تو پھر بھی بہتر ہے۔"

صائمہ کا منہ بن گیا۔ (جو اس گھر میں گڈو نہ ہوتا تو وہ تو تھوکتی بھی نہ یہاں آکر۔ ہنہ۔ دل ہی دل میں اماں جی کو چند القابات سے نوازا) بلی نے پلیٹ لی اس کے ہاتھ سے۔

"وہ میں نے آلو گوشت بنایا تھا۔ سوچا پہلے آپ کے ہاں دے آؤں پھر خود کھاؤں گی۔" کچھ جتاتے ہوئے انداز تھے کہ (تمہیں تو کبھی توفیق نہ ہوئی کچھ بھجوانے کی)

"آلو گوشت۔۔۔؟" بلی نے حیران ہو کر پلیٹ کو دیکھا جہاں شوربے میں تین چار آلو تیر رہے تھے۔ "گوشت کہاں ہے اس میں۔۔۔؟"

"وہ ہمیں نے سوچا آپ اتنے سارے لوگ ہو تو ایک دو بوٹی ڈال دی تو لڑائی نہ پڑ جائے' اس لیے خالی آلو لے آئی۔ ویسے شوربے میں گوشت کا ذائقہ ہے۔" جلدی سے وضاحت کی۔ ساتھ ساتھ نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔

"یہ لے۔" پلیٹ خالی کر کے بلی نے اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ وہ کچھ مایوس سی واپس پلٹی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رکی۔

"وہ گڈو کہاں ہے۔۔۔؟" دل کڑا کر کے پوچھ ہی لیا۔

(اب دل پر کس کا زور چلتا ہے؟)

"وہیں ہے جہاں روز اس وقت ہوتا ہے۔ کیوں؟ تو نے بنٹے کھیلنے ہیں اس کے ساتھ۔۔۔؟" بلی کو صائمہ کا گڈو پر دھیان دینا ذرا پسند نہیں تھا۔ اتنا سوہنا اس کا بھائی اور یہ سوکھی چھپکلی۔

"نہیں۔ وہ۔" صائمہ ذرا گڑبڑائی۔ آخر بروقت

بہانہ سوجھا۔ "وہ ہمارے کچن میں چھپکلی آگئی تھی۔ میں نے کہا گڈو ہو تا تو وہ مار دیتا۔"

"گڈو... خالی فراٹے مار سکتا ہے۔ چھپکلی مارنے میں تیرے ساتھ چلتی ہوں۔ (ساری چالیں سمجھتی ہوں تیری)" بیلی جانے کو تیار ہوئی۔

"نہیں نہیں' اب تک تو وہ بھاگ چکی ہوگی۔" یہ کہتے ہی وہ دروازے سے باہر نکل گئی مبادا بیلی ساتھ ہی نہ چل پڑے۔

بیلی ہاتھ جھاڑتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

گڈو کام سے واپس آرہا تھا۔ ایک ہاتھ سے بال ٹھیک کرتا' دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالے' ہولے ہولے کچھ گنگنا رہا تھا جب شی شی کی آواز پر ہونٹ سکیڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔

"او گڈو!" آواز صائمہ کی تھی۔ گڈو کا موڈ خواہ مخواہ ہی خراب ہوا۔

"ایک تو یہ چمگادڑ پیچھا نہیں چھوڑتی' روز گھر گھسنے سے پہلے ضرور دیدار کراتی ہے۔"

آج تو ویسے بھی استاد کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا اس کی حسین و جمیل بیٹی سے نظریں ملی تھیں اور بس پھر پلٹنا بھول گئی تھیں۔ گڈو نے نظروں ہی نظروں میں سلام کیا تھا۔ جواباً" استاد کی بیٹی نے بھی نظروں ہی نظروں میں اسے لکھ لعنت کہا تھا اور ٹھک کرکے دروازہ اس کے منہ پر بس مارنے کی کسر رہ گئی تھی لیکن اس لعنت سے گڈو ذرا بے مزہ نہ ہوا تھا۔ وہ عادی تھا ایسی لعنتوں کا۔

"اوئے گڈو..." صائمہ کی آواز اسے حال میں واپس کھینچ لائی۔ "بات سن۔"

"کیا ہے...؟" گڈو نے بے زاری سے پوچھا۔

"اماں نے وہی بڑے بنائے ہیں' میں نے تیرے لیے پہلے ہی الگ سے پیالہ نکال لیا تھا۔" صائمہ نے بتاتے ہوئے شاباش طلب نظروں سے گڈو کو دیکھا۔ دل ہی دل میں نظر بھی اتاری اس گھبرو جوان کی۔

"ہاں' پچھلی بار جو تیری اماں نے وہی بڑے بنائے تھے نا اور تو نے بڑی چاہ سے مجھے کھلائے تھے' پوری رات میری لیٹرین کے چکر لگاتے گزری تھی۔ تیری بہت مہربانی۔ یہ جو تیری اماں تیرے باوا سے بدلے لینے کے لیے جمال گھوٹے والے دہی بڑے بناتی ہے نا' تجھے ہی مبارک ہوں۔ مجھے معاف کردے۔" گڈو نے دونوں ہاتھ جوڑے اور قدم اپنے دروازے کی طرف بڑھائے۔

"اچھا سن تو۔" وہ جلدی سے بولی کہ کہیں وہ اپنے گھر کے اندر ہی نہ گھس جائے۔ "کتنی دیر سے دروازے پر کھڑی انتظار کررہی تھی۔ کتنے دن ہوگئے۔ تو ہماری طرف نہیں آیا' دو گھڑی بیٹھ جا آکر۔ تھوڑی دیر باتیں کرلیتے ہیں۔" صائمہ نے آخر میں کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

"تا میں' تیری بچپن کی سہیلی ہوں جو تو نے مجھ سے دکھ سکھ کرنے ہیں۔ باتیں کرنی ہیں نا تو نے۔ چھ بہنیں ہیں میری ان میں سے کسی سے کرلے آکر۔"

سخت زہر لگ رہی تھی ایسے شرماتی ہوئی۔ گڈو کا بس نہیں چل رہا تھا پاس پڑا روڑا اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارے۔ شکر ہے قدرت نے اس کا زیادہ امتحان نہیں لیا دور گلی میں صائمہ کے ابا آتے دکھائی دیے اور صائمہ انہیں دیکھتے ہی غڑاپ سے اندر گھس گئی۔ اس سے زیادہ تیزی سے گڈو گھر کی طرف بھاگا۔ (ان بڈھوں کا کیا بھروسا۔ خدا جانے کیا سمجھ بیٹھیں)

☼ ☼ ☼

رات کا کھانا کھاتے ہی بے جی نے اعلان کیا۔ "چلو بھئی کڑیو' اٹھو برتن سمیٹو' اپنے اپنے کام کرو۔" لڑکیاں بھی فوراً" ہی اٹھ گئیں۔ (فلم شروع ہونے والی تھی)

"بھئی آفتاب! تجھے اگر اعتراض نہ ہو تو میں اپنی مرحومہ بہن کا ختم کروانا چاہتی ہوں۔ خرچا' پانی سب میں کروں گی بس انتظام تجھے دیکھنا ہوگا۔"

"مجھے کیوں اعتراض ہوگا خالہ! اور خرچا پانی کی کیا بات ہے۔ تم بس بتادو کب کروانا ہے۔ انتظام ہوجائے

گا۔"

اب صرف بے جی، صفورہ اور آفتاب وہاں موجود تھے۔ بچے اٹھ کر جا چکے تھے۔

"صفورہ! تو جا ذرا، سبز پتی کا قہوہ بنا کر لا میرے لیے۔" بے جی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت صفورہ کو وہاں سے بھیجنا چاہ رہی تھیں۔

"اچھا اماں!" صفورہ لڑکیوں کو آواز دینے کا ارادہ ترک کر کے خود ہی اٹھ گئی۔

"بات سن پتر!" بے جی نے آہستہ آواز میں آفتاب کو مخاطب کیا۔ "کوئی گھربار کی بھی خیر خبر ہے یا بس کمانے میں ہی لگا رہتا ہے۔"

بے جی کی بات پر وہ تھوڑا ٹھٹکا۔ "کیوں بے جی! کیا ہوا ہے گھربار کو، سب ٹھیک تو ہے۔"

"آفتاب، تجھے یاد ہے تیری شادی کے وقت تیری اور صفورہ کی کیا عمر تھی۔" (کیسی بے تکی بات کی ہے بے جی نے۔ یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے)

"جی بے جی میں بائیس برس کا اور صفورہ بیس برس کی تھی۔"

"بیس کی وہ شادی کے بعد ہوئی تھی۔ شادی کے وقت کچھ مہینے کم تھے بیس میں۔" بے جی نے تصحیح کی۔

آفتاب نے تائید میں سر ہلایا۔ پر بے جی کی اگلی بات پر وہ چونکا۔

"اور تجھے کچھ یاد ہے تیری سیمی اور ببلی کتنے برس کی ہو گئی ہیں یا ان کی باری یادداشت کھو بیٹھا ہے۔" سمجھ میں نہیں آ رہی تھی بے جی کی بات) کچھ ان کو بھی اپنے گھربار کا کرنے کا سوچا ہے۔"

"خالہ! اب لڑکیوں کا معاملہ ہے۔ بندہ خود تو جا کر رشتے کی بات نہیں کر سکتا نہ کسی سے۔" ہولے سے جواب دیا۔

"خود جا کر اگر بندہ بات نہیں کر سکتا تو جو لوگ اپنے منہ سے، اتنی چاہ سے تیری بیٹیاں اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں ان کو انکار کرنے کی بھلا کیا تک ہے؟"

اب کہ وہ تھوڑا چونکا۔ "کس رشتے کی بات کر رہی ہو خالہ۔۔۔؟"

"کوئی ایک رشتہ ہو تو بتاؤں، میں تو حیران ہوں تجھے نہ کوئی خبر ہے نہ فکر۔ خاندان کے کتنے ہی لوگ سیمی، ببلی کا ہاتھ مانگ چکے ہیں، تیری بیوی تجھے بتائے بنا ہی انکار کر دیتی ہے۔"

"وہ ایسا کیوں کرے گی خالہ! ماں ہے بچیوں کی۔ کچھ دیکھ سن کر ہی منع کرتی ہو گی۔"

"بس کر دے آفتاب اب یہ زن مریدی، ہوش کے ناخن لے، وہ تو ہے ہی سدا کی کم عقل اور نکمی۔ پر تجھ سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔ خیر مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا۔ رشتے تو میں بچیوں کے ان ہی دنوں طے کرواؤں گی۔ تو یہ بتا، تیری جیب کے کیا حالات ہیں۔۔۔؟ ابھی گھر میں شادی کی رونقیں شروع ہو جائیں تو تیرے پلے کچھ ہے کہ نہیں۔" بے جی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہو جائے گا بے جی کچھ نہ کچھ بندوبست۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ کرتی ہوں میں کچھ۔"

صفورہ قہوہ لے کر آ گئی تھی۔ بے جی نے بات بدل دی۔

☼ ☼ ☼

"سیمی! یہ سوٹ کیسا رہے گا؟" ببلی نے ایک سوٹ سیمی کے سامنے کیا۔ "ببلی! بے جی اپنی بہن کے مرنے کا ختم دلا رہی ہیں۔ ان کا ولیمہ نہیں کر رہی ہیں جو تو اتنا کام والا سوٹ نکال لائی ہے۔" سیمی نے بہن کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے یاد دہانی کروائی۔

"بے جی نے خود مجھ سے کہا ہے کہ تو اور سیمی ذرا ٹھیک سے تیار ہونا اور ہر کسی کے پاس جا کر خوش اخلاقی سے حال چال پوچھنا۔ ختم کا تو بس بہانہ ہے سیمی، اصل میں تو بات کچھ اور ہی نظر آ رہی ہے۔" ببلی نے شرم سے دہری ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا" پھر تو ایسا کر، وہ لہنگا نکال کر پہن لے جو میں نے رابعہ کی شادی کے لیے بنوایا تھا۔" سیمی سے اس کا انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

ببلی کا منہ بن گیا اس طنز پر۔ "کوئی ڈھنگ کا مشورہ

نہیں دے سکتی تو باتیں بھی نہ بنا۔"
"اچھا چل' آمیں تجھے بتاتی ہوں کیا پہننا چاہیے۔"
پھر کافی غور و خوض کے بعد سیمی نے اپنے اور ببلی کے لیے کڑھائی والے سوٹ منتخب کیے۔ رانی اور سونی کے لیے بے جی نے خاص ہدایات جاری کی تھیں کہ زیادہ اچھے کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی ہر کسی کے پاس جاکر سلام دعا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف کو بیٹھی رہنا۔ جس پر دونوں نے سخت احتجاج کیا۔
"کیوں بے جی! ہم کیوں نہ اچھے کپڑے پہنیں۔ یہ سیمی اور ببلی زیادہ لاڈلی ہیں۔" سونی کا خوب منہ پھولا تھا۔
"ارے میری شہزادیو! تمہارے سارے ارمان ان دونوں کی شادیوں پر پورے کروں گی میں۔ فکر ہی نہ کرو۔" بہرحال بے جی نے جیسے تیسے سمجھا بجھا ہی لیا دونوں کو۔

☆ ☆ ☆

مہمان آنا شروع ہوگئے تھے۔ مردوں کا انتظام پچھلے صحن میں تھا۔ خواتین کے لیے دو کمروں میں دریاں بچھائی گئی تھیں۔ بے جی نے خاندان کا کوئی بندہ چھوڑا نہیں تھا۔ ایک ایک کو یاد کرکے بلوایا تھا۔ صفورہ کو تو اتنے مہمان دیکھ کر ہی ہول اٹھنے شروع ہوگئے تھے۔
"کیا ضرورت تھی اماں! اتنا میلہ لگانے کی...؟ مدرسے سے بچے بلوا کر قرآن پاک کا ختم کروالیتیں۔ قرآن خوانی بھی ہوجاتی۔ ثواب بھی مل جاتا۔"
"منہ ٹھیک رکھو اپنا اور اب عادت ڈال لے ان میلوں کی۔" بے جی نے سپارہ بند کرکے صفورہ کو گھورا۔
صفورہ منہ بناتی وہاں سے ہٹ گئی۔ بے جی نے دوبارہ سپارہ کھول لیا۔
گڈو مردانے سے نکل کر کچن میں جارہا تھا پانی لینے جب صائمہ پر نظر پڑی۔ کالے رنگ پر چیختا' چنگھاڑتا پیلے رنگ کا سوٹ اوپر سے پیلا پراندہ کندھے پر ڈالا ہوا تھا۔ ایک تو شکل اللہ اللہ پھر ڈریسنگ غضب کی۔
"واہ بھئی واہ! کیا بات ہے صائمہ بی بی۔" گڈو دل ہی دل میں اس کے مضحکہ خیز حلیے پر سر دھن رہا تھا۔ پتا تو تب چلا جب وہ سر پر نازل ہوگئی۔
"کیسی لگ رہی ہوں؟" اٹھلا کر پوچھا۔
"سرسوں کے کھیت میں پڑا' جلا ہوا کارتوس لگ رہی ہے۔" صائمہ پر منوں کے حساب سے اوس پڑگئی۔
"کبھی بندہ دل بھی رکھ لیتا ہے۔" ایک ادائے ناز سے کہا۔
"تجھے شاید کسی نے بتایا نہیں کہ یہاں میری مہندی کا فنکشن نہیں ہورہا' میری خالہ نانی کے مرنے کا ختم ہورہا ہے۔"
"مجھے کسی ختم' شروع سے کیا لینا... مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ آج میں تیرے گھر آئی ہوں اور تو گھر میں موجود ہے۔" دوپٹے کا کونہ انگلی پر لپیٹتے' کھولتے' ایک بار نگاہ اٹھائی' پھر جھکالی۔ (آئینے کے سامنے کتنی بار پریکٹس کی تھی۔ رج کے سوہنی لگی تھی خود کو' ایسا کرتے ہوئے)
پھر جو نگاہ اٹھائی تو گڈو غائب تھا۔ "ہائے ہائے اب دو تین ڈائیلاگ مزید جو بولنے تھے ان کا کیا ہوگا...؟" (چلو کوئی بات نہیں' مل جائے گا ان کا بھی موقع)
کھانا لگوانے میں صائمہ آگے آگے تھی ببلی' سیمی کے ساتھ' اس کا سارا دھیان دیگوں سے سالن نکلوا کر پاس کرنے میں تھا۔ (اصل میں دیگوں پر گڈو بیٹھا تھا اور سالن نکال نکال کر دیتا جارہا تھا) لیکن ببلی اس کو موقع نہیں دے رہی تھی۔ جیسے ہی ببلی آگے پیچھے ہوئی۔ صائمہ پہنچ گئی خالی ڈش لے کر گڈو کے سر پر۔
"اس میں ڈالنا چاول۔" نزاکت سے ہاتھ آگے کیا۔
گڈو نے چاول ڈال کر ڈش واپس کی۔ بس کچھ پل تھے۔ گڈو کا دھیان دیگ کے اندر تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا

چاول کتنے رہ گئے اور صائمہ کا سارا دھیان گڈو کی طرف تھا۔ یوں ہی بے دھیانی میں ڈش پکڑی۔ ہاتھ گرم گرم چاولوں سے ٹکرائے اور ساتھ ہی ٹھاہ کی آواز کے ساتھ ڈش زمین بوس ہوئی۔

"ہائے میں مرگیا۔" گرم گرم چاول گڈو کے پاؤں پر گرے تھے۔ اس نے اٹھ کر صحن میں اچھلنا شروع کردیا۔ (اوہو ٗایسے موقع پر ڈراموں میں ہیروئن کیا کرتی ہے۔ بڑا ذہن پر زور ڈالا پر کچھ یاد نہ آسکا)

بہت سارے لوگ شور شرابا سن کر آگئے تھے۔

"چل ہٹ تو یہاں سے پہلی دفعہ کوئی کام کرنا پڑ گیا ہے۔ پر کام کم شور زیادہ ہے۔" بے جی نے گڈو کو وہاں سے بھیجا۔ مردانے سے خالہ جمیلہ کے پوتے کو بلوا کر دیگوں پر بٹھایا گیا۔

بلی، سیمی، صائمہ ہنوز کھانا ٹرانسفر کرتی رہیں اور خالہ کا پوتا چوری چوری بلی کو دیکھتا رہا تھا۔ بلی نے دو بار اس کی نظروں کی چوری پکڑی اور پھر خود کو بے نیاز ظاہر کیا۔ (ہاں یہ اور بات دل ہی دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے)

خیر خیریت سے تقریب اختتام کو پہنچی۔

☼ ☼ ☼

قرآن خوانی سے جو مقصد بے جی نے حاصل کرنا چاہا تھا۔ وہ پورا ہو چکا تھا۔ خالہ جمیلہ 'اپنی بہو' بیٹے کے ساتھ آکر دونوں پوتوں کا رشتہ ڈال گئی تھیں بلی اور سیمی کے لیے۔ بے جی نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی۔ بات پکی کرتے ہی دن تاریخ بھی طے کردیے۔ صفورہ شور مچاتی رہ گئی۔ پر جو قدرت نے لکھا ہو وہ ہو کر رہتا ہے۔

آج بلی، سیمی کی مہندی کی رات ہے۔ ان کے میکے میں آخری رات، کل ان کو وداع ہو کر پیا دیس سدھار جانا ہے۔

"بلی!"

"ہوں۔" سیمی کی آواز پر بلی مڑی۔ سیمی کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

"تو رو رہی ہے سیمی۔" بلی جلدی سے بہن کے پاس آئی۔

"بس ایسے ہی۔" سیمی نے آنکھیں پونچھیں۔

"بلی! پتا ہے میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں ایسا گھر بناؤں جہاں سکون ہو، پیار ہو، محبت ہو۔ نہ کوئی لڑائی ہو نہ جھگڑا بس امن ہی امن ہو۔" سیمی کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں بول رہی تھی۔

"ہاں تو ہم ایسا گھر بنائیں گے نا سیمی۔ ہم اپنے گھروں کو محبت سے پیار کے رنگوں سے سجائیں گے۔ ہمارے گھروں میں محبت بنیاد ہوگی۔ ہم اپنے گھر کو پورا وقت دیں گے۔ وہ وقت جو ہماری اماں نے اپنے گھر کو نہیں دیا۔" وہ دونوں دیر تک مستقبل کے سپنے بنتی رہیں۔

خوابوں پر کس کا زور چلتا ہے۔ انسان خواب تو دیکھتا ہی ہے نا تب ہی تو تعبیر ملتی ہے اور پھر انت بھلا تو سب بھلا۔

شازیہ جمال طارق

زرمینہ کی دبی دبی سسکیوں کی آواز نے کمرے میں داخل ہوتے ہمایوں کو ٹھٹکا دیا تھا۔ قدموں کی آہٹ پا کر زرمینہ نے سرعت سے اپنا گیلا چہرہ صاف کیا۔ لیکن تب تک ہمایوں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

"زرمینہ! کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟" وہ فکر مندی سے پوچھتا اس کے قریب بیڈ کے کنارے ٹک گیا۔

زرمینہ جبراً" مسکرائی۔ "کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔"

"تو پھر کیوں رو رہی تھیں؟ اماں نے کچھ کہا ہے؟" اس کے نرمی سے استفسار کرنے پر زرمینہ نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر یار! یہ آنسو یقیناً" خوشی کے تو نہیں لگ رہے۔" وہ ابھی بھی بغور اس کے سرخ روئے روئے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔

"افوہ ہمایوں! آپ بھی نا بس.... چلیں چھوڑیں، جلدی سے اٹھ کر فریش ہو جائیں۔ تب تک میں آپ کے لیے گرما گرم چائے بنا کر لاتی ہوں۔" لہجے میں بشاشت سموتی وہ اس کے ماتھے پر بکھرے بال سمیٹتی وہاں سے اٹھ گئی۔

کچن میں آکر اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگی تھیں۔ وہ ہمایوں کو کیا بتاتی یہ آنسو یقیناً" خوشی کے نہیں ہیں بلکہ یہ تو بے بسی اور کم مائیگی کے جھیلے جانے والے اس احساس کی بدولت اس کی آنکھوں سے ٹپ

ٹپ کر کے گرنے لگے تھے۔ جس سے گو کہ وہ پہلی بار دوچار نہیں ہوئی تھی لیکن دکھ پہلی بار ہی کی طرح ہوا تھا۔

علی الصبح دونوں شادی شدہ نندوں کی آمد پر ماں جی نے اسے بریانی چڑھانے کا آرڈر دیا۔ فائقہ بھابھی سے کسی قسم کی امید کی توقع رکھنا عبث تھا کہ وہ پھوہڑ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کی کام چور واقع ہوئی تھیں۔

شہلا شادی شدہ بہنوں کی آمد پر خود بھی ان کے ساتھ مہمان بن کر بیٹھ جاتی۔ ویسے بھی کچن میں جھانکنے کی زحمت وہ مجبوراً بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ ایسے میں وہ ہمیشہ کی طرح اکیلی ہی کچن میں گھن چکرنی رہی۔ یہ تو وہ بھی جانتی تھی کہ زبان سے اظہار نہ سہی لیکن دل میں اس کے ذائقے دار کھانوں کے سب ہی معترف تھے۔

اور جب وہ بریانی، سلاد، رائتہ اور کولڈ ڈرنک وغیرہ میز پر لگا کر سب کو کھانا لگنے کی اطلاع دے کر پلٹی تو مہران کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، وہ یقیناً نیند سے اٹھ گیا تھا۔

زرمینہ فوراً اپنے کمرے کی جانب بھاگی۔ روتے ہوئے مہران کو کندھے سے لگا کر تھپک تھپک کر بہلانے کے بعد اس کا ڈائپر وغیرہ تبدیل کر کے وہ ڈائننگ روم میں آئی تو اسے دھچکا سا لگا۔

کسی نے مروتاً بھی اس کا انتظار کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ سب اپنی پلیٹوں میں چاول اور بوٹیوں کے انبار کھڑے کیے کھانے میں جتے ہوئے تھے۔ بریانی، سلاد، رائتہ سب ختم۔ وہ لب کچلتی کچن میں چلی آئی۔ جہاں شگفتہ آپا "بچی کھچی" بریانی اپنے گھر لے جانے کے لیے باندھ رہی تھیں۔

"حماد کے ابا کو بریانی بہت پسند ہے سوچا، ان کے لیے تھوڑی سی لے جاؤں۔ ویسے بھی یہاں باسی کھانے کون کھاتا ہے، بھلا؟" وہ نہ رائے مانگ رہی تھیں نہ اجازت، انہیں عادت نہیں تھی۔

زرمینہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ لیکن باوجود ضبط کے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ بے حسی کی کوئی حد تھی تو اس گھر کے لوگ اس سے بھی پار اترتے تھے۔

"ارے بھئی چائے لے بھی آؤ اب۔" ہمایوں کمرے سے پکار رہا تھا۔

"لیجیے جناب! آپ کی گرما گرم چائے۔" وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔

"سنو زری! رویا مت کرو یار۔" اس کا ہاتھ تھام کر وہ کچھ اس انداز میں بولا کہ زرمینہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگی تھیں۔

"اور کوئی حکم؟" بھیگی پلکیں اٹھا کر وہ بہت محبت سے مسکرائی۔

"اور ایسے مسکرایا بھی مت کرو۔" اس کے بے چارگی سے کہنے پہ زرمینہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

☼ ☼ ☼

"افوہ! یار کچھ تو بتاؤ آخر ہوا کیا ہے؟ کیوں ایسے روئے چلی جا رہی ہو؟" فائقہ کو چپ کرانے کی کوشش میں ہلکان ہوتا اسفند بالآخر زچ ہوا تھا۔ وہ جب سے کمرے میں آیا تھا فائقہ یونہی چھکوں پھکوں روئے چلی جا رہی تھی۔

"بس کرو فائقہ! پلیز مجھے بتاؤ آخر ہوا کیا ہے؟"

"وہی ہوا ہے جو ہمیشہ سے میرے ساتھ ہوتا چلا آ رہا ہے، ماں جی شگفتہ اور راحت آپا کی آمد پر ہر دفعہ میرے ساتھ زیادتی کر جاتی ہیں۔ میرا الٹا بی پی لو ہو رہا تھا۔ ڈھنگ سے کچھ کھایا نہیں گیا۔ ماں جی نے حکم دیا ابھی کے ابھی چائے اور کباب وغیرہ لے کر آؤ۔ میں نے صرف اتنا کہا ماں جی میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ گھڑی بھر آرام کروں پھر بنا کر لے آتی ہوں چائے اور کباب۔ لیکن میرا اتنا کہنا غضب ہو گیا۔ لے کے ماں جی نے سب کے سامنے مجھے بے عزت کر کے رکھ دیا۔ اتنا خیال بھی نہیں کرتیں کہ میں اس گھر کی بڑی بہو ہوں۔" آخر میں وہ پھر دھواں دھار رونا شروع

کر چکی تھی۔

"اویار! ایک تو ماں جی بھی۔۔۔" اسفند نے کوفت سے سر جھٹکا۔

"اچھا تم رونا تو بند کرو۔ میں ماں جی سے بات کروں گا۔" وہ اٹھ کر واش روم گیا تو فائقہ نے آرام سے اپنا تر چہرہ صاف کر کے اطمینان بھری سانس لی۔

☆ ☆ ☆

ماں جی غصے سے بل کھا رہی تھیں۔ انہیں اسفند کا بے چینی سے انتظار تھا۔ جس کی بدلحاظ بیوی ان کے لیے دن بدن درد سر بنتی جا رہی تھی۔ ماں جی نے کس قدر ٹھسّے سے بیٹیوں کے سامنے اسے چائے بنا کر لانے کا کہا لیکن اس نے۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر صفا چٹ انکار کر دیا۔ اور پیٹ بھر کر بریانی کھانے کے بعد لمبی ڈکار لیتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

پیچھے سے تلملانے کو ماں بیٹیاں رہ گئیں۔ چائے بنانے کے لیے پھر سے زرمینہ کو آوازیں پڑی تھیں۔ بیٹیاں تو رخصت ہو گئیں۔ لیکن ماں جی دیر تک پیچ و تاب کھاتی رہیں۔

اسفند بگڑے تیور لیے ماں جی کے کمرے میں داخل ہوا۔

"ماں جی آپ بھی حد کر دیتی ہیں۔ جانتی تو ہیں آج کل اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ آپ نے لازمی اسے ہی چائے بنانے کا کہنا تھا۔"

"ہائیں۔" ماں جی غصے سے نیلی پیلی ہونے لگیں۔ ایسا تو ہمیشہ سے ہی ہوتا تھا۔ وہ جب بھی فائقہ کی شکایت لگانے کا پروگرام بناتیں۔ فائقہ پہلے سے ہی شوہر کے کان بھر کر اسے اپنے حق میں کر لیتی۔

اس کی یہ آزمودہ ترکیب ہمیشہ کی طرح کارگر رہی تھی۔ ماں جی جو بہو کی بدتہذیبی پر بھری بیٹھی تھیں۔ بیٹے سے شکایت لگا کر اسے اچھا خاصا سبق سکھانے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھیں اب سب کچھ یوں تلپٹ ہو جانے پر خوب کلسیں۔

"ناس پٹی نے میرے بیٹے کو زن مرید بنا لیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

پڑھ لکھ کر اسفند نے سرکاری ملازمت جبکہ ہمایوں نے اپنا ذاتی کاروبار کرنے کو ترجیح دی۔

مین مارکیٹ میں اس کا دو منزلہ فرنیچر شوروم تھا۔ اب وہ اپنے کاروبار میں وسعت لانا چاہتا تھا۔

اس نے بطور قرض مالی معاونت کے لیے اسفند سے بات کی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا بچت کے نام پر اسفند کے پاس اچھی خاصی رقم موجود تھی۔

فائقہ کو پتا چلا تو ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے زیادہ سخی بننے کی۔ آپ خود کون سا کروڑ پتی ہیں جو یوں دوسروں پر لٹانے کو تیار ہو گئے؟"

"وہ بطور قرض لے رہا ہے۔ جیسے ہی کاروبار میں منافع ہوا وہ ہمارے پیسے لوٹا دے گا۔"

"ہونہہ! اگر نفع کے بجائے نقصان ہو گیا پھر؟ ہماری رقم تو ڈوب گئی ناں؟" فائقہ اسے سوچ کی نئی راہ دکھا رہی تھی اور وہ ہمیشہ سے ہی اس کے دکھائے راستوں پر چلنے کا عادی تھا۔

"بس کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ صاف جواب دے دیں کہ ہمارے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔ اپنا گزارا مشکل سے ہو رہا ہے۔"

دوسرے روز اس نے دل میں شرمندگی محسوس کرنے کے باوجود ہمایوں سے معذرت کر لی۔ "دیکھ یار! برا مت ماننا۔ میرا ہاتھ آج کل تنگ ہے۔ گھر میں ہر ماہ ماں جی کو بھی خرچہ دینا پڑتا ہے۔ ہم سرکاری ملازموں کو تو جانتے ہو ناں لگی بندھی تنخواہ میں بمشکل کھینچ تان کر ہی مہینہ پورا ہو پاتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں اسفند بھائی! آپ پریشان نہ ہوں، اللہ مالک ہے۔ میں نے ایک دو دوستوں سے بات کی ہے 'ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" ہمایوں بنا کچھ جتائے سنجیدگی سے کہتا وہاں سے اٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

ہمایوں نے چند ایک قابل بھروسہ دوستوں سے قرضہ لے کر کام شروع کیا۔ اس کی محنت 'ایمانداری'

لگن رنگ لانے لگی تھی۔ گویا مٹی میں ہاتھ ڈالا تو وہ سونا بن گئی۔

دن رات بے تحاشا مصروفیت کی نذر ہونے لگے تھے۔ بسا اوقات وہ رات کو بھی دیر تک جاگتا۔ حساب کتاب میں لگا رہتا۔ زرمینہ کبھی پھر اٹھ کر اس کو چائے بنا کر دیتی۔ جب وہ تھک ہار کر لیٹتا تو پیشانی پر زرمینہ کی نرم ہاتھوں کا لمس اس کی ساری تھکاوٹ اتار دیتا۔

ماہانہ اخراجات کے علاوہ ماں جی جب جتنے پیسے طلب کرتیں وہ بنا کسی تامل کے ان کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ اسفند کی چابی فائقہ کے ہاتھ میں تھی' وہ لگی بندھی تنخواہ کا رونا روتے ہر دفعہ اپنا پہلو بچا جاتا۔

☆ ☆ ☆

موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔

شگفتہ اور راحت آپا کی ایک ساتھ آمد پر ماں جی کھل سی اٹھیں۔ گو کہ یہ "آمدورفت" ہفتہ بھر جاری ہی رہتی لیکن ماں جی کی خوشی ہر بار دیدنی ہوتی۔

"گرما گرم پکوڑے کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔" شہلا نے انگڑائی لیتے ہوئے ماں بہنوں کی طرف تائیدی انداز میں دیکھا۔

دوسرے ہی پل زرمینہ کو آوازیں پڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے پکوڑے 'پودینے کی چٹنی ٹرے میں لیے ماں جی کے کمرے میں چلی آئی۔ فائقہ بھابھی کی ٹرے وہ ان کے کمرے میں بھجوا چکی تھی۔

"بڑی بھابھی کیا کر رہی تھیں؟ یقیناً" فون پر ماں بہنوں سے ہمارے بخیے ادھیڑنے میں لگی ہوں گی۔" چائے کی چسکیاں لیتی راحت نے ٹوہ لینے والے انداز میں پوچھا۔

"پتا نہیں آپا! مجھے تانک جھانک کرنے کی عادت نہیں ہے۔" اس کے سادگی سے کہنے پر راحت آپا کو پتنگے لگ گئے۔

"اے بی بی! تو تمہارا کیا مطلب ہے ہم سارا دن لوگوں کے کمروں میں تانک جھانک کرتی پھرتی ہیں؟"

زرمینہ بوکھلائی۔ "ارے نہیں آپا! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تو اور کیا مطلب تھا تمہارا کہ ہم بہنوں کو کن سوئیاں لینے کی عادت ہے' ہاں؟" شگفتہ آپا بھی میدان میں کود پڑی تھیں۔ ماں جی نے بھی اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

زرمینہ رونے کو ہو گئی۔ "میں تو اپنی بات کر رہی تھی آپ لوگوں کا کہاں سے ذکر آ گیا؟"

چور کی داڑھی میں تنکا کے مترادف سب کو فوراً سانپ سونگھ گیا' زرمینہ بمشکل جان بچا کر نکلی۔

"ماں جی اس کی معصوم صورت پر مت جایئے گا۔ اندر سے بڑی گھنی ہے۔ میری بات لکھ کر رکھ لیں' ایسا نہ ہو بڑی کی طرح یہ بھی پر پرزے نکالنا شروع کر دے۔"

"اے یہ کیا پر پرزے نکالے گی۔ اس کی اوقات ہی کیا ہے۔ میرا ہمایوں میری مٹھی میں ہے' مجال ہے جو کسی حکم سے روگردانی کرے۔ اس زن مرید کی طرح نہیں ہے جو آئے دن جورو کا حمایتی بن کر ماں سے سوال جواب کرنے کھڑا ہو جاتا ہے۔"

تینوں بہنوں نے عادتاً" سر ہلایا۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں آ کر زرمینہ نے رکی ہوئی سانس بحال کی۔ اس نے کئی بار اپنے کانوں سے سنا تھا' ماں جی ہمایوں سے اس کی شکایت لگا رہی ہوتیں کہ تمہاری بیوی نندوں کے ساتھ تو گھلتی ملتی نہیں' کترائی کترائی سے پھرتی ہے۔ گو کہ ہماریوں نے اس سے کبھی باز پرس نہیں کی لیکن وہ از خود ہی ان کی یہ شکایت دور کرنے کے لیے ماں جی کے کمرے میں جا بیٹھتی۔

گھل مل کر بات کرنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی ایسا شوشا چھوڑ دیتیں کہ زرمینہ بمشکل اپنی گلو خلاصی کر کے وہاں سے اٹھ جاتی۔

☆ ☆ ☆

سیٹھ نجمی کی ان کے علاقے میں کپڑوں کی چلتی دکان تھی۔ ماں جی کپڑے لینے کی خریداری ہمیشہ اسی دکان سے کرتیں۔ ان کی سیٹھ نجمی سے پرانی جان پہچان تھی۔ جب سے ماں جی جوڑوں کے عارضے میں مبتلا ہوئی تھیں تب سے سیٹھ نجمی ہر موسم میں اپنے ملازم لڑکوں کے ہمراہ نئے پرنٹ ماں جی کے پاس بھجوا دیتا۔ ماں جی پسند کر کے چند سوٹ منتخب کرتیں باقی واپس بھجوا دیتیں۔

وہ سردی' گرمی' بہار' خزاں پر بدلتے موسم میں بہوؤں' بیٹیوں کو دو' دو سوٹ دلواتیں۔ یہ روایت انہوں نے برسوں سے قائم رکھی ہوئی تھی۔ اب بھی بہار کی آمد آمد تھی۔ ماں جی نے ہمایوں سے تذکرہ کیا تو اس نے اگلے روز ہزار ہزار کے کئی نوٹ ان کے ہاتھ میں تھمائے۔ ماں جی نے فوراً" کال ملا کر سیٹھ نجمی کو کپڑے بھیجنے کے لیے کہا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا؟ کیا سوچ رہی ہو؟" اخبار سے نظریں ہٹا کر اسفند نے فائقہ کا پر سوچ چہرہ دیکھا۔

فائقہ نے گہری سانس لی۔ "جانتے ہیں اسفند! کل راحت آپا لوگ مارکیٹ گئی تھیں۔ سچ میں ایسے دیدہ زیب ملبوسات لے آئیں کہ میں دنگ رہ گئی۔ ان میں دو تو ایسے تھے کہ ان پر بری طرح میرا دل آ گیا۔"

"تو تم بھی چلی جاتیں اپنی پسند کے لے آتیں۔"

فائقہ مسکرائی۔ "خیر اب میں اتنی بھی بے حس نہیں ہوں کہ آپ دن رات محنت کر کے ایک ایک روپیہ کمائیں اور میں جا کر بازاروں میں بے دردی سے لٹا آؤں۔"

اسفند اس کی لچھے دار باتوں میں ایسے ہی تو نہیں آ جاتا تھا۔ وہ من پسند بات منوانے کے لیے سارے داؤ پیچ آزماتی تھی۔

"میں تو یہ سوچ رہی تھی ماں جی اس بار بھی سب کو سوٹ دلوائیں گی تو آپ ان سے کہیے گا۔ پچھلی بار کی طرح اس بار میرے ساتھ ناانصافی نہ کریں۔"

"پچھلی بار سارے اچھے پرنٹ راحت اور شگفتہ آپا نے لے لیے تھے۔ مجھے ماں جی نے اتنے سڑے سے پرنٹ دیے کہ پہننے کو بھی جی نہیں چاہا اس لیے تو دونوں سوٹ چپکے سے رمیصہ کو دے دیے تھے تاکہ ماں جی کی دل آزاری نہ ہو۔ لیکن اسفند اس بار بھی اگر میری حق تلفی ہوئی تو......"

"ارے تم فکر مت کرو میں ماں جی سے بات کروں گا۔" اور فائقہ کو کاہے کی فکر' وہ جانتی تھی اسفند ماں جی سے ضرور ہی بات کرے گا۔

☆ ☆ ☆

لاؤنج میں بکھرے کھلتے ہوئے رنگوں کے ملبوسات بہار کی آمد کا پتا دے رہے تھے۔ فائقہ کی تمام تر چالاکی کے باوجود راحت اور شگفتہ نے سب سے پہلے اپنے من پسند پرنٹ کے جوڑے اٹھا کر گود میں رکھ لیے۔

البتہ شہلا ہاتھ ملتی رہ گئی کہ جن جوڑوں پر اس کی نظر تھی وہ پلک جھپکتے میں فائقہ بھابھی نے دبوچ لیے تھے۔

شہلا نے منہ بنا کر گویا احسان جتاتے ہوئے سرخ' نارنجی کنٹراسٹ کے دو سوٹ اٹھائے۔ آخری جو دو جوڑے بچے اس میں بھی ایک پر شگفتہ آپا نے للچائی نظر ڈالی۔

"اف ماں جی! یہ رائل بلو کلر تو میرا فیورٹ ہے۔ ندیم کہتے ہیں یہ کلر مجھ پر جچتا بھی بہت ہے۔" ان کا مطمح نظر جان کر ماں جی نے فراخدلی سے وہ سوٹ اٹھا کر بھی اسے دے دیا۔

اور آخری بچا جوڑا زرمینہ کی طرف بڑھایا۔ جسے اس نے خاموشی سے گود میں رکھ لیا۔

☆ ☆ ☆

"زری! یہ سوٹ؟"

وہ مہران کو سلا رہی تھی۔ ہمایوں کے استفسار پر یونہی گردن موڑ کر دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔ "ماں جی نے

دیا ہے۔"

ہمایوں جانتا تھا زرد رنگ اسے پہننے اوڑھنے میں بالکل پسند نہیں تھا۔

"تو تم ماں جی کو یہ سوٹ واپس کر کے کوئی اور کلر لے لیتیں ناں۔" وہ اسے آج بہت چپ چپ سی لگی تھی۔

"ایسے مناسب نہیں لگتا ہمایوں! ماں جی کو برا لگ جاتا۔"

"اچھا کوئی بات نہیں میں دو ایک روز میں فارغ ہو جاؤں پھر خود تمہیں مارکیٹ لے جاؤں گا۔ تم اپنی پسند کی شاپنگ کر لینا۔ کافی دن ہو گئے اس مصروفیت کی وجہ سے ہم کہیں گھومنے بھی نہیں گئے اور نہ ہی تم نے اتنی دنوں سے باہر ڈنر کرنے کے لیے کہا۔ کیوں؟" وہ بیڈ پر پہلو کے بل نیم دراز ہو گیا تھا۔

"آپ مصروف تھے مجھے آپ کو پریشان کرنا اچھا نہیں لگتا۔" ہمایوں اسے دیکھے گیا۔

وہ اسے دل سے نکلی دعا کی طرح لگتی تھی۔ بہت خالص اور پاکیزہ۔

☆ ☆ ☆

وعدے کے مطابق وہ اگلے دن ہی اسے گھمانے پھرانے لے گیا۔ زرمینہ کے چہرے پر قوس قزح کے سارے رنگ اتر آئے تھے۔ آنکھوں میں گویا قندیلیں سی جل اٹھیں۔ اسے پرجوش، خوش اور مطمئن دیکھ کر ہمایوں کے دل میں ڈھیروں سکون اترنے لگا تھا۔ وہ اس کی شریک حیات تھی۔ اس کی حیات کے ہر اتار چڑھاؤ میں پوری نیک نیتی سے شریک۔

اس نے بڑی خوش دلی سے خریداری کی۔ کڑھائی کے دیدہ زیب ملبوسات، میچنگ جوتے، بیگز، کاسمیٹکس۔ وہ جس چیز پر ہاتھ رکھتی ہمایوں دلاتا گیا۔ آخر میں مہران کی ڈھیر ساری شاپنگ کر کے اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ سے کھانا کھانے کے بعد وہ بہت خوش اور مگن سی لوٹ آئی۔

☆ ☆ ☆

حیرت کی جگہ رشک اور رشک کی جگہ حسد نے لے لی۔ جب وہ اگلی صبح لاؤنج میں خوش دلی سے سب کو اپنی شاپنگ دکھا رہی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی برانڈڈ چیز، نندیں حق دق، فائقہ بھابھی کا غم و غصے کی شدت سے برا حال ہونے لگا۔

"کیسی ہیں؟ میں اتنے عرصے بعد شاپنگ پر گئی۔ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کیا لوں؟ اچھی ہیں ناں؟"

تعریف کیا ہونی تھی الٹا سب کے حسد سے بگڑتے چہروں سے خائف ہوتی وہ سب کچھ سمیٹ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

"یہ تو بہت تیز نکلی۔" فائقہ بھابھی اپنے کمرے میں جلے پیر کی بلی کی مانند چکر کاٹ رہی تھیں۔

"دیکھ لیا ماں جی! جسے آپ بھولی بھالی سمجھ رہی تھیں اندر سے کیسی چلتر نکلی۔ ہمایوں نے ایسے ہی تو ایک دن میں ہزاروں روپے نہیں لٹا دیے اس پر۔ ابھی سے اس کا کچھ کریں ورنہ سر پکڑ کر روئیں گی ایک دن۔"

اس وقت وہ سب یہ بھول گئی تھیں کہ اسی ہمایوں کے دیے پیسوں سے ماں جی ہر رسم، تہوار پر ان کے منہ مانگے مطالبات پوری کرتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

رویہ پہلے بھی سب کا اس کے ساتھ بہتر نہیں تھا لیکن اب کی بار تو جیسے سب نے آنکھیں ہی ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ جب ماں جی اور نندیں اسے یونہی بات بے بات کاٹ کھانے کو دوڑتیں تو وہ آنسو پیتی محض اپنا قصور ڈھونڈنے میں ہی ہلکان ہو جاتی۔

وہ ان کے مقابلے میں کم حیثیت گھرانے سے آئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں غریب گھر سے گندمی رنگت، دبلی پتلی سی۔ لیکن ہمایوں کی محبت اور آسائشات نے اسے کھلتا گلاب بنا دیا۔ اپنے کام سے کام رکھنے کی لگن، سلیقہ مندی، خدمت شعاری اور مروت نے اس کی شخصیت کے گرد گویا سچے موتیوں کی مالا سی پرو دی تھی۔ وہ آسودہ تھی اور مطمئن۔

باوجود اس کے کہ ماں جی اکثر اسے بری طرح جھڑک دیتیں۔ فائقہ بھابھی فطرت سے مجبور خوب داؤ پیچ لڑاتیں اور نندیں یوں رعب جماتیں گویا وہ ان کی مجبور و مسکین رعایا ہو۔ وہ سب خود ساختہ عدم تحفظ کا شکار تھیں۔

ایسے میں ایک ہمایوں اس کے لیے ٹھنڈی میٹھی چھاؤں کی مانند تھا۔ قبل اس کے کہ وہ ہمایوں سے گھر والوں کے ناروا سلوک کا ذکر کرتی وہ خود ہی اس پر نرم ٹھنڈی پھوار کی مانند برس کر اسے اندر تک شانت کر ڈالتا۔ ہر شکایت لبوں پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ جاتی۔

وہ اکثر سوچتی گھر والوں کی پست ذہنیت سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کسی دن اسے ناکردہ جرم کی پاداش میں کٹہرے میں لا کھڑا کریں۔ ایسے میں وہ ہمایوں کو کم از کم ان کے روا رکھے جانے والے برتاؤ سے تو باخبر رکھے۔ تاکہ ایسا کوئی بھی وقت پڑنے پر ہمایوں کو اس کی سچائی پر یقین کرنے میں ذرہ بھر تامل نہ ہو۔

وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہوتی تو آنکھیں برسنے لگ جاتیں۔ "مجھے یہ مناسب نہیں لگتا کہ میں ہمایوں کا دل اس کے خونی رشتوں سے پراگندہ کردوں اور اس کا ذہن منتشر ہو۔ مجھے اس کی آسودگی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے۔ کیا یہ غنیمت نہیں ہے کہ ماں جی کے ہزار بھڑکانے کے باوجود بھی وہ آج تک میرے سامنے بازپرس کرنے کھڑا نہیں ہوا؟"

وہ سجدے سے سر اٹھاتی تو دل میں ڈھیروں سکون اترنے لگتا۔

☆ ☆ ☆

اس روز وہ عجیب محسوسات سے گزرا۔ ماں جی کی طبیعت ناساز تھی۔ آپاؤں' ان کی بچیوں نے ان کے گرد گھیرا سا بنا رکھا تھا۔ اور ان سب میں گھرا ہمایوں۔

وہ مان بھرا انداز لیے بہت استحقاق سے اس پر اپنائیت جتا رہی تھیں اور وہ خود بھی تو بھانجیوں کے ساتھ ہلکی پھلکی باتوں میں مگن مسلسل مسکرا رہا تھا۔

اسے اپنا آپ عجیب سا لگا۔ کسی نے بھی اس کی آمد کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ کجا کہ اس قدر مان اور بے تکلفی سے بات کرتا۔ اس نے چائے سرو کرتی زرمینہ کو دیکھا۔ جس کے چہرے کی مدھم مسکراہٹ اس کی خوش دلی کا پتا دیتی تھی۔

فائقہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے یقیناً" اپنے کمرے میں تھی۔ اسفند عجیب ناقابل فہم تاثرات سے دوچار خاموشی سے وہاں سے اٹھ گیا۔

"اسفند! دیکھا آپ نے ماں جی کی ذرا سی طبیعت کیا خراب ہوئی انہوں نے اپنے گرد میلہ سا لگا لیا۔ صبح سے شام تک ڈاکٹر کی الگ دوڑیں لگوائیں اور ہم چاہے ہفتہ بھر بخار میں پھنکتے رہیں مجال ہے جو کبھی پروا کی ہو۔" اس کے اندر آتے ہی فائقہ حسب عادت شروع ہو چکی تھی۔

اسفند نے ناسمجھی سے اسے دیکھا' یا شاید وہ اب ہی سمجھا تھا۔

☆ ☆ ☆

شدید ذہنی انتشار کا شکار وہ آج کل اپنے کام پر توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ زرمینہ کی ناسازیٔ طبیعت کی بنا پر ماں جی نے ناشتے کی ذمہ داری فائقہ کے ناتواں کندھوں پر ڈال دی۔ اس نے لاکھ دامن بچانا چاہا' پاؤں پٹخے حسب عادت اسفند کو بیچ میں گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن اس بار کوئی ترکیب کارگر نہ ہوئی۔

باقی سب تو دیر سویر ناشتہ کرکے صبر کے گھونٹ بھر لیتے۔ لیکن اسفند کو وقت پر دفتر پہنچنا ہوتا۔ صبر آزما انتظار کے بعد ناشتہ ملتا بھی تو کبھی جلے ہوئے توس کبھی بدمزہ سی چائے۔ نتیجتاً" نہ وہ ڈھنگ سے ناشتہ کر پاتا نہ ہی دفتر وقت پر پہنچتا۔

کوئی بہت بڑی فرم تو تھی نہیں' فرم کے مالک نے پہلے پہل اس کی چھوٹی موٹی کوتاہیاں نظرانداز کیں لیکن مسلسل ناقص کارکردگی اور وقت پر نہ پہنچنے کی شکایت پر اسے صاف لفظوں میں نوکری سے نکال دیے جانے کی وارننگ ملی۔

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔

راحت آپا کی بیٹی شانزے کی سالگرہ تھی۔ چھٹی کا دن تھا سوماں جی نے سب کو وہاں جانے کا آرڈر جاری کیا۔
"ہونہہ! گفٹ بٹورنے کے طریقے ہیں سب۔ اب وہ کون سی ننھی کاکی ہے جو سالگرہ کا شوشا چھوڑ دیا۔"
فائقہ نے جانے میں لاکھ آنا کانی کی لیکن اسفند اسے سنجیدگی سے تیار ہونے کا کہتا خود بھی تیار ہونے واش روم میں گھس گیا۔
"میں کہوں اور وہ نہ مانیں ایسے تو حالات نہیں۔"
وقت کم تھا اس لیے وہ سوچیں جھٹکتی تیار ہونے لگی۔
زرمینہ نے بلیک شیفون کی نفیس کام والی ساڑھی زیب تن کی۔ بچے کی پیدائش کے باوجود بھی اس کی جسامت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ سیاہ ساڑھی اس کے متناسب جسم پر گویا جچ سی گئی۔ خود پر پرفیوم اسپرے کرتے ہمایوں نے بہت گہری نگاہوں سے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔
"اگر کوئی اچھا لگ رہا ہو تو اس کی تعریف کر دینی چاہیے۔" زرمینہ نے شرارتاً نچلا لب دباتے ہوئے کہا۔
ہمایوں فوراً" پھیل گیا۔ "اجی ہم تو ابھی کے ابھی تعریفوں کے پل باندھ دیں مگر آپ کو ہی اعتراض ہو گا۔"
"میں زبانی کلامی تعریف کی بات کر رہی ہوں۔"
"پر ہم تو لفظوں کے بجائے "عمل" پر یقین رکھنے والوں میں سے ہیں۔"
زرمینہ بوکھلائی، بے وقت کی چھیڑ چھاڑ اسے مہنگی پڑ سکتی تھی۔ سو فوراً "پرے دھکیل کر مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی۔
"جلدی چلیں سب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

✵ ✵ ✵

گو کہ سادہ سی گھریلو تقریب تھی۔ صرف شانزے کے ننھیال اور ددھیال والے ہی مدعو تھے۔ پھر بھی اچھی خاصی رونق لگ گئی تھی۔ اسفند عرصے بعد ایسی کسی تقریب کا حصہ بنا تھا۔ سب نے اس کا اچھے انداز سے خیر مقدم کیا۔ لیکن ہمایوں جیسا پروٹوکول! وہ محض دیکھتا ہی رہ گیا۔
اسے آج معلوم ہوا تھا کہ بہنوں 'بھانجیوں کے لیے ہمایوں کی موجودگی کس قدر اہم اور خوشی اور طمانیت کا باعث تھی۔
اور وہ خود کہاں تھا؟ شاید کہیں بھی نہیں۔ اپنوں کے ہجوم میں اس نے خود کو تنہا محسوس کیا۔ رشتے 'ان سے جڑا مان' کھٹی میٹھی تکرار ہی زندگی کا اصل حسن ہیں۔ اگر یہ سب نہ ہوں تو زندگی گزاری جا سکتی ہے' جی نہیں جا سکتی۔

✵ ✵ ✵

"اف توبہ! اس لیے میں وہاں جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ آپ کی بہنیں کتنی بڑی ڈراما باز ہیں اور بیٹیاں ان سے بھی دو ہاتھ آگے' آپ نے دیکھا۔"
"بس!" اسفند نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ جیولری اتارتی فائقہ ٹھٹکی تھی۔
"بس کر دو فائقہ! خدا کے لیے اب تو بس کر دو۔"
فائقہ اس کے انداز اور لہجے پر ششدر ہی تو رہ گئی۔
"تمہیں ہمیشہ ان سے شکایت رہی لیکن اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سے نکل کر کبھی تم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ انہیں تم سے کیا شکایات ہیں؟ تم نے اپنے ساتھ ساتھ میرے گرد بھی خود ساختہ محرومیوں اور گلے شکووں کا ایسا حصار کھینچ دیا کہ میں کبھی رشتوں کو اور ان سے متعلقہ چاشنی کو محسوس ہی نہیں کر پایا۔" کیسا احساس زیاں اس کے لہجے سے چیخ رہا تھا۔ فائقہ دم سادھے کھڑی تھی۔
"جانتی ہو زندگی کچھ دو کچھ لو کے اصول پر چلتی ہے لیکن تم دینے کی بجائے لینے پر ہی یقین رکھتی' ہمیشہ دوسروں سے خائف رہیں اور مجھے ان سے بدگمان کیے رکھا۔ تمہاری جھوٹی سچی شکایتوں میں آکر میں ان سے بدظن رہا۔ اپنے خونی رشتوں سے لاتعلق' ان کی

اپنائیت سے محروم!

آج ہمایوں سرخرو ہے۔ گھر کا سارا بوجھ اسی نے اٹھا رکھا ہے۔ اگر اس روز جب وہ میرے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ میں تمہاری باتوں میں آکر کم ظرفی کا ثبوت نہ دیتا تو آج میرا سر اس کے سامنے ندامت سے نہ جھکا ہوتا۔ لیکن میں سارا الزام تمہارے سر ہی کیوں دھروں؟ میرے جیسے مرد جو آنکھیں اور کان رکھنے کے باوجود بیوی کے کانوں سے سنتے اور اسی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں' ان کی جھولی ہمیشہ خساروں سے بھری رہتی ہے۔"

آج تو شاید روز حشر تھا۔ اس کے لہجے کے ٹوٹے کانچ فائقہ کو لہولہان کرنے لگے تھے۔

وہ جو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ سر اوپر اٹھا کر بولا۔ "اور آخری بات فائقہ! تمہیں میرے گھر والوں سے اتنی ہی شکایتیں ہیں تو میں تمہیں ان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ تم جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

"نہیں' نہیں...." فائقہ کا رواں رواں شدت سے نفی کر اٹھا۔ ضمیر کے آئینے میں ابھرتا عکس بہت واضح تھا۔ اب اسے عمر بھر حرف شکایت زبان پر نہیں لانا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہمایوں' ماں جی کے سامنے سر جھکا کر بیٹھا تھا۔ ماں جی مسلسل بول رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ہمیشہ کی طرح شگفتہ' راحت آپا اور شہلا۔ وہی زرمینہ کی کوتاہیاں' نافرمانیاں' من مانیاں....

وہ چپ کر کے سر جھکائے سنتا رہا' ماں جی کو وہ معمولی سی لڑکی کھٹکنے لگی تھی۔ جواب معمولی نہیں رہی تھی۔ بہنوں کو خوف لاحق تھا کہ بھائی بیوی کی باتوں میں آکر کسی دن ان کے سر سے اپنا دست شفقت اٹھا لے گا۔

اس نے بے حد خاموش نگاہ ماں جی پر ڈالی۔ جن کی خدمت اس نے عبادت سمجھ کر کی تھی۔ جن کا حکم منہ سے نکالتے ہی وہ فوراً" پورا کر دیتا۔

اس نے کچھ نہ کچھ بولتی بہنوں کی طرف دیکھا۔ جنہیں چھوٹا بھائی ہونے کے باوجود اس نے کبھی باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔

اس نے گہری سانس اپنے اندر اتاری۔ "ماں جی! میں شرمندہ ہوں' وہ آج تک آپ کی امیدوں پر پورا نہ اتر سکی۔ کبھی آنسو چھپاتی' کبھی خواہ مخواہ مسکراتی۔ اس نے کبھی مجھ سے کوئی گلہ نہیں کیا۔ سرد و گرم سہا بھی تو مجھے نہیں بتایا لیکن آپ لوگوں کی اس سے بڑھتی شکایتوں کی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کو لے کر الگ گھر میں شفٹ ہو جاؤں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا گھر کا ماحول پراگندہ ہو۔ اس کی وجہ سے آپ ذہنی اذیت سے دوچار ہوں۔ یہ مجھے گوارا نہیں کہ آپ کی آسودگی مجھے یہ ہر چیز سے بڑھ کر مقدم ہے۔"

"ہائیں ہائیں۔" ماں جی نے بوکھلا کر بیٹیوں کی طرف دیکھا جو خود متوحش سی کبھی ماں تو کبھی بھائی کا سنجیدہ چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

وہ یہ کیا کہہ رہا تھا؟ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ والی حالت ہو گئی۔

"نہ.... نہیں بیٹا! تم سے دور رہ کر کیا میں جی پاؤں گی۔ میرا سکون' میری آسودگی تم ہی سے تو ہے میرے بچے!"

"ماں جی! میں خدانخواستہ آپ کو چھوڑ کر تو نہیں جا رہا' آتا جاتا رہوں گا۔ اس کو آپ سے کوئی شکایت نہیں' لیکن آپ سب کی شکایتیں دور ہونی چاہئیں۔ آپ سوچ لیں۔"

سوچنا کیا تھا۔ پل بھر میں سود و زیاں بے باق ہو گئے تھے' انہوں نے خسارہ مول نہیں لینا تھا۔ انہیں زرمینہ کے خلاف حرف شکایت اب زبان پر نہیں لانا تھا اور دہلیز پر کھڑی زرمینہ کی آنکھیں بے ساختہ بھیگتی چلی گئیں۔

صبر' درگزر اور مستقل مزاجی کے ہتھیار ساتھ ہوں تو بعض معرکے بغیر لڑے بھی جیتے جا سکتے ہیں۔

☼

حنا گل

شادی کی تقریب اپنے عروج پر تھی۔ وہ ولیمے کے جوڑے میں ملبوس ایک پُراعتماد مسکراہٹ جو اس کے مزاج کا خاصہ تھی چہرے پہ سجائے اسٹیج پر بیٹھی تھی۔ ہنسی، باتیں، قہقہے اور ملا جلا شور تھا جس میں خوشی کی ترنگ تھی۔ دائیں بائیں کرسیوں پر کافی مہمان بیٹھے تھے جن میں کچھ تو تصویریں بنا کر اتر جاتے اور کچھ مستقل ڈیرہ جمائے مسند پر جلوہ افروز تھے اور تقریب کے آخر تک ان کے اٹھنے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ ان میں اس کی تین عدد دیورانیاں بھی مع بچوں کے شامل تھیں۔ اپنے گھر کی ہی شادی تھی پر مجال ہے جو ہاتھ بھی ہلایا ہو۔ خود کو مہمان سمجھ کر بڑے ٹھسّے سے بیٹھی تھیں اور اللہ معاف کرے بیٹھے بٹھائے ہی آفت مچا رہی تھیں۔

ارے نہیں حسن کے جلوے دکھا کے نہیں زبان کے کرشمے دکھا کر۔ ہنسی، مخول، آئے گئے پہ طنز اور بات بات پہ ٹھٹھا لگانا، چھوٹے سے لے کر بڑے بوڑھے تک سب ہی ان کے نشانے پہ تھے۔ خاندان کے لوگ بھی شاید ان کے رگ آشنا تھے۔ دور سے ہی ان آفت کی پرکالیوں کو دیکھ کر آہستہ سے کھسک

جاتے۔

عینا یوسف ان کے زرخیز دماغوں کے طنز نما تبصروں پہ تصور ہی تصور میں کوئی سو دفعہ کانوں کو ہاتھ لگا چکی تھی۔ لیکن مروت سے چہرے پہ مسکراہٹ سجائے ان کی باتوں کو سننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس کی دو شادی شدہ نندیں جو نسبتاً "نرم مزاج معلوم ہوتی تھیں" ایک دو دفعہ ہی اسٹیج پر آئی تھیں اور ماں کے ساتھ بھاگ دوڑ میں مصروف تھیں۔ ساس کے گھٹنوں نے تو اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ لیکن یہ سب ان "پٹاخہ ٹائپ" بہوؤں سے دور رہنے کے بہانے تھے کیونکہ عینا صبح ہی ان سب کے درمیان ایک واضح تناؤ کی جھلک محسوس کر چکی تھی۔ منجھلی دیورانی نجمہ عینا کو سوا سیر لگی تھی اُسے بھی نہ چھوڑتا تھا اور وقتاً "فوقتاً" تو پوں کا رخ اس کی جانب موڑ دیتی۔ اب بھی موضوع گفتگو اسی کی ذات تھی۔

"دیکھا اس ندیدی بڈھی کھوسٹ کو' کیسا اونچا ہاتھ مارا ہے' جب ہی تو پیسہ پانی کی طرح بہا رہی ہے۔ ہماری باری پہ تو دانتوں سے پکڑ کر کاٹا' اسی لیے تو نہیں کہتے نا کہ مالِ مفت دلِ بے رحم۔" اس کے قیمتی زیورات اور ملبوسات پہ چوٹ کی گئی اور ساتھ ہی بڑے بے ہنگم انداز میں ہاتھ پہ ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔ باقیوں نے بھی بھرپور ساتھ دیا۔ عینا ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھے گئی کہ ان کی بات پہ ہنسا جائے کہ رویا جائے۔

"اور ہاں سنا دلہن!" چھوٹی دیورانی نے بچی کو سنبھالتے ہوئے عیارانہ رازداری دکھائی۔ "اس نحوست ماری کو رام کرنا ابھی سے سیکھ لو ورنہ جینا حرام کر دے گی' ٹرٹر کر کے' دماغ نہ کھپانا' فوراً" الگ ہو جانا خس کم جہاں پاک۔" اور پھر سے اپنی ہی بات کا لطف لینے کے لیے ٹھٹھا مارا۔

"اف!" نفیس سی عینا یوسف نے فوراً" ہی اپنا رخ بدلا کہ اب اگر تھوڑی دیر اور۔۔۔ ان کی باتوں کو سنتی رہی تو اس کے دل کو کچھ ہو جائے گا۔

✡ ✡ ✡

عینا یوسف تین بھائیوں کی اکلوتی بہن' ایم اے پاس کرتے ہی ایک کمپنی میں اچھے عہدے پر ملازم عثمان حیدر کا رشتہ آگیا۔ بابا نے ہر لحاظ سے اس رشتے کی چھان پھٹک کی تھی۔ عثمان حیدر کے چار بھائیوں میں سے تین کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنی بیویوں کو لے کر الگ ہو چکے تھے۔ دو نندیں تھیں۔ شادی شدہ اور اپنے گھروں میں خوش۔ ایسے میں عثمان حیدر کا رشتہ کافی معقول تھا۔

عثمان حیدر اپنے ماں باپ کے ساتھ اکیلا رہتا تھا۔ بھائیوں کی بے حسی اسے رُلاتی تھی۔ سو اول تو شادی سے ہی انکاری تھا پھر ماں بہنوں کے اصرار پر یہی شرط رکھی "بھلے زیادہ حسین اور پڑھی لکھی نہ ہو لیکن شریف ہو' میں اپنے ماں باپ کو مزید کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا۔" اور یوں عینا یوسف اس کے من کی مراد بن کر آنگن میں اتر آئی تھی۔

ایم اے ڈگری ہولڈر' صبیح چہرے پہ سیاہ پُرکشش آنکھیں لیے' وہ حسن اور تعلیم کے معیار پہ تو پوری اتری ہی تھی اب آخری اور فیصلہ کن امتحان باقی تھا۔ بابا کو اپنی نازوں پلی عینا کی تربیت پر پورا اعتبار تھا وہ پُرامید تھے کہ عینا ان کی تربیت کی لاج ضرور رکھے گی۔ اپنے بابا کی آخری نصیحت عینا کے کانوں میں ابھی تک گونج رہی تھی۔

دھن رے دھنیے اپنی دھن
پرائی دھنی کا پاپ نہ بُن
تیری روئی میں چار بنولے
سب سے پہلے ان کو چُن

عینا کو شرارت سوجھی۔ "بابا! ایم اے اردو کے بعد تو آپ مجھے چچا غالب ہی سمجھ بیٹھے ہیں۔ اللہ رے اتنی گاڑھی اردو۔"

جواباً" بابا نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہاں بیٹا! اسے اپنی زندگی کا نصب العین بناؤ گی تو ہمیشہ غالب بن کے جیو گی۔"

عینا نے نا سمجھی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

✡ ✡ ✡

عثمان ہر لحاظ سے ایک بہترین رفیق سفر ثابت ہوا تھا۔ شادی کی پہلی رات بڑی نرمی اور محبت سے اسے سمجھایا۔

"عینا! اس گھر میں تمہیں ہر وہ نعمت ملے گی جو ایک لڑکی کا ارمان ہوتا ہے۔ عزت' راحت' محبت' ہر آسائش' ہاں جواباً" تمہیں اپنا دل ذرا کشادہ رکھنا ہو گا۔" اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "اس گھر میں میرے علاوہ میرے ماں باپ رہتے ہیں' میرے باپ نہایت شریف النفس انسان ہیں' رہ گیا میں تو تمہاری من موہنی صورت نے میرے من کو تو خرید ہی لیا۔ سو یہ بندہ بھی بے ضرر ہوا' بے فکر ہو جاؤ۔" اس نے شرارت اور محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔

ایک حسین مسکراہٹ نے عینا کے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا۔

"ہاں تمہارا اصل امتحان میری ماں سے نبھا کرنا ہے۔ عینا یقین کرو' میری ماں زبان کی تیز سہی لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا دل کورے کاغذ اور شفاف آئینے کی مانند ہے۔" اس نے سانس کا وقفہ لیا۔ "ان کے لہجے کی یہ سختی اردگرد کے لوگوں کے بے لچک اور تیر جیسے رویے ہیں۔ انہیں میرے اپنوں سے وہ توجہ اور محبت نہیں ملی جو اس عمر میں ان کا حق ہے۔"

بھائیوں بھابیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چہرے پہ بے پناہ سختی در آئی۔ "لیکن عینا تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم وہ کرو گی جو دوسرے نہ کر سکے۔ میری ماں کا دل اپنی محبت سے جیتو گی۔ اپنی توجہ اور چاہت کی پھوار اس آنگن پر برساؤ گی' دل جوڑنے والے لفظ بولنے ہیں ہم نے عینا ورنہ اس دودھاری تلوار کو منہ میں لیے پھرنے سے میں نے کتنے ہی گلشنوں کو آگ میں جلتے دیکھا ہے۔" عینا سر جھکائے توجہ اور احترام سے اسے سن رہی تھی کہ یہی اس کی زندگی کو سنوارنے والے اصول تھے۔

✡ ✡ ✡

شادی کے شروع کے دن محاورتاً" نہیں حقیقتاً" بہت اچھے گزرے۔ اب سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ دونوں نندیں بھی دو دن رہ کر اپنے گھروں کو سدھار چکی تھیں اور ایک ہفتے بعد عثمان نے بھی آفس جانا شروع کر دیا تھا لہٰذا عینا کو خلاف معمول بہت کم وقت آرام کا ملا تھا اور جواباً" اس نے بھی شکر ادا کیا تھا کیونکہ فارغ کا لفظ اس کی لغت سے خارج تھا۔ گھر میں بھی بھائی لیے سو مصروفیت کتنے سو ایک دو ہی دنوں میں اس نے گھر کا پورا انتظام خوش اسلوبی سے سنبھال لیا۔

عثمان صبح آفس چلا جاتا' شام میں آتا۔ سسر صاحب ذرا دیر سے اٹھتے اور نو دس بجے تک اپنے کسی دوست سے ملنے چلے جاتے' پیچھے وہ اور ساس ہی رہ جاتیں اور ابھی تک تو ان کا رویہ اچھا ہی تھا۔

"عثمان بھی نا" نقشہ۔ ایسا خوفناک کھینچا تھا کہ میرا نازک سا دل دھڑک اٹھا تھا۔ "کتنی اچھی تو ہیں یار' اماں" وہ خود سے ہی مخاطب ہوتی۔

آج صبح ہی عثمان نے آفس جاتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ تیار رہنا' شام میں باہر چلیں گے اور اب جب وہ تیار ہو کر باہر آئی تو امی سے سامنا ہوا۔

"کہاں کا ارادہ ہے بہو' جو اتنا ـــــ تیار ہوئی ہو۔" انہوں نے ناقدانہ جائزہ لیا تو عینا گڑبڑا گئی۔

"دراصل امی' وہ عثمان کہہ رہے تھے کہ شام میں باہر چلیں گے تو تیار ـــ" اسی لمحے عثمان بھی اندر داخل ہوا۔

"السلام علیکم امی' کیا حال چال ہے بھئی' عینا تیار ہو۔" ایک ہی سانس میں سب کہہ ڈالا۔

"ارے بہو! چھوٹی رابعہ آرہی ہے رات کے کھانے پہ شوہر کے ساتھ اور تم باہر کا پروگرام بنائے بیٹھی ہو۔ حد ہے' مجھ بڈھی جان سے کیا ہو پائے گا بھلا۔"

عثمان کی مسکراہٹ سمٹی۔ کچھ کہنے کو لب کھولے عینا نے فوراً" خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھی۔

"ٹھیک ہے امی' آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ وہ آرہی ہیں ورنہ میں عثمان کو

پہلے ہی منع کر دیتی' ہم کل چلے جائیں گے۔ اب رابعہ سے تو کچھ بڑھ کر نہیں ہے نا۔" اس نے چھوٹی نند کا نام لیا۔ اور خوشدلی سے انہیں تسلی دی۔

"یار! میں خوامخواہ ہی جلدی آگیا۔" وہ صوفے پر دھم سے بیٹھا چہرے پر واضح بے زاری تھی۔

لیکن زبیدہ بیگم کچھ بھی نہیں سن رہی تھیں۔ ان کا ذہن تو بس ایک ہی جملے میں اٹکا ہوا تھا۔ "اب رابعہ سے تو کچھ بڑھ کر نہیں ہے۔" کیا یہ میری بہو نے کہا ہے میری بہو نے؟ وہ تو کسی کرارے جواب کی منتظر تھیں جو فوراً" بھڑک کر آگ لگاتا ہے جیسے ایک بار منجھلی بہو کی جانب سے آیا تھا۔

"آ رہی ہے تو کیا میں اپنی شام برباد کر دوں۔ آپ کی بیٹی ہے' خود بھگتیں۔" جیسے کوئی عذاب ہو۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے۔ عثمان تیزی سے ان کی جانب لپکا۔

"امی ارے کیا ہوا...... ہم نہیں جا رہے آپ ۔"

"نہیں نہیں بیٹا۔ کون منع کر رہا ہے ضرور جاؤ۔ دیکھو بہو کتنی چاہ سے تیار ہوئی ہے' میں رابعہ کو منع کر دوں گی۔" دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں اور وہ دونوں اس کایا پلٹ پر حیران تھے۔

اچانک عثمان جاگا۔ "یا ہو.... امی زندہ باد۔" اس نے خوشی اور شرارت سے نعرہ لگایا۔ عینا اس کے انداز پر مسکرا دی۔

"امی! میں نے اسے زیادہ موجیں نہیں کروانیں آپ رابعہ کو منع مت کریں' ہم انشاء اللہ رات کے کھانے سے پہلے آجائیں گے۔ کھانا بھی ساتھ لائیں گے اور پھر سب مل کر کھائیں گے۔" وہ انہیں تسلی دے کر ان کے سر کا بوسہ لے کر پلٹی تو زبیدہ بیگم کی آنکھیں تشکر سے ایک دفعہ پھر بھیگ گئیں۔

✲ ✲ ✲

اور پھر تشکر کے یہ آنسو زبیدہ بیگم کی آنکھوں میں اکثر آنے لگے۔ چھوٹے بیٹے عثمان کے لیے لڑکی ڈھونڈتے وقت وہ کن کن خدشات کا شکار نہ تھیں

لیکن پھن پھیلائے ان خدشوں کو عینا نے ایک ایک کر کے کچلا تھا۔ پہلے پہل وہ ان زہریلے ناگوں کی منتظر رہتیں جنہوں نے گھروں کو آگ کے بھانبھڑ میں جلا ڈالا تھا' سب کچھ ریزہ ریزہ خاکستر۔

کچن میں کام کرتی عینا کو ہدایات دیتیں۔ "اپنا کھانا بنانے کے بعد ابا کے لیے پرہیزی کھانا تیار کرنا' مرچ مسالے والا ہی نہ لا کر رکھ دینا' منع ہے ان کے لیے۔"

تندی اور ترشی تو ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ سو وہ بھی ٹکرا توڑ جواب کی منتظر رہتیں جو وہ ہمیشہ سے سنتی آئی تھیں جس سے چنگاری اٹھتی اور اٹھ کر بھڑک اٹھتی۔

"نہیں ہوتے مجھ سے دو دو کام' سو بکھیڑے ہیں میرے بھی' ہاتھ پیر سلامت ہیں' خود کر لیں آکر۔" بجائے اس کے عینا کی طرف سے بڑی تابعداری اور محبت سے جواب آتا۔

"جی اچھا امی! آپ فکر نہ کریں۔ جب سے آپ نے کہا ہے میں خود ہی ان کے لیے الگ کھانا بنانے لگی ہوں۔" اور زبیدہ بیگم تو کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہتیں۔

اپنی بہوؤں کے ہاتھوں تو انہوں نے طنز کے نشتر اور نفرت کے بول ہی پائے تھے۔

"لور لور پھرتی رہتی ہے بڈھی کھوسٹ۔ اتنا بھی نہیں ہوتا صرف سبزی لا دے۔"

"امی! آپ آس پڑوس میں جایا کریں نا' دل لگا رہے گا۔ گھر میں بور بھی نہیں ہوں گی۔" ایسی محبت اور توجہ سے بھلا انہیں کس نے نوازا تھا جس سے وہ اب آشنا ہوئی تھیں۔

چھوٹی چھوٹی باتوں کا جواب بھی محبت بھرے انداز میں کہ اگلے کا نثار ہونے کا دل چاہے۔ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہتی' کچن کے برتن رات کو دھونا ان کی پکی عادت تھی۔ شامت اعمال جب ایک دن بہو کو پکار بیٹھیں۔

"کبھی تو معاف کر دیا کریں۔ دن اور رات کا چین نہیں ہے اس گھر میں' نوکر تھوڑی لگے ہیں۔ دن تو

چھوڑ رات کو بھی برتنوں کے ڈھیر دھوتے پھریں۔"
اور اب عینا کو دیکھتے ہی ایک ٹھنڈی میٹھی چھایا ہر سو چھانے لگتی۔
"امی! آپ میں مجھے اپنی ماں نظر آتی ہے' سو میرا دل لگ گیا ہے' اور یہ گھر آپ کے دم سے ہی تو مکمل ہے۔" دن ہو کہ رات ہر کام وقت پہ ایک کیف اور سکون کا پاکیزہ احساس ہر دم گھیرا کیے رہتا اور آہستہ آہستہ زبیدہ بیگم غیر محسوس انداز میں عینا کو بیٹیوں کی طرح چاہنے لگیں۔ اس میں ان کا کچھ کمال نہ تھا۔ بلاشبہ یہ عینا کا ہی کمالِ تعظیم تھا۔

☆ ☆ ☆

آج عثمان حیدر نے کمپنی میں اپنی ترقی کی خوشی میں سب کی دعوت کی تھی۔ دونوں بہنیں' تینوں بھائی مع اپنی بیگمات کے' لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ عینا کچن میں کھانے کی تیاری میں مصروف تھی اور بیک وقت تین تین کام نمٹا رہی تھی۔ سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ اندر سب خوش گوار موڈ میں باتوں میں مصروف تھے۔ تینوں بھوویں تو گھر کی اس کایا پلٹ پر حیران تھیں۔ البتہ ناک بھوں تو اب بھی چڑھا رہی تھیں۔ (ہائے ری عادت) یہ وہ گھر تو نہ تھا جسے وہ چھوڑ کر گئی تھیں اور عینا کو آئے ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔
صاف ستھرا لش پش کرتا گھر' ہر چیز ترتیب' سلیقے قرینے سے اور سب سے بڑھ کر حیران کن ساس بہو' ماں بیٹی کی طرح شیر و شکر اور پرسکون (بھلا تو کیسے؟ دانتوں میں انگلیاں) واقعی ان کے تو ارمانوں پر اوس پڑی تھی وہ تو دل میں انہیں کچھ "قیمتی گر" سکھانے کے مشورے بھی ساتھ لائی تھیں اور یہاں تو.... بات عینا کی طرف گئی تو زبیدہ بیگم کو تو بہانہ چاہیے تھا۔
"سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے مولا نے مجھے میری کون سی نیکی کا صلہ دیا ہے جسے دیکھ کر زندگی سے محبت کی جائے' ایسی نیک' شریف ہیرے جیسی لڑکی۔"
اور یہ تمام آوازیں لاؤنج کی دیوار پار کرکے کچن میں کام کرتی عینا کے کانوں میں بھی پڑ رہی تھیں جو رات کے کھانے کے لیے تیز تیز ہاتھ چلا رہی تھی۔

چاولوں کو دم پہ رکھ کر اب سلاد کے لیے ٹماٹر کاٹ رہی تھی۔ جب پیچھے سے کسی نے اس کے بال کھینچے۔ اچھل کر مڑی تو عثمان تھا۔ وہ ٹکراتے ٹکراتے بچی۔
"اللہ! آپ نے تو ڈرا ہی دیا یہاں کیوں آگئے' کمپنی وہیں نا انہیں۔" مسکرا کر لاؤنج کی سمت اشارہ کیا۔
"آں.... وہاں تو کسی محترمہ کی بڑی تعریفیں ہو رہی تھیں' ہضم نہ ہو سکیں تو یہاں چلا آیا۔" ٹماٹر کا قتلا اٹھا کر منہ میں ڈالا نٹ کھٹ شرارتی لہجہ اس کی اندرونی خوشی کا غماز تھا۔
"اوہ! جیلسی۔" وہ ہنسی۔
"نہیں یار' جیلسی نہیں تشکر۔" عثمان نے اس کے ہاتھ سے چھری رکھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "اس مکان کو گھر بنانے پر میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں' میں تمہیں اتنا بہادر نہیں سمجھتا تھا' کیسے کر لیا یہ سب عینا عثمان حیدر۔" وہ از حد سنجیدہ تھا۔ عینا سمجھتی تھی اس کا اشارہ کس جانب ہے۔
وہ شوخ ہوئی اور رازداری سے بولی "بابا اور تمہاری باتوں کو نچوڑ کر ایک نسخہ تیار کیا میں نے' نسخہ اکسیر اور ہو گیا بس۔" دھیرے سے ہاتھ چھڑائے اور سلاد کی طرف متوجہ ہوئی۔
"یار بیوی' کیسا نسخہ۔" وہ گھوم کے سامنے آیا اور اسٹول پہ اچھل کر بیٹھ گیا۔
وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ "بس اک نسخہ
"رضائے خدا کا حصول
زندگی انمول
زبان کا میٹھا بول"
دھیرے سے بتا کر شرارت سے اس کے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خشش کا اشارہ کیا تو عثمان کھلے دل سے مسکرا دیا کہ واقعی اس کی عزیز از جان بیوی نے ایسا اکسیر نسخہ ڈھونڈا تھا جس سے دل تو کیا سلطنتیں بھی فتح کی جا سکتی تھیں۔

☆

سکوئی سیف اللہ بٹ

دعا کی والدہ کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں' ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کہنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔

ریاض احمد کے دو بیٹے عمیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ عمیر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جبکہ عمر ایک بگڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔

الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد ہتھیانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایکسیڈنٹ میں معذور ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی مرجاتی ہے وہ ذہنی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

انعم اور احسن ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی میں ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن اپنا ٹیسٹ کرواتا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے' احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر

مکمل ناول

اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازیٹو آتی ہیں' وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا نروس بریک ڈاؤن ہوجاتا ہے۔ کمی اس میں ہوتی ہے۔

الیاس احمد بنیادی طور پر لالچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا اکھڑا رہتا ہے اور اپنے بھتیجے عمر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکاتا ہے۔

عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بہن بھائی دعا کو اپنی ماں کے غم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بہن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھاتی' وہ اسے ہروقت ذلیل کرتا رہتا ہے۔

دعا کو دیکھ کر الیاس احمد کا لالچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔

الیاس احمد' عمر کے کہنے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتا ہے' جسے ریاض احمد سختی سے رد کردیتے ہیں۔ عمران سے مزید برگشتہ ہوجاتا ہے۔

تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر ہمیشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بناتا ہے۔ اور عمر کو اپنے ساتھ ملالیتا ہے۔ عمر کا رویہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہوجاتا ہے۔ رابعہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں' کیونکہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمر اور دعا کی شادی ہوگئی تو باپ' بیٹے کے درمیان فاصلے کم ہوجائیں گے۔

ریاض احمد' عمیر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں' مگر رابعہ' دعا کا عمیر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کے اچھے تعلقات کو جتاتی رہتی ہیں۔ دعا کے رویے سے عمیر کھٹک جاتا ہے۔

رابعہ احمد کی کوششوں سے عمر اور دعا کا تعلق سب کی نظر میں آجاتا ہے۔ ریاض احمد کو کھیل سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ وہ عمر کو اسلام آباد برانچ کا چارج دے دیتے ہیں۔

عمیر کو دعا کا شادی سے انکار اور عمر سے تعلق کا رویہ الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ دعا بھی ممانی کی نیت کا فتور سمجھ جاتی ہے' مگر کم ہمتی اور کوئی اور ٹھکانا نہ ہونے کے سبب خاموش رہتی ہے۔

منصوبے کے مطابق الیاس احمد بیمار ہو کر ریاض احمد کے گھر جاتے ہیں جہاں دعا' عمر کے کمرے سے برآمد ہوتی ہے۔ عمر گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ رابعہ کو اس سارے ڈرامے کے باوجود دعا کی پاک دامنی پر یقین ہوتا ہے' وہ عمر کو ڈانٹتی ہیں۔ ریاض احمد صدمے سے بیمار ہو کر اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ اور دعا کو الیاس احمد اپنے گھر لے آتے ہیں' جہاں مریم اسے خوب لعن طعن کرتی ہے۔ دعا اپنی پاک دامنی ثابت نہیں کرپاتی' اس کے باوجود عمیر کا دل اسے قصوروار نہیں مانتا۔

الیاس احمد' مریم کے معذور بھائی کے لیے دعا کا نام پیش کرتے ہیں۔

الیاس احمد اپنی لچھے دار باتوں سے مریم اور رابعہ احمد کو دعا کی آصف سے شادی پر راضی کرلیتے ہیں۔ ریاض احمد اور نوال کے کہنے پر عمیر' دعا کو اس کی شادی سے ایک روز قبل الیاس کے چنگل سے چھڑالیتا ہے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اس کے سوتیلے بھائی کے دروازے پر چھوڑ آتا ہے۔

اس کا سوتیلا بھائی ملک چھوڑ کر جاچکا ہے۔ دعا گھر فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمر نے عمیر کو گولی ماردی ہے۔ نوکرانی اسے کہیں اور جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ بہت بری حالت میں دعا اپنی دوست انعم کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اسے اپنے حالات بتاتی ہے۔

انعم لاؤنج ٹیبل پر بیٹھی کافی پیتے ہوئے احسن کو دعا کی ساری روداد سنا چکی تھی۔ اس کی خاموشی میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کی محبت میں انعم کا ساتھ 'انکار' اثبات 'بھرم' مان ہر تعلق بہت بامعنی تھا۔

"بٹ انو' تمہاری فرینڈ کی بھی میسٹیک ہے۔ اگر اس کا کزن عمر اس پر غلط نگاہ رکھتا تھا تو اسے کم از کم اپنے ماموں کو انفارم کرنا چاہیے تھا۔ شاید وہ لڑکا محتاط ہو جاتا۔" گفتگو سننے کے بعد اس کے دل میں پہلا خیال یہ ہی آیا تھا۔

"ہاں 'اس سے یہ غلطی ضرور سرزد ہوئی ہے بٹ احسن! جہاں تک اسے میں جانتی ہوں' وہ اتنی ہی معصوم اور بزدل ہے۔ وہ اسکول و کالج لائف میں کینٹین کے رش میں کبھی اپنے لیے جگہ نہ بنا پائی۔ اب جبکہ وہ ان کے گھر میں پناہ گزین تھی۔ وہ کیسے اتنی جرأت کر لیتی۔ وہ بے چاری چپ چاپ اپنے سوتیلے بھائی کے گھر لوٹ آئی' لیکن یہاں بھی قسمت نے اس کے ساتھ دھوکا کیا' اس کا بھائی وہ گھر سیل کر کے انگلینڈ شفٹ ہو گیا ہے۔ اس کے لیے کوئی کانٹیکٹ نمبر تک نہیں چھوڑا۔" انعم نے پوری تفصیل بتادی۔

دعا کی منت سماجت پر اس نے احسن سے' اس کی رات کو عمر کے کمرے سے برآمدگی اور الیاس احمد کی قید میں رکھنے والی بات ہضم کر لی تھی۔ جو ہو چکا' اس میں دعا کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ ایک نامحرم کے گھر میں رہتے ہوئے اس کے سامنے نظریں جھکا کے نہیں جی سکتی تھی۔ اس معمولی سی بات سے انعم کے رشتے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے والا تھا' اس لیے وہ رضامند ہو گئی۔

"اس کے ماموں اپنے بڑے والے بیٹے سے اس کی شادی کروا دیتے۔" احسن کو نئی سوجھی۔

"یہ نادر مشورہ تم ماموں جان کو جا کے دے آؤ۔ خود سے تو انہیں کبھی خیال نہیں آیا' نہ ان کے بیٹے کو۔" عمیر کے ذکر پر انعم کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا۔ اسے سب سے زیادہ غصہ اسی ڈرپوک اور بزدل مرد پر تھا۔ جو اسے اپنی محبت کا مان تک نہ دے سکا۔

"اچھا لیٹس سپوز' اگر دعا نے سب جھوٹ بولا ہو تو۔"

"جسٹ بی کوائٹ احسن! میں تمہارا سر توڑ دوں گی' میں پچھلے سوا دو گھنٹے سے تمہیں جھوٹ سنا رہی ہوں۔" انعم موبائل پر وقت دیکھ کے چیخ پڑی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں جان! تم بہت انوسینٹ اور سوفٹ ہارٹڈ (نرم دل) ہو' ہر کسی کے چکر میں یوں ہی آ جاتی ہو۔" احسن کو اپنا بچاؤ مشکل لگا۔

وہ غصے کی تیز تھی' برا مان جاتی تو مشکل سے ہی مانتی تھی۔ جبکہ احسن کو پل بھر کی ناراضی گوارا نہیں تھی۔

"میری دوستی صرف دعا تک محدود نہیں' بلکہ اس کے گھر میں بھی آنا جانا تھا۔ اس کی والدہ نہایت شریف اور باپردہ خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی تربیت بھی اسی نہج پہ کی ہے اور پھر ماما جان بھی ان کی فیملی کو اچھے سے جانتی ہیں' تم ان سے کنفرم کر لو۔" اس نے سختی سے تردید کی۔

"فائن' میرے لیے یہ ہی کافی ہے کہ تم اپنے ٹینس سرکل سے نکل آؤ گی اور اپنی فرینڈ میں اتنی بزی ہو کہ مجھے دن بھر ایک کال تک کرنا بھول گئیں۔" اس نے منہ بسور کے شکوہ کیا۔

"اوہ۔۔۔ رئیلی سوری۔" اس نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ ایسا بہت سالوں میں پہلی بار ہوا تھا۔ "یہ حادثہ دعا جیسی کمزور اعصاب کی لڑکی کے لیے بہت بڑا ہے۔ وہ بہت کنفیوژ اور ڈری ہوئی ہے' اسے اس وقت توجہ اور تحفظ کی بہت ضرورت ہے۔" انعم کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

"میں نے یوں ہی کہہ دیا' تم اسے پراپر ٹائم' میڈیسن اور غذا دو' اس کی تندرستی اور نارمل لائف کی طرف لوٹنا' اب ہماری ذمہ داری ہے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی بیوی کی مجبوری کو پوری سنجیدگی سے لیا۔

"تھینکس احسن۔" وہ دل سے بے حد ممنون تھی۔ وہ بھی مسکرا دیا' ان دونوں کی خوشی مشترکہ تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ عشاء کی نماز ادا کر کے انگلیوں پہ تسبیح پڑھ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ سے بہت سی دھند چھٹ گئی تھی۔ انعم بہت اسٹریٹ فارورڈ، ضدی اور مغرور لڑکی سہی، لیکن وہ بہت نرم اور ہمدرد سا دل بھی رکھتی تھی۔ اگر اس نے دعا کو اپنے گھر میں رکھنے کی ذمہ داری اٹھائی تھی تو وہ خوش اسلوبی سے نبھانے والی تھی۔ اب اس کا دل عمیر کے لیے پریشان تھا۔

اسے عمر نے گولی اسی کی وجہ سے ماری تھی۔ سارے غم ایک طرف، لیکن عمیر کو جو زخم اس کی وجہ سے پہنچا تھا، وہ اس کا دل چیر گیا تھا۔ وہ مر کے اس کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی تھی۔ اگر اسے عمر کے اس حد تک گر جانے کا احساس ہو جاتا تو وہ کبھی بھی وہاں سے نہ نکلتی، چپ چاپ شادی کروالیتی، عمیر کو یہ تکلیف نہ پہنچتی۔ اس کا حال احوال دریافت کرنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ملازمہ کے منع کرنے کے بعد اب وہ مزید کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دعا کی شکل میں دونوں ہاتھ اٹھالیے، بس یہ ہی وہ کر سکتی تھی۔

"میں اس نامحرم کے لیے اپنے رب سے کیا مانگوں سوائے اس کے کہ اس نے برے وقت میں، میری مدد کی اس کی حفاظت کرنا میرے مولا، اسے شیطان کے شر سے محفوظ رکھنا، میری وجہ سے اسے کوئی زک نہ پہنچے، میرے باپ جیسے ماموں کی وہ آنکھوں اور کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔ اس ٹھنڈک کو، ان کی آنکھوں کے نور کو صحت و سلامتی عطا فرما، بے شک تو ہی معبود اور عطا کرنے والا ہے۔"

"دعا.... دعا...." انعم اسے پکار رہی تھی۔ اس نے منہ پر ہاتھ پھیر کے جاء نماز لپیٹی۔

"آجاؤ انعم...." اس نے اجازت دی۔

"میں تمہیں ڈنر کے لیے بلانے آئی تھی۔" وہ اندر داخل ہوئی۔

"پلیز انو! برا مت ماننا، اگر تم کھانے کی ٹرے یہیں بھجوا دو تو...." اس نے انعم کے تاثرات دیکھتے بات ادھوری چھوڑی

"وجہ؟" اس نے سینے پر بازو باندھے۔

"کچھ سولڈ نہیں۔ بس میں احسن کا سامنا نہیں کر سکتی۔" اس نے نظریں چراتے اپنے اندر کا سچ بتایا۔

"تم کب تک اور کس کس سے ڈرو گی، تمہیں اسی دنیا میں سروائیو کرنا ہے، فیس کرنا سیکھو، ہر مرد کو ایک ہی رخ سے دیکھو گی تو فیوچر کیسے پلان کرو گی، تمہارے ساتھ جو بھی ہوا، اس میں سب سے اسٹرانگ پوائنٹ تمہاری بزدلی تھی اور اب آگے کے لیے تم پھر وہی کرنے جا رہی ہو۔ ڈیٹس اے ویری گڈ اسٹیپ۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے دعا کو داد دی۔

اس کا کہا ایک ایک لفظ دعا کے اندر تک سرائیت کر گیا، وہ کتنا درست تجزیہ کرنے لگی تھی۔

"یقین کرو انو! میں احسن کے بارے میں ایسا کچھ بھی غلط نہیں سوچ رہی۔ وہ تمہارے حوالے سے میرے لیے بہت ریسپیکٹ ایبل ہیں۔ میں اندر سے بہت ٹوٹ گئی ہوں۔ میں.... میں...." اس سے مزید بولا نہ گیا۔ اس کے ہاتھ اور آواز کانپنے لگی۔ انعم کو اس کی کیفیت سمجھ میں آ رہی تھی۔

"سوری دعا! اب تم غلط سوچ رہی ہو۔ میں تمہیں صرف سمجھا رہی تھی۔ ورنہ جیسے تمہیں اچھا لگے، تم ویسے ہی کرو۔" انعم کو خود پر افسوس ہوا۔

دعا کو ابھی اپنے اندر کا ڈر ختم کرنے اور ہمت پیدا کرنے کے لیے بہت سا وقت درکار تھا۔ وہ یک دم اس دھچکے سے نہیں نکل سکتی تھی۔

"ٹھہرو انعم.... میں ٹیبل پہ آتی ہوں۔" دعا نے پہلی دفعہ خود سے اتنی جلدی کوئی فیصلہ لیا۔

مڑتی انعم کے قدم رک گئے۔ "ضرور آؤ۔" دعا پیروں میں چپل اڑستی اپنی حفاظت و نگہبانی کی دعائیں دہرانے لگی۔

☆ ☆ ☆

عمر اگلے روز رات گئے گھر لوٹا تھا۔ رابعہ احمد کو کسی پل چین نہیں تھا، نہ ان کی آنکھوں میں نیند اتری

تھی۔ ان کے مجازی خدا ان سے ازحد خفا تھے۔ وہ انہیں اپنے قریب بھی دیکھنا گوارا نہیں کر رہے تھے۔ بڑا بیٹا جس کی فرماں برداری پہ انہیں شک نہیں تھا۔ ماں کی خدمت اس کی زندگی کا مقصد تھی۔ اس کی ہر پسندیدہ چیز' شرٹ' جوتے' پرفیومز' بیڈ رومز حتیٰ کہ کھانے پینے والی چیزوں تک کو عمر اپنی دسترس میں لے لیتا۔ وہ نرمی اور بے چارگی سے کہتیں۔

"عمیر پلیز بیٹا' وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔"

وہ مجبور ماں کا ہاتھ تھام کے چومتا۔ "ماما جان! آپ نہ بھی کہتیں' میں تب بھی اس سے جھگڑا نہیں کرتا' بلکہ مجھے اس کی نیچر پہ ہنسی آتی ہے۔ سم ٹائم جو چیز مجھے اچھی نہیں لگتی یا میں اسے ملازم کو دینے کا سوچ رہا ہوتا ہوں وہ اسے میری فیورٹ سمجھ کے اپنے قبضے میں کرلیتا ہے۔ اسے صرف مجھ سے چڑ ہے' میں اپنی محبت اور نرمی سے اس کے اندر کی نفرت کو ختم کردوں گا' یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔"

رابعہ احمد کے کانوں میں عمیر کے الفاظ گونجے۔

وہ ان کے ہر دکھ سکھ کا ساجھی تھا۔ انہوں نے کبھی اس کی پسند و ناپسند' خواہشات اور جذبات تک کو سیریس نہیں لیا تھا۔ ان کے لیے عمر ہی اہم رہا تھا۔ وہ اس کے لیے ناشتا بناتیں' اسے کچھ اور کھانا ہوتا' فوراً سے دوسرے ناشتے کی تیاری' وہ ہر کام کرواتا بھی ماں سے تھا اور ساتھ میں نقص نکالتا جاتا اور وہ اس کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ سب برداشت کیے جاتیں۔ وہ عمیر کی ہر خوشی اور خواہش کے آڑے آیا تھا اور برسوں بعد یہ آگاہی انہیں کسی پل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ انہیں اس بدبخت کا انتظار تھا۔

لاؤنج کا دروازہ کھلا' وہ جیکٹ ہاتھ میں پکڑے کی چین گھماتا داخل ہوا۔ رابعہ احمد جو صوفے پر اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں تیر کی سی تیزی سے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ عمر تھوڑی پیے ہوئے تھا' لیکن اس نے بپھری ہوئی ماں کو نوٹ کرلیا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ماں کے چہرے پر ہمیشہ والی نرمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ مفقود تھی۔

رابعہ احمد کا ہاتھ اٹھا اور اتنی زور سے عمر کے گال پر پڑا کہ اس جوان مرد کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ یہ ماں کا وہ ہاتھ نہیں تھا جو اس کے منہ میں نوالے ڈالتا تھا۔ بلکہ یہ ماں کا وہ والا ہاتھ تھا جو جوان بیٹے کے خون سے لتھڑا تھا۔ وہ ذرا سا لڑکھڑایا اور سرخ پڑتی شعلہ باز نگاہیں لیے سیدھا ہو گیا۔

"واٹ نان سینس' شرم نہیں آئی آپ کو' میرے گال پر تھپڑ مارتے ہوئے۔ میں اس حرکت کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" اس کی اکڑ برقرار تھی۔ وہ آنکھوں میں سوالیہ نشان لیے کھڑا تھا۔

رابعہ احمد کا پھر سے ہاتھ اٹھا' لیکن بڑی دیدہ دلیری سے وہ ہاتھ بیچ رستے میں ہی پکڑ لیا گیا۔ "بس ماما! آپ میری نرمی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتیں' آپ ماں ہیں میری' اس لیے لحاظ کر رہا ہوں' ورنہ..." وہ اپنے ہوش حواس سے بے گانہ ہو رہا تھا۔

"کیا ورنہ..... بولو' ورنہ کے بعد..... تم کیا کرو گے' ہاتھ توڑ دو گے میرا' یا میرے منہ پر جواباً تھپڑ مارو گے۔" وہ غصے سے بپھر گئیں۔

"تمہاری یہ جرأت' میرے جوان بیٹے پر گولی چلائی' اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا اور تم اس سب پر شرمندہ بھی نہیں ہو۔" وہ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑنے لگیں۔ وہ ہسٹریائی ہو رہی تھیں۔ نوال اور ریاض احمد کی ناراضی کا غصہ بھی اس کی طرف نکلتا تھا۔ اس نے ان سے سب رشتے دور کر دیے تھے۔

"ہاں میں نے چلائی گولی۔" اس نے چیختے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا لیا۔ "شکر کریں کہ چلائی' ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھلنی کردوں اور اپنے قدموں میں تڑپ تڑپ کے اس کے مرنے کا منظر دیکھوں۔" وہ انتہائی نفرت سے پھنکارا۔

وہ ششدر رہ گئیں' ان کی زبان تالو سے جا لگی۔ ان کی پلکیں تک جھپکنا بھول گئیں۔

"بچہ ہے' نادان ہے ریاض! سمجھ جائے گا۔"

"وہ تم سے چھوٹا ہے عمیر' امیچور ہے اس کے اندر بچپنا زیادہ ہے' ورنہ دل کا بہت اچھا ہے میرا عمر۔"

انہیں دور سے اپنی آواز سنائی دی۔
وہ تواس کی پردہ پوشی کرتی آئی تھیں۔ اس کے لیے احتجاج کرتیں' دلیلیں دیتیں۔ آج اس نے سب سچ ثابت کردیا تھا۔ وہ جھوٹی پڑ گئی تھیں۔ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھیں۔
"تم حاسد ہو' تمہارے دل میں اتنا بغض' اتنا کینہ بھرا ہے' اپنے بڑے بھائی کے لیے' اپنے خون کے لیے۔" دکھ کی شدت سے ان سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔
"بڑا بھائی' آخ تھو....." اس نے زمین پر تھوکا۔
"ہاں' نفرت ہے مجھے اس رشتے سے' اپنی بہن اور باپ سے بھی۔ جب آپ ان کی طرف داری کرتی ہیں تو آپ بھی مجھے بری لگتی ہیں۔" عمر کے دماغ کو نشہ چڑھ گیا تھا۔ وہ غصے میں زور سے چلا رہا تھا۔
"تمہیں اتنی نفرت ہے ہم سب سے تو چلے کیوں نہیں جاتے' کیوں ہم سب کے ساتھ رہ رہے ہو' دفع ہوجاؤ' نکلو میرے گھر سے۔" وہ غصے سے روتے' بولتے اسے دھکے دینے لگی تھیں۔
عمر نے زور سے ان کے بازو پکڑ لیے۔ "جسٹ اسٹاپ اٹ اینڈ بی کوائٹ' آپ کے اس طرح رونے دھونے اور اموشنل بلیک میلنگ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا' میں اپنے رشتے کی تمام رکاوٹیں دور کر کے ہی دم لوں گا اور یہ گھر میرا بھی ہے۔ میرا حصہ ہے اس گھر میں' اور میں یہاں سے کہیں نہیں جانے والا۔ آپ چاہے اپنے بیٹے کو لے آئیں یا شوہر کو۔"
وہ ماں کو پرے دھکیلتا' لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ رابعہ احمد حق دق اس کے الفاظ پر حیرت زدہ' سانس روکے گم صم کھڑی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

پچھلے تین دن سے مریم نے خود کو کمرے میں لاک کر رکھا تھا۔ وہ الیاس احمد کے آفس جانے کے بعد نکلتی اور ان کے آفس سے آنے سے قبل پھر سے خود کو کمرے میں بند کر لیتی۔ تبریز ملک نے اسے آصف ملک کی میت کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا تھا۔
الیاس احمد اس کایا پلٹ پر از حد پریشان تھے۔ وہ دوسروں کا برا چاہ رہے تھے اور خود ان کے ساتھ کتنا برا ہوگیا تھا۔ گھر کا ماحول کھنچاؤ کا شکار تھا۔ بچے الگ سہمے ہوئے تھے۔
اس روز الیاس احمد بارہ بجے کے قریب بڑی خاموشی سے گھر آگئے۔ وہ سامنے والے روم میں کارپٹ پر بیٹھی صوفے پر سر رکھے ہوئے تھی۔ قدرے بکھرے بال' ملگجا حلیہ انہیں کسی کی یاد دلا گیا تھا۔ چند دن پہلے اسی لٹے پٹے انداز میں دعا بیٹھی اپنی قسمت پر حیران تھی۔ الیاس احمد جیسے سخت دل شخص کا دل لمحہ بھر کو ٹھہرا سا گیا۔
"مریم....." انہوں نے قریب جا کے کندھے پر ہاتھ دھرا' اس لمس اور پکار پر وہ بدک گئی۔
"دور ہٹ جاؤ مجھ سے' مت چھوؤ مجھے' تم قاتل ہو میرے بھائی کے' مجرم ہو تم..... مجرم ہو۔" وہ انہیں اپنے قریب پا کے دیوانہ وار چیخنے لگی۔
"چپ ہوجاؤ مریم' پلیز چپ ہوجاؤ' حوصلہ کرو' جو بھی ہوا' اس سب میں میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے غلط فیصلہ کیا۔ اپنے گھر اور بچوں کا سوچو' سب کچھ ڈسٹرب ہوگیا ہے' پلیز مجھے معاف کردو' پلیز مریم۔" انہوں نے مریم کے دونوں ہاتھ تھام رکھے تھے۔ ان کی آواز میں ندامت اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔
"تم نے بہت برا کیا الیاس بہت برا' میرا میکہ برباد کردیا' بڑے بھائی صاحب مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے' میں مرجاتی الیاس....." وہ پھر سے زور' زور سے رونے لگی۔
"چپ کر جاؤ مریم! بھائی صاحب کے سامنے میں ہاتھ جوڑ لوں گا' لیکن اس سے پہلے ان لوگوں کو سبق سکھانا ضروری ہے جنہوں نے تمہیں اس حال تک پہنچایا۔ ایک بار اس کم بخت دعا کا پتا چل جائے' دیکھنا میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔" الیاس احمد نے دانت پیستے ہوئے حریم سے زیادہ خود کو آس دلائی۔ اگر فی الوقت دعا ان کے سامنے آجاتی تو وہ اسے کچا چبا جاتے۔

"عمیر نے اچھا نہیں کیا الیاس۔۔۔" اس نے آنسو صاف کیے۔

"اُسے فی الحال تو اپنے کیے کی سزا مل گئی' لیکن میرا انتقام یہیں ختم نہیں ہوا' میں ان باپ' بیٹوں کو ترسا ترسا کے ماروں گا' جس طرح تم سے تمہارا بھائی چھینا ہے' انہیں بھی ایک دوسرے سے دور کردوں گا' ڈونٹ وری' دیکھنا عنقریب سب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگا۔" الیاس احمد کی آنکھیں اندر جلتی آگ سے سرخ پڑ گئی تھیں۔

مریم اپنا دکھ اور رونا دھونا بھول کے ان کے چہرے پر پھیلی وحشت کو تکتی رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

چوتھے روز عمیر کی حالت قدرے بہتر تھی۔ اس نے اور نوال نے زبردستی' ریاض احمد کو گھر بھجوا دیا تھا' تاکہ وہ چند گھنٹے ریسٹ کرکے تازہ دم ہو جائیں۔ عمیر اب سہارا لے کر بیٹھ سکتا تھا اور ہلکی غذا بھی لے رہا تھا۔

"نوال! ماما جان اسپتال آئی تھیں؟" عمیر نے باپ کے نکلتے ہی سوال کیا۔

"کیا آپ کو واقعی ماما جان کا انتظار ہے۔"

نوال کو شاک لگا۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی وہ ماں کا پوچھ رہا تھا۔

"بہرحال وہ ماں ہیں میری۔" وہ مضمحل لہجے میں بولا۔

"وہ بہت بری ماں ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت شرم آرہی ہے۔" نوال بہت زیادہ دل گرفتہ تھی۔

"ماما بری نہیں ہیں' لیکن جو انہوں نے حرکت کی ہے' وہ واقعی بہت شرمناک ہے۔" عمیر کی اپنی الگ ہی سوچ تھی۔ وہ ابھی بھی اس عظیم رشتے کو مارجن دے رہا تھا۔ وہ جانتے بوجھتے اس سے سب کچھ چھین کے بھی ماں ہی کے رتبے پر قائم تھیں۔

"میں اور دعا انہیں آئیڈیلائز کرتے تھے بھائی! ان کی سوچ' مسکراہٹ ان کے دھیمے پن کو وہ ایپری شیٹ کرتی تھی۔ ماما نے اسے کتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ پاپا جان نے غصے میں دو' ایک بار عمر کو گھر سے نکالنے کی بات کی تو ماما جان مضبوط دیوار کی طرح ان کے سامنے ڈٹ گئیں' عمر کے لیے اسٹینڈ لیا اور دعا۔۔۔ جو پرائی بیٹی اور امانت تھی اُسے خود اپنے ہاتھوں سے دربدر کردیا' کیا اب وہ دوبارہ زندگی بھر کسی رشتے پر اعتبار کرسکے گی۔

پتا نہیں اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا' وہ چپ چاپ سہتی گئی' اس نے ہم سے بھی کچھ شیئر نہ کیا' نہ جانے کتنے زخم لے کر وہ ہمارے گھر سے نکلی ہے۔ ہم کبھی اس لڑکی کی تکلیف اور دکھوں کا ازالہ نہیں کرسکیں گے کبھی نہیں۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھے زار زار رونے لگی تھی۔ اس کے اندر پلتے دکھ کو باہر آنے کا رستہ مل گیا تھا۔

عمیر خاموش رہا' وہ لفظ بہ لفظ سچ کہہ رہی تھی۔ کچھ یہ ہی کیفیت اس کے دل کی بھی تھی۔ لیکن وہ شاید نوال کی طرح دلیر نہیں تھا کہ یوں سارا سچ اگل دیتا۔ اس کے دل کا ایک کونا ابھی بھی ماں کے لیے دھڑکتا تھا۔ اس کے اعصاب تھک چکے تھے۔ اس میں روتی نوال کو چپ کرنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔

✡ ✡ ✡

رابعہ احمد لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی قمیص کی ترپائی کررہی تھیں۔ ریاض احمد ناک کی سیدھ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ سب کچھ وہیں پھینک کے ان کے پیچھے لپکیں۔ وہ الماری کھولے کھڑے تھے۔

"السلام علیکم!" کچھ جھجکتے ہوئے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" تلاش روکے بغیر زور سے جواب دیا گیا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟" انہوں نے مداخلت کرنے کی ہمت پکڑی۔

انہیں مطلوبہ سوٹ مل گیا تھا۔ سو بغیر جواب دیے ہینگر لیے وہ واش روم کی طرف چل دیے۔ رابعہ احمد تم

آنکھیں لیے بیڈ پر ٹک کے ان کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ پندرہ منٹ کا انتظار بہت کٹھن اور دشوار تھا۔ ان کے درمیان عمر کی وجہ سے چھوٹا موٹا اختلاف ضرور ہوتا تھا' لیکن ایسی خاموشی اور نظر اندازی کبھی اختیار نہیں کی گئی تھی۔

وہ واش روم سے تولیے سے بال رگڑتے نکلے۔ تولیہ اسٹینڈ پر ڈالا اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔ ان کا رویہ ایسا تھا جیسے کمرے میں ان کے سوا کوئی اور نہ ہو۔ وہ خود اٹھ کر ان کی طرف گئیں۔

''آپ کے لیے کھانے کو کچھ لاؤں۔'' انہوں نے تھوک نگل کے پوچھا۔

نوال ایک گھنٹہ قبل ہی ناشتا لے کر گئی تھی۔ وہ صبح کا ناشتا بہت ہلکا پھلکا لیتے تھے۔

''نہیں....'' مختصر انکار کرکے وہ بالوں میں کنگھا پھیرنے لگے۔

''چائے یا کافی۔'' انہوں نے پھر ہمت باندھی۔

اب کے زبان کے استعمال کے بجائے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا گیا۔ کنگھا رکھ کے وہ بیڈ کی طرف بڑھ گئے۔ رابعہ احمد کا دل ٹوٹ سا گیا۔

''عو.... عمیر کیسا ہے؟'' انہوں نے تھوک نگلا۔

''ان فارچونیٹلی (بدقسمتی سے) بچ گیا۔'' انہوں نے لائٹ آف کی اور لیٹ گئے۔ رابعہ احمد کا دل چاہا کہ وہ تیز تیز آواز میں رونے لگیں۔ اتنی بے اعتنائی۔ وہ تو ایک نگاہ غلط بھی ڈالنا گوارا نہیں کر رہے تھے۔

''آپ کے پیر دبا دوں۔'' وہ پھر سے قریب ہوئیں۔ وہ اکثر سوتے ہوئے پیر دبواتے تھے۔ اس سے انہیں پرسکون نیند آتی تھی۔

''ہرگز نہیں' پلیز میری نیند ڈسٹرب مت کرو۔'' اب کے لہجے میں واضح ناراضی تھی۔

کمرے میں ہلکا اندھیرا تھا اور رابعہ احمد کی آنکھوں میں مکمل اندھیرا چھا گیا۔ انہیں اب بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بے آواز روتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ ریاض احمد کو بہت دنوں بعد اپنا بستر نصیب ہوا تھا۔ وہ جلد ہی سکون کی وادی میں اتر گئے۔

☆ ☆ ☆

دعا' انعم کی دیکھ بھال اور ہر وقت ساتھ چپکے رہنے سے بہت تیزی سے زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ وہ کچن' لاؤنج' بیڈ روم اور لان میں واک کرتے اسکول و کالج کی یادیں دہراتی مسکرانے لگی تھی۔ احسن کا سامنا کرنے سے وہ بڑے محتاط انداز میں گریز برتتی۔

''دعا! آج شام ہم شاپنگ پہ جا رہے ہیں' رات کا ڈنر بھی پلان میں ہے۔'' انعم پاپ کارن کا پیالہ لیے دھپ سے اس کے سامنے بیٹھی۔

''شاپنگ.... کس قسم کی شاپنگ۔'' دعا نے ایک بے تکا سوال داغا۔ وہ باہر جانے کا سن کر اندر سے سہم گئی تھی۔ لیکن اس نے انعم پر واضح نہیں کیا تھا۔

''شاپنگ کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ تھینکس فار دا انفارمیشن۔'' انعم برا منہ بنا کے تیز تیز پاپ کارن کھانے لگی۔

''نہیں میرا مطلب تھا کہ کیا خریدنا ہے۔'' دعا ہچکچانے لگی۔ اسے اسکول اور کالج لائف میں بھی انعم کی ناراضی سے ڈر لگتا تھا' لیکن تب کے ڈر اور اب کے ڈر میں بہت فرق تھا۔

''تمہارے کپڑے' صرف تن کے ایک سوٹ میں یہاں آئی تھیں۔ کافی دنوں سے میرے کپڑے استعمال کر رہی ہو جو تمہیں تھوڑے لوز ہیں۔ اس طرح اچھا نہیں لگتا' اب تم ہماری فیملی ممبر ہو' تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔'' انعم نے اس کا گال کھینچا۔

''اگر مجھے کسی نے دیکھ لیا انو' تو بہت برا ہوگا۔ وہ مجھے واپس لے جائیں گے۔'' دعا نے وجہ بتائی۔

''کتنی بھولی ہو تم میڈم! احسن چوہدری کے گھر پر مہمان ہو' اس ملک کی سیاست میں ہماری چھٹی پشت حصہ ڈال رہی ہے۔ ہم گردن کٹوا دیتے ہیں' لیکن اپنی زبان سے نہیں پھرتے۔ ان لوگوں کا ڈر اپنے ذہن سے کھرچ دو۔ تمہیں کوئی کہیں نہیں لے جاسکتا۔'' انعم نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے مضبوطی سے دلاسا

دیا۔
"تم احسن کے بغیر ڈنر کرلوگی۔" دعا نے اسے ڈاج دینے کے لیے نیا نکتہ اٹھایا۔
"اب میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی' شام کو تیار رہنا' شاپنگ ہم دونوں کریں گے اور ڈنر کے لیے احسن ہمیں جوائن کرلیں گے۔" انعم نے آنکھیں نکالتے ہوئے اسے بتایا۔
دعا کھسیانی سی ہنسی ہنس دی۔

✡ ✡ ✡

عمیر کو اگلے روز ریاض احمد نے ڈسچارج کروالیا تھا۔ یوں بھی وہ لیٹتے' بیٹھتے اور ڈریس لگوا کے اوب گیا تھا۔ رابعہ احمد پورچ میں کھڑی اس کا انتظار کررہی تھیں۔ انہوں نے نوال کے نمبر پر بھی کال کی تھی کہ وہ عمیر سے بات کروادے' لیکن اس نے عمیر کے سونے کا بہانا کردیا۔ جیسے ہی گاڑی پورچ میں آکے رکی' انہوں نے پھرتی سے آگے بڑھ کے عمیر کی سائڈ کا دروازہ کھولا۔ ریاض احمد فرنٹ سیٹ سے اترے۔
"عمیر میرے بچے' تم ٹھیک ہونا۔" ان کی بے تابی قابل دید تھی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کراسے اترنے میں مدد دی۔
"میں ٹھیک ہوں۔" جواب دیتے وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اترا۔ اسے سیدھا ہو کے بغیر سہارے کے چلنے میں دشواری تھی۔
"پاپا جان! مجھے اندر لے جائیں۔" اس نے ڈرائیور سے گاڑی سے سامان نکلواتے باپ کو پکارا۔
"میں تمہیں لے جاتی ہوں۔" رابعہ احمد نے اس کا بازو پکڑلیا۔
"آپ کو تکلیف ہوگی' پاپا جان لے جائیں گے۔" اس نے سنجیدگی سے انکار کرکے باپ کو دیکھا۔ جو اس کے دائیں طرف آکے کھڑے ہوگئے تھے۔
وہ ان کے کندھے کے گرد بازو لپیٹ کے چلنے لگا۔ رابعہ احمد کو محسوس تو ہوا' لیکن اس کے تندرست ہو کے لوٹنے کی خوشی زیادہ تھی۔
"عمیر! میں نے تمہارے لیے بہت ساری ڈشز بنائی ہیں جو ساری تمہاری فیورٹ ہیں۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ بھی اس کے برابر بیٹھ کے بڑی خوشی سے بتانے لگیں۔
"تھینک یو' آپ نے میری خوشی کے لیے اتنی زحمت کی۔" خاصا لیا دیا سا انداز۔
"کیا میں اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتی۔" ان کے دل میں کھٹکا سا ہوا۔ عمیر کا رویہ بھی باپ اور بہن سے مختلف نہیں تھا۔
"آپ میرے اور میری خوشی کے لیے کیا کچھ کرسکتی ہیں' یہ میں بہت سالوں سے دیکھتا آرہا ہوں۔" کڑوا سچ سیدھا منہ پر۔
ریاض احمد خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ بھی ان کی طرح رابعہ احمد کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ ماں کے اندر تک خالی پن چھا گیا۔ انہیں شاید ابھی بھی اس بیٹے سے تھوڑی سی نرمی کی توقع تھی۔
"پاپا جان' میں اپنے بیڈ روم میں ریسٹ کروں گا' مجھے بہت تھکن فیل ہورہی ہے۔" وہ پھر سے مدد کے لیے باپ کو پکار رہا تھا۔
"ہاں چلو' میں ذرا خود بھی فریش ہو کے آفس کا چکر لگالوں' نوال سے کہتا ہوں کہ تمہارے کھانے کی ٹرے کمرے میں ہی پہنچادے۔" زخم لگانے میں ریاض احمد نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔
"عمیر! میں نے تمہارے لیے سامنے والا بیڈ روم سیٹ کروایا ہے۔ ابھی تمہیں سیڑھیاں چڑھنے میں دقت ہوگی۔" رابعہ احمد نے پژمردگی سے اطلاع دی۔ ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔
"مجھے اپنی جگہ پہ جاکے ہی سکون ملے گا۔" عمیر نے مڑے بغیر دل گرفتی سے کہا اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔
وہ واپس نہیں پلٹا تھا اور نہ ہی اب اسے پلٹنا تھا۔ بے شک اس سے ماں کی آنکھوں میں جمی نمی اور ہونٹوں سے کوکتا دکھ چھپا نہیں رہ سکا تھا۔

✡ ✡ ✡

عمر اپنے کیے پر بالکل شرمندہ نہیں تھا اور نہ ہی اسے کسی کی پروا رہی تھی۔ وہ ان لوگوں کے متعلق سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ ماں نے اسے بلانا چھوڑ دیا تو اس نے بھی ماں کو دوبارہ مخاطب کرنا ضروری نہ سمجھا۔ وہ اپنا ہر کام ملازمہ سے کروالیتا' دن بھر پڑا سویا رہتا اور رات باہر گزار دیتا۔

رابعہ احمد کے دل و دماغ پر صرف عمیو اور ریاض احمد چھائے ہوئے تھے۔ ان کی ناراضی اور خاموشی انہیں تکلیف میں مبتلا رکھتی۔ وہ رات سارے کام نپٹا کے کمرے میں آئیں تو ریاض احمد کمر کے بل لیٹے سو چکے تھے یا سونے کی ایکٹنگ کررہے تھے۔ ان کا دل چاہا کہ وہ انہیں ہلائیں' لیکن اب تو بات کرنے سے قبل کئی منٹ سوچنا پڑتا' غیر ضروری بات کا جواب وہ سر ہلا دیتے یا پھر خاموش رہتے۔ وہ گومگو کی کیفیت میں بیٹھی تھیں کہ باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔

"ریاض! اٹھیں' دیکھیں باہر کیا ہورہا ہے؟" انہوں نے گھبرا کے شوہر کو جھنجوڑ ڈالا۔

"کیا ہوا؟" وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے۔

"باہر شور..." وہ کہتے ہوئے باہر کو لپکیں۔ ریاض احمد بھی ان کے پیچھے تھے۔

عمیو بھی جاگ گیا تھا' اوپر ریلنگ پر کھڑا تھا۔ لاؤنج میں کھڑا عمر زور زور سے چلا رہا تھا۔ وہ نشے کی حالت میں تھا۔ اس کے قدم بار بار لڑکھڑاتے تھے۔

"سب کو ماردوں گا' کوئی نہیں بچے گا' اگر اس نے میرے پیسے نہ دیے تو ایک ایک سے بدلہ لوں گا' سب نے مل کر میرا بیڑا غرق کیا ہے۔ تم... تم ریاض احمد! تم شروع سے میرے دشمن رہے ہو۔ اگر مجھے ایک کروڑ نہ ملا تو میں پھر سے تمہارے لاڈلے کو گولی ماردوں گا' بار بار ماروں گا' سب تباہ و برباد کردوں گا۔ مم... میں دیکھ... لوں گا۔" وہ بکتا جھکتا لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔

ریاض احمد اس کی باتوں کو یوں ہی بلاوا سمجھ رہے تھے۔ جبکہ عمیو نے اس کی گفتگو کا لفظ بہ لفظ غور سے سنا اور ذہن نشین کیا تھا۔ رابعہ احمد دروازے کی چوکھٹ پکڑے وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

"عمیو! تم اپنے روم میں جاؤ' اس کتے کو بھونکنے دو' اس کے گلے میں بھی پٹا ڈالنا پڑے گا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اندر چلے گئے۔

رابعہ احمد وہیں چوکھٹ سے لگی اپنا سب کچھ لٹ جانے کا ماتم کررہی تھیں۔ بس یہ ہی ایک کمی رہ گئی تھی' اب وہ نشہ بھی کرنے لگا تھا' یا پھر انہیں پتا نہیں تھا۔ ریاض احمد کو بیوی کے دکھ کی پروا نہیں تھی۔ کیونکہ جو دکھ ان کے کلیجے کو لگا تھا' وہ بہت بڑا تھا' اس کا مداوا کوئی نہیں کرسکتا تھا۔

وہ تنہا بے یار و مددگار بیٹھی اپنے لٹ جانے کا ماتم کررہی تھیں۔ شوہر' بیٹے اور بیٹی کے چھن جانے کا ماتم۔ وہ کس کس کو روتیں اور کس تکلیف پر صبر کرتیں۔

✡ ✡ ✡

وہ اپنے بیڈ روم سے ملحقہ ٹیرس پر کھڑی ٹھنڈی ہوا کا مزا لے رہی تھی۔ اس کے سیاہ سلکی بال جو آگے سے کٹے ہوئے اس کے گالوں کے اطراف پہ پڑے اٹھکیلیاں کررہے تھے۔ آنکھوں کا سیاہ کاجل اور سرخ لپ اسٹک لگے ہونٹ ہوا کی شرارتوں اور رقص پر دھیما دھیما مسکرارہے تھے۔ وہ بہت مطمئن اور مسرور تھی۔ تب ہی موبائل کی بیل ہوئی تو وہ ٹیرس کی ریلنگ کو چھوڑ کے اندر آگئی۔

"السلام علیکم ماما!" اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام میری جان' خیریت' تم بہت خوش ہو انو۔" ہزاروں میل دور بیٹھ کے بھی اس خوشی کو محسوس کرلیا گیا تھا۔

"آپ کو پتا چل گیا۔" وہ ذرا حیران نہیں ہوئی تھی۔

کیونکہ ان کے درمیان ایسا ہی انوکھا بندھن تھا۔ وہ اس کے ہر رنگ اور ڈھنگ سے اس قدر آگاہ تھیں کہ اسے کبھی کبھار خود کو تلاش کرنے کے لیے ان کے پاس جانا پڑتا۔

"اپنا سوال مت کرو' میرے کا جواب دو۔" انہوں

نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"جی ہاں' میں کافی دن سے بہت خوش ہوں' خود کو بہت ہلکا اور ایزی فیل کرتی ہوں۔ ایسے جیسے اچانک بہت بھاری بوجھ مجھ پر سے ہٹ گیا ہو۔" وہ غیر محسوس انداز میں ان سے سب شیئر کرنے لگی۔

اس کی زندگی میں صرف دو افراد تھے جن سے وہ اپنا آپ چاہ کر بھی چھپا نہیں سکتی تھی۔ ایک احسن اس کا محبوب شوہر' مجازی خدا اس کے سامنے وہ اپنا اندر کھول کے رکھ دیتی تھی۔ لیکن دل آرا بیگم کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ خود جان جاتی تھیں۔

"آپ کو یاد ہوگا' میری ایک ہی بیسٹ فرینڈ تھی' میری بر تھ......"

"دعا کا ذکر کر رہی ہو۔" انہوں نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ انہیں صرف دوست کا نام ہی نہیں بلکہ شکل تک بھی یاد تھی۔ ان کی حاضر دماغی قابل رشک تھی۔

"جی وہی' وہ آج کل میرے پاس ٹھہری ہوئی ہے۔" انعم نے جوش سے بتایا۔ دوسری طرف چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

"ہیلو....." انعم نے خاموشی کو جا پکڑا۔

"ہیلو ماما....." اس کی آواز میں بے تابی ابھری۔

"تمہارے پاس' مطلب تمہارے گھر میں....." انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"جی ہاں....." اس نے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" ان کا لہجہ بگڑا۔

"اس کیوں کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے جو پھر کبھی سناؤں گی' آپ بتائیں پاپا جان ٹھیک ہیں۔" ٹھنڈی ہوا اس کے مزاج پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

"پاپا جان ٹھیک ہیں' ایک دم فٹ' ان کا شوگر لیول نارمل ہے' تم مجھے دعا کی اسٹوری سناؤ' مزید کچھ نہیں۔" دل آرا کا لہجہ سنجیدگی سے لبریز تھا۔

انعم کو ان کے لہجے اور ٹون کی بخوبی پہچان تھی۔

اسے چارو ناچار سب کچھ اول سے آخر تک بتانا پڑا۔ بالکل اتنے ہی شدومد سے جو وہ احسن کو بتا چکی تھی۔

اس کہانی کا اتنا حصہ حذف کر لیا تھا۔ جو احسن سے بھی مخفی رکھا گیا تھا۔ انہوں نے سب سن کے بغیر کوئی تبصرہ کیے فون بند کر دیا۔

اسے دل آرا کی چپ کھٹکی تھی۔ وہ ٹوں ٹوں کرتے موبائل کو کان سے ہٹا کے گھورنے لگی۔

✡ ✡ ✡

ریاض احمد آفس کے لیے تیار ہو کے' عمیر کے روم میں آ گئے۔ وہ روز آفس ناشتا کر کے نہیں جاتے تھے۔ رابعہ احمد پھرتی سے ٹرے بنا کے ان کے پیچھے عمیر کے روم میں آ گئیں۔ وہ کوئی فائل آگے کیے اس پر ڈسکس کر رہے تھے۔

"یہ ناشتا کر لیں۔" انہوں نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔

ریاض احمد کو دل میں اس چالاکی پر بہت غصہ آیا۔

"نہیں' میں آفس جا کے کر لوں گا۔" وہ فائل بند کر کے اٹھ گئے۔

رابعہ احمد کا چہرہ لٹک گیا۔ عمیر نے ماں کو دیکھا تو دل بھر آیا۔

"تم کہو ناں عمیر اپنے پاپا جان سے' پتا نہیں آفس میں کچھ ٹھیک سے کھاتے بھی ہیں کہ نہیں' دوپہر کے پرہیزی کھانے کے لیے بھی منع کر دیا ہے۔" انہوں نے عمیر کو اپنا سفارشی بنایا۔

"میں نکلتا ہوں عمیر! تم ناشتے کے بعد ہلکی پھلکی واک ضرور کرنا' اللہ حافظ۔" وہ بیوی کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے بیٹے کو نصیحت کرتے نکل گئے۔

"پاپا جان بتا رہے تھے کہ انہوں نے آفس میں شیف رکھ لیا ہے۔ ناشتا اور کھانا وہی بنایا کرے گا۔"

اس نے سنجیدگی سے اطلاع دی۔ اور چپل پیروں میں اڑس کے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ خالی کمرے میں ٹیبل پر دھری بھری ناشتے کی ٹرے کو گھورتی رہ گئیں۔ ان کا دماغ یہ سن کر سائیں سائیں کر رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ دونوں بیٹھی مووی دیکھ رہی تھیں۔ انعم پورے

انہماک سے۔ جبکہ دعا کا دھیان بھٹکا ہوا تھا۔ انعم زیادہ ٹائم اس کے ساتھ لگی رہتی' تاکہ اسے اپنا ماضی اور تکلیف میں گزرا وقت یاد نہ آئے اور وہ خود کو ان لوگوں میں آسانی سے ایڈجسٹ کرلے۔ لیکن دعا کا ذہن کہیں نہ کہیں بھٹک ہی جاتا تھا۔ رابعہ احمد نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا' وہ ابھی تک اس کے لیے حیران کن تھا۔ نوال ایک بار بھی الیاس احمد کے گھر اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہتا کہ کہیں سے نکل کے ریاض ماموں آجائیں اور وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کے بے تحاشا روتی جائے۔ پھر وہ ان کی گود میں سر رکھ کے سو جائے۔ ان کے سینے سے اسے اپنی ماں کی مہک آتی تھی۔ دعا کے لیے ان کا سینہ اتنا ہی فراخ تھا جتنا اس کی ماں کا۔

اسے اپنے یقین پہ بھی شک نہیں تھا کہ اس سینے میں اس کے لیے اتنی ہی وسعت تھی' جتنی اس کی ماں کے ممتا بھرے سینے میں۔ اس نے اپنی زندگی کا سب سے پہلا اور خود مختار فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ عمیر یا اس گھر میں کسی کو کال کرے گی نہ ہی لوٹ کر جائے گی۔

انعم کے دیے حوصلے اور ہمت نے اس کی قوت ارادی کو مضبوط کردیا تھا۔

"اب یہ اس اسٹرائیک میں پکڑا جائے گا۔ ہے نا؟؟" انعم نے بات کرتے گردن موڑ کے دیکھا' وہ نہ تو ٹی وی دیکھ رہی تھی' نہ اس کی آواز سن پارہی تھی' وہ اپنی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"دعا... اے دعا۔" اس نے اونچی آواز میں پکارا۔

"آں... ہاں... کیا ہوا؟" دعا چونک گئی۔

"ان یادوں کے آسیب سے فرصت پانے کے لیے میں نے مووی لگائی تھی اور تم پھر سے گم ہوگئیں۔" اس نے برا سامنہ بنایا۔

"میں سوچ رہی تھی انو کہ اچھے دوست بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ میں نے خود ہی تمہاری شادی کے بعد تم سے کانٹیکٹ نہیں کیا' کیونکہ تم احسن کے ساتھ بہت خوش اور بزی تھیں۔ میں نے سوچا' تم اپنی میرڈ لائف میں اچھے سے سیٹل ہو جاؤ' اگر میں تم سے رابطے میں ہوتی تو عمر کی حرکت ضرور شیئر کرتی اور تم یقیناً" مجھے درست مشورہ دیتیں اور میں آج اس حال کو نہ پہنچتی۔" دعا نے سسکی بھری۔

"انیف یار' اب پھر سے ڈپریس مت ہو جانا۔" انعم ریموٹ رکھ کے اس کے قریب جا بیٹھی۔ "اچھے خاصے موڈ کا بیڑا غرق کردیتی ہو۔ تم میرے گھر میں محفوظ ہو' اب ان ظالم لوگوں کو یاد کرنا چھوڑ دو' ان تلخ یادوں پہ کتنا روؤ گی۔"

"میں نے اپنے ماموں کے اعتبار کو توڑا ہے۔ انہیں میری وجہ سے بہت تکلیف پہنچی ہے۔" اس کے آنسو نکل آئے۔

"تم خود کو مضبوط اور اس قدر پاور فل کرلو کہ اپنے لیے لڑ سکو' اگر وہ زندگی میں کبھی تمہارے سامنے آئیں تو تم ثابت قدمی سے اپنا دفاع کرسکو۔ جب تمہارا کوئی قصور ہی نہیں تو تم کیوں چھپو اور کیوں روؤ۔"

اس نے اپنے کندھے سے اس کا چہرا ہٹا کے آنسو صاف کیے۔

دعا خود پر ضبط کرتی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

✡ ✡ ✡

الیاس احمد دن بھر اپنے آفس کی ریوالونگ چیئر گھماتے رہتے یا پھر اٹھ کے آفس سے ملحقہ بیڈ روم میں جا لیٹتے۔ ان کے ذہن میں ہر وقت کروڑوں کی جائیداد اور عمیر کے دھوکے کا غلبہ چھایا رہتا۔

سالے صاحب کی ناراضی' مریم کا ڈپریشن' وہ ہر دو تین ماہ بعد چند لاکھ کسی نہ کسی بہانے نکلوا لیا کرتے تھے۔ مریم کو باقاعدہ دو فیکٹریوں کا کرایہ بھی آتا۔ اب اس سب سے چھٹی۔ لالچی الیاس احمد کے ہاتھوں کے توتے اور راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔ چند لاکھ کی انکم کا ذریعہ بھی بند ہوگیا تھا۔ مریم کا رونا' دھونا اور ناراضی الگ سے برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔

"عمیر احمد! تمہیں میں چھوڑوں گا نہیں' ایسی

حادثاتی موت ماروں گا کہ تمہاری لاش دیکھ کے' تمہارا مریض باپ خود بھی قبر میں جا پڑے گا' عمر بھر باپ میرے ہر کام میں روڑے اٹکاتا رہا' اب بیٹا اٹھ کھڑا ہوا۔"

الیاس احمد نے دانتوں میں غصہ چبا چبا کے نکالا۔ ان کی آنکھیں خون آشام تھیں۔ ان کا بس چلتا تو عمیر کے سینے میں چھ گولیاں خود اتار دیتے۔ وہ اس روز کے بعد ریاض احمد کے گھر یا عمیر کی اسپتال عیادت کرنے نہیں گئے تھے۔

موبائل کی بیل ہوئی تو وہ اپنے خیالات سے چونکے۔ اسکرین پر عمر کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔

"ہیلو..." سانس خارج کر کے غصہ کم کیا گیا۔

"ہیلو چاچو' آپ نے پھر کیا فیصلہ کیا ہے۔" عمر نے چھوٹتے ہی کہا۔

"کیسا فیصلہ؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"میرے حصے کی رقم کب دے رہے ہیں۔" اس نے صاف پوچھا۔

"کیسی رقم؟ کون سا حصہ۔" وہ آگ بگولہ ہو گئے۔

"دیکھیں چاچو؟ آپ جو کہتے گئے' میں بالکل ویسا ہی کرتا گیا' میرا کام دعا کو اپنے جال میں پھنسا کے' الزام تراشی کر کے' اپنے گھر والوں کی نظروں میں گرا کے' آپ کے گھر تک بھیجنا تھا اور میں نے سب کچھ بہت کامیابی اور ہوشیاری سے کر لیا۔ لڑکی آپ کے گھر سے فرار ہوئی' مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی' اب مجھے میرا طے شدہ معاوضہ چاہیے' ایک روپیہ بھی کم نہیں لوں گا' بتائیں' کب دے رہے ہیں رقم۔"

عمر کا لہجہ بے باک تھا۔ الیاس احمد کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کا لفظ بہ لفظ سچ تھا۔

"دیکھو عمر! ابھی میں مینٹلی بہت ڈسٹرب ہوں۔ میرا سالا اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کے بعد جائیداد کا بٹوارہ کرنے والا تھا۔ ان ہی پیسوں میں سے میں تمہارے حصے کی رقم تمہیں دے دیتا' اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آخری دم پر آ کے ساری بازی ہی الٹ..."

"مائنڈ اٹ چاچو جان۔ ہماری بدقسمتی نہیں' صرف آپ کی بدقسمتی' مجھے اس طوطا کہانی سے کوئی کنسرن نہیں' میں نے لڑکی آپ کے حوالے کر دی تھی۔ اسی کام کا معاوضہ طے ہوا تھا اور یہ حصہ وجائیداد کی اسٹوری مجھے مت سنائیں' آپ پلیز میری رقم مجھے ٹرانسفر کریں۔" عمر کے لہجے میں ضد اور ڈھٹائی واضح تھا۔

"عمر! مجھے ایک بہت ضروری کال آ رہی ہے۔ میں تم سے بعد میں کانٹیکٹ کرتا ہوں۔"

الیاس احمد کو کوئی مناسب جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ انہوں نے فٹ سے جھوٹ گھڑ کے اپنی جان چھڑائی۔ لیکن کب تک وہ جھوٹ سے کام چلا سکتے تھے۔ کیونکہ عمر پیسے کے معاملے میں اپنے چچا کی طرح ہی حریص تھا۔

☆ ☆ ☆

فراغت سے اکتا کے دعا نے کچن سنبھال لیا۔ اس کا پہلا روز تھا' انعم کو یقین نہیں تھا کہ اتنی خاموش' بے وقوف اور دبو قسم کی دعا کو کچھ پکانا آتا ہوگا۔ وہ اس کے سر پر کھڑی کمنٹری کر کے اسے پریشان کر رہی تھی۔ دعا نے اس کا ہاتھ پکڑ کے' لاؤنج کے صوفے پر لا بٹھایا اور خود تسلی سے کام نپٹانے لگی۔ باہر بیٹھی انعم ہر دو منٹ بعد اس سے معلومات لے رہی تھی۔

ٹیبل لگی تو دعا کافی گھبرائی ہوئی سی تھی۔ ان کے گھر کا شیف بھی اچھا پکا لیتا تھا۔ احسن اور انعم نے ڈونگوں کا ڈھکن اٹھایا۔ مٹن بریانی' چکن روسٹ' سلاد' رائتہ اور پاستا احسن نے پہلا نوالہ لیا اور نگلنے تک اس کی نگاہیں دعا کے چہرے سے ہٹ نہ پائیں۔ انعم چباتے ہی شروع ہو گئی۔

"واؤ' ویری یمی' امیزنگ' اتنی ذائقہ دار بریانی میں نے پہلے کبھی نہیں کھائی۔" انعم ایک ہی سانس میں بے تحاشا بولے گئی۔

"آئی ایگری ود یو۔" احسن نے انعم کی طرف دیکھا۔

"میں نے بہت ٹریول کیا ہے۔ بہت سی علاقائی اور غیر ملکی ڈشز ٹرائی کی ہیں' لیکن جو مزا اور خوشبو آپ کے ان چاولوں میں ہے۔ وہ سب سے منفرد اور الگ سی ہے۔" احسن نے بھی اپنے حصہ کی تعریف کی۔

"کاش آج میری امی جان زندہ ہوتیں۔ وہ بھی بالکل ایسا ہی پکاتی تھیں' میں نے کوکنگ ان سے سیکھی۔ وہ بھی ہر کسی سے یوں ہی تعریفوں کے ڈھیر سمیٹتی تھیں۔ آپ دونوں کے یہ الفاظ میرے لیے بہت انمول ہیں۔" دعا افسردہ ہو گئی۔

"اچھا اب رونے دھونے مت بیٹھ جانا' جلدی سے کھانا کھاؤ' پھر ہم باہر آئس کریم کھانے چلیں گے' تمہیں آئس کریم بہت پسند ہے نا۔" انعم نے اس کا دھیان بٹا دیا۔

دعا مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆
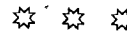
رابعہ احمد بجھ کے رہ گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ریاض احمد ان سے کیوں ناراض ہیں' لیکن وہ سمجھتی تھیں کہ جو ہو چکا اس میں ان کا قصور بہت تھوڑا سا ہے۔ اس تھوڑے نے ہی تابوت میں آخری کیل ٹھونکی تھی۔ ان میں حوصلہ نہ تھا۔ وہ شوہر سے ان کی بے اعتنائی اور گریز کے متعلق آواز اٹھا سکتیں۔ شام میں آ کے اسٹڈی روم میں بند ہو جاتے۔ جو بھی کام ہوتا ملازمہ سے کہا جاتا۔ دعا سے ان کا رشتہ اور محبت رابعہ احمد سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ وہ اپنے دکھوں کا مداوا خود کو سزا دے کے کر رہے تھے۔ رابعہ احمد کو اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اس جرم کی اتنی سخت سزا ملے گی۔ ان کی سگی اولاد تک انہیں کٹہرے میں کھڑے کیے ہوئے تھی۔

وہ دن بھر جلے پیر کی بلی کی مانند سارے گھر میں باؤلی ہوئی پھرتیں' کسی کام میں دل نہ لگتا' بیشتر کام ملازموں پر آ پڑے تھے۔ وہ بے خبر تھیں۔

"خورشید آپا۔ خورشید آپا۔" نوال آوازیں دیتی آ رہی تھی۔ وہ دال میں کھوئی ہوئی سی ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ اس پکار پر چونک گئیں۔

"جی چھوٹی بی بی۔" خورشید چولہے کی آنچ دھیمی کر کے پلٹی۔

"مجھے ناشتا بنا کے دیں۔" اس نے کھڑے کھڑے کہا۔

"جی بی بی۔" خورشید تابع داری سے فریج کی طرف بڑھی۔

"میں بنا دیتی ہوں ناشتا۔" رابعہ احمد ٹرے رکھ کے اٹھیں۔

"نہیں' آپ رہنے دیں' خورشید ہے نا' وہ کر لے گی۔" اس نے مکمل سنجیدگی سے' نرم آواز میں ٹوک دیا۔

"پہلے بھی تو میں ہی کرتی تھی۔" وہ بے بس ہو گئیں۔

"پہلے اور اب میں بہت فرق ہے۔" نوال ان سے نظریں نہیں ملاتی تھی۔ کیونکہ ان نظروں میں ہمیشہ سے ماں کے لیے احترام رہا تھا۔

"تم کالج نہیں گئیں۔" رابعہ احمد نے موضوع بدلا۔

"میرا دل نہیں چاہتا۔" اس نے ٹیبل پر پڑا نیوز پیپرز اٹھا لیا۔

"خورشید آپا' ناشتا باہر لے آئیں۔" وہ اخبار پڑھتی باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

انعم اپنے پیروں پر کیوٹیکس لگا رہی تھی۔ جب لیپ ٹاپ پر کام کرتے احسن نے سر اٹھایا۔

"انو! تمہیں ماما جانی کی کال آئی تھی؟"

"ہاں چند دن قبل میں نے دعا کا بتایا تو بغیر کوئی تبصرہ کیے انہوں نے فون بند کر دیا۔" اس نے ناخنوں پر پھونک ماری۔

"انہوں نے مجھے بھی کال نہیں کی' میں نے کال کی تو سرونٹ نے بتایا کہ وہ ضروری کام سے باہر نکلی ہیں۔ پاپا جان تو یورپ کے ٹور پر ہیں۔ ان سے بھی بات نہیں

ہو پا رہی' وہ کافی بزی ہیں۔" اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

"میرا دل ان کے لیے اداس ہو رہا ہے۔" اسے اچانک والدین کی یاد ستانے لگی۔

"تمہارا میسیج انہیں مل گیا ہوگا' وہ خود کال کرلیں گی۔"

انعم کیوٹیکس رکھ کے اس کے قریب آگئی' جانتی تھی کہ اب اس پر کافی دیر اداسی کا غلبہ رہے گا۔

"نو! میرا دل ریلیف لینے کو چاہ رہا ہے۔ کیا خیال ہے' کینیڈا ماما جانی سے ملنے چلیں' تھوڑا سا چینج بھی مل جائے گا۔" احسن نے اپنے دل کی بات کہی۔

انعم نے اس کی گردن میں بازو ڈال دیے۔ احسن نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک کے آنکھیں موند لیں۔ جب سے اسے اپنے بانجھ پن کا پتا چلا تھا۔ وہ دل آرا سے ملنے سے کتراتی تھی۔ احسن' انعم سے محبت کرتا تھا' لیکن جو عقیدت و احترام اس کے دل میں' اپنی ماں کے لیے تھا اس کے آگے انعم کی محبت خاصی کمزور پڑ جاتی۔ انعم بھی دل آرا سے بہت محبت و احترام سے پیش آتی۔ انہوں نے اسے پالا تھا۔ اس میں اور اپنے بیٹے احسن میں کبھی فرق نہیں کیا تھا۔ بلکہ انعم کو اکثر محسوس ہوتا کہ وہ اسے' احسن پر ترجیح دیتی ہیں' حقیقتاً" ایسا ہی تھا وہ بیٹی ہونے کی حیثیت سے اسے زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ لیکن انعم کے دل میں چور چھپ گیا تھا۔

احسن اندرون اور بیرون ملک اتنی بڑی اسٹیٹ کا وارث تھا۔ وہ ہر چھ ماہ یا سال بعد ضرور کینیڈا جاتی' اب دو برس سے اس نے جانا چھوڑ دیا تھا۔ پچھلی بار دل آرا آئیں تو انعم سایے کی طرح' ان سے چپکی رہی۔ وہ انہیں احسن کے پاس بہت کم تنہا بیٹھنے دیتی۔ اس کے دل کو دھڑکا لگا رہتا۔

"وہ احسن ابھی ہم کیسے جا سکتے ہیں' یو نو ویل' دعا آئی ہوئی ہے' اسے یوں اچانک سے اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا' ابھی وہ اتنی مشکل سے تو سنبھلی ہے۔" انعم نے کافی سوچ کے بہانا گھڑا۔

"میں اکیلا ہی چند روز کے لیے چلا جاتا ہوں۔ مجھے امی بہت یاد آرہی ہیں۔ اپنے فرینڈز سے ملے بھی کافی عرصہ ہوگیا ہے۔"

اس کا لہجہ تھکن زدہ تھا۔ انعم کو لگا کہ ساری تھکن اس کے جسم میں اتر گئی ہے۔

"میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔" ایک مضبوط دلیل۔ "چند گھنٹے تمہیں دیکھے بغیر' پتا نہیں کیسے کٹتے ہیں' رو' رو کے برا حال ہو جائے گا میرا۔ صرف تھوڑا سا مزید ویٹ کرلو' پھر ہم دونوں ایک ساتھ جائیں گے۔"

اس نے احسن کے سینے پر تھپکی دی۔ اس کے پاس اپنی محبت ہی ٹھوس وجہ تھی۔ وہ اس سے واقعی اتنی محبت کرتی تھی کہ اگر وہ اسے ازراہ مذاق بھی تپتی دھوپ میں کھڑا ہونے کو کہتا تو وہ کھڑی رہتی۔

☆ ☆ ☆

عمیر اور ریاض احمد شام کی چائے لان میں پی رہے تھے۔ رابعہ احمد خود ٹرے انہیں دینے آئی تھیں۔ ٹرے ٹیبل پر رکھ کے' وہ چند لمحے کھڑی رہیں کہ شاید کوئی انہیں بھی بیٹھنے کو کہہ دے۔ وہ دونوں انہیں مکمل طور پر نظرانداز کیے اپنی باتوں میں مگن رہے تو وہ دل برداشتہ سی اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

"پاپا جان! اب میں پہلے سے کافی بہتر فیل کرتا ہوں' آئی تھنک کل سے مجھے آفس جوائن کرلینا چاہیے۔"

عمیر نے چپس کا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ گھر میں پڑے پڑے وہ اوب گیا تھا۔

"تم نے ہی ساری زندگی آفس سنبھالنا ہے۔ چند روز مزید ریسٹ کرلو۔" ریاض احمد نے اعتراض کیا۔

"تو پاپا جان' ناؤ' آئی ایم فٹ' کہیں بھی تکلیف نہیں ہے مجھے' بغیر سہارے کے چل پھر سکتا ہوں' پیٹ بھر کے کھا لیتا ہوں' پلیز مجھے جوائن کرنے دیں۔" وہ بضد تھا۔

"اوکے' جیسی تمہاری خوشی۔" ریاض احمد نے اجازت دے دی۔

٭ ٭ ٭

وہ ادھر ادھر گھوم پھر کے اپنا وقت گزارتا۔ اسے الیاس احمد کی طرف سے ملنے والی رقم کا شدت سے انتظار تھا۔

"تم کب تک اپنا بزنس اسٹارٹ کرو گے عمر۔" احتشام نے ایک فائل چیک کرتے یوں ہی سرسری سا پوچھا۔

"کیوں اکتا گئے ہو مجھ سے' نہ آیا کروں۔" عمر جو صوفے پر ڈھیلے انداز میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا' چڑ گیا۔

"میرا ایسا کچھ مطلب نہیں' تم بلاوجہ اپری ٹیٹ ہو رہے ہو' میں نے بس یوں ہی پوچھا تھا۔" احتشام نے احتیاط برتتے فائل بند کردی۔

وہ اس کا کالج لائف سے فرینڈ تھا۔

"صرف چند روز کی بات ہے۔ اچھا خاصا کام آخر پہ آکے بگڑ گیا' میں خود بہت اپ سیٹ ہوں۔" عمر نے گہرا کش لگایا۔

"میں نے بہت اچھی لوکیشن پر فیکٹری دیکھی ہے۔ کرایہ بھی بہت مناسب ہے اور مشینری بھی بہت سستے میں مل رہی ہے۔ کل بھی مالک کی کال آئی تھی' ایڈوانس مانگ رہا تھا' اسے کوئی مجبوری ہے' اس لیے سب اتنے سستے میں سیل کررہا ہے' پاپا نے تمہاری وجہ سے اسے روکا ہوا ہے' ورنہ خریدار تو اور بھی بہت سے ہیں۔" احتشام نے کرسی جھلاتے اسے تفصیل بتائی۔

"کرتا ہوں کچھ..... جلد ہی....."

عمر نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلی اور جھٹکے سے اٹھ کے کمرے سے نکل گیا۔ احتشام نے افسوس سے سر ہلایا۔

٭ ٭ ٭

مریم صوفے پر منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ اس کا موڈ بگڑا ہی رہتا تھا۔ نہ اسے بچوں کے کسی کام میں دلچسپی تھی نہ شوہر اور گھرداری میں۔ الیاس احمد کو دیکھتے ہی ہتھے سے اکھڑ جاتی۔ وہ اپنی بھائی کی موت اور دوسرے بھائی کی ناراضی کا باعث ان ہی کو ٹھہراتی تھی جنہوں نے اتنی کمزور پلاننگ کی۔ وہ پہلے ہی دعا کے لیے رضامند نہیں تھی۔

"اب یہ ساکت بیٹھی کون سا چلہ کاٹ رہی ہو۔ تم سے چائے کا کہہ کر فریش ہونے گیا تھا' تم تو اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہیں ہوئیں۔" وہ کف الٹتے بولتے جارہے تھے۔

"مجھ سے نہیں بنتی چائے' جاؤ' ملازمہ سے کہو۔" صاف انکار تھا۔

"تم جانتی ہو نا مریم! میں چائے اور کھانا صرف تمہارے ہاتھ کا بنا کھاتا ہوں' باقی سارے کام ملازموں کے ہی ذمے ہیں۔" انہوں نے حتی الامکان نرم لہجہ اختیار رکھا۔ وہ اس کی ذہنی حالت سے آگاہ تھے۔

"کھانا آج بھی باہر سے آرڈر کردینا' میں نے کچھ نہیں بنایا۔" اس نے کورا جواب دیا۔

"کیوں..... کیوں نہیں بنایا' اب یہ ڈرامے بازی مزید کتنے دن چلے گی۔" الیاس احمد کا پارہ یک دم ہائی ہوا۔

یوں بھی روز بازار کا کھا' کھا کے ان کا معدہ خراب ہو رہا تھا۔ منہ بھی بدذائقہ تھا۔

"اور جو تم نے ڈراما کری ایٹ کیا' میرا میکہ' مجھ سے چھین لیا' میرے بھائی کی زندگی چھین لی' اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔" وہ یک دم سیدھی ہوئی۔

"جاہل عورت! اب مزید کتنے دن اس قصے کو دہراؤ گی' میں نے کیا جان بوجھ کر یہ سب کیا' جو قسمت میں لکھا تھا وہ ہونا ہی تھا۔"

"سچ سچ بتاؤ الیاس' تم نے یہ سب کیوں اور کیا سوچ کر کیا' تم قسمت کا لکھا کہہ کر مجھے ٹال نہیں سکتے' تم نے دعا کے لیے میرے بھائی ہی کا کیوں انتخاب کیا' اب مجھے شک سا ہونے لگا ہے۔" اس نے اپنے ذہن میں پلتا خدشہ بیان کیا۔

"کیا گھٹیا سوچتی رہتی ہو تم بدبخت! میں نے اس گناہ گار اور بدکردار لڑکی کو تمہارے اس لولے لنگڑے معذور بھائی کے ساتھ نتھی کرنے میں دونوں کا بھلا

سوچا تھا کہ اچھا ہے کہ ایک دوسرے کے عیب چھپالیں گے' لیکن وہ میسنی اور بدذات نکلی۔ اپنے کیے پر شرمندہ ہوئے بغیر عمیر کی انگلی پکڑ کر چل نکلی' اب تو مجھے یقین ہے کہ اس کا عمیر کے ساتھ بھی ضرور کوئی چکر ہوگا' اس لیے اس نے دعا کو فرار ہونے میں مدد دی ہے۔" الیاس احمد نے مریم کا شک دور کرنے اور ان کا دھیان ہٹانے کے لیے لمبی تقریر جھاڑی۔

"میں سچ کہوں الیاس! تو میں نے دعا کے کردار میں کبھی کوئی جھول نہیں دیکھا۔ اس کی عمیر کے ساتھ دوستی ضرور تھی' لیکن عمر کو تو اس نے کبھی مخاطب بھی نہیں کیا تھا۔"

مریم کو سب کچھ لٹ جانے کے بعد اب یاد کرنا آیا تھا۔

"ہاں تو اس رات اس درویش عورت کو اٹھا کے میں عمر کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ دس لوگوں کی موجودگی میں اس کی برآمدگی ہوئی ہے' اگر ویسا کچھ نہ ہوتا تو عمر جیسا منہ پھٹ' زبان دراز بھی خاموش نہ رہتا۔

میں اس سے کنفرم کرچکا ہوں' جو کچھ بھی ہوا' اس میں مکمل طور پر دعا کی رضامندی شامل تھی۔ تم اپنے چھوٹے سے ذہن کو' فضول میں استعمال نہ کرو اور اٹھ کے کچن میں جاؤ۔" الیاس احمد نے جھوٹ گھڑنے کے ساتھ ان کی طبیعت بھی صاف کی۔

"ہر رشتہ مجھ سے روٹھ گیا' بھابھی نے بھی مجھے کال نہیں کی۔" مریم رو دینے کو تھی۔

"بھائی صاحب کے گھر جاؤ' ان کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا' ان سے معافی تلافی کی کوشش کرو اور ذرا میری بھابھی جان کے گھر کا بھی معائنہ کر آؤ کہ آج کل وہاں کیا صورت حال چل رہی ہے۔ کوئی نئی تازی خبر لاؤ۔"

"واٹ ربش' میں کیا جاسوس ہوں کہ دوسروں کے گھر میں تانک جھانک کرتی پھروں۔ تمہارے ذہن میں نہ جانے اتنے چھوٹے اور غلط سلط خیالات کیسے آجاتے ہیں۔ وہ آپ کی بھابھی جان ہیں' کوئی کاروباری حریف نہیں۔" مریم کو غصہ چڑھ گیا۔ اسے شوہر کی یہ حرکتیں سخت ناپسند تھیں۔

"اچھا اب تم سیدھے طریقے سے اٹھ کے کچن میں قدم رنجہ فرماؤ گی یا پھر تمہیں بھی تمہارے بھائی صاحب کے ہی گھر پہنچا آؤں۔" الیاس احمد کے تیور یک دم بدلے۔

اس کے غصے کا مریم کو اندازہ تھا۔ اپنی خیریت مناتی وہ اٹھی اور ناک کی سیدھ کچن میں جارکی۔

"پہلے چائے لاؤ میرے لیے۔" انہوں نے بیوی کی پشت کو گھورتے اونچی آواز میں پکارا۔

"گھٹیا' ذلیل عورت۔" منہ میں اسے مزید القابات سے نوازتے ہوئے ٹیبل پر پڑے ریموٹ اٹھا کے ایل ای ڈی آن کرنے لگے۔

✡ ✡ ✡

رابعہ احمد نے بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا تھا کہ انہیں عمیر سے کھل کے سارا معاملہ ڈسکس کرکے کم از کم اس کی ناراضی اور گلے شکوے دور کرنے چاہئیں' اگر وہ مان جاتا تو نوال کو سنبھالنا مشکل نہیں۔ سب ان سے کٹ گئے تھے' وہ اولاد کی ناراضی برداشت کرنے کی متحمل نہیں تھیں۔

عمیر ان کا فرماں بردار بیٹا تھا۔ ایک بار وہ ماں کے سینے سے لگ جاتا' دل سے ساری کدورت صاف کرلیتا' پھر باپ کو منانا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ اصل ٹارگٹ تو عمیر تھا۔ ان کا دایاں بازو' ماں کے معمولی کہے کو بھی حکم کا درجہ دے کے تعمیل کرنے والا۔

وہ صوفے پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ بوریت سے بچنے کے لیے اور فراغت کے بہترین استعمال کا حل اس نے یہ نکالا تھا کہ باپ کے اسٹڈی روم سے استفادہ کیا جائے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ بہت کم لاؤنج میں آتا تھا۔ یہ احتیاط بھی شاید اس لیے برتی جاتی تھی کہ ماں سے ملاقات نہ ہو۔

"عمیر....." وہ اس کے قریب آئیں۔
"جی...." اس نے انہیں دیکھ کے کتاب بند کردی۔
"یہاں بیٹھے ہو' باہر لاؤنج میں آجایا کرو' ہر وقت کمرے میں گھسے رہنے سے دل نہیں گھبراتا۔" انہوں نے تمہید باندھی۔
"دل تو جسم میں صرف ایک مشین کی مانند کام کررہا ہے' ورنہ اس کے سارے جذبات و محسوسات مرچکے ہیں۔" وہ بے اختیار ہوا۔
"تم لوگوں کی بے مروّتی اور خاموشی' میرا دل چیر رہی ہے عمیر! کتنے روز گزر گئے۔ تمہارے پاپا جان نے مجھے مخاطب تک نہیں کیا۔" رابعہ احمد اسے اپنا مسیحا سمجھ کے شروع ہوگئی تھیں۔
"تم بھی بالکل گپ چپ ہو' میرا جرم بتائے بغیر مجھے سزا دینے پر تلے ہوئے ہو۔ تمہارے پاپا میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کررہے ہیں۔" ان کے اندر کی بھڑاس آنسوؤں کی صورت نکلنے لگی۔
وہ یک ٹک روتی ماں کو دیکھے گیا۔ وہ واقعی اتنی معصوم تھیں یا بن رہی تھیں۔ اتنا سب کچھ ہوجانے کے بعد بھی کم فہمی کا مظاہرہ کیا جارہا تھا یا ان کا ضمیر مر چکا تھا۔ اسے ماں کے آنسوؤں نے تکلیف دی تھی' لیکن یہ یک طرفہ فیصلہ ہوتا' اس کی آنکھوں کے سامنے دعا کی سرخ سوجی آنکھیں' زردی میں ڈھلا چہرا اترا۔ وہ کتنا روئی اور گڑگڑائی تھی۔ کسی نے اس پر ترس نہیں کھایا تھا' اسے صفائی کا موقع نہیں دیا تھا۔ بس سزا سنادی۔
"یہ آپ دونوں کا پرسنل میٹر ہے' بہتر ہے کہ آپ فرینڈلی ہینڈل کریں' میں انٹرفیئر نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے صاف کورا جواب دیا۔
اگر وہ ماں تھیں تو دوسری طرف باپ تھا۔ وہ شوہر کے ساتھ اتنے برس گزار کے بھی اس کے جذبات اور رشتوں کا تقدس نہ رکھ سکیں۔ وہ ماں کی طرف داری کرکے انہیں کیوں تکلیف میں مبتلا کرتا۔
رابعہ احمد کے دل کو دھچکا لگا۔ لیکن انہیں ہمت نہیں ہارنی تھی۔ ریاض احمد نہ سہی' وہ سہی۔
"عمر نے جو کچھ بھی کیا' اس سب کے لیے میں کیوں قصوروار ٹھہرائی جارہی ہوں۔" رابعہ احمد نے نظریں چراتے' اصل حقیقت کو صرف نظر کرکے عمر کا نکتہ اٹھایا۔
"عمر کا کیا ذکر' اس سے' اس سے بھی بڑی اور گھٹیا حرکت کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن جو آپ نے دعا کے ساتھ کیا۔" اس سے مزید یاد نہ کروایا گیا۔
"کیا' کیا میں نے اس کے ساتھ' اس نے خود اپنے مقدر میں رسوائی لکھی' ہمارے اعتماد و یقین کو توڑا' ہمیں دھوکا دیا۔" اس پکڑائی سے ان کا پارہ چڑھ گیا۔
"کیا آپ کو سو فیصد یقین ہے کہ جو بھی اس رات' ہم نے دیکھا یا عمر کی زبانی سنا' وہ اول و آخر سب سچ ہے۔" اس نے ماں کو گھیرا۔
"گ..... اگر..... کک..... کچھ جھوٹ تھا..... تو دعا کو..... اپنی صفائی میں بولنا چاہیے تھا۔" رابعہ احمد نے سر جھکاتے' اٹھاتے' نظریں چرائے بمشکل جواب پورا کیا۔
"آپ تو گھبرا گئی ہیں' ٹھیک سے بول نہیں پا رہیں۔" عمیر نے گھیراؤ مزید تنگ کیا۔ "مطلب سب سمجھتی ہیں آپ' میں آپ کا فرماں بردار بیٹا آپ سے پوچھ کچھ کررہا ہوں' آپ چاہیں تو مجھے ڈانٹ کے خاموش کروادیں یا اٹھ کے چلی جائیں۔ اپنا ماں ہونے کا حق استعمال کرتے ہوئے تھپڑ مار سکتی ہیں۔ میں اف تک نہیں کروں گا۔ لیکن آپ کی زبان نہیں لڑکھڑانی چاہیے' کیونکہ آپ جو کہہ رہی ہیں' وہ بالکل سچ ہے۔" اس نے اپنے "سچ" پر زور دیا۔
"آں..... ہاں....." انہوں نے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ کتنی بری گھڑی تھی جب انہوں نے عمیر کو لاٹھی بنانے کی کوشش کی۔ یہ تو ان کا بیٹا نہیں تھا۔ نہ ہی یہ اس کی زبان تھی۔
"آپ دعا کی نیچر سے آگاہ تھیں۔ وہ عام روٹین کے گیم میں اپنے لیے فائٹ نہیں کرسکتی تھی۔ سب لوگوں کے بیچ اچانک اس پر اتنا گندا الزام لگ گیا۔ چار مردوں

کے بیچ اپنی صفائی کے لیے وہ کن الفاظ کا استعمال کرتی۔ اس کے ہوش و حواس قائم رہے ہوں گے؟؟"

رابعہ احمد کے حواس منجمد اور آنکھیں جوان بولتے بیٹے پر ساکت تھیں۔ وہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی جانب دار ہو کے سوچ رہی تھیں۔ وہ سرے سے خود کو ضمیر کی عدالت میں بری الذمہ کر چکی تھیں۔ عمیر تو انہیں صرف حکم کا غلام لگتا تھا۔ وہ تو اب بھی اسے الو بنانے آئی تھیں۔ وہ کتنا گہرا اور باریک بین نکلا تھا۔ ان کے دل کی دھڑکن معمول سے ہٹ کر تیز ہو گئی۔

"دعا اور عمر کی فرینڈ شپ کی آپ سب سے بڑی حامی تھیں۔ آف کورس یہ فرینڈ شپ ہوئی بھی آپ کے توسط سے تھی۔ آپ نے جان بوجھ کر ایک معصوم لڑکی کو ٹریپ کر کے اس شخص کے حوالے کیا، جو بیس سال کی عمر میں فحاشی کے اڈے سے گرفتار ہوا اور اکیس سال کی عمر میں اس نے طوائف رکھ لی۔ سب کچھ جانتے ہوئے آپ نے اپنے مجازی خدا سے سب چھپا کے، بیٹے کی پشت پناہی کی۔

آپ کیسی خاندانی عورت تھیں، جس نے اپنے پرکھوں کی عزت کو داغ دار کرنے میں بیٹے کا ساتھ دیا۔ آپ نے ماں ہونے کا فرض خوب نبھایا" آپ جیسی ماں کی عظمت کو سلام کرنا چاہیے آپ۔۔۔۔"

"خدا کے واسطے چپ کر جاؤ عمیر۔۔۔۔" رابعہ احمد کا ضبط و حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ عمیر کی سنجیدگی اور جوش سے بلند ہوتی آواز کی گونج ان کے دل و دماغ پر کسی زوردار ہتھوڑے کی مانند لگ رہی تھی۔

"ایک لفظ مت کہنا، ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا عمیر۔" ان کے رونے میں التجا تھی۔ وہ اس کے پاس سے مزید زخم لیے اٹھ گئیں۔

"پاپا جان کو مت چھیڑیے گا ماما جان، ورنہ۔۔۔۔ ورنہ آپ کا دل سچ مچ میں پھٹ جائے گا، جبکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ دعا کے ساتھ کیے گئے مظالم کا مداوا کرنے تک زندہ رہیں۔"

رابعہ احمد کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں گڑ جائیں۔ ان سے مڑ کے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ کیا سوچ لے کر اس کے پاس آئی تھیں، ان کا جسم کانٹوں سے بھر گیا تھا۔ اس کا لفظ لفظ ان کے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس شام موسم بہت سہانا تھا۔ وہ دونوں لان چیئرز پر آ بیٹھیں۔ احسن کے آنے میں کچھ وقت تھا، وہ موسم کو انجوائے کرتی، ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگیں۔

"نعم! میں سوچ رہی تھی، دن بھر فارغ رہتی ہوں، کیوں نہ جاب کر لوں، اس طرح شاید اپنے لیے کچھ پازیٹو اور بہتر پلان کر سکوں۔" دعا نے جھجکتے ہوئے ساتھ وجہ بھی بتادی۔

"تم ہمارے بیچ خود کو غیر اور ان کمفرٹیبل فیل کرتی ہو، اسی لیے فرار کا رستہ تلاش رہی ہو۔" وہ بہت تیزی سے سنجیدہ ہوئی تھی۔

"نہیں۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔" اس نے انعم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تمہیں محبتیں راس نہیں آتیں دعا! احسن نے تمہیں خندہ پیشانی سے ایکسیپٹ کیا ہے۔ میں تمہارا ہر ممکن دھیان بٹائے رکھتی ہوں، تاکہ تم تنہا بیٹھ کے خود کو بے بس فیل نہ کرو، پھر تم مجھ سے کو آپریٹ کیوں نہیں کرتیں۔ کبھی کہیں جا چھپتی ہو، پچھلے لان یا کوریڈور میں جا بیٹھتی ہو، تم ایسا کیوں کرتی ہو۔" انعم نے اس کے چہرے پر خفگی بھری نگاہیں ٹکا دیں۔

دعا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "نن۔۔۔۔ نہیں۔" دعا کے منہ سے الفاظ نکلنے مشکل تھے۔

"ایسا ہی ہے دعا! تم خود کو ایڈجسٹ کر نہیں پا رہیں اور خود اپنے لیے فیصلہ بھی کر چکی ہو۔ جاؤ میری طرف سے تم جاب کر و یا کسی ہاسٹل یا فلیٹ میں شفٹ ہو جاؤ، میں تمہیں نہیں روکوں گی۔" وہ کہہ کر اٹھ گئی۔

مزید بیٹھنا اور بولنا دشوار تھا۔ دعا اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ انعم ہلکا پھلکا ڈانٹتی رہتی تھی، لیکن اتنا سخت رد عمل کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے رحم و کرم پر

تھی۔

وہ اس کے ساتھ الجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ رو دینے کو تھی جب احسن کی گاڑی ہارن بجاتی گیٹ سے داخل ہوئی۔ وہ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے سیدھا لان میں اتر گیا۔ جس دن سے دعا آئی تھی۔ اس نے ان دونوں کو ہمیشہ اکٹھے دیکھا تھا۔

"انعم کدھر ہے؟" وہ کرسی کے قریب آرکا۔

"وہ... وہ مجھ سے ناراض ہو کے اندر گئی ہے۔" دعا رو دی۔

"تم پلیز روؤ تو مت' تمہارا رونا مجھے پریشان کر رہا ہے۔ میں تم دونوں کی صلح کروا دیتا ہوں۔"

احسن خاصا گھبرا گیا تھا' اسے انعم کے علاوہ کسی روتی عورت کو چپ کروانے کا تجربہ نہیں تھا۔ اس نے جیب سے ٹشو پیپر نکال کے اس کی طرف بڑھایا۔ تب ہی گیٹ سے ایک اور گاڑی داخل ہوئی اور آنے والے کی پہلی نگاہ روتی دعا اور اس کی طرف ٹشو پیپر بڑھائے احسن پر پڑی' جو اس کی کرسی کے قریب کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا کھانا کھا کے باپ' بیٹا لان میں واک کر رہے تھے۔

"پاپا جان! میرے سارے ٹیسٹ کلیئر ہیں' میں کل سے آفس جاؤں گا۔" اس نے اپنا ارادہ بتا دیا۔

"نہیں۔ کل نہیں۔" ریاض احمد نے چند لمحے سوچا۔

"کل کیوں نہیں۔" وہ رک کے باپ کو دیکھنے لگا۔

"تم کل دعا کی طرف چکر لگا کے آؤ کہ وہ کیسی ہے' کس حال میں ہے' ہمیں اس کی خیر خبر رکھنی چاہیے۔ پتا نہیں اس نے حماد کو کیا کہہ کر مطمئن کیا ہوگا۔"

ریاض احمد کو ساری الجھنوں کے باوجود بھی اس بیٹی کی فکر دامن گیر تھی۔

"میں کل جاؤں گا۔" عمیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

دل آرا اچانک سے لوٹ آئی تھیں' بغیر اطلاع دیے' انعم ان کے دائیں طرف بغل میں دبی اور احسن کارپٹ پر بیٹھا' سر ان کی گود میں دھرے تھا۔

"آپ نے بہت... بہت اچھا کیا ماما جانی' جو آپ آگئیں۔ میرا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔" احسن تب سے ان سے چمٹا تھا۔ اسے ان کے وجود سے سکون مل رہا تھا۔

"نو بٹونگ' اگر تم اتنے اداس تھے تو ملنے آجاتے۔"

"میں ضرور آجاتا' اگر انعم کی فرینڈ کا پرابلم نہ ہوتا' اب وہ ہماری ذمہ داری ہے اور اتنی بڑی ٹریجڈی سے گزر رہی ہے۔ ہم اسے تنہا چھوڑ کے نہیں آسکتے تھے۔" احسن نے وجہ بتائی۔

"اسی لیے میں خود تم سے ملنے آگئی ہوں' ماں ہوں نا' تم نے مجھے یاد کیا میں دوڑی چلی آئی' اب بہت سارے دن تمہارے ساتھ گزاروں گی۔"

"بہت سارے دن" پر انعم کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ کبھی بھی دس یا پندرہ روز سے زیادہ نہیں ٹھہرتی تھیں۔ کیونکہ جنید حیات کو اپنے کاروبار کے لیے کئی ملک گھومنے پڑتے تھے' دل آرا گھر کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔

"ماما جی! آپ سچ کہہ رہی ہیں؟ واقعی میں بہت سارے دن ہمارے ساتھ رہیں گی' کتنا مزا آئے گا۔"

انعم نے بظاہر بھرپور جوش ظاہر کیا' لیکن وہ اپنا شک دور کرنا چاہ رہی تھی۔

"ہاں جانی! ایک ماہ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔"

انہوں نے انعم کے گال پر ہاتھ پھیرا۔

"آئی لو یو ماما جانی' میں آفس سے چھٹی کروں گا' بہت سارا ٹائم آپ کے ساتھ اسپینڈ کرنا چاہتا ہوں۔ میں دو راتوں سے ٹھیک سے سو نہیں پایا' آپ میرے خوابوں میں آتی تھیں۔"

احسن کارپٹ سے اٹھ کے' ان کے کندھے سے جا

نگاہ انعم کو چپ سی لگ گئی۔
دل آرا نے بیٹے کا منہ چوما اور مسکرا دیں۔

✡ ✡ ✡

عمر کوریڈور میں چکراتا الیاس احمد کو کال ملا رہا تھا۔ بیل جا رہی تھی، لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ عمر کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ الیاس احمد اس کے سامنے آجاتے تو وہ ان کا منہ توڑ دیتا۔ وہ اپنے سارے فرینڈز کو بزنس اسٹارٹ کرنے کے متعلق اتنا کچھ بتا چکا تھا کہ اب وہ سب بار بار اس سے پوچھ کر اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہے تھے۔ دو تین سے اس کی تلخ کلامی بھی ہو گئی تھی۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ تھا۔ اس نے فیکٹری دیکھ لی تھی۔ اسے فوری طور پر اپنا حصہ وصول کرنا تھا۔ ساری منصوبہ بندی مکمل تھی، صرف پیسے کی دیر تھی۔

اس نے ایک بار پھر سے نمبر ڈائل کیا اب کے نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے موبائل زور سے دوسرے ہاتھ پر مارا۔

"تم سے تو میں اچھی طرح نپٹ لوں گا الیاس احمد۔" وہ غائبانہ انہیں دھمکیاں دینے لگا۔

✡ ✡ ✡

احسن، دل آرا کے بیڈ روم میں تھا اور ان کی گود میں سر رکھے سو گیا تھا۔ انعم نے لمبی سی جمائی لی اور گھڑیال کو دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

"انو! تم بھی ادھر میرے پاس ہی سو جاؤ۔" انہوں نے انعم کی نیند کے خمار سے سرخ ہوتی آنکھوں کو پڑھا۔

"نہیں ماما جی! آپ دونوں تنگ ہوں گے، میں بیڈ روم میں چلی جاتی ہوں۔" اس نے بے دلی سے کہا، ورنہ اس کا دل احسن کے بغیر جانے کا بالکل نہیں تھا۔ وہ سستی سے اٹھنے لگی۔

"انو! یہ تمہاری وہی دوست ہے نا، جس کے گھر تم کمبائن اسٹڈی کے لیے جایا کرتی تھیں۔ ایک دو بار میں بھی اس کی والدہ سے ملی تھی۔ یہ تمہاری برتھ ڈے پہ آیا کرتی تھی اور تمہاری شادی میں بھی شرکت کی تھی۔" دل آرا کی یادداشت بہت تیز تھی۔

"جی ماما جی! میری ون اینڈ اونلی فرینڈ۔" اس نے بالوں کو سمیٹا۔

"یہ فرینڈ شپ صرف اسکول و کالج تک ٹھیک تھی، اب تم اپنی میرڈ لائف میں سیٹل ہو، تمہارا گھر اور شوہر ہے۔ اب اس طرح کی دوستی زیب نہیں دیتی۔" دل آرا نے نرمی سے اسے سمجھانے کا آغاز کیا۔

وہ بہت کچھ سوچ کے یہاں آئی تھیں۔ ان کی سوچ بہت دور تک تھی۔ لیکن انہیں سب بہت عقل مندی کے ساتھ ہینڈل کرنا تھا۔

"وہ بہت مصیبت میں تھی۔ اس کا ماموں کے علاوہ اور کوئی قریبی عزیز بھی نہیں۔ اگر اس کے پاس کوئی مضبوط سائبان ہوتا تو کبھی میرے پاس نہ آتی۔ ہمارا گھر اس کے پاس لاسٹ آپشن تھی۔"

دل آرا بچوں کے ذاتی معاملات میں بلاوجہ مداخلت نہیں کرتی تھیں۔ انعم اس بات سے آگاہ تھی۔ اب اگر وہ تفتیش کر رہی تھیں تو یقیناً" اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ تھی۔

"جو بھی ہو، تم جتنی جلدی ممکن ہو، اس کی کہیں اور شفٹنگ کا ارینج کرو، مجھے یہ سب بالکل مناسب نہیں لگا۔" دل آرا کا لہجہ حکمیہ تھا۔

"نہیں ماما جی! میں ایسا نہیں کر سکتی، وہ بہت مان اور بھروسا لے کر مجھ سے مدد مانگنے آئی تھی۔ اس کا کوئی آسرا نہیں۔ میں اسے کیسے جانے کا کہہ دوں۔" انعم نے انکار کے ساتھ وجہ بھی بتا دی، وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"جو تم کہہ رہی ہو، وہ درست ہو گا، لیکن جوان لڑکی کو ساری زندگی اپنے ساتھ باندھ کے تو نہیں رکھو گی نا، کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کے اس کی شادی کروا دو۔"

دل آرا نے صاف کہہ دیا۔ وہ اپنی سوچ اتنی آسانی سے بیان نہیں کر سکتی تھیں۔

"اسے بہت بڑا دھچکا لگا ہے، فی الحال ایسا کچھ بھی ممکن نہیں، وہ خود مجھے جاب کرنے اور ہاسٹل شفٹ

ہونے کا کہہ چکی ہے۔ میں نے ہی اسے روک رکھا ہے۔ اگر بظاہر میں اس کا آسرا بنی ہوں تو اس نے بھی میری ساری تنہائیوں کو سمیٹ لیا ہے۔ اتنے بڑے گھر میں، میں بولائی پھرتی تھی۔ کوریڈور سے لان' کچن سے لاؤنج' گیسٹ روم' اسٹڈی اور بیڈ روم تک چکراتے میری ٹانگیں اور ذہن شل ہو جاتا تھا' لیکن وقت کٹتا ہی نہیں تھا۔

اس کی موجودگی نے' مجھے جوڑ دیا ہے۔ اب مجھے خواب اور خیال نہیں ستاتے ماماجی! میں مسکرانے لگی ہوں' میری خوشی کے لیے ماماجی۔ پلیز میری خاطر..."

وہ بے بسی کی آخری حد پر کھڑی تھی۔

دل آرا خاموشی سے اس کا چہرا تکتی رہ گئیں۔ اب مزید کچھ کہنا فضول تھا۔

☆ ☆ ☆

شام رات میں ڈھل چکی تھی۔ جب اس کی گاڑی دعا کے گھر کے گیٹ کے سامنے رکی۔ وہ اپنے باپ کے حکم کی تعمیل اور اپنے دل کے بے حد اصرار پر یہاں آیا تھا۔ اس کا دماغ کشمکش کا شکار تھا۔ حماد اس کا سوتیلا بھائی کافی روکھا اور سنجیدہ مزاج تھا۔

اگر دعا نے اسے ساری حقیقت بتا دی ہو' وہ اس کے ساتھ برے طریقے سے پیش آیا یا انسلٹ کی تو وہ کیا کہے گا؟ اگر دعا نے ہی ملنے سے انکار کر دیا تو وہ کیا کرے گا؟ وہ ان کے سوالوں کا کیا جواب دے گا؟ وہ گومگو کی کیفیت میں گاڑی سے اترا اور لاتعداد سوچوں میں گھرا گیٹ تک جا پہنچا۔ بیل بجاتے اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔

"السلام علیکم! حماد صاحب ہیں گھر پر؟" اس نے گلا کھنکھارتے پوچھا۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔

"کون حماد صاحب' یہ گھر تو ڈاکٹر توقیر حسین کا ہے۔" چوکیدار نے نئی اطلاع کا بم پھوڑا۔

"ڈا... ڈاکٹر توقیر حسین' لیکن یہاں حماد رہتا تھا' کچھ عرصہ قبل تک یہ اس کا گھر تھا۔" وہ بے ربط بولتا گیا۔

"سننے میں آیا ہے کہ پہلا مالک انگلینڈ شفٹ ہو گیا ہے۔ تھوڑا عرصہ قبل ہی ڈاکٹر صاحب نے یہ گھر خریدا ہے۔"

اس چوکیدار کی شفٹ رات کی تھی۔ اسے جو معلوم تھا بتا دیا۔

"نن... نہیں... نہیں۔ یہاں حماد رہتا تھا۔ میں اس کی بہن کو چند دن قبل یہیں چھوڑ کے گیا تھا۔ وہ کہاں گئی۔" اس کے ہوش و حواس معطل ہو رہے تھے۔ وہ کھڑے قد سے زمین بوس ہوا تھا۔

"پتا نہیں سر! ہم کسی لڑکی کو نہیں جانتے اور نہ ہی یہاں کوئی آیا ہے۔ شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔" چوکیدار اپنے طور پر اسے مطمئن کر رہا تھا۔

چند دن قبل کچھ اس سے ہی ملتی جلتی خبر جب دعا کو ملی تھی تو وہ زمین پر گر کر دھاڑیں مار مار کے روئی تھی' اب عمیر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زمین پر بیٹھ کے گیٹ سے سر ٹکرا کے روئے' ماتم کرے' بین ڈالے۔ اس کی ٹانگوں سے جان نکل چکی تھی' لیکن وہ چھ فٹ کا جوان مرد' اپنی مردانگی کا بھرم رکھتے زمین پر نہیں بیٹھ سکتا' تھا نہ ہی کسی دیوار کا سہارا لے رہا تھا۔ اسے چند قدم چلنا تھا۔ وہ اپنی مردہ ٹانگوں اور آنکھوں میں ٹھہری نمی کو بار بار کف سے پونچھتا' گھسٹ رہا تھا۔

دعا کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا۔ وہ اس کے لیے ماں اور خود کو معاف نہیں کر پا رہا تھا۔ اس پر ایک اور قیامت۔ وہ گاڑی تک پہنچ گیا۔

اس کی آنکھوں میں دعا سے آخری ملاقات کا منظر تازہ ہوا۔ زرد رنگت' سوجی ہوئی آنکھیں۔ گندے کپڑے' بکھرے بال' وہ کوئی بھٹکی ہوئی بدروح لگ رہی تھی۔ ایسی زندہ درگور حالت تو اس کی ماں کے بچھڑنے پر بھی نہیں ہوئی تھی۔ عمیر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا' وہ سر جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کو مسلتی جاتی۔

اس نے تھوڑی دور ڈرائیو کیا' اس سے اسٹیئرنگ بھی سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے گاڑی سڑک کے

ایک طرف روک دی اور اسٹیئرنگ سے ٹکا دیا۔

✲ ✲ ✲

اسے اپنے باپ سے جھوٹ بولنا پڑا تھا۔ وہ شخص اندر ہی اندر گھل رہا تھا۔ وہ ایک نیا صدمہ دے کر اس کی جڑیں کھوکھلی نہیں کر سکتا تھا۔ رابعہ احمد نے جو بھی کیا تھا، پھر بھی ماں تھیں۔ ان کی ہر پل نم آنکھیں اور ایک دوسرے میں پیوست ہونٹ اسے نظریں چرانے پر مجبور کر دیتے۔ نوال ہر کسی سے خفا، کمرے سے کم ہی باہر پائی جاتی۔ گھر کی ویرانی اور ڈپریس ماحول اس کے دل کے کسی کونے کو ٹھیس پہنچا تا تھا۔

اس کے والدین کے بیچ جو سرد مہری تھی، وہ اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ ریاض احمد کی طبیعت میں خاموش تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

"پرانا ملازم بتا رہا تھا کہ حماد اسے ڈاکٹر کے مشورے پر اسلام آباد لے کر گیا ہے۔ ملازمہ پوچھ رہی تھی کہ کیا دعا بہت بیمار وغیرہ رہی ہے جو اس کی حالت اتنی بگڑ گئی ہے۔ یا وہ اب تک اپنی ماں کے صدمے سے نکل ہی نہیں پائی۔ مجھے اتنی شرمندگی ہوئی کہ آپ کو بتا نہیں سکتا۔ سو شیم فل۔" اس نے اپنے چہرے پر بھرپور ندامت طاری کر لی۔

"وہ کب تک واپس آئیں گے۔" انہوں نے اگلی ملاقات کی امید باندھی۔

عمیر نے بہت غور سے باپ کے چہرے پر آس و نراس کو پڑھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا کرنا پڑا۔

"پتا نہیں، یہ تو دعا کی صحت پر ڈیپینڈ کرتا ہے۔ بٹ آئی تھنک کہ ہمیں انہیں ٹائم دینا چاہیے۔" اس نے باپ کو ٹالا۔

"کتنا ٹائم۔" ان کی بے قراری عروج پر تھی۔

"سنبھلنے تک کا۔" اس نے مناسب الفاظ چنے۔

"یہ تمہارا ذاتی خیال ہے یا..."

"حالات کا تقاضا ہے پاپا جان۔"

اس نے باپ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اچک لی۔

ریاض احمد نے خاموش رہ کے اثبات میں سر ہلایا۔

✲ ✲ ✲

وہ نماز پڑھ کے لان میں نکل آئیں۔ سرسبز ہوا سے جھومتے درخت اور ان پر چہچہاتی چڑیاں بھی ذکر الٰہی میں مگن تھیں۔ وہ بھی چیئر پر بیٹھ کے، آنکھوں کو سبزے کی تراوٹ بخشتی تازگی اندر اتارتے تسبیح پڑھنے لگیں۔

"السلام علیکم!" انہوں نے اس خوب صورت آواز پر گردن موڑی۔

"وعلیکم السلام۔" دعا سر پر دوپٹا لپیٹے کھڑی تھی۔ وہ بھی نماز سے فارغ ہو کر آئی تھی۔

"صبح بخیر..." اس نے مسکرا کر کہا۔

"صبح بخیر..." دل آرا نے بھی خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

"آؤ یہاں بیٹھو۔" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"رات تم سے زیادہ بات چیت نہیں ہو سکی، احسن اور انو میری اچانک آمد پر اتنے ایکسائیٹڈ تھے کہ گود سے ہی نہیں نکلے۔" انہوں نے اپنی بے توجہی کی وجہ بتائی۔

رات جو انعم نے انہیں کہا تھا وہ بالکل سنجیدہ تھیں۔ اتنی دور بیٹھے انہیں بھی اس کی تنہائی، ڈپریشن اور تکلیف کاٹتی تھی۔

"ہم دو ایک بار پہلے بھی مل چکے ہیں، انعم اکثر تمہارا ذکر بھی کیا کرتی تھی۔" انہوں نے تمہید باندھی۔

"جی مجھے یاد ہے۔ انعم کی آئیڈیل ماما بھی کوئی بھولنے والی پرسنالٹی ہیں۔" دعا کو سب یاد تھا۔

انعم کی زندگی میں صرف تین افراد تو تھے۔ جنید حیات، دل آرا اور احسن۔

"مجھے تمہارے پیرنٹس کا سن کر بہت افسوس ہوا۔" انہوں نے افسوس کا اظہار بڑے گھرے انداز میں کیا۔

"تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو۔" دل آرا نے اسے اعتماد دیا۔

"بٹ میں جاب کرنا چاہتی ہوں' تاکہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہو سکوں۔" دعا کو ان سے بات کرنا مناسب لگا۔ انعم تو سنتے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔

"ہمارے گھر کی عورتیں نوکری نہیں کرتیں۔ جب تک تم ہمارے خاندان کی سرپرستی میں ہو' ہمارے اصول و روایات کے مطابق چلنا ہوگا۔" انہوں نے تحکم بھرے لہجے میں اس کی غلط فہمی دور کی۔

"میری آپ لوگوں کے خاندان میں کیا حیثیت' میں ایک لاوارث لڑکی ہوں۔ مجھے اپنا مستقبل سیو کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔" دعا نے بغیر جھجکے اپنی سوچ ان پر واضح کردی۔

"تم اپنی حیثیت کا تعین اور مستقبل کی فکر مت پالو۔ تم میری ذمہ داری ہو اور میں نے سوچ لیا ہے کہ تمہیں کس طرح سیو کرنا ہے۔"

دل آرا کا انداز اتنا ذومعنی تھا کہ وہ ان کا چہرا تکتی رہ گئی۔

بالکل یہ ہی انداز انعم کا بھی ہوتا تھا۔ وہ بھی صرف اپنی کہتی اور من مانی کرتی تھی۔ ایسا ہی بارعب اور دبدبہ دل آرا کے لہجے میں بھی کو کتا تھا۔

"آپ کے لیے چائے یا ناشتا لاؤں۔" اس نے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔

"چائے لے آؤ' ناشتا میں اپنے بچوں کے ساتھ کروں گی۔"

انہوں نے کہہ کر' پھر سے ــــ تسبیح پڑھنا شروع کردی۔ دعا اثبات میں سرہلاتی اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ منہ پر تکیہ رکھے گہری نیند میں تھا جب اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ چند پل تو اس کے اعصاب پر ذرا اثر نہ ہوا' بیل بھی متواتر بجتی جارہی تھی۔ اسے کسمسانا پڑا۔ منہ سے تکیہ ہٹائے بغیر بیڈ پر ہاتھ پھیر کے' موبائل تلاش کیا' تکیہ پرے پھینک کے' موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو...." آواز میں غنودگی تھی۔

"ہیلو عمر۔ کدھر پھنسے ہو یار' تم سے پے منٹ کا ارینج منٹ ہوا کہ نہیں' وہ مل اونر میرے گھر آیا بیٹھا ہے' اگر آج ہم نے ایڈوانس نہ دیا تو وہ دوسری پارٹی سے سودا کرلے گا' اپنا ارادہ صاف بتا دو یار' تاکہ میں اسے ٹھیک ٹھیک جواب دوں۔" احتشام بہت چڑا ہوا تھا۔

"میں تمہیں آدھے گھنٹے تک کنفرم کال کرتا ہوں۔" اس نے کہہ کر مزید احتشام کی سنے بغیر فون کاٹ دیا۔

چپل پیروں میں اڑس کے واش روم گیا' ٹونٹی کھول کے زور' زور سے چند چھپاکے منہ پر مارے' تولیے سے چہرا رگڑتا باہر آگیا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔ بیڈ کا نچلا دراز کھول کے ریوالور نکال کے پینٹ میں اڑس لیا۔

"آج تجھے پیسے دینے ہی ہوں گے الیاس چاچا۔" وہ غصے سے بڑبڑاتا نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

مریم نے سوئے ہوئے بچوں کو زبردستی اٹھا کے واش روم میں گھسایا' ملازمہ کو انہیں یونیفارم دینے اور تیار کرنے کی ہدایات دے کر وہ خود کچن میں ان کا ناشتا اور لنچ باکس تیار کرنے آگئی۔

"میں جاگنگ کے لیے جارہا ہوں' تم بچوں کو ڈرائیور کے ساتھ بھیج دینا۔" الیاس احمد نے لاؤنج سے گزرتے آواز لگائی۔

"جی اچھا...." مریم نے ٹوسٹ بناتے جواب دیا۔ وہ مرکزی دروازہ کھول کے پورچ میں نکلے۔ عمر بھی پورچ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

"ارے عمر' تم اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے؟" الیاس احمد نے اسے اپنے سامنے پا کے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"آپ میری کال ریسیو کیوں نہیں کرتے اور نہ ہی

میسیج کا جواب دیتے ہیں۔" عمر کے چہرے کے تاثرات ہرگز نارمل نہیں تھے۔

"ایسا کچھ نہیں' ایکچوئلی مریم کے بھائی صاحب نے ہم سے بول چال بند کر رکھی ہے۔ مریم نے اپنے چھوٹے بھائی کی موت کا بھی بہت صدمہ لیا ہے۔ میں آفس بھی کم وقت کے لیے جاتا ہوں' اس کی ذہنی حالت بگڑ جاتی ہے۔ میں خود بہت ڈسٹرب ہوں' جب گھر پر ہوتا ہوں' تب کسی کی کال ریسیو نہیں کرتا' باقی تو ایسا کچھ نہیں۔" انہوں نے بڑی معصومیت سے پریشان کن لہجے میں جواب دے کے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

"میرا جو حصہ طے ہوا تھا' مجھے وہ ابھی چاہیے' کیش میں دیں' میں نے فیکٹری کا سودا کیا ہے' ایڈوانس پے کرنا ہے۔" عمر نے کافی رکھائی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"تم تو ایسے مطالبہ کر رہے ہو' جیسے معمولی سی رقم ہو۔" الیاس احمد کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

"آپ کے پاس پیسے ہیں یا نہیں' یہ میرا مسئلہ نہیں' آپ نے مجھے زبان دی تھی' مجھے میرا معاوضہ ابھی چاہیے۔" عمر از حد سنجیدہ تھا۔
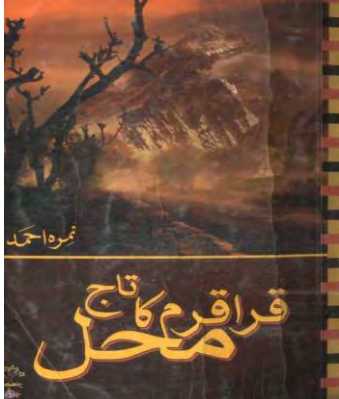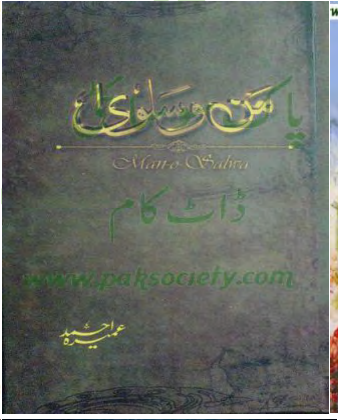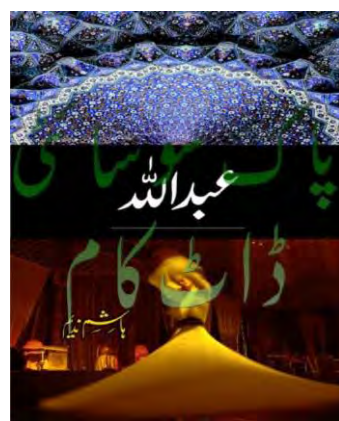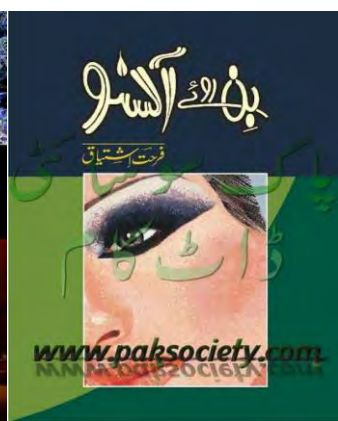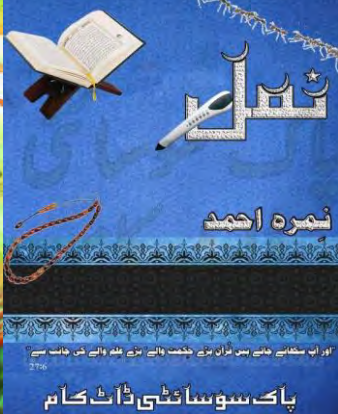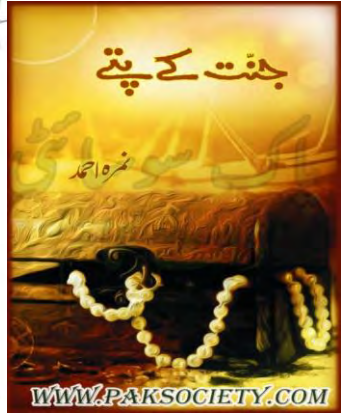
"تم اچھی طرح جانتے ہو عمر' میں نے تمہیں مریم کی وراثت سے ملنے والی رقم میں سے حصہ دینا تھا۔ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ' میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔" وہ روہانسے ہو رہے تھے۔

"چاچی جان کا حصہ 20 کروڑ ہے' میں نے کبھی زیادہ کا مطالبہ نہ کیا' دعا کی ماں کا حصہ اور اسے سگے باپ کی طرف سے ملنے والا حصہ بھی' اس لولے لنگڑے سالے سے شادی کروا کے' آپ نے ہی ہتھیانا تھا' میں نے کبھی آپ کی چالاکیوں کا نوٹس نہیں لیا۔ آپ نے جو معاوضہ اپنی زبان سے طے کیا تھا' میں تو صرف وہ مانگ رہا ہوں' آپ کے ساتھ دھوکا ہوا تو یہ میرا مسئلہ نہیں۔"

عمر کا رویہ ترش ہو گیا۔ اس میں ذرا بھی رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔

جب سے اس نے عمیو پر فائر کیا تھا۔ الیاس احمد اندر سے سہم سے گئے تھے۔ وہ پیسے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس کٹھور اور سنگ دل کو کسی رشتے کی پروا نہیں تھی۔ الیاس احمد پر اس کی شخصیت کے بہت سے پرت اب کھل رہے تھے۔ اس کا مسئلہ صرف اور صرف پیسہ تھا۔ وہ اسے چھوٹا موٹا لالچی سمجھ رہے تھے' جو اپنے چاچا پر پڑا تھا' لیکن زبان اور اصول کے معاملے میں وہ اپنے باپ کا ریر تو تھا۔

مریم ڈرائیور کو گاڑی تیار کرنے کا کہنے آئی تھی۔ مرکزی دروازہ کھولا تو ان دونوں کو دیکھ کے ٹھٹک گئی۔ الیاس احمد کی پشت مریم کی طرف تھی۔ عمر اسے دیکھ چکا تھا' لیکن اس نے الیاس احمد کو بولنے دیا۔

"تمہارے بھائی کی وجہ سے میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ تمہارا تو ایک کروڑ ہے' میں نے کتنے کروڑ پر صبر کیا ہوا ہے۔" ان کا انداز ابھی بھی دھیما تھا۔ وہ عمر کے ساتھ غصے سے یا سختی سے پیش آ کے اپنا ہی نقصان کرتے۔

"میں نے آپ کے کہنے پر دعا کو اپنے چنگل میں پھنسایا' اتنا گھٹیا الزام لگا کے گھر بدر کیا' ہارٹ اٹیک میرے باپ کو ہوا' گولی میرے بھائی کو لگی' گھر ہمارا اجڑا' آپ کے حصے میں کون سا نقصان آیا۔ آپ کا سالا آپ سے ناراض ہے' یہ میرا مسئلہ نہیں' مجھے ابھی کیش چاہیے۔"

عمر نے تیسری بار اپنا مطالبہ دہرایا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ چاچا کو کچا کھا جائے۔

مریم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کا سر نفی میں ہلتا جا رہا تھا۔

"الیاس....." اس نے زوردار چیخ ماری۔

انہوں نے حواس باختہ ہو کر مڑ کر دیکھا۔ "مم..... مریم! اس کی باتوں میں مت آنا' یہ جھوٹا ہے' بکواس ہے۔ یہ جو کہہ رہا ہے' میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔"

الیاس احمد گھگھیا رہے تھے۔ مریم کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور گالوں پر آنسو لڑھک آئے تھے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"جھوٹ میں نہیں' آپ بول رہے ہیں چاچو! اپنے بڑے خبیث سالے سے جائیداد میں سے حصہ نکلوانے کے لیے آپ نے یہ سارا ڈراما رچایا۔" عمر نے سچائی کی حد کردی۔

الیاس احمد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ وہ کبھی بولتے عمر کے آگے ہاتھ جوڑتے اور کبھی مریم کے بے یقین چہرے کو دیکھتے۔

"تم نے بہت ظلم کیا الیاس! میرے اعتماد کو توڑا' ایک یتیم و مسکین لڑکی کے ساتھ ظلم کیا۔ تم اس حد تک گر جاؤ گے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میرے بھائی کی موت کا سبب بھی تم ہو' میرے بھائی صاحب تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" مریم دکھ سے چلا رہی تھی۔ اس کا اعتبار ٹوٹ گیا تھا۔

اسے اپنے شوہر پر ہمیشہ سے شک رہا تھا۔ انہوں نے کتنے برے طریقے سے اس شک کو یقین میں بدلا تھا۔ وہ اس کے ساتھ صرف کروڑوں کی جائیداد کے حصول کے لیے نباہ کرتے آرہے تھے۔

"تمہیں میں نہیں چھوڑوں گا عمر' آئی ول کل یو۔"

الیاس احمد نے بل کھا کے اس پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کردی۔

"نہیں بھی آج اپنا حساب برابر کرکے جاؤں گا۔" اپنا بچاؤ کرتے ہوئے عمر نے چلاتے ہوئے پینٹ سے ریوالور نکالا اور الیاس احمد پر فائر کھول دیا۔

مریم زور زور سے چیخنے لگی۔ "نہیں عمر... نہیں' پلیز نہیں۔" وہ عمر کی طرف دوڑی' تب تک وہ اپنا کام دکھا چکا تھا۔

وہ تڑپتے ہوئے خون آلود شوہر پر گر پڑی۔

✲ ✲ ✲

رابعہ احمد ناشتا بنا رہی تھیں۔ وہ ایکسر سائز کرکے سیدھا کچن میں آیا۔

"السلام علیکم!" اس نے سلام کرتے ہوئے فریج کھولا۔

"وعلیکم السلام! میں نے آج تمہارے لیے اسٹرابری فلیور کا جوس بنایا ہے' تم شوق سے پیتے ہو۔" رابعہ احمد نے سلیب پر دھرا جگ اٹھایا۔

"جی دے دیں۔" اس نے جگ پکڑنے کو ہاتھ آگے بڑھایا۔

وہ کچن میں ماں کے پاس بہت کم بیٹھتا تھا' بلکہ وہ جہاں ہوتیں' وہ وہاں سے ہٹ جاتا۔

"یہیں بیٹھ کے پی لو نا میرے سامنے۔"

رابعہ احمد نے بے چارگی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اسے غور سے دیکھے' اسے چوسے' سینے سے لگائے کتنے دن بیت گئے تھے یا پھر شاید صدیاں' انہیں ہر دن صدی پہ محیط لگنے لگا تھا۔

عمیر ان کے احساسات کا احترام کرتے ہوئے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔

"ایک ماں صرف اپنی اولاد سے ہی کیوں پیار کرتی ہے' ماں کا دل تو سمندر جتنا وسیع ہوتا ہے' پھر اس میں صرف اپنے جنے ہوؤں کی ہی محبت کیوں سماتی ہے۔ کیا وہ کوشش سے بھی کسی اور کے لیے تھوڑی سی گنجائش نہیں نکال سکتی۔"

جوس کے گھونٹ بھرتے وہ لامتناہی سوچوں میں گھر گیا۔

جبکہ رابعہ احمد اس کے ایک ایک نقش کو اپنے دل میں اتارتی اپنے اندر کی پیاس بجھا رہی تھیں۔

"ماردیا اس کمینے خبیث کو... مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا' میں نے اس کے لیے اتنا کچھ کیا اور وہ..." وہ وحشی انداز میں بولتا گالیاں بکنے لگا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور خود اس کا چہرا پسینے سے شرابور تھا۔

"کیا ہوا عمر! ریوالور کہاں لے کر گئے تھے' کسے مار دیا تم نے۔" رابعہ احمد بھاگتی ہوئی اس تک پہنچیں۔

"اسے مارنے گیا تھا' بس مار دیا' سالا' میرا حصہ غبن کررہا تھا۔" وہ پھر سے اپنا جملہ دہرانے لگا۔

ریاض احمد بھی تلاوت چھوڑ کے باہر نکل آئے' نوال آنکھیں مسلتی معاملے کو سمجھنے کی کوشش کررہی

تھی۔

"کسے مار کے آرہے ہو؟ چھوڑو اسے۔" عمیر نے اس سے پستول چھین لیا۔

"چھوڑو مجھے' اس ذلیل' بے غیرت الیاس احمد کو مار کے آیا ہوں' تم تو نہیں مرے' لیکن وہ ضرور مر جائے گا۔"

وہ ہوش و حواس سے بے گانہ اول فول بکتا جارہا تھا۔

ریاض احمد نے نفی میں سرہلایا' رابعہ احمد دل پہ ہاتھ رکھے زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

"عو... عمیر... تم نے۔"

عمیر کے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور دماغ جھنجھنا کے رہ گیا۔ "اوہ مائی گاڈ' چلو... چلو۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔

"چھوڑو مجھے تم کیا کررہے ہو؟ میرا بازو چھوڑو' ورنہ میں تمہیں بھی شوٹ کردوں گا' تم جانتے نہیں ابھی مجھے۔"

وہ بولتا جارہا تھا۔ عمیر پورا زور لگا کے اسے کمرے تک گھسیٹتا لے گیا' کمرے کا دروازہ کھول کے اسے زور سے دھکا دے کے فوراً دروازہ بند کرکے تالا لگا کے چابی نکال لی۔

"یہ جتنا بھی واویلا کرلے' میرے آنے تک کوئی دروازہ نہیں کھولے گا۔" عمیر نے پھولے سانس سے وارننگ دی اور ماں باپ کو دیکھا' جن کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور رنگت زردی مائل تھی۔

"نوال! تم بابا جان کو اندر لے جاؤ اور ڈاکٹر کو کال کرو' میں الیاس چاچو کی طرف جارہا ہوں۔"

وہ نوال کو سب سونپ کے اس طرف بھاگا جہاں جانا فی الحال بہت ضروری تھا۔

اندر عمر چلا رہا تھا' اسے باہر آنا تھا' وہ شور مچا رہا تھا۔ چیزیں توڑ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

دعا گول زینے پر خاموش گم صم سی بیٹھی تھی۔ گرل کے اس کے پار سفیدے کے درختوں کی اونچائی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ تھا۔ انعم' دل آرا کو جنید حیات سے بات کرتا ہوا چھوڑ کے اسے ڈھونڈتی ہوئی آئی تھی۔

"تم یہاں چھپی بیٹھی ہو' میں سارے گھر میں تمہیں تلاش کررہی ہوں۔"

انعم کا سانس سیڑھیاں چڑھنے سے مزید پھول گیا' وہ اس سے دو سیڑھیاں نیچے اس کے چہرے کی طرف رخ کرکے بیٹھ گئی۔

جس دن سے دل آرا آئی تھیں انعم ان کے ساتھ ہی چمٹی رہتی تھی۔ اس نے دعا کو وقت دینا اور خیال رکھنا ترک کردیا تھا۔ وہ کتابیں پڑھ کے اپنا وقت گزارتی۔

وہ اگر ان دونوں کے بیچ بیٹھی ہوتی تو ان کی اپنی خاندانی باتیں' رشتے داریاں یا ذاتی گفتگو زیر بحث ہوتی' اس وقت بھی دونوں باتوں میں مصروف تھیں اسے اپنا آپ فالتو لگا تو اٹھ کر باہر آگئی۔

"میں نے ایک بات نوٹ کی ہے انو! برا نہ مانو تو کہوں؟"

"ضرور کہو میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گی۔" انعم ہنس کر بولی۔ "تم ہر پل ماما جی کے ساتھ چپکی رہتی ہو' ان کی ہر چیز اور ضرورت کا خیال رکھتی ہو' ان سے پہلے کی طرح محبت بھی والہانہ کرتی ہو۔ لیکن... لیکن تمہارے چہرے پر وہ روشنی' خوشی اور مسکراہٹ مفقود ہے' جو آنٹی کے آنے سے قبل تمہارے چہرے پر پھیلی رہتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اور کیا؟ لیکن مجھے ان دنوں تمہارا رویہ بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔"

دعا نے اتنے دنوں سے کیے گئے تجزیے کو دہرایا۔ تو انعم کو حیرانی ہوئی۔

"ہاں۔ ایسا ہی ہے۔" انعم نے اس کے گھٹنے سے ہاتھ اٹھالیا۔ ماربل کی سیڑھیوں کو گھورتے اس نے بلا تردد اعتراف کرلیا۔

"بٹ وائے انو! کیا احسن سے شادی کے بعد تم ماں' بیٹی کا رشتہ چینج ہوگیا ہے۔ یا صرف تم ایسا سوچنے

لگی ہو۔"

دعا یہ ہی نتیجہ اخذ کرپائی تھی۔ اس کا اور دعا کا کئی برس کا ساتھ رہا تھا۔ وہ اس کی دل آرا سے محبت سے بخوبی آگاہ تھی۔

"ماما جی کی نہیں میری سوچ بدل گئی ہے' وہ تو مجھ سے آج بھی اپنے سگے اور اکلوتے بیٹے سے بڑھ کر محبت کرتی ہیں۔ میں نے ایک بات تم سے شیئر نہیں کی 'ایکچوئلی۔"

انعم نے کپکپاتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اسے اگلے کئی لمحے بولنے میں لگے۔ "میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔" وہ رودی۔

دعا ساکت رہ گئی۔

وہ زندہ دل' بہادر' ہنس مکھ' ضدی لڑکی اس میں اتنی بڑی خامی۔ خوش باش لڑکی' اپنے اندر کتنا بڑا دکھ چھپائے بیٹھی تھی۔

دعا کے پاس الفاظ' تسلی' دلاسا کچھ نہیں تھا۔ اس نے اسے رونے دیا۔ اس کے دل کی گھٹن کم ہورہی تھی۔ دعا اس کا سر تھپکتے اپنے آنسوؤں پر بھی قابو نہ رکھ پائی۔

☆ ☆ ☆

عمیر خود الیاس احمد کو اسپتال لے کر آیا تھا۔ وہ ایمرجنسی میں تھا۔ مریم بینچ پر بیٹھی مسلسل روئے جارہی تھی۔ عمیر کے اپنے ہاتھ پاؤں بے جان ہورہے تھے۔ الیاس احمد کی حالت نازک تھی۔

"چاچی جان! پلیز ڈونٹ کرائے۔ آخر ہوا کیا تھا؟"

"عمر نے چاچو جان پر گولی چلادی۔"

عمیر انگلیاں مروڑتا کافی مضطرب سا تھا۔ اس کا دل کسی اور ہی انہونی کی طرف اشارہ کررہا تھا۔ اسے پہلے ہی شک ہوچکا تھا کہ ان دونوں کے بیچ کچھ خفیہ لین دین چل رہا تھا۔

"میں تو بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے ڈرائیور کو بلانے آئی تھی۔ پورچ میں الیاس اور عمر ۔۔۔۔ لڑ رہے تھے' ایک دوسرے پر چلا رہے تھے اور وہ اپنی لڑائی میں دعا کا بھی بار بار ذکر کرتے تھے' میں نے۔۔۔۔"

"دعا کا ذکر' کیا کہہ رہے تھے دعا کے بارے میں۔"

عمیر کے دل میں پنپتا شک ثابت ہوگیا تھا۔ اس کے اندر کی دنیا تہ و بالا ہوگئی۔

"میں کچھ زیادہ ڈیٹیل تو نہیں سمجھ پائی' شاید ان دونوں نے پلاننگ کے مطابق دعا کو ٹریپ کیا تھا اور اس رات۔۔۔۔ اس رات اس معصوم لڑکی پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔"

مریم کے رونے میں مزید شدت آگئی۔ اسے بری طرح سے احساس ندامت نے گھیرا ہوا تھا۔ دعا کی ماں ہمیشہ اسے "مریم بیٹی" کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ کبھی نندوں والا رعب یا دبدبہ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مریم کی ہر بات اور مسئلہ وہ بہت محبت اور توجہ سے سنتی تھیں اور اس نے ان محبتوں کے صلے میں ان کی بیٹی کے کردار پر۔۔۔۔ کیچڑ اچھالا۔

اب اسے لگ رہا تھا کہ اس نے دعا پر نہیں بلکہ اس نیک اور پرہیزگار عورت کی تربیت پر۔۔۔۔ کیچڑ پھینکی ہے۔

عمیر کے کان اور حواس اب مزید کچھ سننے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس کے اعصاب پر جیسے کوئی زور' زور سے ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ تب ہی مریم کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے گال صاف کرکے کال اٹینڈ کی۔

"بھائی صاحب! میں برباد ہوگئی' بھائی صاحب' الیاس کے بھتیجے نے اسے مار دیا' پلیز' پلیز بھائی صاحب' میں بہت اکیلی ہوگئی ہوں' میرے پاس آجائیں۔" وہ اپنے بھائی کی آواز سنتے ہی پھر سے زور زور سے رونے لگی۔

ان کے ساتھ دو ذاتی ملازم آئے تھے جنہوں نے فوراً" پیچھے اطلاع دے دی تھی۔ تب ہی ایمرجنسی کا دروازہ کھلا اور نرس باہر آئی۔

"سر! آپ کو خون کی تین بوتلوں کا جلد از جلد ارینجمنٹ کرنا ہوگا' ورنہ آپ کے پیشنٹ کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔" نرس وارننگ دے کے اتنی ہی

پھرتی سے واپس مڑ گئی۔
عمیر سلپ پکڑے، موبائل جیب سے نکال کے کوریڈور سے نکلتا چلا گیا۔

٭ ٭ ٭

ڈاکٹر نے ریاض احمد کا چیک اپ کر کے، انہیں انجکشنز لگا دیے۔ ان کا بی پی ہائی تھا، دل کی دھڑکن بھی تیز تھی۔ وہ غنودگی میں بھی کراہ رہے تھے۔ رابعہ احمد بار بار دوپٹے کے پلو سے نم آنکھیں خشک کرتیں۔
"اوں.... ہوں۔" وہ تکلیف سے کراہ رہے تھے۔
رابعہ احمد بیڈ کی پائنتی پر بیٹھی ان کے پیر داب رہی تھیں۔ منہ میں وہ قرآنی آیات وغیرہ پڑھ کر، شوہر پر وقفے وقفے سے پھونک بھی مارتی جا رہی تھیں۔ ملازمہ بڑے محتاط انداز میں دروازہ کھول کے اندر آئی۔
"باجی! باہر آئیں ذرا۔" اس نے کان کے قریب ہو کر ریاض احمد پر نگاہ ڈالتے آہستگی سے کہا۔
"کیا ہوا ہے صغریٰ؟"
رو رو کے ان کے جسم کی طاقت ختم ہو گئی تھی۔ ان کا دل مزید ڈوب گیا، کیونکہ گھریلو ملازمین بغیر کسی ضروری وجہ کے بیڈ روم میں نہیں آتے تھے۔
"جی۔ آپ باہر آ کے خود ہی دیکھ لیں۔" ملازمہ نظریں چراتی باہر نکل گئی۔
رابعہ احمد آیت الکرسی پڑھتی باہر آئیں تو لاؤنج میں ایس ایچ او دو سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔
"السلام علیکم!" انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے دوپٹا سر پر جمایا۔
"وعلیکم السلام!" ان کے صرف لب ملے۔ آواز حلق میں ہی گھٹ گئی۔
"بیگم صاحبہ! ہمارے پاس عمر احمد کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں، اینڈ آئی ہوپ کہ آپ بغیر کسی مزاحمت کے ہمارا وقت ضائع کیے بغیر مجرم پکڑوانے میں ہماری مدد کریں گی۔" اس نے نہایت ادب سے گزارش کی۔
ایس ایچ او ریاض احمد کی جان پہچان والا تھا۔ اسی لیے وہ ان کے ساتھ احترام سے پیش آ رہا تھا۔ رابعہ احمد میں مزاحمت کی ہمت بھلا تھی کب؟ انہوں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔ انہیں اپنے مجازی خدا کی زندگی اور سلامتی زیادہ عزیز تھی۔
وہ عمر کی ہر غلطی، خطا اور جرم کے سامنے دیوار بنتے تھک گئی تھیں۔ اب وہ ایک کمزور ڈھال رہ گئی تھیں۔ جو قانون کے سامنے ہرگز نہیں ڈٹ سکتی تھی۔ انہیں عمر احمد نے پے در پے اتنے صدمے دیے تھے کہ انہیں سوچنا پڑتا کہ وہ پہلے کس دکھ پہ روئیں۔ ان کی آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔
"اس طرف...." انہوں نے سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کیا، جہاں عمیر اسے لاک کر کے گیا تھا۔
صغریٰ نے مالک کا حکم ملتے ہی آگے بڑھ کر لاک کھول دیا۔ پولیس بھی اس کی تقلید میں اندر گھس گئی اور وہ ماں اپنی بے جان ٹانگوں کو بڑی طاقت سے گھسیٹتی پچھلے لان کی طرف نکل گئی۔

٭ ٭ ٭

اس نے سلام پھیر کے انگلیوں پہ تسبیح پڑھی اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔
"اے میرے رب، میں انسان ہوں، خطاوار ہوں، تو اس گناہ گار کی خطاؤں کو معاف فرما کے میری آئندہ زندگی کے تمام رستے آسان اور روشن کر دے۔ میں دوسروں کے رحم و کرم پہ ہوں۔ ان کی محتاج ہوں، انسانوں کی محتاجی سے بچا لے۔ میری تمام ضرورتیں اور گزارشیں اپنے در سے پوری...."
تب ہی اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کے ملتے لب تھم گئے۔ دل آرا بغیر دستک دیے آئی تھیں۔ لاؤنج سے گزرتی انعم نے ماما کی اس حرکت کو حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ اتنی ال مینرڈ تو نہیں تھیں۔ ایسا انہوں نے کبھی بھی نہیں کیا تھا۔
دعا انہیں دیکھ کے منہ پر ہاتھ پھیرتی، جاء نماز سمیٹنے لگی۔

"آئیں بیٹھیں۔" اس نے ادب کو ملحوظ رکھا۔
"تم نماز پڑھ رہی تھیں۔" انہوں نے اپنی حیرت چھپائی۔
"جی۔۔۔" اس نے جاء نماز دراز میں ڈالی۔
"ادھر میرے پاس آؤ۔"
انہوں نے اس کے لیے اپنے برابر جگہ پر ہاتھ مارا۔
دعا تھوک نگلتی قریب ہوگئی۔
"تم اتنی چپ چپ کیوں رہتی ہو' شاید اداس سی۔" انہوں نے یوں ہی بلاوجہ تمہید باندھی۔
"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں' میں بھلا کس کے لیے اداس ہونے لگی گھر میں صرف انعم' آپ اور میں ہی تو ہوتے ہیں۔ آپ دونوں زیادہ تر فیملی کی باتیں کرتی ہیں جو میں خاموشی سے سنتی رہتی ہوں اور میری شام کچن میں گزرتی ہے۔" دعا نے تفصیلی جواب دے کے انہیں مطمئن کیا۔
"ہوں۔" دل آرا نے پُرسوچ ساہنکارا بھرا۔
"انعم کے ساتھ کافی پرانی دوستی ہے تمہاری۔" یہ بے تکا سا سوال تھا' کیونکہ وہ ہمیشہ سے اس کی واحد دوست رہی تھی۔
"جی۔ ہم اسکول لائف سے فرینڈز ہیں۔" دعا مسکرادی۔
"اسٹرینج۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔
"انعم غصیلی' ضدی اور تھوڑی بدمزاج بھی ہے۔ شاید وہ اپنے اکلوتے پن کی وجہ سے ایسی ہے۔ جبکہ تم اتنی ہی خاموش اور انوسینٹ سی ہو۔" انہوں نے انعم اور اس کا برملا تلخ سا موازنہ کیا۔ دعا کو جھٹکا لگا۔
"ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایکچوئلی میں نیچرلی تھوڑی ڈرپوک اور بزدل سی ہوں۔ انعم اسکول ٹائم سے ہی ہر مشکل گھڑی میں میری ڈھال بنتی رہی ہے۔ اگر میں روٹھ جاؤں تو بدمزاج لڑکی کبھی کبھار مجھے منا بھی لیا کرتی ہے۔ تھوڑی موڈی ہے' لیکن ایٹی ٹیوڈ سجتا ہے اس پہ۔" اس نے دھیمی مسکان سے اپنی دوست کی طرف داری کی۔
انعم نے یہ فطرت اپنی اس ماں سے ہی تولی تھی۔
پروقار سی چال' کھڑی مغرور گردن' سنجیدہ اور ہلکے مسکراتے ہونٹ' لہجہ میں ایک دبدبہ اور نرمی بیک وقت تھی۔
"تم واقعی بہت معصوم ہو یا ایکٹ کرتی ہو۔" یک دم ان کا لہجہ بدل گیا۔
دعا نے سر جھکالیا' صرف چند لمحے سوچنے کے لیے۔ "پتا نہیں' ابھی آپ یہیں پر ہیں' خود ہی جانچ لیجئے گا کہ میں کیسی ہوں۔"
وہ مغموم مسکراہٹ سے بولی۔
"تم انعم سے زیادہ سمجھ دار لگتی ہو' کچھ اسے بھی سمجھایا کرو۔" انہوں نے پھر سے اسے الجھانے کی کوشش کی۔
"میں کافی دنوں سے انعم کے ساتھ ہوں' میں نے اس کی کوئی غلطی نوٹ نہیں کی' جس کے لیے اس کو ٹوکنا یا سمجھانا پڑے۔" دعا نے صاف گوئی سے کام لیا۔
دل آرا کی گفتگو اسے بہت عجیب سی لگ رہی تھی۔
"تم چائے بہت اچھی بنالیتی ہو۔" انہوں نے فٹ سے موضوع بدل دیا۔
"جی تھینک یو' آپ کو طلب ہے۔" دعا نے تعریف وصول کرتے دل میں شکر ادا کیا۔
"تم اسٹرانگ سی چائے بنا کے لاؤ' میں لاؤنج میں بیٹھی ہوں۔" وہ ایک دم سے تحکم بھرے انداز میں کہتی اٹھ گئیں۔ دعا نے بھی فوراً ان کی تقلید کی۔
دعا کے لیے یہ ملاقات کافی حیران کن تھی۔

✲ ✲ ✲

مریم اپنے بھائی کے گلے سے لگی روئے جارہی تھی۔ وہ بھی ساری ناراضی اور بھائی کی موت کا صدمہ بھلا کر بہن کی دل جوئی کو حاضر تھے' کیونکہ وہ ان کی اکلوتی بہن تھی۔
عمیر بینچ پر ایک طرف بیٹھا گاہے بگاہے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اٹھ کر تبریز ملک سے مصافحہ ہی کرلے۔ ایمرجنسی کا دروازہ کھلا' سینئر ڈاکٹر باہر آیا۔

"ایکسکیوزمی سر' چاچو جان ٹھیک تو ہیں نا۔
انہیں ہوش آگیا؟" عمیر سب سے پہلے لپکا۔
باقی سب بھی قریب آگئے۔
"ہم نے گولیاں نکال دی ہیں۔ انہیں بلڈ بھی لگ رہا ہے۔ ران میں لگی گولی بھی نکال لی گئی ہے۔ لیکن زخم ذرا گہرا ہے' اگلے چوبیس گھنٹے تشویش ناک ہیں۔ ان کا بی پی بھی نارمل نہیں' آپ دعا کریں۔" ڈاکٹر نے انہیں مکمل تفصیل سے آگاہ کردیا۔
"بھائی صاحب' الیاس احمد کو بچالیں۔ پلیز بھائی صاحب۔" مریم پھر سے بھائی کے کندھے سے جڑی بین شروع کرچکی تھی۔
عمیر کے جسم میں سنسنی سی دوڑے جارہی تھی۔ ان کے درمیان وہ خود کو مجرم گردان رہا تھا۔ تب ہی اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔
"یااللہ خیر کرنا۔" پاکٹ سے موبائل نکالتے اس نے صدق دل سے مدد مانگی۔
اسکرین پر گھر کا نمبر روشن ہو رہا تھا۔ وہ موبائل ہش کرتا قدرے پرے جاکے کال ریسیو کرنے لگا۔
"السلام علیکم ماما جان!"
لینڈ لائن نمبر سے رابعہ احمد ہی ضرورت پڑنے پر کال کرتی تھیں۔
"وعلیکم السلام!" ان کی آواز خاصی بھاری تھی۔
"کیا ہوا' سب ٹھیک تو ہے' پاپا جان کی طبیعت سنبھلی' ڈاکٹر تو آگیا تھا ناں؟"
اس نے ایک ہی سانس میں پوچھ لیا۔
"ہاں۔ ڈاکٹر آگیا تھا۔ وہ تو بے سدھ پڑے ہیں لیکن عمیر... وہ عمر..." ان کی آواز گلے میں گھٹ گئی۔
"عمر؟ کیا ہوا عمر کو؟ میں نے تو لاک کیا تھا' کیا وہ ہنگامہ کررہا ہے۔" عمیر یہی اندازہ لگاپایا۔
"عمر کو پولیس اریسٹ کرکے لے گئی ہے۔" ان کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔
عمیر نے شدت ضبط سے آنکھیں بند کرلیں۔ بائیں ہاتھ سے ماتھے کو زور سے پکڑ کردبایا۔

اس کا موبائل والا ہاتھ پہلو میں گر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سلاخوں کے پیچھے بند عمر نے چیخ چیخ کے حوالات کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ایس۔ ایچ او فائل پر جھکا لمبی لسٹ نکالنے میں مصروف تھا۔ اس لڑکے کے لیے اسے ابھی اوپر سے اگلا آرڈر نہیں ملا تھا۔ اس لیے وہ اس کی بکواس سننے پر مجبور تھا۔
"تم سب مجھے ٹھیک سے جانتے نہیں ہو' میرا باپ بہت امیر آدمی ہے' بہت پیسہ ہے اس کے پاس' جتنی تمہاری تنخواہ ہے ناں ایس۔ ایچ او' اتنی تو ہم گھریلو ملازمین کو خیرات دیتے ہیں' میرے باپ کی ایک فون کال سے تم سب کی وردیاں اتر جائیں گی۔"
"میں تم لوگوں کو ناکوں چنے چبوا دوں گا' تم لوگوں کی ہمت کیسے ہوئی' ہمارے گھر میں گھس کے' مجھے گرفتار کرنے کی' دو ٹکے کے ملازمو! اپنی اوقات بھول کے' ہمارے گریبان پہ ہاتھ ڈالنے کی بڑی کڑی سزا ملے گی تم لوگوں کو' عمر بھر پچھتاؤ گے کہ کس مرد کے بچے سے پالا پڑا تھا' میں تم سب کے کس بل نکال دوں گا۔"
عمر حلق پھاڑ رہا تھا' اس کی زبان درازی حد سے بڑھتی جارہی تھی۔
ایس۔ ایچ۔ او نے پین زور سے فائل پر مارا۔ اس کے ماتھے پر ناگوار بل پڑگئے تھے۔
"رحیم... یاسر۔" اس نے زور سے آواز لگائی۔ عمر خاموش ہوگیا۔
"جی سر۔" دو باوردی ملازم دوڑے آئے۔
"اوئے اس خبیث' الو کے پٹھے کی بکواس تو بند کراؤ' میرا تو سر درد سے پھٹنے لگا ہے۔ ایک منٹ کے لیے بھی' اس نے زبان منہ میں نہیں ڈالی' ایسی چھترول لگاؤ کہ دوبارہ اس کی آواز میرے کانوں میں نہ پڑے۔" اس نے سختی سے حکم دیا۔
"جی... جی سر۔" وہ دونوں سلیوٹ کرتے تیز تیز گردنیں ہلارہے تھے۔
"مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا' سپریم کورٹ

کے جج کا بیٹا میرا جگری یار ہے۔ ابھی اسے کال لگاؤں تو دیکھنا تم سب منٹوں میں معطل ہو جاؤ گے۔"

دونوں سپاہیوں نے لاک اپ کھول کے اس کے چلّانے کی پروا کیے بغیر اسے گردن سے دبوچ لیا' اس کے گلے میں بازو ڈال کے پیچھے کو دھکیلا۔

"چھوڑو مجھے' یہ کیا بے ہودگی ہے۔ تم جانتے نہیں ہو' اس سب کا انجام بہت بُرا ہوگا۔" وہ زور زور سے چلّانے لگا۔

دوسرے سپاہی نے اس کے منہ پر زور سے دو مکے رسید کیے۔ خون کی تیز دھاریں اس کے منہ اور ناک سے ابل پڑیں۔

"یو باسٹرڈ۔" اس کے خون سے بھرے منہ سے بمشکل نکلا۔

اس پر لاتوں کی بارش کر دی گئی۔ وہ زمین پر گر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دل آرا انعم کے سر میں خوب تیل ڈالے' نرم انگلیوں سے مساج کر رہی تھیں۔ ان ممتا بھری نرم پوروں میں محبت کی گرمائش نے انعم کی آنکھوں میں نیند بھر دی تھی۔

"ماما جی! یاد ہے آپ کو' میں جب بھی ٹینس یا احسن سے ناراض ہوتی تھی' آپ زبردستی مجھے پکڑ کر بالوں میں مساج کرنے لگ جاتیں۔ آپ کا یہ نسخہ اتنا آزمودہ تھا کہ تھوڑی دیر بعد ہی' میری ساری ٹینشن غائب ہو جاتی تھی۔" انعم نے مسکراتے ہوئے گزرا وقت یاد کیا۔

"ماں کے ہاتھوں میں اپنی اولاد کے لیے سکون اور ممتا ہی ہوتی ہے۔ میں تو وہاں بھی چھوٹے موٹے کام کرتی تمہیں اور احسن کو یاد کرتی رہتی ہوں' جب بھی کچھ پکاتی ہوں' تم لوگ یاد آتے ہو۔" دل آرا کی آواز بھرّا سی گئی۔

ان کی دو اولادیں تھیں اور وہ بھی ان سے دور' جب ان کا دل زیادہ تڑپتا' وہ ان سے ملنے دوڑی چلی آتیں۔

"ماما جی' آپ یہیں آجائیں' پاپا جی سے کہیں کہ وہ سب کچھ وائنڈ اپ کر دیں' ساری عمر پردیس میں گزار دی' انہوں نے خود لوٹنے کے بجائے' آپ کو بھی ہم سے چھین کے اپنے پاس قید کر لیا ہے۔" انعم نے بُرا سا منہ بنایا۔

وہ واقعی دل سے چاہتی تھی کہ اس کے والدین ہمیشہ کے لیے اس کے پاس آجائیں تاکہ اس کی تنہائیوں کا سدِباب ہو۔

"میں نے دو ایک بار واپسی کا ذکر کیا' لیکن تم جانتی ہو' وہ غصے کے تیز ہیں۔ بار بار اپنی بات دہرانا پسند نہیں ہے انہیں۔" دل آرا نے بیٹی کو سر پکڑ کر گود میں رکھ لیا اس کے بال سہلانے لگیں۔

"ماما جی! آپ احسن کو سمجھائیے گا' اس کی تھوڑی سی برین واشنگ کیجیے گا۔" انعم نے اپنے دل کا دھڑکا بیان کیا۔

"کیا ہوا؟ کیا کوئی پرابلم چل رہی ہے۔"

وہ یہی سمجھ سکیں۔ انعم احسن کی ساری شکایتیں انہیں ہی درج کروایا کرتی تھی۔

"نہیں' میرے دل کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کا دھیان باہر نہ بھٹک جائے' وہ مجھ سے دور نہ ہونے لگے۔"

یہ اس کی خود ساختہ ذہنی فکریں تھیں۔ جو وہ پالتی رہتی تھی۔

"تم یوں ہی دل کو وسوسوں میں مت الجھایا کرو۔ آج تک اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا' جو مجھ سے اور تم سے پوشیدہ رکھا گیا ہو' اس کا کردار دن کی طرح روشن' ہمارے سامنے ہے' پھر شک کی گنجائش کہاں سے نکلتی ہے۔ میرا بیٹا اتنا بھی لوز کریکٹر نہیں کہ پرائی عورتوں پہ بُری نگاہ رکھے۔" دل آرا نے ڈپٹتے ہوئے اس کی کلاس لے ڈالی۔

وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے درمیان غلط فہمیاں کھڑی ہوں' اسی لیے وقتاً فوقتاً انعم کو ٹوکتی رہتی تھیں۔

"شاید یہ خوف' میرے اندر کی کمی نے' مجھ میں

ڈال دیا ہے‘ مجھے یقین ہے کہ وہ کسی سے محبت نہیں کرسکتا‘ بری نگاہ نہیں رکھتا لیکن اگر ماما جی.... اس نے اولاد کی خاطر‘ کسی دوسری عورت کو‘ مجھ پر لا بٹھایا تو....“ اس کی آواز میں خوف واضح ہوتا تھا۔ ”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنا یہ سیکریٹ‘ ہم سے شیئر نہ کرے۔“ اس نے اپنی دلی کیفیات کھل کر بیان کیں۔

انعم نے کبھی صاف لفظوں میں یہ ذکر نہیں چھیڑا تھا‘ وہ نادان تھی لیکن وہ ایک دنیا گھوم چکی تھیں‘ مرد کی فطرت سے اتنی آگاہی تو تھی لیکن انعم کی دل آزادی کا خیال آڑے آجاتا‘ انعم ان کی بہو سے پہلے بیٹی تھی وہ کیسے بیٹی پر سوتن لانے کا سوچ سکتی تھیں۔ یہ سب بہت تکلیف دہ تھا۔

”انعم! تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ہمارا خاندان ہے‘ اتنی وسیع اسٹیٹ ہے‘ اندرون و بیرون ملک اثاثے ہیں۔ تم اور احسن اکلوتے ہو‘ تم دونوں کے بعد یہ سب کچھ کس کا ہوگا‘ یہ سب کس کی وراثت میں جائے گا۔ میں خود بہت سوچتی ہوں‘ ہم احسن کو کیوں موقع دیں‘ کیوں اسے مجبور کریں کہ وہ ہم سے کچھ چھپائے‘ ہم کیوں زندگی بھر دھوکے کی اذیت میں رہیں‘ میں یہ سب سمجھتی ہوں‘ لیکن تمہاری محبت کے آگے آکے ہار جاتی ہوں‘ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنی بیٹی‘ اپنی اولاد سمجھا‘ میں نہیں چاہتی کہ تم ایک دن احسن کے بجائے‘ مجھ پر انگلی اٹھاؤ‘ مجھے الزام دو‘ میری ممتا کو گالی دو۔“

دل آرا کی آواز پست اور کمزور ہوگئی‘ خود سے کبھی یہ ذکر نہ چھیڑتیں‘ انعم نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا‘ اس ساری گفتگو میں انعم کے لیے بہت کچھ تھا‘ سوچنے اور فیصلہ لینے کے لیے۔ وہ اسی وقت کے انتظار میں تھیں کہ وہ خود ہی سب محسوس کرے۔

انعم اپنی جگہ پتھرائی بیٹھی تھی۔

✡ ✡ ✡

نوال کرسی پر بیٹھی سوں سوں کیے جارہی تھی۔ عمیر باپ کے پاؤں دبا رہا تھا۔ رابعہ احمد نے شوہر سے

عمر کے جیل جانے کی خبر چھپائی تھی' کیونکہ ان کی حالت یہ خبر برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی۔
"اس کے اتنا بگڑا ہونے کے باوجود بھی' مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ کسی پر قاتلانہ حملہ کرے گا اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے جائے گا۔ ہم خاندان والوں کو کیا جواب دیں گے کہ اس نے کیوں سگے چچا پر حملہ کیا' میں شہر میں کس کس کو صفائیاں دوں گا۔"
ایس ایچ او نے تھوڑی دیر قبل کال کرکے انہیں سب بتادیا تھا۔
"یہ لڑکا میری جان لے کر ہی رہے گا' میں کبھی اسے چھڑانے نہیں جاؤں گا' میری طرف سے یہ عمر بھر جیل میں پڑا سڑتا رہے۔" ریاض احمد نے سختی سے صاف اعلان کردیا۔
رابعہ احمد کا دل کٹ سا گیا۔
"نہیں پاپا جان! آپ عمر سے ملنے جائیں اور اس سے سب معاملات ڈیٹیل میں پوچھیں۔" عمیر نے نظریں چراتے دھیمے سے کہا۔
"کیا پوچھوں گا اور پوچھنے کو ہے کیا؟ میری طرف سے وہ مرگیا۔" ان کا صاف کورا جواب تھا۔
"عمر نے بغیر کسی وجہ کے تو چاچو جان پر گولیاں نہیں چلادیں۔
مجھے مریم چاچی سے پتا چلا ہے کہ ان دونوں کے مابین پورچ میں جھگڑا ہورہا تھا' وہ بار بار دعا کا نام بھی استعمال کررہے تھے۔ عمر کسی معاوضے کا مطالبہ کررہا تھا۔ آپ جاکے عمر سے اصل حقیقت اگلوائیں' ہمیں بہت سی الجھی گتھیاں سلجھانے کے لیے عمر کے پاس جانا ہوگا۔"
وہاں بیٹھے سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ عمیر نے کتنا بڑا انکشاف کیا تھا۔ ریاض احمد کے ہونٹ سل گئے' سوچیں سلب ہوگئیں۔
"کیا دعا کے معاملے میں یہ دونوں ملوث ہیں۔"
رابعہ احمد ہکلا کے رہ گئیں۔
"یہ تو وہ دونوں ہی بتاسکتے ہیں' فی الحال میں اور پاپا جان عمر سے ملنے جارہے ہیں۔" عمیر نے باپ کی طرف دیکھا۔
"اس کے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی ہے' میں اپنے وکیل سے ڈسکس کرلوں' پھر نکلتے ہیں۔"
وہ موبائل اٹھا کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔
"میں بھی چینج کرلوں۔" عمیر بھی اٹھ گیا۔
نوال دعا کے ذکر پر مزید رونے لگی۔ رابعہ احمد دعا کرنے لگیں' اگر عمر نے دعا کے ساتھ جان بوجھ کر غلط کیا تھا یا اس پہ لگا الزام غلط نکلا تو ریاض احمد کا سارا عتاب ان پر نازل ہوگا۔ وہ انہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔

☆ ☆ ☆

الیاس احمد کو آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا تھا۔ وہ نالیوں اور سوئیوں میں جکڑے ہوش و حواس سے بے گانہ پڑے تھے۔ چہرا سوجن زدہ اور زرد تھا۔ مریم ان کے قریب کھڑی' بے حس آنکھوں سے ان کے وجود کو تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ترحم تھا نہ محبت۔
"تم کتنے بڑے دھوکے باز نکلے الیاس احمد! میں نے ہمیشہ تمہاری عزت کی' تمہاری تمام بری خصلتوں کو اگنور کرتی رہی' تمہاری ہر کڑوی کسیلی اس لیے برداشت کی کہ تم میرے بچوں کے باپ ہو۔ تم نے جب جب پیسوں کا مطالبہ کیا' میرے بھائی صاحب پورا کرتے رہے اور تم ہماری شرافت کو بے وقوفی سمجھتے رہے' مگر اب مزید نہیں' تم چاہے جیو یا مرو' مجھے تمہارے ساتھ مزید نہیں رہنا' نہیں رہنا۔"
اس نے بڑے مستحکم لہجے میں اس بے سدھ پڑے کو وارننگ دی۔ اسے اپنے الفاظ پر قائم رہنا تھا۔

☆ ☆ ☆

دل آرا سیڑھیاں اتر رہی تھیں' جب ان کی نگاہ کچن میں کام کرتی دعا پر پڑی۔ وہ سیدھی اس کے پاس چلی آئیں۔
"کیا کررہی ہو؟" وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔
احسن کے آنے میں کچھ وقت تھا۔ انعم اپنے کمرے میں تھی۔

"انعم کا دل چکن کباب اور کٹلس کھانے کو چاہ رہا تھا۔ اسی کی تیاری کر رہی ہوں' پھر رات کا کھانا بنانا ہے' اگر آپ کا بھی کچھ کھانے کو جی چاہ رہا ہے تو بتا دیں' میں بنا دوں گی۔"

دعا نے اتنی مصروفیت کے باوجود بھی ان کی فرمائش پوچھ ڈالی۔

"رات کا کھانا تم بناتی ہو۔" دل آرا نے اپنی حیرت چھپالی۔

"جی کک۔ چھٹی لے کر گاؤں گیا ہے۔ دوپہر کا کھانا انعم بناتی ہے۔ احسن آتے ہیں تو انعم ان کے ساتھ بزی ہو جاتی ہے۔ میں کچن میں آجاتی ہوں۔" وہ ہلکی آنچ پر کباب تلتی ان کے سوالوں کے جواب بھی دیے جا رہی تھی۔

"کھانا بہت ذائقہ دار ہوتا ہے۔ بہت مزا ہے تمہارے ہاتھ میں۔"

"میری امی جان بھی بہت مزے کا پکاتی تھیں۔ میں نے اپنے گھر میں کبھی کک نہیں دیکھا۔ میں امی جان کو پیار سے زبیدہ طارق کہتی تھی۔ انہیں بہت کچھ پکانا آتا تھا۔ وہ بہت سگھڑ اور سلیقہ مند خاتون تھیں۔" اس نے بڑی محبت سے اپنی ماں کا ذکر کیا۔

"تمہارے والد کا اسپیئر پارٹس کا بزنس تھا نا۔" دل آرا نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

جب انعم نے اس سے دوستی کی تھی تو دل آرا نے احتیاط کے طور پر اس کی فیملی کا بایوڈیٹا حاصل کیا تھا۔

"جی۔۔۔ ان کی وفات تین سال قبل ہوئی ہے۔ امی جان نے ان کی وفات کا روگ دل کو لگالیا۔ میں نے۔۔۔"

"بی بی جی! احسن صاحب آگئے ہیں' انعم بی بی کہہ رہی ہیں۔ جلدی سے چائے لگا دیں۔" ملازمہ کے آنے پر اس کی بات بیچ میں رہ گئی۔

"اچھا۔۔۔ میں ابھی چائے بناتی ہوں۔" دعا فریج میں سے دودھ نکالنے لگی۔ دل آرا اٹھ گئیں۔

"میرے لیے بھی ایک کپ بھجوا دینا۔"

دعا نے اثبات میں سر ہلایا' وہ دودھ چولہے پر رکھ کے ٹرالی میں کیچپ اور کٹلس وغیرہ سیٹ کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ریاض احمد اور عمیر کے حواس گم ہو گئے۔ جو شخص ان کے سامنے بیٹھا تھا کیا وہ واقعی عمر تھا۔ چہرے پر جا بجا نیل تھے۔ ہونٹ پھٹا اور سوجا ہوا تھا۔ دائیں آنکھ سوجن زدہ اور تقریباً "بند تھی۔ یقیناً" یہ ہی حال اس کے جسم کا بھی تھا۔ کیونکہ وہ بہت مشکل سے قدم گھسیٹتا ان تک آیا تھا۔ ریاض احمد کے دل پر ہاتھ پڑا' جیسا بھی تھا ان کا بیٹا' جگر کا ٹکڑا تھا۔ عمیر کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔

"پاپا جان! آپ اس کی حالت دیکھ رہے ہیں نا۔" عمیر تڑپ گیا تھا۔ اس پر غصہ اور دکھ بیک وقت حاوی ہوئے۔

"پاپا جان! آپ ابھی اپنے وکیل کو یہاں بلائیں۔ عمر کی کنڈیشن نوٹ کروائیں' کتنا ظلم کیا ہے ان درندوں نے۔" عمیر کرسی پر بیٹھا بھائی کی تکلیف پر برہم ہو رہا تھا۔

"ہم جلد ہی اسے رہا کروالیں گے۔" ریاض احمد نے بڑے یقین سے اسے مطمئن کیا۔

"لیکن عمر! تم جانتے ہو' یہ مریم چاچی کے تبریز بھائی صاحب نے کروایا ہے۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اگر تم سب سچ ہمیں بتادو' ہم ڈائریکٹلی ان کے پاس جاکے سارا معاملہ ڈسکس کرسکتے ہیں۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہے کہ دو چار دن میں تمہیں رہا کروالیا جائے۔" عمیر نے اسے ورغلا کے سب سچ بولنے پر اکسایا۔

"سچ..... وہ سچ....." عمر ہکلا کے رہ گیا۔ اس کا گلا خشک ہوگیا۔ وہ اپنے منہ سے کیسے سب سچ بول دیتا' کیا سب بتادینا اتنا آسان تھا۔

عمیر نے کن انکھیوں سے باپ کو دیکھا' وہ عمر کی ہچکچاہٹ نوٹ کرچکے تھے۔

"پلیز عمر! تم ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرو' اگر تبریز بھائی صاحب نے مقدمہ واپس لے لیا تو یہ قصہ ختم ہوجائے' تمہارے اور الیاس چاچو کے بیچ جو بھی چل رہا تھا۔ وہ سب صاف صاف بتادو۔" عمیر نے منت بھرے لہجے میں اسے سمجھایا۔

عمر کے پاس اور کوئی رستہ نہ تھا۔ اب سب بتا کے ہی جان چھوٹنی تھی۔ "میں سب بتادوں گا' پلیز آپ لوگ مجھے بچالیں۔ یہ لوگ وحشی ہیں' بہت زیادہ مارتے ہیں' یہ مجھے ماردیں گے' میں مرنا نہیں چاہتا۔" عمر سب بتانے سے قبل ان سے وعدہ لے رہا تھا۔

اس کا دل ہمیشہ سے ان دو کرداروں کی طرف سے مشکوک رہا تھا۔ لیکن فی الحال اس کے پاس یہ ہی دو لاسٹ آپشن تھے۔

"میرا اور دعا کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے نوال اور عمیر کی فرینڈ ہی دیکھا' مجھے دیکھ کے وہ بھاگ جاتی' یا پھر سر جھکا لیتی۔ مجھے اس میں دلچسپی تھی' نہ اس پر توجہ۔ الیاس چاچو نے مجھے اس کی طرف جھکنے پر مجبور کیا' وہ اپنے سالے تبریز ملک سے جائیداد میں حصہ....." عمر اٹکتے گہرے سانس لینے'

آنکھیں تکلیف سے بند کرتے' کھولتے سب الف سے یے تک بتاتا چلا گیا۔

عمیر اور ریاض احمد کی نہ صرف آنکھیں بلکہ دماغ کے سارے دروازے بھی کھلتے چلے گئے۔ ریاض احمد کا سر مسلسل نفی میں ہلے جارہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں باربار نمی در آتی' ان کا دل تکلیف سے بھر گیا تھا۔ اتنی گہری سازش ان کے گھر میں چلتی رہی اور وہ بے خبر رہے۔

عمیر نے باپ کا ہاتھ تھام لیا' وہ اسے نرمی سے تھپک کرانہیں حوصلہ رکھنے کی ترغیب دے رہا تھا۔

"جو بھی اس رات ہوا' وہ سب ایک مضبوط پلاننگ کے تحت تھا۔ الیاس چاچو کو اس رات کچھ نہیں ہوا تھا' انہوں نے جان بوجھ کر آپ کو کال کی تھی۔ میں دعا جیسی ڈرپوک لڑکی کو' زبردستی ڈرا دھمکا کے اپنے روم میں لے کر گیا تھا اور اس رات آپ نے جو کچھ سنا' وہ صرف ڈائیلاگ بازی تھی' پلیز بابا جان مجھے معاف کردیں' پلیز عمیر! تم بھی مجھے معاف کرو' میں نے پیسے کے لالچ میں اندھا ہوکے' تم پہ بھی گولی چلائی' سب مجھے معاف کردو اور یہاں سے چھڑوالو' ورنہ میں مر.....۔"

ریاض احمد سے مزید برداشت نہیں ہورہا تھا۔ وہ کھڑے ہوگئے' عمیر نے بھی باپ کی تقلید کی۔ ریاض احمد سیل سے باہر نکل گئے۔ عمر نے بوکھلا کے باپ کو جاتے دیکھا۔

"ہم تمہارے لیے ضرور کچھ کریں گے' تم پریشان مت ہونا۔" عمیر کو اس سے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ وہ اسے کھوکھلا سا دلاسا دے کر باپ کے پیچھے لپکا۔

جبکہ ریاض احمد اسے کبھی نہ چھڑوانے کا مصمم ارادہ کرچکے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ' ان شاءاللہ)

ایک دانا نے بہت خوب کہا ہے کہ بے وقوف کو ذہین پر ایک فوقیت حاصل ہے کہ بے وقوف مطمئن ہوجاتا ہے۔ جبکہ ذہین اپنی عقل کی طرح خواہشوں کے منہ زور گھوڑے کی باگ بھی کھلی چھوڑ دیتا ہے کہ قسمت سے زور آوری کرتا رہے۔

صائمہ اور سجیلہ دونوں بہنوں میں سجیلہ ذہن کی زیادہ اچھی تھی۔ کام اس سے ہو کر نہیں دیتا تھا یا وہ جان بوجھ کر اس میں پھوہڑپن دکھاتی تھی کہ کہیں مستقل اس کے گلے نہ پڑ جائے۔ اپلے جلا کر لکڑیوں کو سلگانے سے اسے نہ صرف گھن آتی بلکہ بدبودار دھواں ناک میں گھستا تو آنکھوں سے پانی نکل آتا۔ وہ کھانس کھانس کر یوں برا حال کرلیتی کہ اماں خود ہی اسے اٹھا کر صائمہ کو کام دے دیتیں۔ سجیلہ شکر کرتی کہ اس کا سانولا رنگ کالا ہونے سے بچ گیا۔

آس پڑوس کے نسبتاً "خوش حال گھرانے اپلوں کی جگہ گتے اور اخبار جلا کر لکڑیاں سلگاتے تھے، تاکہ لکڑی جلدی آگ پکڑے۔ ان کی اماں بھی چند بیگمات کے گھر مالش کرنے جاتی تھیں۔ اترن کے ساتھ ردی بھی مل جاتی، مگر محدود آمدنی میں ردی کو آگ لگانا ان کے لیے پیسے کو آگ لگانا تھا۔ اس لیے ردی بیچ کر اماں پانچ روپے کے اپلے خریدتیں اور باقی سے کچھ میٹھا خرید لاتیں۔ اس دن گھر میں رونق ہو جاتی۔

سجیلہ کو اپنے نام کی طرح سجنے سنورنے کا بھی شوق تھا۔ تیزی سے اپنے حصے کا کام نپٹا کر کنگھی لے کر بیٹھ جاتی۔ کبھی پراندہ ڈالتی، کبھی مینڈھیاں بناتی۔ صائمہ کے ذہن کی طرح اس کے ہاتھ بھی سست تھے۔ ایک کام لیتی تو اس کو خوب سنوار کر کرتی، لیکن وقت اتنا لگا دیتی کہ اماں تعریف کرنے کے بجائے صلواتیں سناتیں۔

اماں کی کسی باجی کو کام والی کی ضرورت ہوئی تو اماں کو بھی آمدن کے در کھلتے نظر آئے۔ فوراً" اپنی بچیوں کی پیش کش کر دی۔ چونکہ وہ ابھی صرف پندرہ سولہ سال کی تھیں۔ اس لیے طے یہ پایا کہ اماں انہیں باجی کے ہاں چھوڑ جائیں اور اپنے کام نپٹا کر واپسی پر ساتھ لیتی جائیں۔ باجی بھی بہت نرم خو اور مہربان تھیں۔ انصاف سے دونوں میں کام بانٹ دیے۔ صائمہ سجیلہ نے جلد کام سیکھ لیا اور سجیلہ تو مہینے بعد ہی باجی کی پسندیدہ ہو گئی۔ ہوشیار پھرتیلی پھر ذہین ۴ نہیں ذمہ داری سے بڑھ کر سکھ دیتی۔ باجی بھول جاتیں کہ کون سی چیز کہاں رکھ دی تو سجیلہ جھٹ سے لے آتی۔ صفائی کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم کی آرائش بھی خود کر دیتی اور باجی کا دل خوش ہو جاتا۔ جہاں باقی کام والیاں ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے پرفیوم کی قطار کو سرسری سا جھاڑتیں۔ سجیلہ وہاں ہر شیشی اٹھا کر صاف کرتی اور بنا پوچھے جان گئی تھی کہ مردانہ پرفیوم کون سا ہے اور زنانہ کون سا۔

صائمہ ایک کام میں لگتی تو اس کو سنوارنے میں دنیا و دنیا و مافیہا سے بے گانی ہو جاتی۔ برتن دھونے لگتی تو پیچھے چولہے پر رکھا دودھ پک پک کر ربڑی بن جاتا، پر صائمہ کو خبر نہ ہوتی۔ استری کرتی تو کپڑے پر ایک شکن نہ رہنے دیتی، مگر کس قمیص کے ساتھ کون سا دوپٹا ہے ہمیشہ بھول جاتی۔

باجی میں جذبہ خدمت خلق بہت تھا اور باتونی سجیلہ نے بارہا اسکول نہ جا سکنے کی حسرت دہرائی تو باجی ان کے لیے قاعدے لے آئیں۔ روزانہ چھٹی سے پہلے کچھ سبق دے دیتیں جو سجیلہ اگلے روز ہی یاد کر کے نیا سبق لے لیتی۔ مگر صائمہ کے ذہن میں حروف گڈمڈ ہو جاتے تھے۔ اس نے صرف گنتی اور حساب سیکھ لیا کہ اس کی اکثر ضرورت پڑتی ہے۔ مگر حروف سے لکھنے کے سفر میں وہ پڑھائی سے بے دل ہو گئی اور باجی کی کوششوں کے باوجود دھیان نہ دیا۔

سجیلہ تو پہلے ہی ہر فن مولا تھی۔ پھر باجی کی کالج جانے والی بیٹی مریم نت نئے ڈیزائن کے اپنے کپڑے جب سجیلہ کو دیتی تو وہ اور بنی سنوری پھرتی۔ ہمیشہ کپڑوں میں پہلا انتخاب سجیلہ کرتی اور اپنے لیے اچھے کھلتے رنگوں کے کپڑے چن لیتی، کیونکہ صائمہ کو جتنے بھی اچھے کپڑے دے دو اس نے لکڑی اور اپلوں کے چولہے سلگا کر ان کا ستیاناس ہی کرنا تھا۔ اب

سجیلہ نے پڑھنا لکھنا بھی شروع کر دیا تو اس کے تو پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ لفظوں کے کھیل نے اس پر ایسے در وا کیے کہ اس کی دنیا لامحدود ہو گئی۔ باجی سے ملنے والی عیدیاں لے کر خود فلم کی دکان پر پہنچ جاتی۔ جوڑ توڑ کر کے فلموں کے نام پڑھتی اور کرائے پر لے آتی۔

ٹی وی دیکھ کر کریموں کے نام یاد کر لیتی اور پیسے جوڑ کر وہی لیتی۔ اب اتنے تردد کے بعد کسی کی نظروں میں نہ آتی، یہ کیسے ممکن تھا۔

اس کے چچا اور ان کی دیوار سے دیوار ملتی تھی۔ عمر میں صائمہ سال بڑی تھی۔ مگر چاچی نے جب بیٹے سے مرضی پوچھی تو اس نے سجیلہ کا نام لیا۔ نوید رکشا

چلاتا تھا اور اپنے آس پاس کے لڑکوں کی نسبت خوش حال تھا۔ اس لیے سجیلہ کی ماں نے ہامی بھرلی۔ مگر سجیلہ اور بھی ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ صائمہ کو اماں نے الگ کام لے دیا تھا اور چونکہ سجیلہ سمجھ دار تھی۔ اس لیے وہ پہلے فارغ ہو کر دوسری گلی سے صائمہ کو لیتی اور اکٹھے گھر جاتیں۔

سجیلہ جب باجی کے گھر سے نکلتی تو سامنے والی کوٹھی میں وکیل صاحب کا آوارہ لڑکا نعمان اکثر گیٹ پر ہی کھڑا نظر آتا۔ کبھی وہ گیٹ کھول کر گیراج میں گاڑی دھونے لگتا۔ کبھی اپنے کتے کو واک کراتے سجیلہ کے رستے سے بار بار گزرتا۔ سجیلہ بھی رفتار آہستہ کر کے اس خوبرو لڑکے کو ضرور دیکھتی، جس نے فی الحال باپ کے پیسے پر عیاشی کے علاوہ کچھ نہ سیکھا تھا۔ بس چند دن کی بات تھی، سجیلہ کی بھی ساری توجہ بھٹک کر گیٹ پر آ ٹکی۔ گاڑی کا ہارن بعد میں ہوتا۔ وہ پہلے گیٹ پر آ پہنچتی اور گیٹ کھولتے اور بند کرتے جی بھر کر نعمان سے نگاہیں ملاتی۔ نعمان بھی بے باکی سے نگاہوں کا جواب نگاہوں سے دیتا اور مسکرا دیتا۔

اب تو سجیلہ کو لکڑی کے چولہے کا دھواں اتنا برا لگنے لگا کہ چولہا جلتے ہوئے اس سے ساتھ والے کمرے میں بھی نہ بیٹھا جاتا اور آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ ان آنسوؤں میں کچھ عمل دخل ان خوابوں کا بھی تھا جو وہ بننے لگی تھی۔ اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ خود کو خوشبودار کرنے کے لیے ٹیلکم پاؤڈر کی جگہ مہنگے انگریزی پرفیوم لگائے۔ بس پھر اس سے رہا نہ گیا اور کچھ کر گزرنے کی سوچ لی۔

"باجی شیشی کیسے لکھتے ہیں؟" کپڑے مل مل کر دھوتے ہوئے اس نے باجی سے پوچھا۔

"پہلے شین کے شوشے...." باجی نے سارے ہجے سمجھا دیے۔

"اور گلاب کیسے لکھتے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔ باجی بھی بچوں کو کھانا کھلانے میں مگن تھیں، جو لفظ پوچھا بتاتی گئیں۔

یہ تو اگلے روز جب سامنے والے وکیل صاحب کا چوکیدار خط پکڑے دروازے پر کھڑا تھا تو ماجرا کھلا۔ سجیلہ نے نعمان کو محبت بھرا نامہ لکھا تھا اور آخر میں دوٹوک بات کرنے کے انداز میں ایک عشقیہ شعر درج کیا تھا۔

شیشی بھری گلاب کی پتھر پر پھوڑ دوں
اس خط کا جواب نہ دیا تو خط لکھنا ہی چھوڑ دوں

باجی نے تو سر پکڑ لیا۔ مہینوں کی محنت اور لاڈ کا یہ انجام نکلا۔ اس نے ساری پڑھائی اس کام پر لگا دی۔ پہلے تو ہینگر پکڑ کر سجیلہ کی دھلائی کر ڈالی۔ پھر اس کی اماں کو بلوا کر سب بات کھول کر رکھ دی۔ اس نے تو محلے میں ان کی ناک ... دی تھی۔ ایک نوکرانی ہو کر کوٹھی کے لڑکوں ... ڈورے ڈالتی تھی۔ سجیلہ نے بہت سمجھ داری سے خط گیٹ کے اس کونے میں پھنسایا تھا جہاں نعمان کھڑا ہو کر سگریٹ پیتا تھا، یہ تو بد قسمتی سے نعمان صبح ہی مری چلا گیا تھا اور خط چوکیدار کے ہاتھ لگ گیا۔

سجیلہ کے جی میں آیا کہ اسی وقت نعمان کی پسندیدگی کا بتا دے، پر چپ رہی، ایک بار نعمان آجائے گا تو سب کے منہ خود ہی بند ہو جائیں گے۔ وہ گھر آئی تو اس کے کارنامے کی اطلاع اس سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ چاچی نے رشتے سے معذرت کر لی۔ مگر سجیلہ کی جوتی کو بھی پروا نہ تھی۔ ایک طرف نوکری سے جواب ملنے پر ماں سر پکڑے بیٹھی تھی۔ دوسری طرف بھتیجے نوید کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر باپ بھی شرمندہ تھا۔ ماں، باپ کی فکر میں صائمہ بھی لب سیے ہانڈی چولہا کرتی رہی۔ سجیلہ منہ سجائے روئے جا رہی تھی کہ اب نوکری گئی تو نعمان سے سامنا کیسے ہوگا۔

کم گو اور باتونی کا بھی موازنہ کرو تو تمام دنیا انگلی اٹھا کر کم گو کی طرف اشارہ کرے گی اور کہے گی کہ اصل فائدہ مند یہ ہی ہے۔ صائمہ بھی کم گو تھی۔ نا سمجھ تھی، پر اتنی بھی نہیں۔ اس نے نوید کے لٹکے چہرے میں چھپا فکر بھانپ لیا تھا اور یہ بھی جان گئی کہ وہ دو دن سے

کام پر کیوں نہیں گیا۔ مغرب کے وقت وہ صحن میں وضو کر رہا تھا تو صائمہ پاس پہنچ گئی۔

"ہم ایک ہی آنگن میں سارا بچپن کھیلے ہیں۔ پریشانی تھی تو کہہ سنائی ہوتی۔" "بہت دھیرے سے اس نے کہا۔

"قسطوں پر رکشہ لیا ہے۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا اب قسط دوں کہ مرمت کرواؤں۔" اس کے چہرے پر روزی روٹی کی فکر آ پھیلی۔ صائمہ نے دوپٹے کے پلو سے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"باجی سے عیدیاں اور خرچ ملتا تھا تو میں جوڑ لیتی تھی۔ اچھا ہے تمہارے کام آجائے۔" نوید پیسے تھامنے کے بجائے صائمہ کی صورت دیکھنے لگا۔

مہینوں ہوئے تھے میونسپل کارپوریشن نے شہر کی حدود سے گائے' بھینس نکالنے کا قانون بنا دیا تھا۔ اپلے بھی نایاب ہو گئے تھے۔ اس لیے صائمہ کا رنگ بھی نکھر گیا تھا اور کپڑوں سے باس بھی نہ آتی تھی۔ اس کی ماں نے جب صائمہ کا نام لیا تھا تو اس نے منہ بنایا تھا کہ وہ کوئی بیاہنے والی لڑکی ہے۔

اب احساس ہو رہا تھا کہ وہی تو گھر بسانے والی لڑکی تھی۔ دوسروں کا سوچنے والی۔

"رکشہ ٹھیک کرا کر واپس کر دوں گا' وہ بھی سود سمیت۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا' پر صائمہ بے وقوف ہی تھی۔ ایسی باتیں نہیں سمجھتی تھی' بنا کچھ بولے پلٹ آئی۔

✲ ✲ ✲

سجیلہ گھر بیٹھی تو ماں نے چولہا ہانڈی اس کے سپرد کر دیا اور ہفتہ بھر کڑا پہرا دیا۔ ہفتے بعد وہ محلے میں کسی سے ملنے گئی تو سجیلہ نے چادر اوڑھ کر دوڑ لگائی۔ نعمان روز اس وقت پارک میں جاگنگ کرتا تھا۔ اس لیے پارک میں جا کھڑی ہوئی۔ نعمان نے بھی دور سے اس کو دیکھ لیا اور رخ موڑ کر اس کی طرف ہی آ گیا۔

"کدھر ہوتی ہو آج کل' نظر ہی نہیں آتیں۔" وہ بے تکلفی سے مخاطب ہوا۔ سجیلہ نے شکر کا سانس لیا کہ کسی اور نے نعمان کو کچھ نہیں بتایا۔ ورنہ بتانے کے انداز نے پیغام کے معنی بدل دینے تھے۔

"وہاں سے کام چھوڑ دیا میں نے۔ باجی نے میری خدمت کا جائز صلہ نہیں دیا۔" اس نے دکھتے دل سے کہا۔

"اوہو۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا۔" نعمان واضح پریشان نظر آیا۔ پریشان تو سجیلہ بھی تھی' مگر یہ امید تھی کہ نعمان سے ملنے کا کوئی اور رستہ ضرور ڈھونڈے گی۔

"میں تو تمہاری راہ دیکھتا رہا کہ کب گیٹ پر آؤ اور کب میں گزارش کروں۔ بس کسی طرح مجھے مریم کا نمبر لادو۔ بہت عرصے سے تم سے یہ ہی کہنے والا تھا۔" نعمان کے منہ سے باجی کی بیٹی کا نام سن کر سجیلہ کھڑے کھڑے جیسے اپلوں میں دھنس گئی۔

"مریم باجی؟" اس نے تصدیق کی۔

"جب وہ کالج سے آتی تھی' میں تب ہی گیٹ پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ مگر وہ ایسی شرمیلی ہے ہمیشہ گاڑی اندر جانے اور گیٹ بند ہونے کے بعد نکلتی تھی۔ اس لیے میں جان گیا تم ہی میرا کام کر سکتی ہو۔ نمبر لادو گی تو انعام میں پورے ہزار روپے دوں گا۔" سجیلہ کے خوابوں کا محل دھڑ دھڑ زمین بوس ہو رہا تھا اور سامنے کھڑے شخص کو اس کے وجود میں ہونے والے دھماکوں کی خبر ہی نہ تھی۔

"صاحب! آپ نے بہت تھوڑی قیمت لگائی میری۔" وہ بس اتنا کہہ کر پلٹ گئی۔

اور لوٹ آئی اسی لکڑی کے چولہے کو پھونک مار مار کر سلگانے۔ کھوٹ اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ اس کے مزاج میں تھا جو قناعت نہیں سیکھ سکا۔ جسے اپنی چادر کی لمبائی ناپنی نہیں آئی کہ حساب سے پاؤں پھیلائے۔ وہ پھونک مارتی رہی اور دل سے لکڑیاں جلانا سیکھنے لگی۔ اسے امید تھی لکڑیوں کا چولہا جلانا سیکھ لے گی تو قناعت بھی سیکھ ہی جائے گی۔ پھر اسے بھی وہ اطمینان نصیب ہو گا جو بے وقوفوں کے پاس فطری ہوتا ہے اور عقل مند ٹھوکر کھا کر حاصل کرتا ہے۔

✲

مریم عزیز

"سنبل" یہ تیسری دفعہ تھا جب امی نے اسے آواز دی تھی۔

"جی امی!" وہ منہ کچن کی طرف کر کے بولی اور دوبارہ نظریں ٹی وی اسکرین پر جمادیں۔ اب کی بار شکیلہ اس کے سر پر آکر کھڑی ہو گئیں اور ایک چپت اس کے سر پر لگائی۔

"امی!" وہ سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"امی کی بچی کب سے آوازیں دے رہی ہوں اٹھ کر برتن دھو کر چاول ابال لو' تمہارے ابو کے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔"

"امی بس یہ مووی کا اینڈ ہونے والا ہے۔" وہ ملتجی انداز میں کہہ کر دوبارہ ٹی وی دیکھنے لگی۔ شکیلہ نے ایک نظر ٹی وی کی طرف دیکھا۔ جہاں سلمان خان دس لوگوں کو اکیلا دھو رہا تھا۔

مکمل ناول

"سنبل! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ چار دفعہ تو یہ فلم تم دیکھ چکی ہو۔"

"نہیں امی! میں تو سات دفعہ دیکھ چکی ہوں۔" تیزی سے کہتے ہی اس نے زبان دانتوں تلے دبائی۔

"شاباش ہے تم پہ، پیپر میں یہی لکھ آیا کرو، کیونکہ کتابیں پڑھتے میں تمہیں مصیبت پڑ جاتی ہے۔" وہ ابھی بات کر رہی تھیں لائٹ چلی گئی۔

"ہاہ!" سنبل نے ٹھنڈی آہ بھری اور برا سامنہ بنا کر کھڑی ہو گئی۔

"امی! پتا نہیں آپ کو میں ہی فارغ نظر آتی ہوں۔ باجی سے بھی کچھ کہہ دیا کریں۔" وہ کچن میں جانے تک بڑبڑاتی گئی۔

"سارا دن وہ بے چاری ہی تو کرتی ہے۔ اب بھی وہ ہی اٹھ رہی تھی میں نے منع کیا ہے، کل پیپر ہے اس کا۔"

"نہ بھی ہوتا تو آپ نے پھر مجھے ہی کہنا تھا۔" وہ برتن دھوتے ہوئے بھی اس مووی کا اینڈ سوچ رہی تھی۔ ہر دفعہ اینڈ سے اس کی مووی رہ جاتی تھی۔

✲ ✲ ✲

"آج بہت دیر کر دی آپ نے۔" کھانا سامنے رکھتے ہوئے شکیلہ نے غور سے اپنے شوہر ارشد کا چہرہ دیکھا۔

"ہوں بھائی صاحب کی طرف چلا گیا تھا۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے بولے۔

"خیریت تھی۔"

"ہاں خیریت تھی ویسے ہی چکر لگایا تھا۔" وہ جو کوئی خاص بات سننے کی منتظر تھیں۔ گہری سانس لے کر اپنی پلیٹ پر جھک گئیں۔

"دلاور کو جاب مل گئی ہے۔" کھانا ختم کرنے کے بعد انہوں نے بریکنگ نیوز دی تھی۔ شکیلہ نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"یہ آپ مجھے اب بتا رہے ہیں۔" بیوی کا چہرہ دیکھ کر وہ مسکرا دیے تھے۔

"اب اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔ ابھی تو صرف لیٹر ملا ہے۔"

"مل تو گیا نا، لیکن دیکھ لیں اپنی بھاوج کو، برت گئیں ناغیریت۔ بندہ جھوٹے منہ ہی فون کر دیتا ہے۔ اتنی بڑی خوش خبری تھی، مٹھائی تو کھلانی چاہیے تھی۔" وہ اب غصے سے تیز تیز بولنے لگیں۔

"شکیلہ بیگم! ابھی تو دھیرج سے کام لیا کرو۔ کل نہیں تو پرسوں وہ بتا دیں گے۔ انہیں تو خود آج پتا چلا ہے۔"

"اونہہ۔" وہ سر جھٹک کر رہ گئیں۔

"شبنم اور سنبل کہاں ہیں۔" انہوں نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"شبنم تو سو گئی ہے۔ صبح اس کا پیپر ہے اور دوسری آپ کی لاڈلی جس کو آپ نے سر چڑھا رکھا ہے، بیٹھی ہو گی ٹی وی کے آگے تصویر بن کے۔" ان کے انداز پر ارشد صاحب بے ساختہ مسکرائے تھے۔

"تمہیں کیا اعتراض ہے شکیلہ! اس کا شوق ہے۔"

"ہاں تو اسی شوق کی وجہ سے ہڈ حرام ہو گئی ہے۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں، میری بیٹی میرا تو ہر کام کرتی ہے۔"

"کہاں کرتی ہے۔ دس دفعہ کہو تو ایک دفعہ وہ بھی منہ بنا کر اٹھتی ہے۔"

"اچھا!" وہ مسکرا کر بولے "سنبل"

"جی ابو۔ فوراً" ہی اس کی آواز آئی تھی اور دوسرے ہی پل وہ ان کے سامنے تھی۔ جبکہ ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"بیٹا! ایک کپ چائے مل سکتی ہے۔"

"جی ابو! ابھی لائی۔" وہ تیزی سے پلٹی۔ شکیلہ نے حیرت سے اس کی پھرتی دیکھی۔

"تو مجھے کیوں اتنے نخرے دکھاتی ہے میں کیا اس کی سوتیلی ماں ہوں۔" ان کی بات پر ارشد صاحب ہنس پڑے تھے۔

"تم ماں ہو اس کی، تمہیں نخرے نہیں دکھائے گی تو کس کو دکھائے گی۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تو شکیلہ بھی مسکرا کر برتن سمیٹنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم تائی امی!" کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے برآمدے میں رکھے تخت پر اسے امینہ تائی نظر آگئی تھیں۔

"وعلیکم السلام لڑکی! تمہیں کہاں سے یاد آگئی۔" اسے دیکھ کر وہ ہمیشہ کی طرح اپنے نخوت بھرے انداز میں بولیں۔

"یاد تو روز کرتی ہوں تائی امی!" مقابل ۔۔۔ بھی وہ تھی جس پر ان کی باتیں اور طنز چکنے گھڑے کی طرح پھسل جاتے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کے پاس تخت پر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"یہ۔" اس نے شاپر میں ہاتھ ڈال کر مٹھائی کا ڈبا نکالا "یہ امی نے آپ کے لیے بھجوائی ہے۔"

"کیوں خیر تھی؟" وہ چونک کر پوچھنے لگیں۔

"دلاور بھائی کی جاب کی خوشی میں۔ اب آپ نے بھجوائی نہیں تو ہم نے تو آپ کا منہ میٹھا کروانا تھا نا۔"

اس کے انداز پر امینہ کے تلووں پر لگی ۔۔۔ سر پر بجھی تھی۔ اس سے پہلے وہ کچھ بولتیں، انہیں اپنے پیچھے ایک جان دار قہقہہ سنائی دیا تھا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔ جہاں انس ہنستا ہوا ان کی طرف ہی آرہا تھا۔

"السلام علیکم انس بھائی!" اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو۔" وہ ماں کا چہرہ دیکھنے کے بعد مسکراہٹ روک کر بولا۔

"دیکھا تم نے اس چھوکری کی زبان 'بالشت بھر کی ہے اور زبان گز بھر کی۔"

"واہ تائی امی! آپ کی اردو تو بڑی غضب کی ہے۔ ویسے بالشت بھر کا مطلب کیا ہوتا ہے؟" وہ آنکھیں پٹپٹا کر معصومیت سے بولی تو انس مسکراہٹ چھپانے کے لیے سامنے رکھے مٹر کے تھال پر جھک گیا۔

"چپ کرتی ہو یا اٹھاؤں جوتی؟" ان کے دھمکانے انداز پر وہ منہ بنا کر رہ گئی۔

"اور کیا ہے اس کے اندر؟" امینہ کو شاپر میں موجود اور سامان دیکھ کر کھدبد ہونے لگی۔

"یہ کچھ کتابیں ہیں، جو مجھے دلاور بھائی کو دینی ہیں۔"

"دلاور تو ابھی گھر نہیں آیا مجھے دے دو میں اسے دے دوں گی۔" ایک پل کے لیے تو سنبل گھبرا کر رہ گئی۔ انس اس کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دیا۔

"جاؤ دلاور کے کمرے میں رکھ آؤ' میں بتا دوں گا۔" انس کے کہنے پر اس نے کب سے رکا اپنا سانس بحال کیا اور تیزی سے کھڑی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ امینہ تائی اس کے ہاتھ سے شاپر چھین لیں۔ کمرے میں آکر وہ متلاشی نظروں سے کوئی محفوظ جگہ تلاشنے لگی۔

"کیا ہوا؟" وہ شاپر کو بیڈ کے نیچے چھپا رہی تھی جب اس کی آواز پر تیزی سے اچھلی۔

"انس بھائی! بہت برے ہیں آپ۔ ڈرا دیا مجھے۔"

وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر بولی۔

"ایسے کام ہی کیوں کرتی ہو جس میں ڈرنا پڑے۔" وہ

کہتے ہوئے بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔
"تو کیا کروں؟ آپ کے بھائی اور میری باجی نے مجھے کبوتر بنا دیا ہے۔ سارا وقت پیغام اور تحفے ادھر سے اُدھر کرتی رہتی ہوں۔ اس سے اچھا تھا۔ میں TCS میں لگ جاتی۔ کم از کم تھوڑے پیسے تو ملتے۔" وہ تھوڑی ناراضی اور غصے سے بولتی ہوئی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔
"اب پلیز، آپ اسے سنبھالیں۔ شبنم باجی نے دلاور بھائی کے لیے بھیجا ہے اور یہ پرسنل ہے۔ کھول کر مت بیٹھ جایئے گا۔"
"کیوں ایسا کیا پرسنل ہے۔ میں تو دیکھوں گا۔ میرے بھائی کا گفٹ ہے۔" وہ ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا تو سنبل نے تیزی سے ڈبا دبوچ لیا۔
"یہ میری بہن نے دیا ہے۔ میں نے بھی نہیں دیکھا، ویسے بھی کسی کی پرسنل چیزیں نہیں دیکھنی چاہئیں انس بھائی! آپ کو اتنا بھی نہیں پتا۔" اب کے وہ جھنجلا کر بولی تو انس ہنس پڑا۔ اسے اس پھلجھڑی سی لڑکی کو تنگ کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔
"اچھا بابا! نہیں دیکھتا اب تو دے دو، نہیں تو امی نے دیکھ لیا تو گیا تمہاری باجی کا گفٹ پانی میں۔"
"او ہاں!" وہ یاد آنے پر جلدی سے بولی۔ "یہ لیں، اسے الماری کے اوپر والے شیلف میں رکھ دیں۔ وہاں تائی امی کا ہاتھ نہیں جائے گا۔" اس نے پکڑانے کے ساتھ مشورہ بھی دے ڈالا۔
اس سے پہلے وہ کچھ کہتا۔ باہر سے امینہ تائی کی آواز آئی تھی۔
"کہاں رہ گئی لڑکی؟"
"ایک تو مجھے لگتا ہے، تائی امی کو میرا نام یاد نہیں ہوتا۔" وہ جھنجلا کر بولتے ہوئے باہر نکل گئی۔ انس نے مسکراتے ہوئے اس ڈبے کو دیکھا اور الماری میں سب سے اوپر والے شیلف میں رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور اس کے دونوں ہاتھوں میں آئس کریم کپ تھے۔
"یہ لیں باجی!" وہ پھولی —— سانسوں کے ساتھ اس کے قریب گرنے کے انداز میں بیٹھی تھی۔
"مجھے نہیں کھانا۔" شبنم اکتا کر بولی۔
"آپ کو ہوا کیا ہے باجی! کل سے ہی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہیں۔" وہ اپنی آئس کریم کھاتے ہوئے مزے سے بولی۔
"پاگل ہو گئی ہوں نا اس لیے۔" اب کے وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی تو سنبل نے رک کر بہن کا چہرہ دیکھا۔
"آپ نے پوچھا نہیں یہ آئس کریم کہاں سے آئی؟"
شبنم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
"دلاور بھائی لے کر آئے ہیں۔" اب کے شبنم نے چونک کر اسے دیکھا جو مزے سے آئس کریم کھا رہی تھی۔
"وہ کب آئے؟"
"کب کے نیچے امی کے پاس بیٹھے ہیں۔" اس کی بے نیازی پر شبنم نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔
"تم مجھے اب بتا رہی ہو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ تو سنبل نے دوبارہ ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔
"یہیں بیٹھ جائیں دلاور بھائی ابھی اوپر آئیں گے۔" وہ جو اسے کچھ سخت سست کہنے والی تھی چپ ہو کر رہ گئی۔
"آئیں سنبھالیں اپنی منگیتر کو لیکن افسوس آپ کے ساتھ روپے پگھل گئے۔" اس نے بے چارگی سے اسے پگھلی ہوئی آئس کریم دکھائی تو دلاور نے مسکرا کر اس کے سر پر چپت لگائی اور شبنم کی طرف دیکھا۔ جس نے ناراضی سے منہ دوسری طرف گھما لیا تھا۔
"سنا ہے کچھ لوگ ناراض ہیں۔" وہ اس سے کچھ فاصلہ پر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا لیکن وہ مسلسل دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔
"دیکھو شبنم! تمہاری دی ہوئی ٹائی لگا کر آفس گیا تھا اور فضا میں مہکی خوشبو کو بھی محسوس کرو، تمہارا بھیجا

ہوا پرفیوم لگایا ہوا ہے۔ اور یہ سب میں تمہیں دکھانے آیا ہوں۔" اب کے شبنم نے رخ موڑ کر دیکھا۔

"بڑی جلدی یاد آگیا۔ اتنے دن تو توفیق نہیں ہوئی۔"

"سوری یار! مجھے پتا تھا۔ تم ناراض ہو گی لیکن کیا کروں نیا نیا آفس جوائن کیا ہے۔ آنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے تو جلدی سو جاتا ہوں اور تمہیں میسج کروں تو تم جواب بھی نہیں دیتیں۔"

"تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔ رات جب فون کرتی ہوں تو بزی جاتا ہے۔ جب تم سو رہے ہوتے ہو تو پھر فون کیسے جاگ رہا ہوتا ہے۔" دلاور نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

"پتا نہیں یار! میں تو سو جاتا ہوں خیر اب تو میں آگیا ہوں نا تو اپنی ناراضی ختم کر لو۔ میری لائی ہوئی آئس کریم بھی ضائع کر دی تم نے۔" وہ منہ بنا کر بولا تو شبنم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆ ☆ ☆

"دلاور کو تم لے کر آئی تھیں نا؟" وہ بڑے انہماک کے ساتھ نوٹس کو رٹا لگانے میں مصروف تھی جب شبنم نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ جواباً" اس نے لاپروائی سے دیکھ کر سرہلایا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ باجی! میں آپ کو افسردہ نہیں دیکھ سکتی۔" اب وہ نوٹس سے نظر ہٹا کر بولی۔

"لیکن مجھے پھر بھی اچھا نہیں لگا سنبل! جو احساس تمہیں ہوا تھا' وہ دلاور کو ہونا چاہیے تھا۔ محبت کا احساس بھیک میں نہیں لیا جاتا اور نہ یہ احساس کسی اور کے احساس دلانے سے ہوتا ہے۔ کیا اس کو نہیں پتا کہ اس کی خوشی پر میرا بھی کچھ حق ہے۔ تائی امی جس طرح کا سلوک ہمارے ساتھ کرتی ہیں اور دلاور جس طرح تائی امی کا چمچہ ہے مجھے ڈر ہی لگتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گا۔ مجھے اپنا مستقبل دھند کی لپیٹ میں لپٹا نظر آتا ہے۔" بات کرتے کرتے وہ سر جھکا کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

اور اس کا چہرہ دیکھتی سنبھل سمجھ گئی تھی وہ آنسو ضبط کر رہی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر بازو اس کے گرد پھیلا دیا۔

"آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں باجی! سب جانتے ہیں بچپن سے آپ کی بات دلاور بھائی سے طے ہے' دوسرا دلاور بھائی آپ کو کتنا پسند کرتے ہیں اور تائی امی جو بھی کر لیں دلاور بھائی' تایا ابو' انس بھائی سب کا ووٹ آپ کے ساتھ ہے سو ڈونٹ وری۔"

"تم بہت اچھی ہو سنبل اور شاید بہت سمجھ دار بھی۔"

"وہ تو میں ہوں۔" شبنم کے کہنے پر وہ فرضی کالر اکڑا کر بولی اور پھر دونوں ہنسنے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

گیٹ پر پڑا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کا خراب موڈ اور خراب ہو گیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور پھر گہرا سانس لے کر دائیں گلی میں مڑ گیا۔

"کون؟" پوچھنے کے ساتھ اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ "ارے انس بھائی!" اسے دیکھ کر وہ بے ساختہ انداز میں خوش ہوئی "اندر آئیں نا!" وہ راستہ دے کر بولی۔

"امی! دیکھیں انس بھائی آئے ہیں۔" دروازہ بند کرتے ہی وہ اونچی آواز میں ہانک لگا کر بولی۔

"السلام علیکم چچی جان! کیسی ہیں؟"

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں بیٹا! آؤ بیٹھو۔ بڑے تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔" شکیلہ کے پوچھنے پر سنبل نے بھی غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ واقعی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"جی چچی! صبح سے نکلا ہوا تھا۔ تین انٹرویو تھے بسیں بدل بدل کر سر گھوم گیا۔ صبح بھی کچھ کھا کر نہیں گیا۔ اب گھر پہنچا ہوں تو امی پتا نہیں کہاں گئی ہیں تالا لگا ہوا ہے۔"

"سنبل! جاؤ شبنم سے کہو' جلدی جلدی گرم پھلکے ڈالے۔ بھائی کے لیے کھانا لے آؤ۔"

"نہیں چچی!"

"چپ رہو یہ بھی تمہارا گھر ہے اور تم صبح سے بھوکے ہو گتنا سامنہ نکل آیا ہے' اب تم کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو' جلدی جاؤ۔" انہوں نے کہنے کے ساتھ پریشان کھڑی سنبل کو گھورا اور اس کے ڈر کر بھاگنے پر وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"چائے!" وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ جب شبنم کی آواز پر چونک کر سیدھا ہوا۔

"سوری شاید میں سو گیا تھا" وہ چائے کا کپ تھامتے ہوئے جھینپ کر بولا۔

"چائے پی کر سو جاؤ اندر آرام سے۔"

"نہیں چائے پی کر چلتا ہوں۔ امی آ گئی ہوں گی۔" وہ چائے کا گھونٹ لے کر بولا۔

"کچھ پریشان لگ رہے ہو۔"

"نہیں تو۔" وہ ٹالنے کے لیے مسکرایا۔

"میرا خیال ہے انس! ہم کزن ہونے کے علاوہ دوست بھی ہیں۔" شبنم نے سنجیدہ انداز میں کہا تو وہ مخصوص انداز میں مسکرا دیا۔

"پتا نہیں جب ایم بی اے کی ڈگری لی تھی تو لگا دنیا فتح کر لی ہے۔ اندازہ ہی نہیں تھا کہ یوں خوار ہونا پڑے گا۔ دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں جاب کی تلاش کرتے ہوئے لیکن مسلسل ناکامی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھوں کو اضطرابی انداز میں بالوں میں پھیرا۔

"تم دل چھوٹا نہ کرو انس! تم تو اتنے باہمت ہو' ابو تمہاری مثال دیتے ہیں۔ دوسرا ڈگری تمہارے ہاتھ میں ہے۔ آج نہیں تو کل تمہیں اپنی محنت کا صلہ ضرور ملے گا۔"

"ہوں!" وہ چائے ختم کر چکا تھا "چلتا ہوں کھانا اور چائے دونوں بہت مزے کے تھے۔ کافی عرصے بعد اتنا مزے کا کھانا کھایا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں امی سے کہوں دلاور کی شادی کر دیں۔ کم از کم تمہارے ہاتھ کا کھانا کھانے کو تو ملے گا۔"

"مجھے نہیں لگتا تمہارے بھائی کو شادی میں یا مجھ میں انٹرسٹ ہے۔ جب سے جاب ملی ہے موصوف کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر گئی تھی۔

"کیا واقعی ایسا ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"تو اور کیا فون تک کرنے کی فرصت نہیں اسے۔"

"پر وہ تو ہر وقت فون پر ہوتا ہے۔ میں سمجھا تم سے۔" انس نے تیزی سے کہہ کر شبنم کا چہرہ دیکھا جو پریشان نظر آ رہی تھی۔

"ارے مذاق کر رہا تھا۔"

"بدتمیز جان نکال دی تھی۔" وہ اس کے بازو پر تھپڑ لگا کر بولی۔

"او کے پھر آؤں گا۔" وہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی اس نے دروازہ کھولا تھا جب اس نے پیچھے سنبل کی آواز سنی۔

"انس بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو بہت جلد بہت اچھی جاب ملے گی۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گی۔" انس حیرت سے اس کی اپنے بارے میں اتنی فکر دیکھ رہا تھا۔ "ابو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ میری دعا جلدی سنتے ہیں۔"

انس کی نظریں اس کے چہرے پر چھائی معصومیت پر ٹھہر گئی تھیں اور اگلے لمحے وہ مسکرا دیا "تھینک یو۔"

✡ ✡ ✡

ارشد صاحب کے باہر نکلتے ہی وہ تلملاتی ہوئی اندر آئی تھیں۔

"آپ نے ارشد کو پیسے دیے ہیں؟" واجد صاحب نے حیرت اور پھر غصے سے امینہ کو دیکھا۔

"ہاں دیے ہیں تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

"مجھے تکلیف پیسے دینے پر نہیں تین لاکھ دینے پر ہے۔"

"تمہارے پیسے تھے جو تمہیں تکلیف ہو رہی ہے۔ میرا بھائی ہے وہ' اسے ضرورت تھی اور اس نے ادھار لیا ہے کوئی احسان نہیں کیا میں نے اس پر۔"

امینہ نے تھوڑا شرمندہ ہو کر حیران نظروں سے دیکھتے اپنے بیٹے کو دیکھا جبکہ انس کی نظریں جھکی تھیں۔
"مجھے برا لگا واجد! کیونکہ اس دن انس نے آپ سے تین لاکھ مانگے تھے تو آپ نے منع کر دیا۔ آپ کے نزدیک اولاد کا فیوچر کچھ نہیں۔" امینہ کے طنز پر واجد صاحب نے ماتھے پر بل ڈال کر انس کو دیکھا تو وہ گڑبڑا کر ماں کو دیکھنے لگا۔
"اس میں میرا کیا ذکر ہے امی! ابو سے میں نے پیسوں کی بات کی تھی لیکن ابو نے مجھے نہیں دیے۔ اس کی کچھ وجہ تھی۔ میں نے آپ سے کوئی شکایت نہیں کی تو آپ اپنے جھگڑے میں مجھے کیوں گھسیٹ رہی ہیں۔"
"میں ماں ہوں تمہاری، تم دونوں کی جو تکلیف مجھے نظر آتی ہے، وہ تمہارے باپ کو نظر نہیں آتی۔"
"ہاں کیونکہ میں سوتیلا ہوں۔ تم انہیں جہیز میں لے کر آئی تھیں۔" امینہ سے بات بن نہ پڑی تو وہ بیٹھ کر رونے لگیں۔ دلاور اٹھ کر ماں کے قریب بیٹھ گیا۔
"تم نے اپنا ہی رونا ڈال دیا ہے۔ جو ضروری بات مجھے کرنی تھی، وہ تو درمیان میں ہی رہ گئی۔" وہ تینوں واجد صاحب کی شکل دیکھنے لگے۔
"شبنم کا ماسٹرز بھی مکمل ہو گیا ہے اور دلاور کی جاب بھی اچھی جا رہی ہے اور یہی اچھا وقت ہے کہ ہم اپنے فرض سے سبک دوش ہو جائیں۔"
"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" امینہ نے سمجھنے کے باوجود نا سمجھی کا مظاہرہ کیا۔
"ایسا کون سا فلسفہ بول دیا جو تم جیسی کم عقل عورت کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں شبنم اور دلاور کی شادی کی بات کر رہا ہوں۔"
دلاور نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔
"آپ عجیب باپ ہیں واجد! آپ کو پہلے اپنے بھائی کی اولاد نظر آتی ہے اور بعد میں اپنی۔"
"مطلب کیا ہے تمہارا؟" انہوں نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔
"پتا ہے، لوگ کیسے اپنے بیٹوں کے لیے رشتے ڈھونڈتے ہیں۔ میرے بیٹے کی جیسی جاب اور حیثیت ہے۔ لوگ ایسے رشتوں کو جہیز میں گاڑی تک دیتے ہیں جبکہ آپ کا بھائی گاڑی تو دور کی بات جہیز کا سامان پورا نہیں دے سکتا۔"
حیرت کی زیادتی سے واجد صاحب کچھ لمحوں کے لیے بول ہی نہیں سکے جبکہ انس حیرت سے خاموش بیٹھے دلاور کو دیکھ رہا تھا۔
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا امینہ! کیا فضول بکواس کر رہی ہو۔ شبنم اور دلاور کا رشتہ بچپن سے طے ہے۔"
"لیکن یہ کوئی پتھر پر لکیر تو نہیں۔ صرف بچپن میں زبانی کلامی بات ہوئی تھی۔ کوئی رسم نہیں ہوئی نہ ہم نے کبھی اس بات کو دہرایا، وہی لوگ امید لگائے بیٹھے ہیں۔"
واجد صاحب نے بے ساختہ اپنا ماتھا پیٹا۔ باپ کو صدمے میں دیکھ کر انس کھڑا ہوا تھا۔
"امی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ جہیز کہاں سے آ گیا درمیان میں۔ میاں بیوی کے رشتے کے لیے چیزوں کی نہیں محبت اور انڈر اسٹینڈنگ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ دلاور اور شبنم میں ہے اور تم دلاور! تم بولتے کیوں نہیں خاموش کیوں ہو؟" انس نے اب غصے سے دلاور کو دیکھا جو کب سے خاموش بیٹھا تھا۔
"وہ کیا بولے گا۔ میرا بیٹا ہے۔ میں جانتی ہوں اسے اور اس کے دل کی بات بھی، بے چارا بچپن سے چپ ہے۔ باپ کے ڈر سے بولا ہی نہیں۔ پنگوڑے میں تھا جب اسے اچھے برے کی پہچان نہیں تھی۔ اپنی قبول صورت بھتیجی تھما دی۔ اب جبکہ اس کے پاس اچھی چوائس ہے تو وہ کیوں جانتے بوجھتے کنویں میں چھلانگ لگائے۔" واجد صاحب نے سختی سے دانتوں پر دانت جما رکھے تھے۔
"دلاور کے باس کی بیٹی ہے۔ خوب صورت ہے، امیر ہے اور سب سے بڑھ کر وہ دلاور کو پسند کرتی ہے۔ اس نے خود دلاور کو پرپوز کیا ہے۔" کہنے کے ساتھ امینہ نے فخر سے اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھا۔
"اس سے شادی کی صورت میں نہ صرف جہیز میں

قیمتی سامان اور گاڑی ملے گی بلکہ دلاور کو پروموشن بھی ملے گی، میں مل بھی چکی ہوں اس لڑکی سے اور مجھے پسند بھی ہے وہ۔"

"امی!" انس نے باپ کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ دیکھ کر دکھ سے ماں کو دیکھا۔

"امی! شبنم کے بارے میں سوچیں۔ چاچو چچی کے بارے میں سوچیں۔ وہ سارے رشتے داروں کو کیسے فیس کریں گے لوگوں کو کیا وجہ بتائیں گے۔ کیوں بچپن کا رشتہ ٹوٹا۔ وہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار کہلائے گی اور دلاور تم تو شبنم کو پسند کرتے تھے۔ میں گواہ ہوں اس چیز کا تم کیوں نہیں بولتے تمہاری زندگی کا سوال ہے سمجھاؤ امی کو۔" اس نے کندھے سے پکڑ کر بھائی کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"تم ان کے زیادہ حمایتی نہ بنو انس، میں اور دلاور فیصلہ کر چکے ہیں اور دلاور کی مرضی سے ہوا ہے۔ دلاور بھی اس لڑکی کو پسند کرتا ہے۔"

اور کب سے خاموش کھڑے واجد صاحب جیسے پھٹ پڑے تھے۔

"جیسی ماں ـــــ ویسا ہی بیٹا نکلا کم ظرف، لالچی۔" دلاور نے تڑپ کر باپ کو دیکھا لیکن ان کی آنکھوں میں اتنا غصہ تھا وہ نظریں جھکا کر رہ گیا۔ "اور تم کم ظرف عورت! تمہیں شروع سے ہی گھمنڈ تھا بیٹوں کی ماں ہونے کا۔ تمہیں احساس ہی نہیں بیٹی کی تکلیف کیا ہوتی ہے، شاید اسی لیے اتنی خواہش کے باوجود اللہ نے تمہیں اس رحمت سے محروم رکھا۔ جس بہو کو تم لالچ کی وجہ سے لا رہی ہو۔ وہی تمہیں ذلیل کر کے اس گھر سے باہر نکالے گی اور تب تمہیں اس ہیرے کی قدر آئے گی جسے تم پتھر سمجھ کر بے مول کر رہی ہو اور تم ناہنجار، تم آستین کے سانپ کیا پلاننگ کر رکھی ہے تم نے، تمہاری ماں تو زہر اگل چکی ہے تم کہو تمہارا کیا فیصلہ ہے۔"

دلاور نے گھبرا کر ماں کا چہرہ دیکھا جنہوں نے آنکھ کے اشارے سے اسے تسلی دی تھی۔

"ابو! میں بھی شبنم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ نیہا کے ساتھ شادی کر کے میں کہاں سے کہاں پہنچ جاؤں گا۔" وہ آنکھوں میں چمک لے کر جوش سے بولا۔

"لعنت ہو تم پر اور تمہاری سوچ پر۔" واجد صاحب نے حقارت سے اسے دیکھا۔ سر جھٹک کر باہر نکل گئے۔ انس بس ملامت بھری نظروں سے ماں اور بھائی کو دیکھ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ کب سے شکیلہ کو دیکھ رہے تھے جو کسی سوچ میں گم بیٹھی تھیں۔

"شکیلہ۔"

"جی!" وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔

"کس بات کو لے کر پریشان ہو۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"کل رضیہ آئی تھیں۔" انہوں نے واجد صاحب اور ارشد صاحب کی مشترکہ کزن کا نام لیا۔

"وہ پوچھ رہی تھیں کہ کیا دلاور اور شبنم کی منگنی ختم ہو گئی؟"

"ایسے کیوں کہا انہوں نے۔" وہ پریشان ہو کر بولے۔

"میں نے بھی یہی پوچھا تھا۔ پہلے تو وہ ٹال گئیں پھر بولیں۔ امینہ بھابھی کسی تقریب میں ملی تھیں، کہہ رہی تھیں۔ دلاور کے لیے انہوں نے کسی بہت امیر لڑکی کو پسند کیا ہے۔ جہیز میں انہیں گھر اور کار ملے گی۔" کہتے ہوئے وہ رو پڑیں۔ کچھ دیر تک ارشد صاحب بول ہی نہیں سکے۔ پھر سر جھٹک کر بولے۔

"تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو، بہت سے لوگوں کو تکلیف ہے کہ شبنم کی شادی دلاور جیسے لڑکے سے ہو رہی ہے تو کہیں تو انہیں اپنا حسد نکالنا ہے، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو بھائی صاحب مجھے بتاتے۔"

شکیلہ تلخ ہو کر بولیں "کیا آپ کو ان لوگوں کے انداز کچھ سمجھ نہیں رہے۔ ایک ماہ ہونے کو آیا ہے۔ نہ بھائی صاحب آئے اور نہ دلاور۔ اس دن بازار میں

بھابھی کو دیکھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن میرے آگے بڑھتے ہی وہ یوں مڑیں جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔"
راشد صاحب کو چپ لگ گئی تھی۔
"اس سے پہلے کہ وقت ریت کی طرح ہماری مٹھی سے پھسل جائے۔ آپ بھائی صاحب سے بات کریں' ان سے پوچھیں لوگ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ میرا دل کچھ غلط ہونے کا اشارہ دے رہا ہے۔"
ماں کی اندیشوں سے لرزتی آواز پر وہ جو چائے کا پوچھنے آئی تھی۔ الٹے قدموں واپس مڑی تھی۔ کمرے تک آتے آتے وہ اپنا ضبط کھو چکی تھی۔ وضو کر کے جونہی سنبل باہر نکلی۔ شبنم کو یوں زار و قطار روتے دیکھ کر وہ گھبرا کر اس کی طرف آئی تھی۔
"کیا ہوا باجی؟ ایسے کیوں رو رہی ہیں۔" شبنم کے رونے میں اور شدت آگئی تھی۔
"باجی پلیز کچھ تو بولیں۔ میں پریشان ہو رہی ہوں۔" شبنم نے روتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ جو سن کر آئی تھی بتاتی چلی گئی۔ سنبل کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔
"آپ بجائے رونے کے فون کر کے دلاور بھائی سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں۔"
"کتنی بار سنبل! کتنی بار اب تو فون کر کر کے میری انگلیاں گھس گئی ہیں۔ وہ فون نہیں اٹھاتا۔ نہ میسج کا جواب دے رہا ہے۔" سنبل خاموش ہو کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔
"باجی! ہو سکتا ہے جو آپ نے سنا ہو' سچ ہو' تائی امی کو آپ جانتی ہیں وہ ایسا کر بھی سکتی ہیں لیکن مجھے یقین ہے دلاور بھائی ایسے نہیں' وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں۔ آپ خود ان سے بات کریں۔"
"کیسے؟" وہ بے بس ہو کر بولی۔
"آپ چلیں میرے ساتھ۔ ہم ان کے گھر چلتے ہیں۔" سنبل کے مشورے پر شبنم نے غصے سے اسے دیکھا۔
"پاگل تو نہیں ہو گئیں گھر جا کر اپنا تماشا بنانا ہے۔" کہہ تو شبنم ٹھیک رہی تھی وہ کچھ اور سوچنے لگی۔

"پھر ایسا کریں' صبح ان کے آفس چلی جائیں پلیز باجی! اب اس پر اعتراض نہ کرنا۔ یہ آپ کے فیوچر کا سوال ہے۔ دلاور بھائی بزدل سے ہیں۔ شاید آپ کو دیکھ کر کچھ ہمت پکڑلیں۔"
سنبل کے کہنے پر شبنم نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں واضح نظر آرہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اور یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔
اسے آفس نہیں جانا چاہیے تھا۔
اس شخص کا کچھ تو بھرم رہ جاتا جس کو اس نے بچپن سے سوچا تھا۔ ریسپشن سے دلاور واجد کا پوچھ کر وہ اس کے کیبن کی طرف بڑھنے لگی۔ بڑھتے قدموں میں بے حد وزن محسوس ہو رہا تھا جبکہ ٹھنڈے موسم میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ پہلی بار تھا جب ماں باپ سے چھپا کر وہ کوئی کام کرنے جا رہی تھی۔
اس نے کیبن میں داخل ہونے سے پہلے سر پر لیا ہوا دوپٹا ایک بار پھر سیدھا کیا۔ ہلکا سا کھٹکھٹا کر اس نے ناب گھما کر دروازہ کھول دیا۔ کمپیوٹر کی اسکرین کی طرف دیکھتے دلاور نے سرسری نظر دروازے پر ڈالی لیکن اگلے ہی پل وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔ اب وہ بے حد حیران' قدرے پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح اس کے سامنے آکر کھڑی ہو جائے گی۔
"تم! آخر اس کا سکتہ ٹوٹا اور ایک لفظ اس کے منہ سے نکلا۔ شبنم اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے بالکل سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔
"کیسی ہو؟" وہ بمشکل مسکرا کر بولا "بیٹھو۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
"بیٹھنے نہیں آئی کچھ پوچھنے آئی ہوں۔" دلاور کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔ اسے پتا تھا ایسا لمحہ ضرور آئے گا لیکن اب تک وہ ہر ممکن طریقے سے بچتا آرہا تھا اور وہ بڑا فیصلہ کرنے کے باوجود اتنی ہمت نہیں کر پا

رہا تھا کہ شبنم کا سامنا کرے اور شبنم بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی۔

"میرا فون کیوں نہیں اٹینڈ کر رہے؟" وہ سنجیدہ لہجے میں پوچھنے لگی۔

"فون؟" وہ گڑبڑایا وہ تو کسی اور سوال کا منتظر تھا "وہ دراصل میرا فون خراب تھا۔"

"اچھا!" وہ بڑی سنجیدگی سے بولی "شاید اسی لیے فون کی بیل بھی جاتی ہے اور فون گھنٹوں انگیج بھی جاتا ہے۔ خیر میں کچھ اور بھی پوچھنے آئی تھی۔"

"تم بیٹھو تو میں کچھ منگواتا ہوں تمہارے لیے۔" وہ سٹپٹا کر بولا۔ اس سے پہلے وہ کچھ پوچھتی دروازہ کھلا تھا۔

"ہائے دلاور!" ایک طرح دار سی لڑکی اندر داخل ہوئی اور پھر شبنم پر نظر پڑتے ہی رک گئی تھی۔

"آؤ نیہا!" دلاور اس کو سامنے دیکھ کر اور گھبرا گیا تھا۔ اس نے شبنم کا فق چہرہ دیکھ کر نیہا کا کھلا ہوا چہرہ دیکھا۔ دونوں کے لباس، انداز اور شکل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دلاور نے گہرا سانس لیا۔ جیسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گئی ہو۔

"یہ کون ہیں؟" نیہا نے سوالیہ نظروں سے شبنم کو دیکھ کر پوچھا۔ شبنم دلاور کے بولنے کی منتظر تھی۔

"یہ شبنم ہے میری کزن اور شبنم! یہ نیہا ہے۔" شبنم نے بھی گہرا سانس لیا۔ جیسے کوئی شخص آخری سانس لیتا ہے۔

"تم نے پورا تعارف نہیں کروایا دلاور!" نیہا نے اٹھلا کر کہا تو دلاور نے مسکرا کر شبنم کو دیکھا۔

"یہ نیہا ہے میری منگیتر۔" شبنم مسکرا دی اور اس مسکراہٹ میں کتنا درد تھا۔ یہ تو صرف وہی جانتی تھی۔ وہ نہ بھی بتاتا۔ آنے والی کے استحقاق بھرے انداز اسے سب سمجھا گئے تھے۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ نیہا!" شبنم نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو اور تم ہماری شادی میں آ رہی ہو نا!" نیہا کے پوچھنے پر اس نے بڑی جلتی نظر اس کم ظرف انسان پر ڈالی جس نے اس کی ہستی لمحوں میں پامال کر ڈالی تھی اور واپس مڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ صدمے کی کیفیت میں سامنے بیٹھی شبنم کو دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر بے ساختہ نفی میں ہلایا۔

"نہیں، دلاور بھائی ایسا نہیں کر سکتے۔" بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے دکھ بھری نظروں سے اپنی بہن کے پتھریلے چہرے کو دیکھا۔ پتا نہیں وہ کتنا رو چکی تھی کہ اس کی آنکھیں بنجر لگنے لگی۔

"آپ نے امی ابو کو بتایا؟"

"نہیں، آج نہیں تو کل انہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔" کہنے کے ساتھ شبنم نے گہرا سانس لیا۔

"آپ اب کچھ نہیں کریں گی یونہی خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گی۔" شبنم بے چارگی سے مسکرائی تھی

"میں آخر کر بھی کیا سکتی ہوں۔"

"مطلب کیا ہے باجی! اتنا بڑا دھوکا ہوا ہے آپ کے ساتھ۔ آپ کو یوں بیچ منجدھار میں چھوڑ کر دلاور بھائی ہنسی خوشی اپنی زندگی کا آغاز نہیں کر سکتے انہیں اس بے وفائی کی وجہ بتانی ہو گی۔" وہ اشتعال سے کھڑی ہو گئی۔

"کیا یہ وجہ کم ہے کہ میرے پاس دولت نہیں ہے۔" شبنم نے اب کے لیٹ کر دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ سنبل کتنی دیر ہونٹ بھینچے اپنی بہن کی لرزتی پلکوں اور ہونٹوں کو دیکھتی رہی۔ اس نے ایک نظر دائیں طرف لگی گھڑی پر ڈالی۔ جہاں شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ اس نے ایک نظر پھر بہن کو دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

گیٹ ہمیشہ کی طرح کھلا تھا۔ لیکن سامنے رکھا تخت خالی تھا وہ اسی طرح سخت اور پتھریلا انداز لیے آگے بڑھ آئی۔ باہر کھڑی مہران دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا۔

دلاور گھر آ چکا ہے۔ اس کا رخ دلاور کے کمرے کی طرف تھا۔ اس سے پہلے وہ اندر داخل ہوتی کوریڈور سے اسے انس آتا دکھائی دیا۔ اس نے واضح طور پر اسے پریشان ہوتے دیکھا تھا۔

"سنبل تم اس وقت خیریت ہے؟" وہ اس کے پاس کھڑے ہو کر اس کے چہرے کو جانچتے ہوئے بولا۔

"مجھے دلاور بھائی سے ملنا ہے۔"

"وہ تو گھر پہ نہیں۔"

سنبل نے بڑی سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ان کی باہر کھڑی گاڑی میں دیکھ چکی ہوں۔" تب ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر دلاور باہر نکلا اور سامنے انس کے ساتھ کھڑی سنبل کو دیکھ کر پہلے وہ ٹھٹکا اور پھر رک گیا۔ سنبل نے طنزیہ نظروں سے انس کو دیکھا۔

"جھوٹ بولنا لگتا ہے آپ لوگوں کی ہابی ہے۔"

اب کی بار انس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ سنبل رکے بغیر سیدھی دلاور کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"جو ہم نے سنا ہے وہ سچ ہے دلاور بھائی!" دلاور نے گڑبڑا کر انس کو دیکھا جو بے حد خاموشی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا سنا ہے تم نے۔" وہ نظریں چُراتے ہوئے بولا۔

"وہی جو آپ نے باجی سے کہا۔" دلاور نے کوئی جواب نہیں دیا اور نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی۔

"میں اس وقت پہیلیاں بوجھنے کے موڈ میں نہیں مجھے کہیں ضروری جانا ہے۔"

"آپ ایسے نہیں جا سکتے دلاور بھائی۔" وہ اب کے اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی دلاور نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"سنبل! اس بدتمیزی کا کیا مطلب ہے۔"

"اور اس بدتمیزی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو آپ نے باجی کے ساتھ کی ہے۔ جو آپ نے ہم سب کے ساتھ کی ہے۔ اتنے سالوں کے رشتے کو آپ ایسے کیسے اچانک خود سے ختم کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہے تو اسے بیٹھ کر ہم حل کر لیتے ہیں لیکن کسی غلط فہمی کی وجہ سے رشتہ تو ختم نہیں کر سکتے۔ آپ کو پتا ہے نا باجی آپ کو کتنا چاہتی ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں۔ آپ بھی باجی سے محبت کرتے ہیں۔ آپ تائی امی کے کہنے پر ایسا کر رہے ہیں نا۔"

اس کو جیسے یقین تھا دلاور ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ "آپ مجھے بتائیں میں تایا ابو سے بات کرتی ہوں۔"

اب خاموش کھڑے دلاور نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔

"تم دونوں کیا میرے پیچھے پڑ گئی ہو کوئی زبردستی ہے کیا۔"

"دلاور بھائی!" وہ اس کے ہتک بھرے انداز پر دنگ رہ گئی۔ کتنی دیر تو بولنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ دلاور نے ایک نظر اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو دیکھا اور ان سے نظریں چُرا کر انس کو آواز دی۔

"انس پلیز! اسے یہاں سے لے جاؤ۔"

"نہیں۔" وہ چیخی تھی۔ "میں ایسے نہیں جاؤں گی مجھے جواب چاہیے اس بدعہدی کا۔"

"آواز نیچے رکھ کر بات کرو لڑکی" اچانک پیچھے سے اسے تائی امی کی سخت اور اونچی آواز سنائی دی "کب سے کھڑی تمہاری بکواس سن رہی ہوں۔ تم ہوتی کون ہو ہم سے سوال جواب کرنے والی؟ اپنی عمر دیکھو اور اپنی حرکتیں دیکھو۔ ماں باپ کو ہوش نہیں اور یہ ننھی بی چلی ہیں دادی اماں بننے۔" سنبل نے رخ موڑ کر امینہ تائی کو دیکھا۔

"یہ سب آپ کروا رہی ہیں نا۔"

"ہاں میں کروا رہی ہوں بولو کیا کر لو گی میرا؟" وہ درمیان کا فاصلہ سمیٹ کر بالکل اس کے سامنے جا کر تن کر کھڑی ہو گئیں۔

"تائی امی! باجی اور دلاور بھائی کی منگنی بچپن سے طے ہے سب جانتے ہیں۔ باجی نے تو کبھی تصور میں بھی دلاور بھائی کے علاوہ کسی کو نہیں سوچا۔ ان کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں۔ وہ مر جائیں گی میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں تائی امی!" وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو پڑی تھی۔ امینہ بیگم نے بے زاری سے اس کے بے مول ہوتے آنسوؤں کو دیکھا۔

"دیکھو لڑکی! یہ ٹسوے بہانے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہم فیصلہ کر چکے ہیں اور اس میں دلاور کی بھی پوری مرضی شامل ہے۔ آخر کیوں نہ ہو نیہا بہت خوب صورت ہے امیر ہے اسے جہیز میں وہ ملنے والا ہے جس کا تمہاری بہن تصور بھی نہیں کر سکتی۔ جب مجھے میرے بیٹے کو اتنی نعمتیں مل رہی ہیں تو ہم کیوں کفران نعمت کریں۔"

سنبل کتنی دیر روتی نظروں سے اس مغرور عورت کا چہرہ دیکھتی رہی اور پھر اس نے جڑے ہوئے ہاتھ کھول کر انہیں پہلوؤں میں گرا لیا۔

"آپ کو اللہ سے ڈر نہیں لگتا تائی امی! جو اگر آپ کی کوئی بیٹی ہوتی اور اس کے ساتھ کوئی ایسا کرتا۔"

امینہ بیگم نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا اور اگلے ہی پل ان کا ہاتھ گھوما اور اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

"امی!" انس نے ایک دم ان کو دونوں بازوؤں سے تھاما تھا۔

"چھوڑو مجھے انس! اس لڑکی کی جرات دیکھو مجھے دعا دے رہی ہے۔ کوئی زبردستی ہے۔ نہیں کرنا ہمیں رشتہ۔ اتنی ہی بھاری ہے تم لوگوں کو اپنی لڑکی تو بیاہ دو اسے کسی کے ساتھ۔ کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔"

"امی بس کریں خاموش ہو جائیں۔" انس نے انہیں چپ کرایا تھا۔

"تم جاؤ سنبل!" اس نے اب اسے مخاطب کیا تھا۔ اس نے چہرہ صاف کر کے دلاور پر ایک نفرت بھری نظر ڈالی اور باہر نکل گئی۔ انس نے ایک افسوس بھری نظر دلاور پر ڈالی جو نظریں چرا کر اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں بیٹھے افراد کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ صرف امینہ بیگم تھیں جن کے منہ سے آگ نکل رہی تھی۔

"قیامت کی نشانی ہے اتنی سی لڑکی اور اتنی بڑی زبان اللہ غارت کرے اسے۔ میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے کوسنے بددعائیں دے کر آئی ہے۔ نامراد کہیں کی۔ یہ تربیت کی ہے تم نے ارشد، شکیلہ! اپنی بیٹیوں کی۔ ایک کی جرات دیکھو، آفس پہنچ گئی پوچھ گچھ کرنے۔ حد ہے بے شرمی کی۔ کیا یہی ہوتے ہیں شریف لڑکیوں کے لچھن اور دوسری جسے دنیا میں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ مجھ سے آ کر حساب مانگ رہی ہے۔ مجھے الزام دے رہی ہے۔ میں شادی نہیں ہونے دے رہی اور اگر ایسا ہے تو میں ماں ہوں۔ میرا پورا حق ہے اس پر۔ میں جہاں چاہوں اپنے بیٹے کی شادی کروں۔ میں پابند نہیں کسی کی۔" کہنے کے بعد انہوں نے جیسے گہرے گہرے سانس لے کر خود کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"اور یہ لو اپنی بیٹی کے تحفے۔" انہوں نے پاس رکھا شاپر اٹھا کر شکیلہ کے قدموں میں پھینکا۔ ٹائی، پرفیوم کی آدھی بوتل، چند کارڈ نکل کر شکیلہ کے قدموں میں گرے۔ وہ یوں لگ رہا تھا محبت کی ناقدری پر ماتم کر رہے ہوں۔ شکیلہ نے نظریں اٹھا کر بھی انہیں نہیں دیکھا۔

"اگلے ہفتے میرے بیٹے کی شادی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تمہاری دونوں بیٹیاں میرے بیٹے کی خوشیوں کو نظر لگانے آئیں۔" کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی تھیں۔

"اپنی بیٹیوں کو لگام دو ارشد! بلکہ میرا مشورہ ہے۔ کوئی مناسب سا رشتہ دیکھ کر ٹھکانے لگا دو دونوں کو، کیونکہ تمہارے چھوٹے سے گھر میں انجینئر ڈاکٹر یا بینکر آنے سے رہا۔" وہ نخوت سے بولتے ہوئے مڑیں لیکن ان کی مسکراہٹ ایک سیکنڈ میں سکڑی تھی۔ دروازے کی بیچ و بیچ واجد صاحب اور انس کھڑے تھے۔ پتا نہیں وہ کب سے کھڑے تھے اور کتنا سن چکے تھے لیکن ان کی آنکھوں سے نکلتے شعلے ان کو ہولانے کے لیے کافی تھے۔ وہ گھبرائی ہوئی ان کے قریب سے نکل گئی تھیں۔ جبکہ واجد صاحب کتنی دیر دروازے کی دہلیز کو تھامے ضبط کی منزلوں سے گزرتے رہے۔ انہوں نے اندر بڑھتے ہوئے افسردہ نظر اپنے ساکت بیٹھے بھائی اور بھابھی پر ڈالی۔

"ارشد!" وہ ان کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ جیسے بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں۔
"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں تم لوگوں کا، شبنم کا گناہ گار۔۔۔ ہوں۔ میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ نوبت یہاں تک نہ آئے' پر میرے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ عورت اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئی اور زیادہ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ دلاور بھی اس کے ساتھ ہے۔ دونوں کو رشتوں کا پاس ہی نہیں رہا۔ دولت کی پٹی بندھ گئی ہے ان کی آنکھوں پر' میں ہاتھ جوڑ کر تم لوگوں سے معافی مانگتا ہوں۔ تم لوگ بڑے ظرف والے ہو۔ تم۔۔۔ مجھے معاف کردو۔"
انہوں نے کہنے کے ساتھ ہاتھ جوڑ دیے جبکہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ انس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بڑی تکلیف سے اپنے باپ کے جُڑے ہاتھ' آنکھ سے نکلتے آنسو دیکھے۔
"پلیز بھائی صاحب! مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ بڑے ہیں میرے اور مجھے پتا ہے آپ کی کوئی غلطی نہیں۔ بس نصیبوں کی بات ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔
"سنبل!" اچانک خاموشی میں شکیلہ کی زوردار آواز سنائی دی۔ تینوں چونک کر شکیلہ کا چہرہ دیکھنے لگے۔ کسی نے بھی پہلے شکیلہ کی ایسی اونچی آواز نہیں سنی تھی۔ تب ہی سنبل کے ساتھ شبنم بھی بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ سنبل سب کو دیکھ کر شکیلہ کا منہ دیکھنے لگی۔ اسے دیکھ کر شکیلہ تیزی سے کھڑی ہوئیں اور اس کے قریب پہنچتے ہی ایک کے بعد دوسرا تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ سنبل کے ساتھ باقی سب بھی حیران پریشان رہ گئے۔
"یہ تربیت کی تھی میں نے تمہاری' کیا سوچ کر تم دلاور سے جواب طلبی کرنے گئی تھیں؟ کس نے تمہیں یہ حق دیا تھا بولو۔" انہوں نے اس کے بازو کو زور کا جھٹکا دیا جبکہ ضبط کرنے کے چکر میں اس کا چہرہ بری طرح سرخ ہو رہا تھا۔
"دکھا آئیں ناوہاں مار اور پڑ گئی ٹھنڈ ماں کی تربیت کو

میڈل دلوا کر۔ اس دن کے لیے تم دونوں کے پیدا ہونے پر خوشیاں منائی تھیں۔ کبھی بیٹے کا شکوہ نہیں کیا۔ تم دونوں بھی پیدا ہوتے ہی مرجاتیں تو اچھا تھا۔ یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" اب کہ وہ بے بسی کے احساس سے رو پڑیں۔
"امی!" سنبل بے چین ہو کر ان کی طرف بڑھی لیکن انہوں نے غصے سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ جو اس حملہ کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ لڑکھڑا کر دیوار سے لگی۔ ایک پل کے لیے اسے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا۔
"پاگل تو نہیں ہو گئیں شکیلہ!" ارشد صاحب کے ساتھ واجد صاحب بے ساختہ آگے بڑھے۔ انہوں نے ایک دم آگے بڑھ کے سنبل کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور سہارا ملتے ہی وہ جو ــــــــ ضبط کر کے کھڑی تھی۔ بلک بلک کر رونے لگی۔ شبنم نے دکھ سے اپنا سر جھکا لیا۔ اسے ان سب کے دکھ کی وجہ اپنا آپ لگ رہا تھا۔
"شکیلہ! ہمارا غصہ اس بچی پر کیوں نکال رہی ہو۔" واجد صاحب نے دکھ سے اپنی بھاوج کو دیکھا۔
"تمہیں کم از کم بھائی صاحب کا ہی لحاظ کرنا چاہیے تھا۔" ارشد صاحب کے کٹھیلے انداز پر وہ شرمسار ہو کر واجد صاحب کو دیکھنے لگیں۔
"معاف کردیں بھائی صاحب! پر اس نے غلط کیا۔ اس کی نادانی کی وجہ سے بھابھی کیا کچھ نہیں سنا گئیں۔"
"اس میں سنبل کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ بچی ہے۔ جذباتی ہے۔ بہن کی تکلیف برداشت نہیں ہوئی تو پوچھنے چلی آئی۔ کس مان سے آئی تھی۔ اب سامنے والوں نے اس کا مان نہیں رکھا تو وہ بے چاری کیا کرتی اور اگر سنبل نہ بھی جاتی تو بھی امینہ نے یہی کچھ کرنا تھا۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ آخر کسی طرح تو اس نے اپنی غلطی کو کور کرنا تھا۔"
"پر بھائی صاحب! میری بچی کا کیا قصور تھا۔ اس کو کس بات کی سزا ملی ہے۔" انہوں نے دکھ سے شبنم کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔

"شبنم کا کوئی قصور نہیں شکیلہ! دلاور اس قابل نہیں تھا کہ یہ ہیرا صفت لڑکی اس کی قسمت میں لکھی جاتی۔ اللہ' دیکھنا اس کے کتنے اچھے نصیب کرے گا۔" انہوں نے آگے بڑھ کر شبنم کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ روتے ہوئے ان کے ساتھ لگ گئی۔ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے وہ پھر آبدیدہ ہو گئے۔ انس نے بھی آگے بڑھ کر شبنم کے سر پر ہاتھ رکھا تھا' انس کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر سنبل بڑے غیر محسوس انداز میں باپ سے الگ ہو کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کو جاتے دیکھ کر انس گہرا سانس لے کر باپ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا بنارسی ساڑھی کے ساتھ میچنگ نیکلس اور میک اپ سے سجے چہرے کے ساتھ امینہ دروازے کے درمیان کھڑی تھیں لیکن دور سے بھی وہ ان کے چہرے سے ان کے غصے کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ دوبارہ مڑ کر الماری سے اپنی مطلوبہ شے ڈھونڈنے لگا۔ اس کے یوں بے نیازی برتنے پر امینہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔"

"کیوں کہاں جانا ہے؟" وہ اپنی شرٹ نکال چکا تھا۔

"کیا تم واقعی اتنے انجان ہو کہ تمہیں پتا ہی نہیں آج تمہارے بھائی کی شادی ہے۔"

"میں آپ کو کل ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے اس شادی میں شرکت نہیں کرنی۔"

"انس! تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ کیا تماشا بنا رکھا ہے تم باپ بیٹے نے۔ غیروں کے لیے اپنوں کا مذاق بنوانے پر تلے ہو۔ کل مہندی میں کس طرح نبھا کے ماں باپ کو مطمئن کیا۔ یہ میں ہی جانتی ہوں بجائے اس کے کہ تم اپنے باپ کو سمجھاؤ۔ تم خود ان کے ساتھ مل گئے ہو۔"

"جن کو آپ غیر کہہ رہی ہیں ان سے ہمارا خون کا رشتہ ہے۔ میں کیسے ابو کو سمجھا سکتا ہوں۔ وہ بڑے ہیں۔ سمجھ دار ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کو نہیں سمجھا سکا۔"

"تم ماں سے مقابلہ کر رہے ہو۔"

"مقابلہ نہیں کر رہا۔ بتا رہا ہوں۔"

"میں یہاں تمہاری بکواس سننے نہیں آئی۔ تم سے کہنے آئی ہوں۔ تیار ہو جاؤ۔ آج تمہارے بھائی کا نکاح ہے۔ تم لوگوں کو ذرا خیال نہیں' وہاں جب وہ باپ اور بھائی کے ہوتے ہوئے بھی اکیلا ہو گا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔"

انس استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

"یہ بات آپ نے اور دلاور نے کیوں نہیں سوچی کہ آپ لوگوں کی اس حرکت کی وجہ سے چاچو چچی اور شبنم کے دل پر کیا گزری ہو گی اور کل جو آپ بغیر کسی وجہ کے ان کے گھر اتنی باتیں سنا کر آئی ہیں۔ آپ کو بالکل اندازہ نہیں ہوا۔ ان کے دلوں پر کیا گزری ہو گی۔" اب کی بار اس کا لہجہ غصیلا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا انس! آخر تمہیں اس لڑکی کا اتنا درد کیوں اٹھ رہا ہے۔ کہیں اب اس شبنم نے دلاور سے ناامید ہو کر تم پر تو ڈورے ڈالنے شروع نہیں کر دیے۔"

"امی!" وہ بے ساختہ چیخا تھا "افسوس ہو رہا ہے مجھے آپ کی سوچ پر۔ وہ میری کزن ہے' بہن ہے' دوست ہے۔ اسے ہمیشہ میں نے اپنی بھابھی کے روپ میں دیکھا تھا۔ چاچو' چچی کے چہرے دیکھتا ہوں تو ڈر لگتا ہے امی کہ آپ نے کتنے لوگوں کا دل دکھایا ہے۔"

"ماں کو بد دعا دے رہا ہے۔" امینہ نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"میں نے کیا کسی کو بد دعا دینی ہے۔" وہ سر جھٹک کر افسردگی سے بولا "اب وقت گزر چکا ہے۔ آپ نے جو کرنا تھا۔ وہ آپ کر چکی ہیں۔ سو اب آپ مجھے اور ابو کو ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔"

"تو تم نہیں آؤ گے؟" وہ ابرو اچکا کر اس سے پوچھنے لگیں۔ جواباً وہ خاموش رہا تھا۔

"اگر آج تم نہ آئے تو سمجھ لینا انس! آج سے

تمہاری کوئی ماں بھی نہیں۔" کہہ کر وہ رکی نہیں تھیں جبکہ اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑی شرٹ کا گولا بنا کر سامنے دیوار پر دے مارا۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے حیرت سے سامنے کھڑے انس کو دیکھا جبکہ انس نے ان کی روئی ہوئی آنکھیں دیکھ کر نظریں چرالی تھیں۔

"چچی! کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" اس کے پوچھنے پر وہ شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹیں۔

"چاچو گھر میں ہیں؟" اس نے کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا "وہ بھائی صاحب کے ساتھ باہر گئے ہیں۔"

اس نے گہرا سانس لیا۔ شبنم کہاں ہے؟

"اپنے کمرے میں۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ سر ہلاتا ہوا شبنم کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ ہلکا سا تھپتھپا کر وہ اندر داخل ہوا تھا۔ شبنم نے جلدی سے آنکھیں صاف کر کے سامنے دیکھا تو حیرانی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "تم شادی پر نہیں گئے۔"

"نہیں۔"

"کیوں۔" وہ بے حد حیران تھی۔

"بس میری مرضی۔" کہہ کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی کتاب اٹھالی۔ "تایا ابو بھی نہیں گئے اور تم بھی؟" وہ ابھی تک بے یقین تھی۔

"تائی امی نے کچھ نہیں کہا؟"

"تم نے اچھا نہیں کیا انس! تمہیں جانا چاہیے تھا۔ تائی امی کو برا لگا ہوگا۔"

"تمہیں ابھی بھی ان کے برا لگنے کی پروا ہے؟" وہ حیرت کے بعد ناراضی سے بولا۔

"ہاں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ اب مزید کوئی مجھ پر انگلی اٹھائے جو ہونا تھا وہ ہو چکا انس! اگر تم اور تایا ابا یوں ری ایکٹ کرو گے تو کل کو میرے لیے اور پرابلمز ہو سکتی ہیں۔ پہلے ہی میری وجہ سے میرے ماں باپ بہت دکھی ہیں میں انہیں مزید دکھی نہیں کرنا چاہتی۔"

"تو کیا تم اسے معاف کر سکو گی؟"

"پتا نہیں۔ شاید کر دوں یا شاید نہیں۔ آنے والا وقت اس کا فیصلہ کرے گا۔ فی الحال میں نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ انس خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"انس! میری ایک بات مانو گے؟"

"ہاں بولو۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہیں شادی پر جانا چاہیے۔"

انس نے حیران ہو کر اسے دیکھا "تم کس مٹی کی بنی ہو شبنم" وہ افسوس سے بولا تو شبنم نے مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہی۔ اگلے ہی پل وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ تھوڑی دیر پہلے جو اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ خود کو سنبھال چکی ہے۔ ان آنسوؤں میں بہہ گیا تھا۔ بہن کے رونے کی آواز سن کر سنبل بھاگتی ہوئی اندر آئی تھی۔ اس نے ایک نظر روتی ہوئی شبنم کو دیکھا اور دوسری قہر بھری نظر پریشان کھڑے انس پر ڈالی۔

"آپ لوگ کیوں بار بار ہمارا تماشا بنانے آجاتے ہیں۔ جو آپ لوگ کر چکے ہیں کیا کافی نہیں ہے؟" وہ انس کے سامنے کھڑے ہو کر بڑی بدلحاظی سے بولی تھی۔

"آپ دیکھ نہیں رہے۔ ان کی طبیعت کتنی خراب ہے۔ پھر کیوں اپنی شکل دکھا دکھا کر انہیں مزید پریشان کر رہے ہیں۔ اپنے گھر کا جشن چھوڑ کر یہاں کیا لینے آئے ہیں؟"

"سنبل!" شبنم نے غصے سے اونچی آواز میں اس کا نام لیا۔ "کیسے بات کر رہی ہو انس سے؟"

"تو کیسے کروں بات؟ باجی یہ اسی گھر کے فرد ہیں جنہوں نے ہماری خوشیاں چھین لیں۔ ان کی والدہ محترمہ تھیں جنہوں نے آپ کے لیے کیسے الفاظ استعمال کیے تھے تو یہ کس منہ سے ہمارے گھر آئے ہیں۔"

انس ماتھے پر بل ڈالے ہونٹ بھینچے اسے دیکھ رہا تھا۔

"چپ ہو جاؤ سنبل! انس کا اس میں کیا قصور ہے؟"

"تو کیا ہمارا قصور ہے؟" وہ الٹا شبنم سے پوچھنے لگی۔

"کسی کا قصور نہیں، قسمت کی بات ہے۔"

"آپ دوسروں کی غلطی کو قسمت پر ڈال سکتی ہیں میں نہیں۔ آپ معاف کر سکتی ہیں میں نہیں۔ میں ان کی شکل دیکھتی ہوں تو۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی کیونکہ ضبط کے باوجود وہ آنسو روک نہیں پائی تھی۔

"آپ کی بہت مہربانی ہوگی اگر آئندہ آپ ہمارے گھر نہ آئیں۔" سنبل کا انداز بہت دوٹوک تھا۔ انس نے بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے بلایا تھا ابو؟" انس نے دروازے سے جھانک کر اندر دیکھا۔ واجد صاحب نے کتاب سے نظر ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"ہاں آؤ بیٹا! کچھ مشورہ کرنا تھا۔"

"جی!" وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمہاری ماں اور بھائی نے جو کیا ہے وہ سب تمہارے سامنے ہے۔ جب میں ارشد اور شکیلہ کی شکلیں دیکھتا ہوں تو ایک احساس ندامت گھیرنے لگتا ہے مجھے، میں نے شبنم کے لیے کچھ سوچا ہے۔ سوچا تم سے پوچھ لوں؟" وہ مسلسل سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور ان کا چہرہ دیکھتے دیکھتے جیسے وہ چونکا تھا۔

"ایک منٹ ابو! اس سے پہلے آپ کچھ کہیں، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ امی اور دلاور نے جو بھی شبنم کے ساتھ کیا۔ مجھے اس کا بہت دکھ ہے اور آپ جانتے ہیں۔ میں شادی میں بھی نہیں گیا۔ شبنم کو ہمیشہ میں نے اپنی بہن مانا ہے۔"

ایک پل کے لیے واجد صاحب خاموش رہ گئے۔

"تم سمجھ گئے تھے میں کیا کہنے والا ہوں۔" وہ جیسے مسکرا کر بولے تو وہ سر کھجا کر رہ گیا۔

"ہاں، میں نے ایسا سوچا تھا لیکن مجھے پتا ہے شبنم بھی نہیں مانے گی۔ اسی لیے پہلے تم سے رائے لے لی۔ بہرحال ایک رشتہ ہے میری نظر میں۔ اظفر میرا دوست ہے نا۔ اس کا بیٹا انجینئر ہے۔ اس نے خود بات کی تھی۔ کوئی اچھی سی لڑکی نظر میں ہو تو بتانا۔ یہ اس کا کارڈ ہے۔" انہوں نے جیب سے کارڈ نکال کر انس کی طرف بڑھایا "پہلے اس کے بارے میں پتا کرواؤ۔ تسلی ہونے پر انہیں لڑکی دکھا دیں گے۔ پھر جو اللہ کو منظور۔"

"جی ابو!" وہ کارڈ پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ تب ہی دروازہ کھلنے پر دونوں نے مڑ کر دیکھا جہاں سے امینہ اندر آ رہی تھیں۔

"مجھے دیکھ کر آپ دونوں کو چپ کیوں لگ گئی؟" انہوں نے بیٹھ کر دونوں کو باری باری دیکھا۔ ان دونوں کو خاموش دیکھ کر انہیں غصہ ہی آ گیا تھا۔

"یہ آپ باپ بیٹے نے خود ساختہ چپ کا روزہ توڑنا ہے یا نہیں۔ یعنی کہ حد ہو گئی ایک مہینہ ہو گیا دلاور کی شادی کو، لیکن مجال ہے آپ دونوں نے ٹھیک سے نیہا سے بات کی ہو۔ کیا سوچتی ہو گی وہ اور دلاور ہنی مون پر جانے سے پہلے آپ سے پوچھنے آیا تھا تو آپ نے اس سے بات بھی نہیں کی۔"

"پوچھنے آیا تھا یا بتانے آیا تھا۔" اب کہ واجد صاحب چپ نہیں رہ سکے۔

"تو اور کیا کرتا۔ اس کے سالے نے اسے سنگاپور کی ٹکٹس گفٹ کی تھیں تو کیا وہ منع کر دیتا۔ اتنے دل والے ہیں میرے دلاور کے سسرال والے۔ اتنے موٹے کپڑے، اتنا بڑا سیٹ دیا مجھے انہوں نے۔ رشتے داروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہی جو میں آپ کے چہیتے بھائی کے گھر اپنا لڑکا بیاہ دیتی تو ملنا کیا تھا سوائے باتوں کے۔" وہ نخوت بھرے انداز میں بولیں۔

"مجھے پتا ہے آپ یہ سب اپنی بھتیجی کے کہنے پر کر رہے ہیں۔ وہی آپ کے کان بھرتی ہے۔"

"امینہ بیگم! بند کرو اپنی بکواس اور خبردار آئندہ

شبنم کا نام لیا تو۔ تم اس لڑکی کی گریٹنس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ وہ بھی جس نے مجھے شادی میں شرکت کرنے پر مجبور کیا تھا ورنہ تمہارا بیٹا باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں کی طرح بیٹھا ہوتا۔" انہوں نے پھینکنے کے انداز میں کتاب میز پر رکھی اور غصے میں باہر نکل گئے۔ امینہ نے اب انس کی طرف دیکھا۔

"تم بھی کچھ کہہ لو اب جا کہاں رہے ہو۔" اسے اٹھتا دیکھ کر وہ ناراضی سے بولیں۔

"کمرے میں جا رہا ہوں سونے۔"

"ماں کے پاس بیٹھتے تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔"

"امی! صبح مجھے جلدی اٹھنا ہے انٹرویو ہے میرا ایمبیسی میں۔"

"ایمبیسی میں؟" وہ چونک کر بولیں۔

"کس لیے؟"

"میں نے آسٹریلیا کے ویزے کے لیے اپلائی کیا ہے۔"

"تم آسٹریلیا جا رہے ہو اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ یقیناً" تمہارے باپ نے تمہیں یہ مشورہ دیا ہو گا۔ وہ چاہتے ہیں۔ میرے بیٹے مجھ سے دور ہو جائیں۔" وہ ایک پل میں جذباتی ہو گئی تھیں۔

انس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "امی! پتا نہیں آپ خود سے اندازے کیسے لگا لیتی ہیں۔ ابو تو جانتے بھی نہیں کہ میں آسٹریلیا جا رہا ہوں۔" اس کے کہنے پر امینہ نظریں چرا کر رہ گئیں۔

"کتنے عرصہ کے لیے جا رہے ہو۔"

"پتا نہیں ابھی مجھے کچھ اندازہ نہیں۔" کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"انس رکو، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"جی!" وہ پلٹ کر انہیں دیکھنے لگا۔

"تم نے نیہا کی بہن دیکھی ہے؟"

"کون سی بہن؟ اس کی تو کئی بہنیں ہیں۔" وہ کوفت بھرے انداز میں بولا۔

"ارے وہی شائلہ' نیہا سے چھوٹی ہے۔ ڈاکٹر بن رہی ہے۔ وہ جو ولیمہ والے دن گلابی لباس میں تھی۔ وہ جس کے بال سنہری رنگ کے تھے۔" وہ اسے بڑی تفصیل سے بتا رہی تھیں۔

"امی! وہاں اتنی لڑکیاں تھیں۔ اب مجھے کیا پتا' گلابی لباس میں کون تھی اور آپ کیوں اس کے بارے میں پوچھ رہی ہیں؟"

"کیونکہ نیہا بتا رہی تھی اس کی بہن اور اس کے پیرنٹس کو تم بہت اچھے لگے ہو۔ وہ اپنی بہن کا رشتہ تم سے کروانا چاہتی ہے۔"

وہ بڑے جوش سے بتا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ انہیں لگا وہ بھی ان کے جتنا خوش ہو گا لیکن اس کے تاثرات ان کے برعکس تھے۔ سخت اور پتھریلے۔

"آپ نے کیا مجھے دلاور سمجھ رکھا ہے؟"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" انہوں نے ناراضی سے انس کو دیکھا۔

"لوگ تو ایسے رشتے کے لیے جوتیاں گھسا دیتے ہیں اور یہاں بن مانگے اللہ اپنا کرم کر رہا ہے اور تم کفران نعمت کر رہے ہو۔"

"امی! میں بکاؤ نہیں کہ کوئی میری قیمت لگائے اور حاصل کر لے۔ میں شادی اپنی مرضی سے کروں گا۔ ایسی لڑکی سے جو مجھے سمجھ سکے۔ مجھے محبت عزت اور سکون دے سکے اور میں جب بھی شادی کروں گا۔ جہیز بالکل نہیں لوں گا۔" اس نے جیسے انہیں جتایا تھا۔

"ہاں تو نہ لو' پر مل تو لو لڑکی بہت اچھی ہے۔"

"امی!" اب کے وہ جھنجلا کر بولا۔ "جب مجھے اس سے شادی کرنی نہیں تو ملوں کیوں؟"

"کہیں تمہارے انکار کی وجہ شبنم تو نہیں؟" وہ شکی انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"خدا کے لیے امی! بس کر دیں۔" اس نے باقاعدہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "آپ کو یہی پریشانی ہے نا کہ میں شبنم سے شادی نہ کر لوں تو تسلی رکھیں۔ میں ایسا کچھ نہیں کرنے والا لیکن ساتھ آپ یہ بھی جان لیں۔ مجھے نیہا کی بہن میں بھی کوئی انٹرسٹ نہیں۔" کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔

✲ ✲ ✲

"باجی میں آپ کو بتا نہیں سکتی میں کتنی خوش ہوں۔" شبنم نے غور سے سنبل کا دمکتا چہرہ دیکھا۔ وہ نہ بھی کہتی تو اس کا چہرہ — بتا رہا تھا۔

"زبیر بھائی اتنے گڈ لکنگ ہیں اور اخلاق اتنا اچھا ایک دفعہ بھی نہیں لگا۔ ہم پہلی بار مل رہے ہیں اور ان کے گھر والے وہ بھی بہت اچھے ہیں خاص طور پر زبیر بھائی کی مما آپ کا اتنا پوچھ رہی تھیں۔ سچ باجی آپ بہت لکی ہیں۔" سنبل کے پرجوش انداز کے جواب میں شبنم کی مسکراہٹ اتنی ہی پھیکی تھی۔ سنبل کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔

"آپ خوش نہیں باجی؟" سنبل نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ وہ سر جھکا گئی لیکن سنبل نے آزردگی سے اس کی آنکھوں سے نکلتے آنسو دیکھے۔

"مجھے نہیں لگتا سنبل! کہ میں کبھی کسی پر یقین کر سکوں گی۔ دلاور میرا اپنا کزن تھا اور اس کی آنکھوں میں ہمیشہ میں نے اپنے لیے پسندیدگی ہی دیکھی تھی۔ اس نے صرف پیسوں کے لیے کیا کر دیا تو یہ تو پھر غیر ہیں۔ یہ پتا نہیں کیا کریں گے۔"

"باجی! ہر شخص ایک جیسا نہیں ہوتا اور ضروری نہیں جس طرح کی گھٹیا حرکت دلاور بھائی نے کی۔ زبیر بھائی ویسے ہوں۔ مجھے امید نہیں یقین ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اچھا ہی کیا ہے جو دلاور بھائی کی جگہ زبیر بھائی کو بھیج دیا۔"

"کب سے آوازیں دے رہی ہوں سنبل!" ناراضی سے بولتی ہوئی شکیلہ اندر داخل ہوئی تھیں "کیا ہوا ہے؟" وہ شبنم کی شکل دیکھ کر رک گئی تھیں۔

"کچھ نہیں امی! میں باجی کو زبیر بھائی کے بارے میں بتا رہی تھی تو وہ ان کی باتیں سن کر خوشی کے مارے رونے لگیں۔"

"بدتمیز۔" شکیلہ نے ہنس کر اسے چپت لگائی اور شبنم کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"مجھے پتا ہے شبنم! تم میری بہت اچھی فرماں بردار بچی ہو' مجھے آج تک تم نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور میں آگے بھی یہی امید کرتی ہوں۔ ماضی میں جو ہوا۔ اسے قصہ پارینہ سمجھ کر بھول جاؤ کیونکہ تمہارا مستقبل بہت تابناک ہے۔ میں دیکھ سکتی ہوں۔ زبیر واقعی اچھا لڑکا ہے۔ بہت ٹھیک ٹھاک لوگ ہیں لیکن خوفِ خدا والے۔ لالچی بالکل نہیں' لیکن تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ کبھی یک طرفہ رشتے کامیاب نہیں ہوتے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ اچھے ہیں تو ضروری ہے۔ تم بھی ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ' شروع میں ہو سکتا ہے تمہیں ایڈجسٹ کرنے میں پرابلم ہو۔ کیونکہ ہر گھر کا رہن سہن طریقہ مختلف ہوتا ہے لیکن تمہیں ان کے طور طریقوں کو اپنانا ہوگا۔ ان کے رنگ میں رنگنا ہوگا تب ہی کامیابی ملے گی۔ زبیر سے شادی کے بعد تمہارا سب کچھ وہی ہے۔ کبھی پیچھے مڑ کے دیکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ کبھی میں تمہاری آنکھوں میں کسی اور کی یاد کے آنسو دیکھوں۔"

شبنم نے نظریں اٹھا کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

"میں بالکل نہیں چاہتی کوئی میرے سامنے کھڑے ہو کر میری بیٹی کے کردار پر الزام لگائے یا میری تربیت پر انگلی اٹھائے۔" ان کا اشارہ کس طرف تھا۔ شبنم اور سنبل دونوں سمجھ گئی تھیں۔

"یہ رشتہ تمہارے تایا ابو نے کروایا ہے۔ ان کی عزت کا بھی سوال ہے۔ دوسرا مجھے تسلی اس لیے بھی ہے کہ انس نے ساری معلومات کر لی ہیں۔ اسے تسلی ہے تو تمہارے ابو اور مجھے بھی تسلی ہے۔"

"انس آیا نہیں؟" شبنم نے اچانک پوچھا۔

"پتا نہیں ایک ماہ سے زیادہ ہی ہو گیا ہے آیا ہی نہیں۔ باہر ہی تمہارے ابو سے مل کر چلا جاتا ہے۔" شبنم نے بے ساختہ سنبل کی طرف دیکھا جس نے برا سا منہ بنایا تھا۔

"اگلے ہفتے وہ لوگ ڈیٹ فکس کرنے آ رہے ہیں۔ تم اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ رنگ دیکھو' کتنا خراب ہو گیا ہے۔" انہوں نے ناراضی سے شبنم کا چہرہ دیکھا "میں ذرا بازار جا رہی ہوں تم ہنڈیا دیکھ لینا سنبل! میرے

آنے تک ہنڈیا تیار ہو۔"

"کیا مصیبت ہے۔" سنبل کے روہانسے انداز پر شبنم بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"مجھے لگتا ہے انس ناراض ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے شبنم کی خود کلامی سنی تو تنک کر بولی "تو کیا فرق پڑتا ہے ناراض ہیں تو ناراض رہیں۔" شبنم نے افسوس سے سنبل کو دیکھا۔

"تمہیں انس سے پرابلم کیا ہے، جو کچھ ہوا اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں۔ اس نے تو آخر تک کوشش کی اور اب تک وہ اپنی ماں اور بھائی کے خلاف جا کر ہماری طرف آتا ہے اور تم نے چھوٹی ہو کر اتنی بدتمیزی کی۔ یہ اس کی بڑائی ہے کہ اس نے تمہیں جواب تک نہیں دیا اگر چاہتا تو تمہیں تھپڑ بھی لگا سکتا تھا اور کوئی اسے کچھ کہتا بھی نہ کیونکہ غلطی تمہاری تھی۔"

"باجی! تایا ابو کو چھوڑ کر مجھے اس گھر کے ہر فرد سے نفرت ہے۔ آپ کو اگر لگتا ہے وہ غلط نہیں تو یہ آپ کی سوچ ہے، جبکہ مجھے وہ بھی مجرم لگتے ہیں میری اس سوچ کو آپ زبردستی نہیں بدل سکتیں۔"

"لیکن تم اسے اس گھر میں آنے سے بھی نہیں روک سکتیں۔ یہ اس کے چچا کا گھر ہے اور ابو امی کو اس سے بہت پیار ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تمہاری وجہ سے وہ اپنے بیٹے سے محروم ہو جائیں۔" سنبل اب کی بار خاموش رہی تھی۔

"ہیلو" کی آواز پر اس نے چونک کر شبنم کی طرف دیکھا جو فون پر بات کر رہی تھی "مجھے نہیں پتا تمہاری کیا مصروفیات ہیں۔ تم بس آج آ رہے ہو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" سنبل سمجھ گئی تھی وہ کس سے بات کر رہی ہے۔ وہ سر جھٹک کر باہر نکل گئی۔

✡ ✡ ✡

"کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تم اتنے دنوں سے آئے کیوں نہیں۔" شبنم نے ناراضی سے سامنے بیٹھے انس کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

"بتایا تو تھا مصروف ہوں۔"

"مجھے پتا ہے تم کتنے مصروف ہو، سیدھی طرح کہو ناراض تھے۔"

انس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"وہ بے وقوف ہے انس! تم جانتے ہو کتنی جذباتی ہے۔ وہ سب بھی اس نے جذبات میں کہا۔"

"جانتا ہوں۔"

"تو پھر اس ناراضی کی وجہ؟"

"ناراض نہیں ہوں۔" اس نے انگلیوں سے پیشانی کو مسلا۔ "میں جانتا ہوں غلطی میرے گھر والوں کی ہے اور اس بات پر میں خود شرمندہ ہوں لیکن ان کی غلطی کا قصوروار مجھے ٹھہرایا جائے یہ تو غلط ہے نا۔ میں دو دن تک سو نہیں سکا۔"

شبنم نے شرمندگی سے انس کا چہرہ دیکھا۔ اسے سنبل پر بے حد غصہ آیا تھا۔

"انس! اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔"

"پاگل ہو گئی ہو کیا۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ خیر چھوڑو یہ بات تم بتاؤ تم خوش ہو نا؟"

شبنم نے گہرا سانس لیا۔ "پتا نہیں لیکن مطمئن ہوں تم لوگوں نے میرے لیے اچھا ہی سوچا ہو گا۔"

"ہوں!" انس نے سر ہلایا "جہاں تک میں نے پتا کیا ہے اور زبیر سے ملا ہوں۔ وہ اچھا ہی لگا ہے مجھے۔ باقی میں دل سے تمہارے لیے دعاگو ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔"

"تھینک یو انس! تم واقعی میرے لیے بہترین بھائی اور دوست ہو۔"

"تھینک یو میڈم!" وہ مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو۔ بیٹھو کھانا بنا ہوا ہے۔"

"نہیں یار! جلدی میں ہوں۔ پرسوں میری فلائٹ ہے۔"

"کیا؟" وہ چیخی "کہاں جا رہے ہو۔" اس کی حیرت پر وہ مسکرایا تھا۔

"آسٹریلیا۔ جاب کے لیے اپلائی کیا تھا۔ پازیٹو رسپانس ملا تو سوچا کوچ کر جائیں۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے انس! تم پرسوں جا رہے ہو اور مجھے اب پتا چل رہا ہے اور جو دو ہفتوں بعد میری شادی ہے وہ۔" اب کے اس کا لہجہ بھر آگیا۔

"اس بات کا مجھے بھی افسوس ہے شبنم! لیکن مجبوری ہے۔ مجھے اسی ویک جوائن کرنا ہے لیکن تم فکر نہیں کرو میں رابطے میں رہوں گا۔"

شبنم نے افسوس سے سرہلایا "تم تھے تو امی ابو اور سنبل کی تسلی تھی۔ اب کون خیال رکھے گا۔"

"پاگلوں جیسی باتیں مت کرو۔ اور نہ فضول وہم پالو۔ ابو یہیں ہیں وہ روزانہ چکر لگائیں گے۔"

"تمہیں اجازت کیسے مل گئی؟" شبنم کا اشارہ امینہ بیگم کی طرف تھا۔

"میں نے سب کر کے اطلاع دی تھی۔"

"شرم کرو۔" اسے ہنستے دیکھ کر شبنم نے اسے گھر کا تھا۔

"اچھا اب برے برے منہ بنانا بند کرو۔ او کے اللہ حافظ" وہ اس کا سر تھپتھپا کر بولا۔

"جانے سے پہلے ملنے آؤ گے؟" وہ اسے چھوڑنے باہر نکل آئی تھی۔

"دیکھو کوشش کروں گا۔"

"امی! سنا آپ نے' یہ آسٹریلیا جا رہا ہے۔" اس نے شکیلہ کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں جانتی ہوں بڑا جلد باز لڑکا ہے۔" انہیں بھی اس کے جانے کا افسوس تھا۔ اس اطلاع پر سنبل کے کان تو کھڑے ہوئے لیکن وہ ٹی وی کی طرف دیکھتی رہی۔ انس نے بھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ وہ شکیلہ اور شبنم سے مل کر باہر نکل گیا اور اس کے باہر نکلتے ہی سنبل نے گہرا سانس لے کر چینل بدل دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ سو کر اٹھی تو شام ہو رہی تھی وہ بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں اٹھی تھی۔ نیچے سے آتی آواز پر وہ حیران ہوتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی ——— شبنم کو شکیلہ کے پاس بیٹھا دیکھ کر وہ بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔

"السلام علیکم باجی! آپ کب آئیں؟" وہ اس سے گلے ملتے ہوئے بولی۔

"کافی دیر ہو گئی ——— تم سوئی ہوئی تھیں تو اٹھایا نہیں۔" شبنم نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے کہا بھی تھا۔ تمہیں اٹھا دے۔ کھانا کون بنائے گا؟" شکیلہ کے کہنے پر سنبل نے برا سا منہ بنا کر شبنم کو دیکھا جو اس کی شکل دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

"منہ دیکھو اس کا' کام کرنے کے نام سے جان جاتی ہے۔" شکیلہ نے ہمیشہ کی طرح اسے گھر کا۔

"سفیان کدھر ہے باجی؟" اس نے اپنے بھانجے کا پوچھا۔

"امی کے کمرے میں سو رہا ہے۔"

"میں اسے دیکھ کر آتی ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھی تو شکیلہ نے افسوس سے سر جھٹکا۔

"تم آئی ہو تو اسے سمجھا کر جاؤ۔"

شبنم نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا۔

"امی! اس میں سمجھانے والی کیا بات ہے۔ سنبل ماشاءاللہ سمجھ دار ہے۔"

"کیا سمجھ دار ہے شبنم! ہر کام کہہ کر کروانا پڑتا ہے اور جب بھی بات کرے گی سوچے سمجھے بغیر۔"

"امی! بے فکری بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ میں تو شکر ادا کرتی ہوں۔ ایک تو وہ فطرتاً" لاپروا ہے دوسرا میری طرح اسے بچپن سے کسی کے نام سے باندھ کر مجبور نہیں کیا گیا۔ اس کی سوچیں آزاد ہیں۔ ذہن کی سلیٹ صاف ہے' آئندہ زندگی میں حالات جو بھی ہوں کم از کم اسے ایڈجسٹ ہونے میں پرابلم تو نہیں ہو گی۔"

آج کتنے عرصے بعد شبنم کے لہجے میں پھر بیتے ماضی کا کرب بولنے لگا تھا' شکیلہ نے کچھ پریشانی سے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

"کوئی بات ہوئی ہے شبنم! زبیر ٹھیک تو ہے تمہارے ساتھ۔" شبنم نے ایک نظر ماں کا چہرہ دیکھا جو یک دم پریشان نظر آنے لگی تھیں تو وہ سر جھٹک کر

بولی۔

"ایسے ہی ایک بات کی ہے امی! ہر وقت سنبل کو مت ٹوکا کریں۔" کہہ کر وہ اٹھ گئی تھی جبکہ شکیلہ کتنی دیر وہیں دیکھتی رہیں جہاں سے شبنم گئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ سنبل سفیان کو گھٹنوں پر بٹھا کر جھولا دے رہی تھی دونوں پتا نہیں کونسی زبان میں بات کر رہے تھے۔

شروع ہو گئیں خالہ بھانجے کی باتیں" وہ کہتے ہوئے سنبل کے قریب لیٹ گئی۔

"ماما خالہ!" سفیان نے ہاتھ میں پکڑا چاکلیٹ اٹھا کر ماں کو بتایا۔ "یہ خالہ نے دیا ہے۔"

شبنم نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ "باجی! اتنے دنوں بعد کیوں آئی ہیں۔ پتا ہے میں سفیان کے بغیر کتنی اداس ہو گئی تھی۔" سنبل نے کہتے ہوئے زور سے سفیان کا گال چوما۔ جواباً" اس نے جھنجلا کر چاکلیٹ والا ہاتھ خالہ کی ناک پر مارا۔

"توبہ ہے باجی! کتنا ظالم ہے آپ کا بیٹا۔" سنبل نے ناک دباتے ہوئے سفیان کو ناراضی سے بیڈ پر بٹھا دیا۔

"تم نے ہی بگاڑا ہے۔ یہ مکے مارنا تم نے ہی اسے سکھایا تھا نا۔"

"ہاں سکھایا تھا پر دوسروں کے لیے' یہ نہیں کہا تھا اپنی خالہ کو مارنے لگ جائے۔" اس نے برا سا منہ بنا کر اپنے بھانجے کو دیکھا۔

"اسی لیے کہتے ہیں دوسروں کے لیے کنواں کھودو گے تو خود گرو گے۔" شبنم کے مزے سے کہنے پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اچھا یہ بتائیں۔ اب رہیں گی نا مجھے بہت کام ہیں۔ امی تو کہیں آتی جاتی نہیں اور نہ مجھے لے کر جاتی ہیں۔ اب آپ آئی ہیں تو میرے ساتھ بازار چلیں۔ مجھے گرمیوں کے لیے کپڑے لینے ہیں۔"

"ٹھیک ہے چلیں گے۔ زبیر بھی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہیں سو دو تین دن رک سکتی ہوں۔"

"بہت مزہ آئے گا اور اس خوشی میں میں امی کو بھی خوش کر سکتی ہوں کھانا بنا کر۔" وہ کہہ کر کھڑی ہو گئی۔

"ویسے زبیر بھائی آپ کو لینے آئیں گے؟" سنبل کے پوچھنے پر شبنم نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"کتنا عرصہ گزر گیا باجی! انہوں نے چکر ہی نہیں لگایا۔ میں خود ان کو فون کر کے آنے کا کہتی ہوں۔"

"رکو سنبل!" شبنم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بزی ہوں گے۔ نیکسٹ ٹائم آ گئی تو انہیں لے کر آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں آپ کے لیے اچھی سی بریانی تیار کرتی ہوں۔" سنبل کے نکلتے ہی شبنم کے چہرے کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی اور سینے میں اٹکا سانس بحال ہوا تھا۔

بریانی کو دم دے کر اس نے سجاوٹ کے لیے رکھا دھنیا اور ہری مرچیں کڑاہی گوشت پر چھڑک کر ڈھکن بند کر دیا۔ کھیرا کاٹتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا جہاں شبنم اندر داخل ہو رہی تھی۔

"کھانا لگاؤں باجی؟"

"نہیں وہ کامران کا فون آیا ہے۔ وہ مجھے لینے آ رہا ہے۔" شبنم نے اپنے دیور کا نام لیا تو کھیرا کاٹتی سنبل نے غصے سے چھری پلیٹ پر پٹخ دی۔

"کیوں' اس کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔ اتنے عرصے بعد آپ رہنے آئی ہیں پھر بھی برداشت نہیں ہوا۔"

"کامران کے دوست گھر آ رہے ہیں اور آنٹی اتنا کام نہیں کر سکتیں۔" شبنم کے کہنے پر وہ "ہنہ" کہہ کر تیز تیز کھیرا کاٹنے لگی۔

"اچھا اب غصہ نہ کرو۔ میں کچھ دنوں میں دوبارہ چکر لگاؤں گی پھر بازار چلیں گے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ جائیں آپ دوسروں کی فکر کریں۔ میری کیا ضرورت ہے۔"

"اچھا چلو غصہ چھوڑو کھانا لگا دو۔ ابو کے ساتھ تایا جی بھی آئے ہیں۔" وہ جگ میں پانی ڈالتے ہوئے بولی۔

"باجی! تایا جی کو جانے مت دینا۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔" شبنم کو باہر نکلتے دیکھ کر اس نے ہانک لگائی اور

تیز تیز ہاتھ چلانے لگی۔
شبنم کھانا کھاتے ہوئے بار بار سامنے دیکھ رہی تھی جہاں تایا جی سفیان کو گود میں لیے خود کم اور اسے زیادہ کھلا رہے تھے۔ وہ جب بھی آتی تھی تایا جی تب ہی پہنچ جاتے تھے، سفیان کے لیے۔ وہ سفیان سے بہت پیار کرتے تھے اور بچے بھی محبت کی زبان سمجھتے ہیں۔ وہ بھی ان کا دیوانہ تھا یا پھر اپنی خالہ کا جو اس کے ساتھ مل کر بچوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی تھی۔

"کیا ہوا؟ تم کھانا نہیں کھا رہیں؟" اسے یوں ہاتھ روکتے دیکھ کر شکیلہ کو ٹوکنا پڑا۔

"میں کھا رہی ہوں۔" سب کو دیکھتا پا کر وہ مسکرا کر بولی۔

"تایا جی! آپ کی اور سفیان کی بڑی دوستی ہو گئی ہے۔" اس کی بات پر واجد صاحب نے جھک کر سفیان کا منہ چوما۔

"یہ آتا ہے تو رونق ہو جاتی ہے۔ اس سے باتیں کرتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے ہی سہی ایسا لگتا ہے کوئی پریشانی ہے ہی نہیں۔"

شبنم نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا، وہ اسے پہلے کی نسبت کافی کمزور لگے تھے "تایا جی! آپ کافی کمزور لگ رہے ہیں۔" واجد صاحب نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر سر جھکا۔

"عمر کا تقاضا ہے بیٹا! کچھ شوگر کا بھی پرابلم ہے شاید اس لیے۔"

"شوگر تو آپ کو پہلے بھی تھی۔" وہ باقاعدہ جرح کرتے ہوئے بولی۔

"آپ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتے۔"

"کوشش کرتا ہوں۔" اب کے وہ سنجیدگی سے بولے "لیکن ممکن ہو ہی نہیں پاتا۔ ڈاکٹر نے بازاری کھانا کھانے سے منع کیا ہے جبکہ گھر میں بازار کا ہی کھانا آتا ہے۔ سارا دن یا تو ٹی وی دیکھتا ہوں یا پھر دیواریں، جتنی دیر ادھر گزارتا ہوں، اتنی دیر محسوس کرتا ہوں زندہ ہوں۔"

اب کی بار وہ لہجے کی افسردگی چھپا نہیں سکے، شبنم سمیت وہ تینوں بھی کھانا چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔

"بھابھی! کھانا نہیں پکاتیں۔" اب کے شکیلہ نے پوچھا تھا۔

"اس کے جوڑوں کا درد اتنا بڑھ چکا ہے کہ اٹھنا بیٹھنا محال ہے۔"

"اور آپ کی بہو۔" شکیلہ کے پوچھنے پر وہ طنزاً مسکرائے تھے۔

"مجھے تو پتا نہیں کب وہ گھر ہوتی ہے اور کب نہیں۔ دلاور کا پوچھو تو وہ بھی سسرال میں پایا جاتا ہے۔"

وہ تلخی سے کہہ کر سفیان کے منہ میں نوالہ ڈالنے لگے۔ شبنم، شکیلہ اور راشد صاحب افسردگی سے واجد صاحب کو دیکھنے لگے، سنبل کو اپنے تایا کے لیے افسوس ضرور تھا لیکن اس کے نزدیک تائی کے لیے ایسا سلوک قدرت کی طرف سے سزا تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ پر جھکی رہی۔

"تایا جی! اس عمر میں اتنا اکیلا پن اچھا نہیں جبکہ آپ دونوں کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ آپ انس کو کیوں نہیں بلا لیتے۔" شبنم واقعی سن کر پریشان ہو گئی تھی۔

واجد صاحب نے گہرا سانس لیا۔

"دلاور سے تو میں امید چھوڑ بیٹھا ہوں۔ انس ہی ہے بس۔ وہ بھی مجبور ہے۔ جب تک کنٹریکٹ پورا نہیں ہو جاتا وہ نہیں آ سکتا۔ ہماری طرح وہ بھی مجبور ہے۔"

آخر میں ان کا لہجہ بھیگا تو سنبل کی نظریں بے ساختہ ان کی طرف اٹھیں، آج چار سالوں میں پہلی بار ہوا تھا جب تایا جی یوں کھل کر بولے تھے، ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے سارے نفوس جیسے خاموش ہو کر رہ گئے تھے اور اس خاموشی کو دروازے پر بجنے والی گھنٹی نے توڑا تھا۔ ارشد صاحب اٹھ کر گئے تھے واپسی پر ان کے ساتھ کامران تھا، کامران کو دیکھ کر شبنم نے گہرا سانس لیا جبکہ سنبل نے غصے سے اسے دیکھا تھا۔ شبنم کھڑی ہو گئی تھی۔

"آؤ بیٹا! بیٹھو، کھانا لگا ہوا ہے۔"

"تھینکس آنٹی! میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ بس بھابھی کو لینے آیا تھا۔"

"شبنم تو رہنے آئی تھی نا!" راشد صاحب نے کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

"جی پر گھر میں کچھ ضروری کام ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! تھوڑی دیر بیٹھو' جاؤ سنبل! چائے بنالو۔" سنبل منہ بناتی ہوئی اٹھ گئی تھی۔

"کیسی ہیں آپ اور پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔" وہ سب کو چائے دے کر کامران کی طرف آئی جو ٹی وی کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھا بریکنگ نیوز دیکھ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"پڑھائی اچھی جا رہی ہے اور جیسی بھی ہوں۔ آپ کے سامنے ہوں۔"

اس کے بے نیاز انداز پر وہ بے ساختہ مسکرا کر بولا۔ "ہمیشہ کی طرح لاجواب ہیں۔"

"کچھ کہا آپ نے؟" وہ چونک کر مڑی۔

"جی وہ چینی کم لگ رہی ہے۔" سنبل نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"پیئے بغیر کیسے کہہ سکتے ہیں۔"

"ہوں!" وہ مصنوعی سنجیدگی سے چائے کو دیکھ کر اسے دیکھنے لگا۔

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں اگر آپ نے بنائی ہے تو پھر پھیکی تو ہو ہی نہیں سکتی۔" کہہ کر اس نے مسکراہٹ روکنے کے لیے کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

پہلے تو سنبل سمجھی نہیں لیکن سمجھ میں آنے پر اس نے دانت پیس کر اسے گھورا۔ پچھلے کچھ عرصے سے اسے کامران کے انداز اور الفاظ بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ وہ جتنا اسے نظر انداز کرتی وہ اتنا اپنی حرکتوں سے اسے متوجہ کرتا تھا۔

"ویسے آپ کیوں آئے ہیں؟" وہ جو اس کے دانت پیسنے کو انجوائے کر رہا تھا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ کو میرے آنے پر افسوس ہے یا میرا آنا ہی برا لگتا ہے؟" کامران نے اتنی سنجیدگی سے پوچھا کہ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

"مجھے کیوں آپ کا آنا برا لگے گا۔"

"تو اس کا مطلب ہے آپ کو میرا آنا اچھا لگتا ہے۔" وہ ایک دم پینترا بدل کر بولا۔

"اف!" سنبل زچ ہو کر وہاں سے ہٹ گئی تھی جبکہ کامران نے مسکراتے ہوئے دوبارہ کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

وہ کمرے میں آئی تو شبنم اپنے کپڑے بیگ میں رکھ رہی تھی۔

"باجی! یہ بالکل ٹھیک نہیں۔ آپ رہنے آئی تھیں۔ میں نے کتنے ہی پروگرام بنالیے تھے اور اب آپ جا رہی ہیں۔" وہ ناراضی سے بولتی ہوئی بیڈ کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ شبنم البتہ کچھ کہے بغیر کپڑے رکھتی رہی۔

"اگر آپ کہیں تو میں زبیر بھائی سے بات کروں کہ وہ آپ کو یہاں رہنے دیں۔" اب کی بار شبنم نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

"میں نے پہلے بھی تم سے کہا ہے سنبل! اس کی ضرورت نہیں۔ وہ کام کی وجہ سے مصروف ہوں گے اور کام گھر میں ہے۔ بتایا ہے تمہیں دعوت ہے کامران کے دوستوں کی اور زبیر کو پسند نہیں کہ ان کی امی اور بھائی کو کسی بات کے لیے انکار کیا جائے۔"

"مجھے نہیں لگتا زبیر بھائی ایسے ہیں۔" سنبل کے کہنے پر شبنم مسکرائی تھی اور پھر سر جھٹک کر اسے دیکھا۔

"تم بھی کبھی تایا جی کی طرف چکر لگالیا کرو۔" سنبل نے اس طرح شبنم کو دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"میں کیوں جاؤں وہاں؟" وہ نتھنے پھلا کر بولی۔

"تمہیں تایا جی کی حالت نظر نہیں آرہی۔ کتنے کمزور ہو گئے ہیں اور تمہارے سامنے بتا رہے تھے تائی جی بھی ٹھیک نہیں رہتیں اور ان کی بہو شاید وہ بھی ان کی پرواہ نہیں کرتی۔"

"ایک منٹ باجی!" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "جو تائی جی اور دلاور بھائی نے کیا۔ آپ بھول

سکتی ہیں میں نہیں۔"
"دسنبل! جو گزر گیا اسے دہرانا فضول ہے۔"
"یہی میں آپ سے کہہ رہی ہوں' تائی جی کے لیے کچھ بھی کرلو' فضول ہے' ویسے بھی انہوں نے جو بویا ہے۔ وہی کاٹ رہی ہیں اور ان کی خدمت' تیمارداری کرنا ان کے بیٹوں کا فرض ہے جبکہ انہیں پروا ہی نہیں تو آپ کو کیوں افسوس ہو رہا ہے۔"
"دسنبل!" شبنم زچ ہو کر بولی۔
"پلیز باجی! مجھے کوئی نصیحت نہ کریں۔" وہ ناراضی اور بے زاری سے بولتی ہوئی باہر نکل گئی۔
باہر چائے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ تایا جی جا رہے تھے۔ اس نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ واقعی بوڑھے لگنے لگے تھے۔ وہ گہرا سانس لے کر شکیلہ اور شبنم کی طرف مڑی۔ تب ہی اس کی نظر کامران کی طرف اٹھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"توبہ ہے۔" وہ چڑ کر شبنم سے ملے بغیر اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

* * *

کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے جھٹکا لگا تھا۔ بیڈ پر لیٹے زبیر کو دیکھ کر وہ اتنی حیران ہوئی کہ اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں سکی۔ زبیر نے ایک نظر اس کے حیران چہرے کو دیکھا اور دوبارہ ٹی وی دیکھنے لگا۔ شبنم نے صوفے پر اپنا بیگ رکھتے ہوئے بغور زبیر کا چہرہ دیکھا جہاں ذرہ برابر شرمندگی نہیں تھی۔
"کھانا لاؤں آپ کے لیے؟" مسلسل خاموشی پر اس نے اکتا کر پوچھا۔
"کھا چکا ہوں۔" وہ چینل بدلتے ہوئے بولا۔
"آپ نے تو کہا تھا۔ آپ کو آفس کے کام سے شہر سے باہر جانا ہے۔ میں سمجھی۔ آپ اس لیے نہیں آئے کہ گھر پر نہیں ہوں گے۔" آخر ہمت کر کے وہ بول ہی پڑی۔ زبیر نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔
"میرا دل نہیں چاہا۔ میں نہیں آیا۔ کیا میرا وہاں حاضری لگوانا ضروری تھا؟"
"امی' ابو آپ کا ہر بار پوچھتے ہیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے آپ کو ان سے ملے۔"

زبیر نے طنزیہ انداز میں سر جھٹکا۔ "میرا نہیں خیال' میرے نہ ملنے سے انہیں کوئی فرق پڑے گا اور دوسری بات وہاں یقیناً" تمہارے تایا بھی پائے جاتے ہوں گے جن سے میں بالکل بھی نہیں ملنا چاہتا کیونکہ میں ابھی بھی اپنی بے عزتی بھولا نہیں۔" اس کے لہجے کی تلخی نے شبنم کے حلق میں کڑواہٹ اتار دی تھی۔
"زبیر! وہ محض ایک غلط فہمی تھی' تایا جی کا مقصد کبھی بھی آپ کی بے عزتی ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اور میرے حوالے سے آپ انہیں بہت عزیز ہیں اور آپ کو میرے لیے تایا جی نے پسند کیا تھا۔"
"اور مجھے اسی بات کا افسوس ہے۔" شبنم نے دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا' کیا آپ کو میرے ساتھ شادی پر افسوس ہے۔"
ان دونوں کے درمیان صرف لفظوں کا ہی بھرم رہ گیا تھا۔ زبیر نے آج اسے بھی توڑ دیا تھا۔
"میرا منہ مت کھلواؤ شبنم تو بہتر ہوگا۔ اس بات کا شکر مناؤ کہ میں نے آج تک تم پر پابندی نہیں لگائی۔ اب اگر مجھ سے بحث کی تو آئندہ ہمیشہ کے لیے وہاں جانا بند کردوں گا۔" وہ انگلی اٹھا کر دھمکی دینے والے انداز میں بولا۔
"لائٹ بند کرو' مجھے سونا ہے۔" وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا تو شبنم لائٹ بند کر کے دوسرے کونے پر ٹک گئی اور آج بھی اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ جب زبیر سے اس کی شادی ہوئی تب اس کے دل و دماغ پر کسی اور کا بسیرا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس نے حقیقت کو قبول کرلیا تھا۔
زبیر کا رویہ اس کے ساتھ اچھا تھا گھر میں اس کی ساس اور دیور تھے۔ شروع میں سب ٹھیک تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کی ساس کو اس میں خامیاں نظر آنے لگیں۔ دونوں بیٹے ماں کے اتنے تابع دار تھے کہ اپنی ماں کی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے تھے اور وہ خامیاں جو شبنم میں موجود ہی نہیں تھیں ماں کے ساتھ زبیر کو بھی نظر آنے لگیں۔ روز گھر میں اسے بے

عزت کیا جاتا۔

وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ جب وہ سر جھکائے زبیر اور آنٹی کی لن ترانیاں سن رہی تھی جب راشد صاحب کے ساتھ واجد صاحب داخل ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ سب حیران کن تھا کیونکہ آج تک شبنم یہی کہتی آرہی تھی کہ سب بہت اچھا ہے۔ ان کو یوں اچانک سامنے دیکھ کر زبیر اور اس کی امی کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ راشد صاحب تو دکھ کے مارے کچھ بول ہی نہیں سکے لیکن واجد صاحب خود پر قابو نہیں رکھ سکے جوان کے دل میں آیا' انہوں نے زبیر اور اس کی ماں کو سنایا تھا۔ جواباً" زبیر بھی بدلحاظی پر اتر آیا تھا۔ نتیجہ اس کو بھگتنا تھا۔

تایا جی اسے لے جانے پر بضد تھے اور دوسری طرف زبیر اور اس کی امی بھی اسے رکھنے کو تیار نہ تھے۔ وہ گھر آگئی۔ یہاں آکر بھی اس نے زبیر کا بھرم رکھا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ اس کے ماں باپ ایک بار پھر اس کی وجہ سے پریشان تھے۔ وہ جانتی تھی۔ زبیر اسے لینے نہیں آئے گا۔ ایک دن وہ خود ہی اپنی انا کا گلا گھونٹ کر چلی آئی کیونکہ اس کا ایک بچہ تھا اور دوسرے شادی شدہ لڑکی ماں باپ کے گھر بیٹھی ہو تو دنیا لڑکی اور اس کے گھر والوں کا جینا محال کر دیتی ہے۔

اس کے بعد زبیر کبھی سسرال نہیں آیا حالانکہ حالات دیکھتے ہوئے تایا جی معافی بھی مانگ چکے تھے۔ بظاہر سب ٹھیک ہو گیا تھا لیکن کتنا ٹھیک ہوا تھا۔ یہ صرف وہ جانتی تھی۔

* * *

"آرہا ہوں بھئی کون ہے۔" متواتر بجتی گھنٹی پر وہ بڑبڑاتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گیٹ کھلتے ہی ان کی نظر دو ٹرولنگ بیگز سے ہوتی ہوئی سامنے کھڑے شخص پر جا کر رک گئی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں لیکن سامنے کا منظر نہیں بدلا تھا۔

"انس!" انہوں نے بے یقینی سے پکارا۔

"السلام علیکم ابو۔" وہ جوش سے بولتا ہوا ان کے گلے لگ گیا۔ "کیسے ہیں آپ؟" وہ اسی طرح بازوؤں میں لیے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"آنے کی اطلاع ہی دے دیتے' میں تمہیں خود لینے آجاتا۔"

"میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں ابو! جو راستہ بھول جاتا۔ دیکھیں ٹھیک ٹھاک خیریت سے پہنچ گیا۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں بیگ تھامے ان کے پیچھے چلنے لگا۔ آہٹ پر انہوں نے مڑ کر دیکھا اور دروازے میں کھڑے انس کو دیکھ کر وہ بے ساختہ اٹھی تھیں۔ اگلے ہی پل وہ اس کے گلے لگ کر اس طرح روئیں کہ اس کے ساتھ ساتھ واجد صاحب بھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔

"امی! بس کریں' میں زندہ سلامت آپ کے سامنے ہوں اور آپ ایسے رو رہی ہیں جیسے میں......"

"بکواس نہ کر۔" امینہ نے بے ساختہ تھپڑ مارتے ہوئے اسے روکا تھا۔ "چار سال بعد آئے ہو۔ یہ نہیں سوچا۔ پیچھے ___ ماں باپ کا کیا حال ہو گا۔" وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے شکوہ کرنے لگیں۔

"سوری امی! مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آپ دونوں کا یہ حال ہو گا۔ میں تو مطمئن تھا کہ دلاور ہے' اس کی بیوی ہے۔"

وہ افسردگی سے اپنے ماں باپ کے چہرے دیکھتے ہوئے بولا۔ جو اپنی عمر سے زیادہ بوڑھے نظر آرہے تھے۔

"اس نے ہمارا کیا خیال کرنا ہے۔ وہ تو خود بیوی کے رحم و کرم پر ہے۔ میری ہی قسمت خراب تھی جو لالچ میں اندھی ہو کر بیٹے کو خود کنویں میں دھکیل دیا۔" امینہ نے کہہ کر ایک بار پھر رونا شروع کر دیا۔

"آپ بیٹھیں امی!" انس نے انہیں تھام کر دوبارہ بیڈ پر بٹھا دیا تھا۔

"میں جب بھی فون کرتا تھا۔ آپ نے کبھی مجھے نہیں بتایا کہ یہاں یہ سب چل رہا ہے اور نہ کبھی دلاور نے کوئی ذکر کیا۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"تمہیں کیا بتاتے بیٹا! تم کیا کر سکتے تھے۔" امینہ

الٹا اس سے پوچھنے لگیں۔
"ٹھیک کہہ رہی ہے امینہ! تم کیا کر لیتے۔ ویسے بھی جس نے کانٹے بوئے ہوں اسے پھولوں کی امید تو نہیں رکھنی چاہیے۔" واجد صاحب کے طنزیہ انداز پر وہ بلبلا اٹھی تھیں۔
"دلاور کی پریشانی کیا کم ہے جو یہ ہر وقت طنز کے تیر تیار رکھتے ہیں۔ کبھی انہوں نے میری پروا نہیں کی' خود تو بھائی کے گھر جا کر دل ہلکا کر آتے ہیں۔ کبھی میرا سوچا۔ میں کس سے دل کی بات کروں۔" سالوں بعد انہیں کوئی اپنا نظر آیا تھا۔ وہ بنا رکے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔
"آپ بھی ابو کے ساتھ چلی جایا کریں چاچو کی طرف۔" وہ مسکرا کر بولا تو وہ خاموشی سے نظریں چرا گئیں۔
"خیر۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اب میں آگیا ہوں نا!" اس نے کہتے ہوئے انہیں بازو کے گھیرے میں لے لیا اور مسکرا کر باپ کو دیکھا جن کا چہرہ ایک دم پرسکون لگنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج کی صبح بڑی خوب صورت تھی۔ صحن میں کھڑے ہو کر بازو پھیلا کر اس نے ہوا کی تازگی کو محسوس کیا تھا۔ انسان دنیا میں کہیں بھی چلا جائے اپنا ملک اپنا گھر اور اپنے بستر کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس نے مسکرا کر آنکھیں کھولیں ایک بھرپور ناشتے کی طلب اس کے اندر بیدار ہوئی۔ اس نے مڑ کر امینہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ یقیناً" اس وقت وہ سو رہی ہوں گی۔ کیونکہ رات کو کافی دیر تک وہ اس سے باتیں کرتی رہی تھیں وہ تو اس نے زبردستی فجر کے وقت انہیں سلایا تھا۔
وہ گیٹ کی طرف بڑھا۔ اب اس کے قدم مانوس راستے پر چل رہے تھے۔ دروازے پر دستک دیتے ہوئے وہ متوقع ردعمل کا تصور کرتے ہوئے مسکرا اٹھا تھا۔

"اس وقت کون آگیا؟" دروازے کے قریب اسے شکیلہ کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا تھا۔ اور اس کی توقع کے عین مطابق۔
شکیلہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ وہ خود آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گیا تھا۔ "کیسی ہیں آپ چچی!"
"میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا! آئے کب ہو اور بھائی صاحب نے بتایا بھی نہیں؟"
"میں اندر آجاؤں چچی!" اس کے پوچھنے پر شکیلہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔
"تمہیں دیکھ کر میں سب بھول گئی۔" وہ اس کا بازو تھام کر اندر لے آئیں۔
"میں رات کو آیا تھا۔ اچانک پروگرام بنا تھا امی ابو کو بھی نہیں بتایا تھا۔" وہ صوفے سے ٹیک لگا کر بولا۔
"چچی! میں دراصل اتنی صبح آپ کے ہاتھ کا ناشتا کرنے آیا ہوں۔" اس نے بلا جھجک اپنی خواہش بیان کی تھی۔
"میں صدقے! اور اس کی فرمائش پر شکیلہ جیسے نہال ہو کر بولیں۔ "کیا کھائے گا میرا بیٹا؟"
"پراٹھا' آملیٹ ہری مرچ اور دھنیے والا اور زبردست سی چائے۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے چٹخارہ لیا۔
"میں بس ابھی بناتی ہوں۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ یا ٹی وی لگا لو۔"
اس کی بوریت کے احساس کے پیش نظر وہ اسے مشورہ دے کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ بھی دونوں ہاتھ گردن کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔
"اف امی! آپ اتنی صبح صبح کس کے لیے ناشتا بنا رہی ہیں؟"
غنودگی میں ڈوبی نسوانی آواز پر اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی ادھر ہی آرہی تھی۔ اس کی نظر انس پر نہیں پڑی تھی جبکہ انس نے ایک بار بھی پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔ وہ اپنی ہی جھونک میں صوفے پر بیٹھ رہی تھی اور انس نے تیزی سے اپنی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو سمیٹا تھا وہ دھپ سے

بیٹھی اور سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔
"صبح صبح اتنا شور مچا دیتی ہیں امی! سونے بھی نہیں دیتیں۔"
اس نے بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور جوں ہی اس نے گردن گھمائی اس کو محاورتاً نہیں حقیقتاً جھٹکا لگا تھا۔
"انس بھائی!" وہ پوری آنکھیں کھول کر بولی۔ اس کے چہرے پر چھائی حیرت انس کو ہنسانے کے لیے کافی تھی۔ "آپ کب آئے؟"
"ابھی!" وہ مسکراہٹ روکتے ہوئے بولا۔
"ابھی!" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "سیدھا ادھر آرہے ہیں؟"
"ہوں!" انس نے معصومیت سے سر ہلایا۔
"اور آپ کا سامان؟" اس نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔
"وہ ایئرپورٹ والوں نے رکھ لیا۔" وہ پوری سنجیدگی سے بولا تو اب کی بار سنبل نے آنکھوں کو چندھیا کر اسے دیکھا۔
"آپ مجھے الو بنا رہے ہیں۔"
"پاگل! بھلا مجھے کیا ضرورت ہے۔"
"ہوں!" اس کے چہرے کی ہنسی نظر انداز کرتے ہوئے وہ تیزی سے کچن کی طرف بھاگی۔
"امی! باہر چلیں۔ دیکھیں۔ انس بھائی آئے ہیں۔" اس کے جوش پر پراٹھا پلٹتی شکیلہ بے ساختہ مسکرائیں "جانتی ہوں اور سنو۔ اپنے ابو کو بھی جگا دو۔"
وہ جو بریکنگ نیوز دینے آئی تھی مایوس ہو کر پلٹی۔
"سنبل!"
"جی؟"
"انس کے سامنے کوئی فضول بات مت کرنا۔ ماضی گزر چکا ہے۔ دلاور اور شبنم اپنی اپنی زندگیوں میں خوش ہیں۔ اب اتنے سالوں بعد انس آیا ہے' میں نہیں چاہتی۔ اس کا یا تمہارے ابو کا دل برا ہو۔ تم جانتی ہو نا۔ وہ انس کو بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں۔"

ان کے لہجے میں چھپی تنبیہہ پر وہ سر ہلاتی ہوئی راشد صاحب کو جگانے ان کے کمرے میں آگئی۔
"ابو! انس بھائی آئے ہیں۔" اس کا اتنا کہنا تھا' راشد صاحب نے پٹ سے آنکھیں کھول کر اس دیکھا۔
"کون؟" انہیں لگا' انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔
"انس بھائی۔" اس نے اب زور سے دہرایا تو وہ تیزی سے اٹھے۔ سنبل نے افسوس سے سر ہلایا۔
"سارے ایسے خوش ہو رہے ہیں جیسے انس بھائی نہیں بلکہ پرنس ولیم آیا ہے۔" وہ منہ بناتے ہوئے باہر آگئی۔
اس کا پراٹھا ابھی آدھا بھی نہیں ہوا تھا۔ جب انس نے دوسرے پراٹھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اب کی دفعہ وہ زبان میں ہوتی کھجلی کو روک نہیں سکی۔
"لگتا ہے انس بھائی! وہاں آپ کو کھانا نہیں ملتا تھا۔"
انس کے ساتھ ساتھ شکیلہ اور راشد نے ایک ساتھ اسے دیکھا تھا۔ شکیلہ کے چہرے پر غصہ تھا جبکہ انس مسکرا دیا تھا۔
"سچ۔ وہاں ایسا کھانا کہاں ملتا ہے۔" وہ شرمندہ ہوئے بغیر دوبارہ کھانے لگا۔
"وہاں تو چلو ٹھیک ہے پر مجھے لگتا ہے' اپنے گھر بھی کسی نے آپ کو کھانے کا نہیں پوچھا۔"
شرمندگی کے مارے راشد صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا جبکہ شکیلہ نے بے ساختہ اسے تھپڑ لگایا تھا۔
"آوچ!" تھپڑ زیادہ زور سے لگا تھا۔
"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ گھر میں سب سو رہے تھے اور جاگ بھی رہے ہوتے تو مجھے چچی کے ہاتھ کا پراٹھا کھانا تھا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔
"بیٹا! اس کی بات کا برا مت ماننا۔ اسے فضول بولنے کی عادت ہے۔" شکیلہ نے دانت پیس کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔

"جانتا ہوں چچی!" اس کا پراٹھا ختم ہو گیا تھا۔
وہ اب راشد صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ سنبل ڈرتے ڈرتے کچن میں داخل ہوئی۔ جانتی تھی ماں کا غصہ عروج پر ہو گا۔
"میں نے منع کیا تھا منہ بند رکھنا۔ بے چارے بچے کا ناشتا خراب کر دیا۔ شرم نہیں آئی یوں اس کے نوالے گنتے ہوئے۔"
"امی!" وہ بدبدا کر رہ گئی۔ جبکہ وہ ناراضی سے چائے کا کپ لے کر باہر نکل گئیں۔ وہ پیچھے آئی تھی۔
"کہاں جا رہے ہو انس! چائے تو پی لو۔"
"نہیں چچی! دیر ہو گئی ہے' مجھے وقت کا پتا نہیں چلا۔ امی ابو کو بتائے بغیر نکل آیا تھا۔ وہ اٹھ گئے ہوں گے۔"
شکیلہ کی گھوری پر اس نے ہڑبڑا کر انس کو دیکھا وہ باہر جا رہا تھا۔ راشد صاحب کی ناراض نظر پر وہ بے ساختہ انس کے پیچھے آئی تھی۔
"انس بھائی؟" انس رک گیا اور مڑ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
"سوری انس بھائی! میں مذاق کر رہی تھی۔"
"ہوں!" وہ اتنا کہہ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا سنبل کو اندازہ نہیں ہوا کہ وہ ناراض ہے یا نہیں۔
"آپ ناراض تو نہیں؟" اب کی بار انس نے گہرا سانس لیا۔
"بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے ناراض نہیں ہوا جا سکتا اور تم میرے لیے ان لوگوں میں سے ہو۔" اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ وہ اس کے چہرے کو دیکھنے لگی یہاں تک کہ وہ ایک مسکراہٹ اچھالتا دہلیز عبور کر گیا۔

✡ ✡ ✡

وہ اندر آیا تو امینہ اور واجد کو اپنے انتظار میں پایا۔
"کہاں چلے گئے تھے انس کتنا پریشان ہو گئے تھے ہم۔"
اسے دیکھتے ہی امینہ ناراضی سے بولیں۔
"کیا ہوا امی! میں بچہ تھوڑی ہوں۔ یہیں پیدا ہوا اور بڑا ہوا ہوں' صبح آپ لوگ سو رہے تھے تو میں چاچو کی طرف چلا گیا۔"
امینہ نے سن کر برا سا منہ بنایا "باپ بیٹے کو اور کوئی کام ہی نہیں۔" وہ بڑبڑا کر رہ گئیں۔
"دلاور آیا ہے۔"
"اچھا کہاں ہے؟" وہ بے ساختہ خوش ہونے کے بعد متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگا۔
"اپنے کمرے میں ہے۔ تم چلو میں ناشتا لاتی ہوں۔"
"نہیں میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔" وہ کہہ کر مڑ گیا جبکہ امینہ کتنی دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔
"بڑے اچھے لگ رہے ہو۔" دلاور نے اس سے ملتے ہوئے کہا۔
"اور تم مجھے کمزور لگ رہے ہو۔" اس کی نسبت انس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔
"تمہارا وہم ہے۔ عرصے بعد دیکھ رہے ہونا۔" دلاور نے ہنس کر ٹالا۔
"ویسے بڑے بے مروت ہو ایسے گئے مڑ کر خبر نہیں لی۔"
"جتنا کنٹریکٹ تھا۔ اتنی دیر تو رکنا تھا۔ ویسے بھی مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہاں یہ حالات ہیں۔ میں تمہارے بھروسے سب چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا۔ تم اتنے لاپروا ہو جاؤ گے۔" انس کا انداز افسوس لیے ہوئے تھا۔
"میں لاپروا نہیں۔ مجبور ہوں انس۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
"مطلب؟" انس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔ دلاور نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔
"میں کس اذیت سے گزر رہا ہوں' کوئی نہیں جانتا۔ جب سے شادی کی ہے۔ شاید ہی کوئی ایک دن ہو' جب میں سکون سے رہا ہوں۔ نیہا کو اپنے باپ کے پیسے کا کچھ زیادہ ہی مان ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ۔ وہ میری شرافت کو میری کمزوری سمجھتی ہے۔ میں لڑائی کو اس لیے طول نہیں دیتا کیونکہ میں گھر توڑنا

نہیں چاہتا۔ لیکن اسے پتا نہیں کس بات کا زعم ہے' پھنس گیا ہوں میں امی کی بات مان کر۔"

پریشانی سے دلاور کی باتیں سنتے انس نے گہرا سانس لیا۔ "وہ غلطی صرف امی کی نہیں دلاور! تم بھی اس میں برابر کے شریک ہو۔ لالچ کی پٹی تمہاری آنکھوں پر بھی بندھی تھی۔ تم نے ہیرے کو کھو کر پتھر کا انتخاب کیا تھا۔"

"جانتا ہوں۔" دلاور نے اب بالوں کو مٹھیوں میں بھینچ لیا۔

"کبھی کبھی لگتا ہے مجھے شبنم کی بددعا لگی ہے۔"

"وہ ایسی نہیں۔" انس بے ساختہ بولا تھا۔ "تم کبھی ملے ہو اس سے۔" انس نے دلاور سے پوچھا تھا۔

"نہیں میں شادی کے بعد سے نہ ملا ہوں نہ اسے دیکھا ہے لہٰذا وہیں چچی، سنبل لوگ بھی نہ آتے ہیں نہ امی جاتی ہیں' صرف ابو اور چاچو ہی آتے جاتے ہیں۔"

"خیر تم اپنا دل برا نہ کرو۔ نیہا کو پیار سے سمجھاؤ۔ وہ سمجھ جائے گی۔ آج تو نہیں دو تین دن تک شبنم سے ملنے جاؤں گا تم چلو گے؟" اٹھتے ہوئے اچانک انس نے دلاور سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے چونک کر دیکھا اور پھر نظریں چرا کر کھڑا ہو گیا۔ "نہیں تم جاؤ مجھے نیہا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔"

انس نے صرف ایک نظر اسے دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

✡ ✡ ✡

روٹیوں کو اچھی طرح دسترخوان میں لپیٹ کر اسے ہاٹ پاٹ میں رکھا اور شامی کباب فریج سے نکال کر شیلف پر رکھے۔ ابھی اس نے کڑاہی چولہے پر رکھی تھی۔ جب زبیر کی آواز پر وہ جلدی سے چولہا بند کر کے اندر کی طرف بھاگی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔

زبیر اس کی والدہ اور کامران تینوں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ ان تینوں کا ایک ساتھ بیٹھنا کم از کم اس کے لیے اچھا شگن نہیں تھا۔

"آؤ شبنم بیٹھو۔" اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں زبیر کی والدہ (رقیہ) نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"ہم ابھی کامران کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ میں نے دو لڑکیاں پسند کی ہیں۔ پر کامران کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔" رقیہ بیگم کی اتنی لمبی تقریر کم از کم اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

"اسے کوئی اور لڑکی پسند ہے اب یہ اور بات ہے کہ مجھے اس کی پسند سے اختلاف ہے۔" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور شبنم نے پہلو بدلا۔

اسے کباب تلنے تھے سفیان کو دودھ پلانا تھا۔ اور یہاں پر فضول ٹاپک بھلا کامران کی شادی سے اس کا کیا تعلق۔ آج تک تو کسی نے کبھی مجھ سے مشورہ نہیں کیا۔ وہ حیران تھی۔

"امی! آپ بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں' سیدھی بات کریں۔" آخر میں زبیر بے زاری سے بول پڑا۔

"کامران کو سنبل پسند ہے اور ہم چاہتے ہیں۔ تم اپنے گھر والوں سے بات کرو۔" شبنم کی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھا گیا تھا۔

"کیوں بھابی! آپ کو کوئی پرابلم ہے۔" اس کی مسلسل خاموشی پر کامران طنزیہ انداز میں گویا ہوا تھا۔ شبنم نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر خود کو بولنے پر آمادہ کیا۔

"مجھے کیا پرابلم ہو گی۔ میں امی ابو سے بات کروں گی' پھر ان کی جو مرضی۔"

"ان کی مرضی نہیں۔ تم سے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں جواب ہاں میں چاہیے۔" رقیہ بیگم نے ابرو اچکا کر کہا اور آنکھوں سے بیٹے کو اشارہ کیا۔

"ایک اور بات بھی کرنی تھی تم سے۔" شبنم نے دھڑکتے دل سے زبیر کو دیکھا۔

"میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔" شبنم نے گہرا سانس لے کر تنتے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا۔ اسی لیے موصوف پچھلے چار دن سے گھر میں پائے جا رہے تھے۔

"میں اپنے دوست کے ساتھ بزنس شروع کرنا چاہ رہا ہوں۔ جس کے لیے مجھے ایک ہیوی اماؤنٹ کی ضرورت ہے۔"

شبنم لب بھینچے اسے دیکھتی رہی "میرے پاس تو کچھ نہیں تم جانتی ہو اس لیے۔" اتنا کہہ کر زبیر نے رک کر ماں کا چہرہ دیکھا اور شبنم نے ان کی آنکھوں کا تعاقب کیا۔ "تم اپنے ابو سے کہو اگر وہ کچھ رقم کا بندوبست کر سکیں۔"

"اوہ!" بے ساختہ شبنم کے منہ سے نکلا۔ تب ہی اتنی لمبی تمہید باندھی جا رہی تھی۔ "کتنی رقم؟" اس نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

"دس لاکھ۔"

"دس لاکھ۔" شبنم کی چیخ اس کے حلق میں دفن ہو کر رہ گئی۔

"اس میں اتنا چونکنے والی کیا بات ہے بہو!" رقیہ کو برا لگا تھا۔ "اتنا تو زبیر کا حق بنتا ہے۔ دو کپڑوں میں لائے تھے تمہیں، کبھی جتایا نہیں۔ پر ہوا کیا؟ جب سے آئی ہو۔ میرے بیٹے پر تو جیسے رزق کے دروازے بند ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ احسان کم کر رہے ہیں کہ تمہاری بہن کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ بھائی تم لوگوں کا ہے نہیں جو ہے۔ تم دونوں کا ہی ہے اور شادی کے بعد رہنا تو تم دونوں نے ساتھ ہی ہے نا اور تمہارے مکان کی قیمت ساٹھ ستر لاکھ تو ہوگی ہی۔"

وہ ہکا بکا ان کا منہ دیکھ رہی تھی جنہوں نے جائیداد کا اندازہ لگانے کے ساتھ کتنی شاندار منصوبہ بندی بھی کر رکھی تھی۔

"پر زبیر! میں ابو کو یہ تو نہیں کہہ سکتی وہ مکان بیچ دیں۔ وہ دونوں اس بڑھاپے میں کہاں دھکے کھائیں گے۔"

اس کی بات پر زبیر کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"دیکھو شبنم ہم نے آج تک تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی اور نہ کوئی ڈیمانڈ کی۔ تمہارے گھر والوں کو تو شاید داماد کی عزت کرنا نہیں آتی اور جو تمہارے تایا نے کیا۔ وہ ہم بھولے نہیں۔ اب یہ تمہیں فیصلہ کرنا ہے

کہ تمہیں ماں باپ کا گھر بچانا ہے یا اپنا۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ اور ایک بات جب بھی اپنے ابو کے گھر جاؤ سوچ سمجھ کر جانا اور تب تک واپس نہ آنا جب تک میری مطلوبہ رقم تمہارے ہاتھ میں نہ ہو۔"

محفل برخاست ہو گئی تھی وہ تینوں جا چکے تھے جبکہ وہ ابھی تک سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھے پندرہ منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن گھر کا کوئی فرد دوبارہ اندر نہیں آیا تھا۔ اس نے کوفت سے دوبارہ گھڑی کو دیکھا۔ تب ہی شبنم اندر داخل ہوئی، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو لیے وہ بڑے بے ساختہ انداز میں اس کے سینے سے لگی تھی۔ انس کا ہاتھ اس کے سر پر ٹھہر گیا تھا۔

"ارے بھئی۔ بس کرو اب تو میں آگیا ہوں۔ تم نے تو رونے میں امی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔"

شبنم کو خود ہی اپنے جذباتی پن کا احساس ہوا تو دونوں ہاتھوں سے چہرہ صاف کر کے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"کب آئے ہو؟ کیسے ہو؟ اچھے لگ رہے ہو۔" شبنم اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے محبت سے بولی۔ انس ہنس پڑا تھا۔

"خود ہی سوال خود ہی جواب دے رہی ہو۔ اپنی سناؤ کیا حالت بنائی ہوئی ہے۔" انس نے اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو تشویش سے دیکھا لیکن لہجہ سرسری رکھا تھا۔

"بس کچھ نہیں۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"سفیان!" دروازے میں کھڑے بچے کو اس نے آواز دی تو انس بھی ادھر دیکھنے لگا۔

"ارے یہ تمہارا بیٹا ہے۔" انس بے اختیار اٹھا اور سفیان کو گود میں اٹھا لیا۔ "کتنا کیوٹ ہے بالکل مجھ پر گیا ہے۔"

شبنم دل سے مسکرائی تھی۔ "ہر کیوٹ بندہ تمہیں

اپنی طرح ہی لگتا ہے۔"
"ہاں بھئی بھانجے کیسے ہو؟"
سفیان حیرت سے کبھی ماں کو اور کبھی انس کو دیکھ رہا تھا۔
"یہ بولتا نہیں۔" انس نے بیٹھتے ہوئے اسے گود میں بٹھالیا۔
"بہت بولتا ہے۔ تمہیں پہلی دفعہ دیکھ رہا ہے نا۔ اس لیے چپ ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کرو۔ ابھی شروع ہو جائے گا۔
اور سناؤ اب رہو گے نا۔"
"دیکھو۔ سوچ کر تو نہیں آیا تھا ایسا۔ پر گھر کے حالات دیکھ کر لگ رہا ہے یہیں رہنا پڑے گا۔"
"کیوں خیریت؟" شبنم چونکی۔
"ہاں وہ دلاور؟" وہ ابھی اتنا ہی بولا تھا جب زبیر اندر داخل ہوا۔
"السلام علیکم۔" انس کھڑا ہو گیا۔ "کیسے ہیں زبیر بھائی؟" اس نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے زبیر نے بڑے تکلف سے تھاما اور اسی تکلف سے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔
شبنم نے شرمندہ ہو کر انس کو دیکھا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ زبیر کے سرد رویے کو نظر انداز کر کے اس سے باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
وہ ڈرنک لے کر واپس آئی تو انس بھی خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے بڑھانے پر اس نے گلاس تھام لیا لیکن پیا نہیں۔
"مجھے تھوڑا ضروری کام تھا۔ چلتا ہوں۔" انس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ میں تمہارے اور زبیر بھائی کے لیے لایا تھا۔"
اس نے ایک بیگ شبنم کی طرف بڑھایا۔
"اور یہ سفیان کے لیے۔" اس نے دوسرا بیگ بھی شبنم کو تھمایا۔
"انس! تھوڑی دیر بیٹھو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔" وہ شرمندہ ہو کر بولی کیونکہ وہ کتنی دیر سے بیٹھا تھا اور گھر میں سے کوئی نہ اس سے ملنے آیا تھا اور نہ کسی نے اسے کھانے کو پوچھا تھا۔
"نہیں شبنم! ضروری کام سے جانا ہے۔"
"اچھا ہوا انس! تم آگئے۔ شبنم کو کچھ دنوں سے اپنے ابو کی طرف جانا تھا۔ میرے پاس تو ٹائم نہیں' ایسا کرو تم آئے ہو تو لے جاؤ۔"
شبنم نے سانس روک کر زبیر کو دیکھا۔ "میں پھر چلی جاؤں گی۔" اس نے ہمت کر کے انس سے کہا۔
زبیر نے غصے سے اسے دیکھا۔ "جو کام کرنا ہے وہ ہو جائے تو بہتر ہے۔" اس کے جتاتے ہوئے انداز پر انس نے چونک کر دونوں کو باری باری دیکھا۔
"میں آئی انس!" زبیر کے باہر نکلتے ہی شبنم بھی اس کے پیچھے بھاگی تھی اور وہ وہاں کھڑے کھڑے اور الجھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

واپسی میں وہ اس کے ساتھ تھی۔ بالکل خاموش اور اس کی گود میں لیٹا سفیان بھی سو گیا تھا۔
"شبنم! اب تم مجھے بتاؤ گی کہ کیا بات ہے۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولا۔
"کچھ نہیں انس! کوئی خاص بات نہیں۔" شبنم نے زبردستی مسکرا کر کہا۔
"اندھا نہیں ہوں' جب سے آیا ہوں تمہارے شوہر کا عجیب رویہ دیکھ رہا ہوں' تمہاری سوجی ہوئی آنکھیں میرے سامنے ہیں اور اوپر سے تمہارے شوہر نے جس طرح تمہیں بھیجا ہے' وہ نارمل نہیں ہے۔"
اور وہ جو اتنے سالوں سے برداشت کر رہی تھی انس کے سامنے اپنا بھرم نہیں رکھ سکی اور آنسوؤں کے درمیان اسے سب بتا دیا تھا جب کہ انس اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا۔ ایک دفعہ پھر ان کے انتخاب کی وجہ سے شبنم کی زندگی خراب ہو گئی تھی۔
"اوپر سے ایک فرمائش یہ بھی کر دی ہے کہ کامران سنبل سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"
انس نے اب چونک کر اسے دیکھا۔ "تو تم نے کیا کہا؟" انس نے رک کر پوچھا۔

"میں تو اس کے حق میں نہیں۔"
"اور سنبل وہ کیا کہتی ہے۔"
"پتا نہیں' نہ تو کبھی میرے ذہن میں ایسا خیال آیا اور نہ کبھی میں نے غور کیا۔"
انس نے گہرا سانس لیا۔ "تم پریشان نہ ہو۔ میں کچھ سوچتا ہوں اور گھر جا کر چاچو' چچی سے اس بارے میں بات نہ کرنا۔ نارمل شو کرنا کہ کچھ دن رہنے آئی ہو۔"
شبنم نے آنکھیں رگڑ کر اسے دیکھا۔ "تم کیا کرو گے؟"
"کچھ نہ کچھ تو کروں گا نا!" اب کی بار انس نے مسکرا کر جیسے اس کی پریشانی کم کرنے کی کوشش کی اور اس کی مسکراہٹ نے جیسے واقعی شبنم کی پریشانی کو کم کیا تھا۔
"تم بڑے ہو گئے ہو انس' ایسا لگتا ہے میرے پاس تمہارے جیسے بھائی کی صورت میں ایک مضبوط سہارا ہے۔"
"تمہارا یہ بھائی ہر مشکل میں تمہارے ساتھ ہو گا۔" انس نے مسکرا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
وہ گھر آیا تو نئی پریشانی اس کی منتظر تھی۔ اس نے کچھ حیرت سے ان تینوں کو دیکھا۔ وہ تینوں ہی اسے روئے ہوئے لگ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر امینہ کے رکے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔
"خیریت تو ہے امی کیا ہوا؟" اس نے گھبرا کر انہیں بازوؤں کے حلقے میں لیا۔
"کوئی مجھے بتائے گا؟" اب کہ وہ جھنجلا کر اونچی آواز میں بولا۔
"نیہا نے خلع کا نوٹس بھیجا ہے۔" واجد صاحب کے بتانے پر انس نے اپنا سر تھام لیا۔
"یہ ہو کیا رہا ہے؟" وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔
"کیوں کر رہی ہے وہ ایسے؟" اس نے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ دلاور سے پوچھا۔
"اعتراض تو اس کو کئی ہیں۔ میرے ماں باپ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ کہتی ہے۔ میں اس پر پابندیاں لگاتا ہوں۔ دس لڑکوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے' جب منع کرتا ہوں تو مڈل کلاس ہونے کا طعنہ دیتی ہے۔ اب بچے کا ایشو بنا لیا ہے کہ مجھ میں پرابلم ہے جب کہ میں اپنے ٹیسٹ کروا چکا ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔ تنگ آ گیا ہوں میں اس سے اور اب چھٹکارا چاہتا ہوں۔" دلاور کے صبر کا پیمانہ جیسے بھر گیا تھا۔
"یہ کسی مسئلے کا حل نہیں دلاور! شادی کوئی مذاق نہیں۔ یہ کرنا آسان ہے' لیکن اسے نبھانا مشکل ہے۔" کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا۔
"کل میں خود جاؤں گا نیہا کی طرف۔ سمجھاؤں گا اسے۔ آپ چلیں گے امی' ابو؟"
"توبہ کرو۔ میں تو منہ نہیں لگتی اس بدتمیز عورت کے۔ پڑھی لکھی جاہل کہیں کی۔" امینہ بیگم رونا بھول کر غصے سے بولیں۔
"ابو! آپ؟" اب کہ اس نے باپ کو دیکھا انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ انس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی جو وہ نیہا کے گھر آیا تھا۔ وہ نیہا کو سمجھانے آیا تھا' لیکن الٹا اس نے اور اس کے گھر والوں نے اسے اور اس کے باپ کو بے عزت کر کے رکھ دیا تھا۔ نیہا کے گھر والے اپنی بیٹی کی غلطی ماننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ ان کے نزدیک سارا قصور دلاور کا تھا اور وہاں سے نکلتے ہوئے انس کو دلاور کے رونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو کہاں ہیں سب؟" گھر میں خاموشی محسوس کر کے اس نے اونچی آواز میں ہانک لگائی اور بیگ صوفے پر پھینک کر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ تب ہی شبنم کمرے سے باہر نکلی۔
"کیا بات ہے باجی۔ اتنا سناٹا کیوں ہے؟ وہ سفیان موٹو کہاں ہے؟"
"وہ سو رہا ہے۔" اس کے سنجیدہ انداز پر سنبل نے

غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔
"امی نظر نہیں آ رہیں؟"
"امی ابو تایا جی کی طرف گئے ہیں۔"
"کیوں خیریت؟" وہ حیران ہوئی تھی کیونکہ راشد صاحب تو جاتے رہتے تھے پر شکیلہ کا جانا عجیب تھا۔
"وہ دلاور اور نیہا کا رشتہ ختم ہو گیا۔"
"کیا؟" سنبل کو جھٹکا لگا تھا، لیکن یہ احساس کچھ لمحوں کے لیے تھا۔ اگلے پل گہرا سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھ جھاڑے۔ "خس کم جہاں پاک!"
"کیا مطلب؟" شبنم نے تعجب سے اسے دیکھا۔
"مطلب کیا باجی! انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ میرے نزدیک تو اچھا ہوا ہے۔ کتنے غرور سے شادی کی تھی انہوں نے۔ اب دلاور بھائی اور تائی جی کا غرور خاک میں مل گیا ہو گا۔"
اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر شبنم کو حقیقتاً "دکھ ہوا تھا۔
"بڑے افسوس کی بات ہے سنبل! کسی کے دکھ میں خوش ہونا ایک اچھے مسلمان کی نشانی تو نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سب کے گھروں کو آباد رکھے اور اگر ایسا میرے ساتھ ہوتا تو بھی تم ایسے خوش ہوتیں۔"
سنبل نے تڑپ کر اپنی بہن کو دیکھا۔ "اللہ نہ کرے۔ آپ کے ساتھ ایسا ہو اور زبیر بھائی، وہ تو بہت اچھے ہیں۔ دلاور بھائی جیسے تو بالکل نہیں۔ دھوکے باز، لالچی۔"
"کون کیسا ہے۔ یہ ہم کبھی نہیں جان سکتے جب تک واسطہ نہ پڑے۔" شبنم نے دھیمی آواز میں کہا۔
"کیا کہہ رہی ہیں باجی؟" سنبل سمجھ نہیں سکی۔
"کچھ نہیں۔" شبنم نے سر جھٹکا۔ تب ہی راشد صاحب اور شکیلہ اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے افسردہ چہرے دیکھ کر دونوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا، لیکن راشد صاحب کے اندر جاتے ہی سنبل خود کو روک نہیں سکی۔
"امی! ابو کی تو سمجھ میں آتی ہے پر آپ کو کیا سوجھی وہاں جانے کی۔ کیا آپ تائی جی اور دلاور بھائی کی باتیں اور حرکت بھول گئی ہیں۔"
شکیلہ نے پہلے شبنم کو اور پھر غصے سے سنبل کو دیکھا۔
"سنبل! میں کب سے تمہاری بدتمیزی برداشت کر رہی ہوں، کتنا بغض بھرا ہے تمہارے دل و دماغ میں۔ کیا میں نے ایسی تربیت کی ہے تمہاری؟" سنبل اپنا غصہ بھول کر پریشانی سے ماں کا غصہ دیکھنے لگی۔
"امی! میں نے غلط کیا کہا ہے۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔
"کسی کی پریشانی میں خوشی کا اظہار کہاں کی صحیح بات ہے اور ایسے وقت میں دشمن بھی دشمنی بھول جاتے ہیں جب کہ وہ تو ہمارے رشتہ دار ہیں۔"
"اس کو چھوڑیں امی! وہاں سب ٹھیک ہیں؟" شبنم نے ناراض نظر سنبل پر ڈال کر پوچھا۔
"ٹھیک کیا ہونا ہے بیٹا! گھر اجڑ گیا دلاور کا۔ تکلیف تو ہے سب کو۔" شکیلہ نے آہ بھر کر کہا تو سنبل ناراضی سے واک آؤٹ کر گئی۔

✡ ✡ ✡

وہ کمرے میں آئی تو پتا نہیں کب سے بجتا اس کا موبائل خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے تیزی سے دوپٹے سے گیلے ہاتھ صاف کر کے موبائل اٹھایا۔ زبیر کی کال تھی، وہ ہونٹ چباتے ہوئے کتنی دیر اسکرین کو دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ فون ایک بار پھر بجنے لگا اس نے دل کڑا کر کے فون اٹھا لیا۔
"کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی تھی جو فون کی بیل سنائی نہیں دے رہی تھی۔" اس کی آواز سنتے ہی زبیر غصے سے بولا۔
"میں باہر تھی۔ فون کمرے میں تھا۔"
"دو ہفتے ہو گئے ہیں تمہیں گئے ہوئے، ایک فون نہیں کیا تم نے؟"
زبیر کے کہنے پر شبنم کو ایک خوش فہمی لاحق ہوئی کہ شاید اسے غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ اسے اور اپنے بچے کو مس کر رہا ہے۔

"میں آپ کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔"

"کیوں میرے فون کا کیوں؟ کام تم نے کرنا تھا' بات کی تم نے اپنے ابو سے یا نہیں؟"

شبنم نے افسوس سے سر جھٹکا۔ "نہیں' ابھی نہیں۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"ابھی نہیں کی تو کب کروگی بے وقوف عورت؟" اب کی بار وہ حلق کے بل چیخا۔

"رمیض میرے باپ کا نوکر نہیں جو میرے انتظار میں بیٹھا رہے گا اور لوگ بھی ہیں اس کے ساتھ انویسٹ کرنے کے لیے اور ہاں' کیا کہانی سنائی ہے تم نے اپنے کزن کو۔"

زبیر کے طنزیہ انداز پر وہ چونکی۔ "کس کو؟"

"وہی تمہارے تایا کا بیٹا انس' کل آیا تھا میرے پاس۔ جاب کی آفر لے کر' میں نے کب تم سے کہا تھا کہ میری جاب کو لے کر تم لوگوں کی منتیں کرتی پھرو' اب میں پینتیس چالیس ہزار کی جاب نہیں کر سکتا' میں نے بزنس کرنے کا مائنڈ بنا لیا ہے اور تم بھی صرف وہی کرو جو کہا ہے اور اگر نہیں کر سکتیں تو وہیں بیٹھی رہو۔ میرے گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

"زبیر!" وہ دکھ کے مارے بس اتنا ہی بول سکی۔ وہ تو زبیر کی بات کو محض ایک بات سمجھ رہی تھی' لیکن نہ ماننے کی اتنی سنگین سزا' اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے انس کا نمبر ملایا تھا۔

وہ اپنے دوست کے ساتھ سائٹ وزٹ کرنے جا رہا تھا جب شبنم کا فون آیا۔ اس کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر وہ اپنے دوست سے معذرت کر کے تیزی سے گھر پہنچا تھا۔ دروازہ اس نے کھولا تھا جس کو دیکھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ نہیں آسکا۔

"کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔" سنبل نے ایک طرف ہو کر اسے راستہ دیا۔

"ارے موٹو!" اسے دیکھتے ہی سفیان بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا تھا۔ انس نے اسی تیزی سے اسے گود میں اٹھا کر اس کا منہ چوما تھا۔ "آج تو میں موٹو کے لیے چاکلیٹ نہیں لا سکا۔" وہ سفیان سے کہہ رہا تھا۔

"تمہاری ماما کہاں ہے؟"

"ماما!" وہ کمرے کی طرف اشارہ کرنے لگا تو وہ تیزی سے ادھر ادھر دیکھے بغیر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ زبیر اس حد تک جا سکتے ہیں۔" وہ روتے ہوئے انس سے کہہ رہی تھی جب کہ انس پریشان تھا۔

"جب اس کو اچھی نوکری مل رہی ہے تو وہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟" انس نے خود کلامی کی تھی۔

"کیا پہلے بھی یوں ہی شرطیں رکھتا تھا اور اس کے گھر والے وہ بھی اسے منع نہیں کرتے؟" انس کے پوچھنے پر وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

"شادی کے صرف کچھ عرصہ تک سب ٹھیک تھے لیکن سفیان کے پیدا ہوتے ہی سب کے انداز بدل گئے' میں حیران ہوں۔ عجیب باپ ہے جسے بیٹے سے بھی پیار نہیں۔"

"تم نے کبھی چاچو یا چچی کو نہیں بتایا۔" شبنم نے سر نفی میں ہلایا۔

"کیسے بتاتی انس! جب دلاور سے بات ختم ہوئی تو لوگوں نے بڑی باتیں کی تھیں۔ بچپن کی منگنی یوں کیسے ٹوٹ گئی۔ ضرور لڑکی میں کھوٹ ہوگا اور ان افواہوں پر مہر تائی جی کی باتوں نے لگادی۔ وہ سب رشتے داروں سے کہتی تھیں۔ لڑکی بدتمیز' منہ پھٹ' کام چور ہے اور رشتہ داروں کو تو تم جانتے ہونا!" شبنم استہزائیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔

"اور جب زبیر سے شادی ہوئی تو مجھے ان سب الزاموں کو دھونا تھا جو مجھ پر لگے تھے۔ اگر میں وہاں سے آجاتی تو تائی جی کے سب الزام سچے ثابت ہو جاتے اور میرے ماں باپ جیتے جی مر جاتے۔"

انس شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں شبنم! واقعی میری فیملی کی وجہ سے تمہیں بہت پریشانی ہوئی ہے۔"

شبنم نے چونک کر انس کی شکل دیکھی۔ "انس پلیز میں یہ باتیں تمہیں شرمندہ کرنے کے لیے نہیں سنا

رہی بلکہ اپنی دل کی بھڑاس نکال رہی ہوں۔ اتنے سالوں سے خود سے لڑتے لڑتے تھکنے لگی ہوں۔"
تھوڑی دیر کے لیے دونوں خاموش ہو گئے تھے۔
"اب زبیر بھائی کیا کہتے ہیں؟" آخر انس ہی بولا تھا۔
"وہی بزنس کی رٹ اور اپنے ابو سے کہو۔ مکان بیچ دیں میں ایسا نہیں کر سکتی انس!
یہ گھر میرے ماں، باپ، بہن کے لیے سائبان ہے۔ میں کیسے اپنے آرام کے لیے ان کے سر سے چھت چھین لوں اور پھر کل کو امی، ابو نے سنبل کی بھی شادی کرنی ہے، صرف میں ہی ان کی اولاد نہیں۔ میں سنبل کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتی۔"
"ہوں!" انس نے ہنکارا بھرا۔ "تم نے سنبل سے بات کی اپنے دیور کے متعلق؟" انس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔ میں جانتی ہوں سنبل وہاں ایڈجسٹ نہیں کر سکتی اور کامران، وہ تو زبیر سے بھی ایک نمبر زیادہ ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں شادی کا شوشا بھی انہوں نے پیسوں کے لالچ میں چھوڑا ہے۔"
"ہوں....." انس نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔
"شبنم! میں ابھی یہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ تم خود ابھی پریشان ہو، لیکن مجھے لگتا ہے کہ ابھی بات نہ کی تو شاید دیر ہو جائے گی۔"
"ایسی کیا بات ہے انس! کھل کر بات کرو۔" شبنم نے گھبرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔
"شبنم! وہ....." وہ اٹکا۔ "میں سنبل سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
اگلے ہی پل وہ ایک سانس میں بول گیا اور دوسری طرف شبنم کا سانس اٹکا تھا۔ اسے یوں ساکت دیکھ کر انس تھوڑا مایوس ہوا تھا۔
"کیا ہوا۔ میں نے کچھ غلط کہا ہے؟"
شبنم نے بے ساختہ سر نفی میں ہلایا۔ "میں سن کر حیران ہوئی ہوں، کیونکہ ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا؟"
"تو اب سوچ لو۔"
انس نے جیسے مطمئن ہو کر کہا۔ "سوچنا، مجھے نہیں، کسی اور کو ہے اور مجھے لگتا ہے وہ نہیں مانے گی۔"
"کیوں؟" انس زور سے بولا۔ "کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں وہ تمہارے دیور کو تو پسند نہیں کرتی۔" انس کے ماتھے پر پڑنے والے بل بڑے بے ساختہ تھے۔
"ایسی بات نہیں انس! تائی جی کی باتوں کا سب سے زیادہ اثر اسی نے لیا تھا۔ وہ آج تک تایا جی کے سوا کسی کو معاف نہیں کر سکی۔"
"لیکن ان سب میں میرا کیا قصور؟" وہ لاچاری سے بولا۔
"قصور تو کسی کا بھی نہیں، لیکن یہ تمہیں اچانک کیا سوجھی؟" بات کرتے کرتے شبنم نے شرارت سے پوچھا۔
"اچانک نہیں سوجھی، بچپن سے نظر رکھ کر بیٹھا ہوں۔" وہ بھی اسی طرح شرارت سے بولا۔ "تم لوگوں کی وجہ سے میرا کام بھی اٹک گیا۔" آخر میں وہ منہ بنا کر بولا۔
"تم نے گھر میں بات کی؟" شبنم نے جیسے اچانک یاد آنے پر پوچھا۔
"ابھی نہیں۔" وہ اپنے موبائل کو گھماتے ہوئے بولا۔
"تمہیں کیا لگتا ہے تائی جی مان جائیں گی؟"
"ان کو تو میں منالوں گا۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے نیہا والے حادثے کے بعد انہیں کافی کچھ سمجھ میں آگیا ہوگا۔"
تم پہلے اپنے گھر میں تو بات کرو۔ سنبل سے پوچھو۔" انس نے کہا۔
"مجھے نہیں لگتا۔ امی، ابو کوئی اعتراض کریں گے اور جہاں تک سنبل کی بات ہے۔ میرے خیال میں وہ

بہت خوش قسمت ہوگی' اگر ایسا ہوجائے تو....." شبنم نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی جیسے کھل کر مسکرایا تھا۔

"اب چلتا ہوں۔ ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اگر تم کہو تو میں دوبارہ زبیر بھائی سے بات کروں؟"

"نہیں انس! اس طرح بات اور بگڑ جائے گی۔ میں نہیں چاہتی' زبیر تم سے کوئی بدلحاظی کریں۔ میں خود ان سے بات کرلوں گی۔"

"شیور!" انس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"ہاں....." شبنم نے مسکرا کر اس کی تسلی کروائی۔

٭ ٭ ٭

"شبنم!" شکیلہ اسے آواز دیتے ہوئے ہانپتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کیا ہوا امی! خیریت....." وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی۔

"تمہاری ساس کا فون آیا تھا۔" شبنم کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"وہ کامران اور سنبل کے رشتے کی بات کررہی تھیں اور کہہ رہی تھیں تمہیں کہہ کر بھیجا تھا۔" شبنم نے گہرا سانس لیا۔ "جی کہا تھا۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"تو تم نے بتایا کیوں نہیں؟" شبنم نے ایک لمحہ رک کر اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔

"مجھے یہ اتنا ضروری نہیں لگا امی! لیکن جو ضروری ہے' وہ ضرور بتاؤں گی۔" شکیلہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"انس سنبل سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا....." جہاں شکیلہ کے منہ سے نکلا وہیں اندر آتی سنبل حیرت کے مارے وہیں رک گئی۔

"تم سے انس نے کہا ہے؟" شکیلہ نے بے یقینی سے پوچھا۔

"جی اس نے خود مجھ سے کہا ہے۔"

"اور وہ کامران' تمہارے سسرال کا معاملہ ہے۔"

شکیلہ تذبذب کا شکار نظر آرہی تھیں۔

"امی! آپ یہ کیوں نہیں دیکھ رہیں۔ یہ سنبل کی زندگی کا معاملہ ہے۔ کامران لاسٹ چوائس ہے میرے نزدیک۔ انس ہر لحاظ سے سنبل کے لیے بہتر ہے۔ وہ سنبل کو بہت پسند کرتا ہے اور اسے بہت خوش رکھے گا۔"

شکیلہ مسکرائی تھیں اس سے پہلے وہ کچھ کہتیں سنبل تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی۔

"میرے لیے کون بہتر ہے اور میں کس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ اس کا فیصلہ مجھے کرنے دیں۔"

شکیلہ اور شبنم نے حیرانی سے اس کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھا۔

"اگر انس بھائی نے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو کیا اس کا مطلب ہے کہ انہیں ہاں ہی کردی جائے۔ کیا وہ دنیا کے آخری انسان ہیں کہ اگر ان سے میری شادی نہ ہوئی تو کسی اور سے نہیں ہوگی۔ میری تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا ان کی جرات کیسے ہوئی میرے بارے میں ایسا سوچنے کی۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

"ان سے شادی کرنے سے بہتر ہے۔ میں کنواری مرجاؤں۔"

"بکواس بند کرو سنبل!" شکیلہ غصے سے بولیں۔

"ذرا اس لڑکی کی زبان میں لگام نہیں۔"

"کیا خرابی ہے انس میں؟" شبنم نے ناراضی سے پوچھا۔

"یہ خرابی کم ہے کہ وہ تائی جی کے بیٹے اور دلاور بھائی کے بھائی ہیں اور کیا گارنٹی ہے کہ وہ دھوکا نہیں کریں گے۔ آپ کی بھی تو منگنی ہوئی تھی۔ کیا ہوا۔ آپ کے احساسات کی پروا کیے بغیر جھوٹے الزامات لگا کر کتنا ذلیل کیا۔ تو وہ بھی اسی فیملی کا حصہ ہیں۔"

"وہ ان سب سے بہت مختلف ہے سنبل!" شبنم نے پیار سے اسے پچکارا۔

"باجی! میں شبنم نہیں جو چپ چاپ سب برداشت

بھی کرلوں اور بھول بھی جاؤں۔ میں کوئی بے عزتی' کوئی الزام برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ضروری نہیں سنبل! جو میرے ساتھ ہوا' وہ تمہارے ساتھ بھی ہو۔ انس' دلاور سے مختلف ہے' اگر اس نے کہا ہے وہ تمہیں چاہتا ہے' تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ اس بات کو نبھائے گا بھی اور امی آپ چپ کیوں ہیں' سمجھائیں اسے۔" آخر میں شبنم نے زچ ہو کر ماں کو پکارا۔

"میں نے اس کی بکواس سن لی ہے' لیکن اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے' ہونا وہی ہے جو اس کے ابو فیصلہ کریں گے۔" وہ حتمی انداز میں کہہ کر اٹھ گئیں' جبکہ اپنی بے بسی پر سنبل کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"پھر تم نے کیا سوچا ہے انس؟"

انس نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر امینہ کی طرف دیکھا۔ "کس بارے میں امی؟"

"ارے بابا شادی کے بارے میں' میں نے تمہیں عروسہ کی تصویر دکھائی تھی نا۔"

"امی! اتنی جلدی کس بات کی ہے؟"

اب کے واجد صاحب نے اس کا چہرہ دیکھا۔ "اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو وہ بتا دو۔" انس نے مسکرا کر باپ کو دیکھا۔ امینہ بیگم نے ناگواری سے پہلو بدلا' لیکن مصلحت کے تحت خاموش رہیں۔

"ایک لڑکی پسند تو ہے مجھے۔" اس کے کہنے پر بے نیازی سے فون دیکھتا۔ دلاور بھی اسے دیکھنے لگا۔

"تب ہی۔۔۔" واجد صاحب کہہ کر مسکرائے۔

"کون ہے؟" دلاور نے اشتیاق سے پوچھا تو انس نے باری باری سب کی شکل دیکھی۔

"سنبل!" یہ نام ان تینوں کے سر پر دھماکے کی طرح پھٹا تھا۔

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔"

"دماغ خراب ہونے والی کیا بات ہے' میرے نزدیک تو اس کا فیصلہ بہت اچھا ہے۔ سنبل بہت اچھی لڑکی ہے۔" انس کے بجائے دلاور نے جواب دیا تھا۔

"جو میں نے شبنم کے ساتھ کیا۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ راشد اب ہمیں رشتہ دے گا۔ نہیں' الٹا بے عزت کرے گا اور مجھ میں اب بے عزتی کروانے کی ہمت نہیں۔" ان کے دو ٹوک انداز پر دلاور نے بھائی کا اترا چہرہ دیکھ کر باپ کو بھی بحث میں گھسیٹا۔

"آپ کچھ کیوں نہیں بولتے ابو!"

"میں کیا بولوں؟ میری تو خواہش تھی۔ میری دونوں بھتیجیاں میری بہو بنتیں' لیکن تمہاری اور تمہاری ماں کی ہٹ دھرمی نے مجھے میرے بھائی کے سامنے نظریں اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا' میں تو اب بات نہیں کروں گا' تمہاری ماں نے غلطی کی تھی۔ اسی کو سدھارنی ہو گی۔"

انہوں نے گیند امینہ کے کورٹ میں ڈال دی۔

انس نے افسوس سے واجد صاحب کو دیکھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی بات کرتا' گھنٹی بجی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر باہر آگیا اور گیٹ پر کھڑی سنبل کو دیکھ کر وہ حیران ہونے کے ساتھ پریشان بھی ہوا تھا۔ کیونکہ اس کا چہرہ کچھ گڑبڑ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"اندر آؤ سنبل!" انس نے نرمی سے کہہ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا' وہ گیٹ کے اندر آگئی' لیکن آگے نہیں بڑھی۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی۔ صرف ایک بات کلیئر کرنے آئی ہوں کہ میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی اور چاہتی ہوں آپ یہ بات دوبارہ نہ دہرائیں میرے امی' ابو کے سامنے' کیونکہ میں ان کے سامنے بھی انکار کروں گی لیکن میں ان کی نظر میں برا بن کر انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتی۔"

"وجہ پوچھ سکتا ہوں اس انکار کی؟" انس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی مزید گمبھیر ہو گئی تھی۔

"وجہ کیا آپ کو نہیں پتا۔ کیا' کیا تھا تائی جی اور دلاور بھائی نے باجی کے ساتھ۔ وہ ان باتوں کو نظرانداز

کر چکی ہیں یا بھول چکی ہیں، لیکن میں بالکل برداشت نہیں کر سکتی کہ مجھ پر کوئی الزام لگے۔"

"کوئی کیوں لگائے گا تم پر الزام؟" انس نے اسے سمجھانا چاہا۔

"آپ کی امی، جب آپ میرا نام لیں گے تو یقیناً ان کو اچھا نہیں لگے گا اور وہ کوئی بڑا سا ایشو بنا کر مجھے سارے خاندان میں بدنام کردیں گی اور میں ایسا بالکل برداشت نہیں کر سکتی اور ویسے بھی باجی کے دیور کا پرپوزل بھی موجود ہے اور مجھے آپ کی نسبت وہی بہتر لگ رہا ہے کم از کم وہ لوگ آپ لوگوں کی طرح لالچی اور دھوکے باز تو نہیں۔"

انس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، پر اس کے ہونٹ بھینچ گئے تھے۔ اسے پتا تھا سنبل تھوڑا اعتراض ضرور کرے گی، لیکن یوں اس کے جذبات کی ناقدری کرے گی۔ اس کی محبت پر کسی اور کو ترجیح دے گی۔ یہ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ وہ چلی گئی تھی، جبکہ وہ کتنی دیر تک ہل نہیں سکا، جب وہ مڑا تو دلاور کو کھڑا دیکھ کر چونک گیا اور اس کے قریب سے تیزی سے گزر گیا، جبکہ دلاور شدید پشیمانی کے احساس میں گر گیا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے اپنے کتنی تکلیف میں آگئے تھے۔

☆ ☆ ☆

بھڑاس نکالنے کے بعد رات سے سلگتا اس کا دماغ پُرسکون ہو گیا تھا۔ وہ گنگناتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی، لیکن آگے کا منظر اسے ڈرانے کے لیے کافی تھا۔ راشد صاحب صوفے پر لیٹے تھے، جبکہ پاس بیٹھی شکیلہ اور شبنم رو رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھی۔

"ابو پلیز... آپ پریشان نہ ہوں۔" شبنم ان کا ہاتھ تھامے انہیں تسلی دے رہی تھی۔

"اتنی بڑی بات ہو گئی شبنم اور تم نے ہم سے ذکر تک نہیں کیا۔"

"میں کیا بتاتی ابو! میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"بیٹا! پریشانی تو زیادہ ہو گئی ہے۔ زبیر نے دس لاکھ روپے مانگے ہیں۔" سنبل نے بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا۔ "میں نے کتنا سمجھایا۔ اپنی مجبوری بتائی، لیکن وہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا، وہ اتنا لالچی ہے۔"

"ابو! آپ زبیر کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ خود ہی مان جائیں گے، کیونکہ ان کی مانگ ناجائز ہے، اگر قابل قبول ہوتی تو میں خود آپ سے کہتی۔" اس نے خود کو مضبوط کر کے باپ کو تسلی دی۔ "بات اتنی چھوٹی نہیں میری بچی اس کے دماغ میں خناس بھرا ہے۔ مجھے دھمکی دے رہا تھا۔ اگر میں نے رقم نہ دی تو وہ طلاق بھیج دے گا اور سفیان کو بھی لے لے گا۔"

واجد صاحب کہتے ہوئے رو پڑے تھے، جبکہ شبنم کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ پاس کھڑی سنبل کو تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جو اس نے سنا وہ سچ ہے۔ اس کے سامنے انس کا چہرہ آگیا، کیسے اس نے زبیر کی مثال دے کر کہا تھا کہ وہ لالچی ہے۔ زبیر کے گھر والے نہیں۔

"آپ کچھ کریں راشد!" شکیلہ کے کہنے پر وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگے اور پھر چونک کر سیدھے ہوئے۔

"میں انس سے بات کرتا ہوں۔"

"ہاں انس کو فون کریں۔" شکیلہ نے بھی آنسو صاف کرتے ہوئے تائید کی تو وہ انس کا نمبر ملانے لگے، لیکن اگلے ہی پل مایوس ہو کر موبائل رکھ دیا۔

"اس کا فون بند جا رہا ہے۔" ان کے کہنے پر سنبل ہونٹ چبانے لگی۔

"آپ گھر چلے جائیں نا!" شکیلہ کے کہنے پر وہ سر ہلا کر کھڑے ہو گئے اور سنبل خاموش بیٹھی شبنم کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

کبھی کبھی انسان کے بولے بڑے بول اس کے آگے آجاتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کسی کے دکھ پر خوشی کا اظہار نہ کرو۔

سنبل روتے ہوئے اپنی بہن کے سفید چہرے اور بند پپوٹوں کو دیکھ رہی تھی۔ دلاور کی طلاق پر وہ یہ کہہ کر خوش ہوئی تھی کہ اسے سزا ملی ہے اور آج صبح ڈاک سے اس کی بہن کو طلاق کے کاغذات ملے تھے۔ تب سے وہ صدمے کے زیر اثر بے ہوش تھی اور جب اپنوں کو تکلیف پہنچتی ہے تب انسان کو اس تکلیف کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی بہن اتنے سالوں سے اتنا کچھ برداشت کررہی تھی اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔

شبنم کے حرکت کرنے پر وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی تھی۔ شبنم نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"کیسی طبیعت ہے؟" سنبل کے پوچھنے پر وہ کتنی دیر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی اور پھر یاد آنے پر آنکھیں یکایک پانی سے بھرنے لگیں۔

"باجی! پلیز باجی روئیں نہیں۔" سنبل نے روتے ہوئے شبنم کے آنسو صاف کیے۔

"سفیان!" اس نے ایک دم متوحش ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔

"وہ تایا جی کے گھر ہے۔ دلاور بھائی اسے لے گئے ہیں۔"

"وہ اسے لینے تو نہیں آئے۔" یقیناً" شبنم کا اشارہ زبیر کی طرف تھا۔

"نہیں، انس بھائی نے ان سے کسٹڈی لے لی ہے۔" شبنم بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

"کتنے پیسے مانگے تھے اس نے؟" سنبل نے چونک کر شبنم کو دیکھا، کیونکہ یہ تو شبنم کو نہیں پتا تھا کہ زبیر نے پیسے لے کر سفیان کی کسٹڈی دی ہے۔

"بولو سنبل!"

"پانچ لاکھ!" سنبل کے دھیرے سے بتانے پر شبنم نے آہ بھری۔

"ابو نے کہاں سے دیے؟"

"ابو نے نہیں، انس بھائی نے دیے ہیں۔" بتاتے ہوئے سنبل شرمندہ تھی۔

انس روز شبنم سے ملنے آتا وہ سب سے بات کرتا سوائے اس کے اور تو اور تائی جی بھی سب بھلا کر شبنم سے ملنے آئی تھیں اور وہ سب کے روتے دیکھ کر اپنے رویے پر پچھتا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شبنم کی عدت پوری ہوتے ہی دلاور، تایا جی اور تائی جی آئے تھے۔ آتے تو وہ اب روز تھے لیکن اس دن وہ خاص مقصد سے آئے تھے۔ وہ شبنم کا ہاتھ مانگنے آئے ہوئے دلاور کے لیے۔

راشد اور شکیلہ پر تو شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ شبنم کا مستقبل تاریک ہوچکا ہے۔ ایک بچے کے ساتھ کون اسے اپنائے گا۔ پر یہاں تو معجزہ ہوگیا تھا۔ لیکن اس بار جب سب راضی تھے تو شبنم نے انکار کردیا۔

سب اسے سمجھا کر تھک گئے تھے۔ حتیٰ کہ منانے والوں میں سنبل سب سے آگے تھی وہ جو دلاور کے اتنے خلاف تھی۔ وہ دلاور کی تعریف میں زمین

آسمان ایک کر رہی تھی، لیکن وہ کچھ سن اور مان نہیں رہی تھی۔

انس پاکستان میں نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے دلاور آیا تھا، وہ کتنی دیر بیٹھ کر شبنم کو سمجھاتا رہا، اپنی محبت اور وفاداری کا یقین دلاتا رہا۔ اس کچھ عرصے میں سفیان بھی دلاور اور تائی جی سے کافی کھل گیا تھا۔ سنبل کتنی بار بہانے بہانے سے کمرے کے گرد چکر لگا چکی تھی اور تھوڑی دیر بعد دلاور مایوس باہر آیا۔

"دلاور بھائی!" سنبل اس کے پیچھے آئی تھی۔

"آپ انس بھائی سے کہیں، باجی ان کی بات نہیں ٹالیں گی۔"

دلاور نے سر ہلایا اور غور سے اسے دیکھا۔

"اور دلاور بھائی! میری کوئی بات آپ کو بری لگی ہو تو مجھے معاف کر دیں۔"

"سنبل!" دلاور نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"تم مجھے چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ اور انس کے حوالے سے ہم سب کو تم سے بہت پیار ہے۔ ہم سب کی خواہش ہے، انس کی دلہن تم بنو۔ میں نے ایک غلطی کی تھی۔ سزا آج تک بھگت رہا ہوں۔ قسمت ہر ایک کو موقع نہیں دیتی۔ وقت ابھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ہماری غلطی کی سزا انس کو یا خود کو نہ دو۔ محبت ہر ایک کا نصیب نہیں ہوتی۔ سمجھ رہی ہو نا۔"

دلاور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو اس نے جھکے سر کو ہلایا اور اس کے جاتے ہی کب سے روکے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

پورے ایک ماہ بعد وہ آیا تھا۔ دروازہ اس نے ہی کھولا تھا۔ ایک نظر اسے دیکھ کر وہ اندر بڑھ گیا۔ وہ سیدھا شبنم کے کمرے میں گیا تھا۔ ساہرہ اور شکیلہ جلے پیر کی بلی طرح گھوم رہی تھیں اور پورے ایک گھنٹے بعد وہ مسکراتا ہوا باہر نکلا تھا۔

"مبارک ہو چچی! لڑکی مان گئی ہے۔ تین دن بعد ہم اپنی امانت لے جائیں گے۔ نکاح سادگی سے ہوگا۔ باقی ولیمہ ہم دھوم دھام سے کریں گے۔"

شکیلہ ایک دم انس کے ساتھ لگ کر رونے لگی تھیں۔

"میں کن لفظوں میں انس تمہارے احسانات کا شکریہ ادا کروں؟"

"چچی بیٹوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا، انہیں دعائیں دی جاتی ہیں۔ مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ چلتا ہوں۔ ابھی تیاریاں بھی کرنی ہیں اور امی، ابو اور خاص طور پر دلاور کو خوش خبری سنائی ہے۔" وہ بتاتے ہوئے خود زیادہ خوش لگ رہا تھا۔ سنبل کب سے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس نے ایک بار بھی اس پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ وہ تیزی سے مڑ گیا اور اس کے اچانک مڑنے پر وہ جلدی سے اس کے پیچھے آئی تھی۔

"انس بھائی!" اس کے پکارنے پر وہ رک گیا تھا، لیکن مڑا نہیں۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں۔" وہ انگلیاں مسلتے ہوئے آنکھیں جھکائے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"نہیں۔" کچھ دیر بعد وہ بولا اور مزید کچھ کہے باہر نکل گیا۔ جبکہ معافی کے لیے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ کتنی دیر دھندلی نظروں سے دروازے کی چوکھٹ دیکھتی رہی۔

✡ ✡ ✡

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی امی!" وہ بے حد جھنجلا کر بولی تھی۔ شکیلہ نے ناراضی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"ابھی نہیں کرنی تو کب کرنی ہے۔ جب عمر نکل جائے گی۔ اتنا اچھا رشتہ ہے۔ لڑکا بینک میں ہے۔ چھوٹی سی فیملی ہے۔"

"پلیز امی!" وہ عاجز آ کر بولی۔

"سنبل! مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ انس کا رشتہ ہمیں پسند تھا۔ اپنا بچہ۔ وہاں بھی تم نے اپنی مرضی کی۔ جو باتیں ہوئی تھیں۔ تمہیں سمجھایا بھی تھا۔ اللہ کی مرضی سے سب ہوتا ہے۔ پر نہیں، منہ پھٹ تو تم سدا کی ہو۔ سب خراب کردیا۔ کتنی چاہت تھی انس کو۔ میں شروع سے سمجھتی تھی۔ تمہاری بدتمیزی، بدلحاظی وہی برداشت کرتا تھا، ورنہ سوچو۔ کون برداشت کرتا ہے۔ خود میں تمہاری سگی ماں تمہاری کاہلی اور منہ پھٹ عادت سے عاجز ہوں۔ پر یہ انس کی محبت تھی اور میں بھی وقت کے انتظار میں تھی۔ پر شبنم والے واقعے کے بعد مجھے لگا۔ سب ختم ہوگیا۔ انس بھی باہر چلا گیا، لیکن جب آیا تب بھی اس بچے کی نیت نیک تھی، اس کی محبت سب کو نظر آتی تھی، سوائے تمہارے۔"

انہوں نے دانت پیسے جیسے غصہ دبا رہی ہوں۔ سنبل کے آنسو نکل آئے۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا اب تم کس بنا پر انکار کررہی ہو؟ جو حرکت تم نے کی، اس کے منہ پر اتنی دیدہ دلیری سے نہ کرکے آئی ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے وہ اب تمہارا رشتہ مانگے گا۔"

سنبل آنسو بھری نظروں میں حیرت لیے ماں کو دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ مجھے شبنم نے بتایا۔ اسے دلاور نے بتایا تھا۔ کیسے تم انس کی بے عزتی کرکے آئی تھیں، کیا کہہ کر آئی تھیں کامران اس سے بہتر ہے۔ ڈوب مرو سنبل!" آخر میں وہ طیش سے بولیں۔

"دلاور کی وجہ سے تم نے کیا نا کہ دلاور نے شبنم کو چھوڑ دیا تو اب کیا کہوگی۔ شبنم آج دلاور کی بیوی ہے۔ وہی تائی جو باتیں کرتی تھیں، آج اسے پلکوں پر بٹھاتی ہیں۔ شبنم کی قسمت وہیں لکھی تھی۔ دیکھو آج وہ اس گھر پر اور ان کے دلوں پر راج کررہی ہے۔ اسے سنجوگ کہتے ہیں۔ شبنم نے صبر کیا اور اسے صلہ مل گیا۔ تم نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ تمہاری تائی انس کا رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ افسوس ہوتا ہے مجھے۔ اپنی بے وقوفی کی وجہ سے تم نے ہیرے جیسے انس کو گنوا دیا۔" سنبل کے دل پر جیسے گھونسا لگا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔ اس کے آنسو دیکھ کر شکیلہ نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے، وہ جانتی تھیں۔ ان کی بیٹی پچھتا رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

سنبل کب سے شبنم کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو چند مہینوں میں کتنی نکھر گئی تھی۔ دھیمے سے مسکرانے والی شبنم کے قہقہے دوسروں کو مسکرانے پر مجبور کردیتے تھے۔ ماں کو لائے ہوئے گفٹ دینے کے بعد اس نے سنبل کو دیکھا تو ٹھٹک گئی۔

"یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ چہرہ اتنا مرجھایا ہوا کیوں ہے؟"

"کچھ نہیں باجی، ایسے ہی۔" اس نے مسکرا کر چہرہ جھکالیا۔ "آپ بتائیں، دبئی کا وزٹ کیسا رہا۔"

وہ ایک ماہ کے لیے دلاور اور سفیان کے ساتھ دبئی گئی تھی۔

"زبردست... بہت انجوائے کیا۔ خاص طور پر سفیان نے۔ ان دونوں باپ بیٹے نے مجھے گھما کے رکھ دیا تھا۔" بات کا اختتام قہقہے پر ہوا تو سنبل مسکرادی۔

"یہ میں تمہارے لیے لائی ہوں۔" شبنم نے میک اپ کٹ، پرفیوم، ہینڈ بیگ اس کی طرف بڑھائے "اور یہ دلاور نے تمہارے لیے چاکلیٹ لیے تھے۔ تمہیں پسند ہیں نا۔" اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ پیکٹ تھام لیے۔

☆ ☆ ☆

وہ بڑی بے دلی سے تیار ہوئی تھی۔ اس کا جانے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ پر حمیرا اس کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ کم از کم ایک فنکشن میں اسے جانا ہی تھا۔ وہ گفٹ اور کلچ تھام کر باہر آگئی۔

"امی! میں تایا جی کی طرف جارہی ہوں۔ دلاور بھائی مجھے چھوڑ آئیں گے۔"

وہ کچن میں کام کرتی شکیلہ سے کہہ کر باہر نکل آئی۔ چھوٹی ہیل کی وجہ سے وہ آرام سے چلتی ہوئی لاؤنج کی طرف بڑھنے لگی' اندر سے آتی آوازوں سے اسے اندازہ ہو رہا تھا۔ سب اندر ہیں۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا تھا۔

"ارے یہ چاند کہاں سے نکلا ہے؟" اسے دیکھتے ہی دلاور بھائی چہکے تو وہ مسکرا کر آگے بڑھی۔

"بھئی..... میں نے بھی نہیں پہچانا۔ یہ پیاری سی لڑکی کون ہے۔"

"تایا جی!" واجد صاحب کے کہنے پر وہ جھینپ کر ان کی طرف مڑی اور پھر ساکت ہو گئی۔ وہ ان کے ساتھ صوفے پر ہی بیٹھا تھا۔ اس کو تو یہی پتا تھا کہ انس ملائیشیا گیا ہوا ہے۔

"یہ کب آئے؟" اس نے خود سے سوال کیا تھا۔

اس کے یوں دیکھنے پر اس نے نظروں کا زاویہ بدل لیا تو وہ گڑبڑا کر امینہ کے پاس بیٹھ گئی۔ اور کنفیوز ہو کر اپنی انگلیاں مسلنے لگی۔ امینہ نے بغور اس کی یہ حرکت دیکھی اور پیار سے اسے ساتھ لگا لیا۔

"تمہاری یہ بیٹی شروع سے ہی بہت پیاری ہے اور بار بار کہہ کر میری بیٹی کو نظر نہ لگایا کرو۔" وہ دلاور سے کہہ رہی تھیں۔

"تائی جی! باجی کہاں ہیں؟" اس نے دھیان بٹانے کے لیے پوچھا۔

"کچن میں ہے۔"

"میں ان سے مل آؤں۔" اسے وہاں سے ہٹنے کا بہانا چاہیے تھا جو اسے مل گیا تھا۔

"ارے سنبل! ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔" شبنم..... اسے دیکھ کر بے ساختہ بولی۔

"آپ کیا بنا رہی ہیں؟" اس نے شیلف پر پھیلی چیزوں کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں..... وہ انس کی آسٹریلیا میں کولیگ تھی۔ وہ آ رہی ہے۔ اس کے لیے یہ اہتمام ہو رہا ہے اور ویسے بھی مجھے لگتا ہے۔ انس اس میں انٹرسٹڈ ہے۔"

اور کھیرے کا قتلہ اٹھاتا اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ شبنم نے بغور اس کا اترا چہرہ دیکھا۔

"رونا نہیں۔ کاجل پھیل جائے گا۔" اس کے رونے کا پروگرام دیکھ کر شبنم نے بے ساختہ ٹوکا تھا۔

"سنبل! میں کب سے تمہاری حالت دیکھ رہی ہوں۔ تمہارا مسئلہ سمجھ رہی ہوں اور انس سے بات کر کے حل بھی کر سکتی ہوں۔ لیکن غلطی تمہاری ہے۔ سدھارنا بھی تمہیں ہو گی۔ اس کا دل تم نے دکھایا ہے تو معافی بھی تمہیں مانگنی ہو گی۔"

"باجی میں معافی مانگنے کو تیار ہوں' پر وہ مجھے موقع تو دیں۔ وہ تو مجھ سے زیادہ ہی ناراض ہو گئے ہیں' مجھے نہیں لگتا۔ وہ مجھے معاف کریں گے۔"

شبنم نے مسکرا کر اپنی بہن کی پریشانی دیکھی۔

"تم کہہ کر تو دیکھو وہ اپنے کمرے میں ہو گا' جاؤ۔"

سنبل نے گھبرا کر شبنم کو دیکھا۔

"میں کیا کروں جا کر!"

"بات کرو جا کر۔"

"میں!" وہ ہکلائی۔

"ہاں تم اور یہ چائے بھی اسے دے آؤ۔" شبنم نے اسے کپ بھی تھما دیا تو وہ بوکھلا کر اس کا منہ دیکھنے لگی۔

دروازہ ہلکے سے بجا کر وہ اندر آ گئی۔ بیڈ پر نیم دراز وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے سیدھا ہوا۔ اس کی نظروں میں تعجب دیکھ کر سنبل' مزید گڑبڑا گئی۔

"یہ باجی نے دیا ہے۔" اس نے کپ یوں آگے کیا جیسے یہی دینے آئی تھی۔

"تھینکس....." اس نے ایک نظر اسے دیکھ کر کپ تھام لیا۔

"کچھ کہنا ہے؟" اسے یونہی کھڑا دیکھ کر انس کو پوچھنا پڑا۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"تو کچھ پوچھنا ہے۔" اب کی بار سنبل نے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آپ نے مجھ سے کہا تھا نا کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے۔"

انس نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"تو پھر آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ انس نے الجھ کر دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"آپ کسی اور سے شادی کیسے کر سکتے ہیں۔"

"میں!" انس سینے پر انگلی رکھ کر بولا۔

"جی آپ.... باجی نے مجھے بتایا آپ اپنی کولیگ میں انٹرسٹڈ ہیں۔ امی نے بھی کہا۔ تائی جی آپ کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں۔ میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟"

اب اس کا رونا غصے میں بدل رہا تھا۔ انس چلتا ہوا سیدھا اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ اس لیے کیونکہ تم نے منع کیا تھا تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔ تمہارے نزدیک کامران مجھ سے زیادہ اچھا ہے۔ میرے گھر والے ہمیں جھوٹے، لالچی دھوکے باز ہیں۔"

وہ اسی کے الفاظ اسے لوٹا رہا تھا جو باتیں بولتے ہوئے اسے تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ سنتے ہوئے اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ یقیناً انس کو بھی اتنی ہی ہوئی ہوگی۔ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ غلطی واقعی اس کی تھی۔ وہ صرف رو سکتی تھی اور رو رہی تھی۔

"سنبل! اب اس طرح رونے کا کیا مطلب ہے۔" وہ تھوڑا جھنجلا کر بولا۔

"اچھا.... رونا بند کرو۔" کہنے کے ساتھ اس نے اس کے آنسو بھی صاف کر دیے۔

"تم بتاؤ میں کیا کروں؟"

"آپ کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتے۔" وہ ضدی انداز میں بولی۔

"کسی سے بھی نہیں۔" انس نے زیر لب مسکراتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

"میرے سوا آپ کسی سے شادی نہیں کر سکتے۔" وہ غصے میں تیزی سے بول گئی۔ اندازہ تب ہوا جب انس قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ اپنی بے اختیاری پر سنبل کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"سوچا تھا اتنی جلدی تمہیں معاف نہیں کروں گا، تم نے مجھے کافی ہرٹ کیا ہے۔ لیکن یہ جو دل ہے نا، یہ تم سے ناراض نہیں ہو سکتا اور نہ تمہیں دکھی دیکھ سکتا ہے۔"

سنبل نے بڑے فخر سے اپنے سامنے کھڑے اس شاندار شخص کو دیکھا۔

"میں آپ کو آئندہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

"پکی بات ہے۔" انس نے جیسے گارنٹی چاہی۔

"جو کہوں گا مانو گی۔" سنبل نے سر ہلایا۔

"تو چلو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"کہاں؟" وہ بوکھلا کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

"سب کو بتانے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

"انس بھائی!" "رک جاؤ۔ انس صرف انس!" انس نے آنکھیں نکال کر اسے ٹوکا۔ "ویسے بھی جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" وہ اس کے قریب جھکا، اسے سمجھا رہا تھا، جبکہ وہ دل کڑا کر کے اندر ہونے والی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

"جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" اس نے خود سے کہا اور مسکرا کر انس کو دیکھا، جس کے چہرے پر بالکل ویسی ہی مسکراہٹ تھی جیسے اس وقت اس کے چہرے پر پھیلی تھی محبت کی روشنی بن کر۔

☆

ریحانہ آفتاب
آفٹر شاکس

ایسا لگتا ہے میں ہواؤں میں ہوں
آج اتنی خوشی ملی ہے

سمرن مہمانوں کے جانے کے بعد۔۔۔ پھیلاوا سمیٹ رہی تھی۔ جوتوں کی مٹی' ٹافیوں کے ریپر' پھولوں کی پتیاں جابہ جا پھیلی ہوئی تھیں۔ ہال کی کوئی بھی چیز ٹھکانے پہ نہیں تھی۔ ایسے میں سی ڈی پلیئر اب بھی بج رہا تھا گو کہ والیوم میں کمی آگئی تھی۔

دلہن بنی انوش ہر اینگل سے سیلفی لے کر لہک لہک کر گارہی تھی۔ سمرن نے کشنز کو جگہ پہ رکھتے' مسکراتے ہوئے اس کے خوشی سے تمتماتے چہرے کو دیکھا۔ وہ اب بھی دلہن بنی سیلفی میں مگن تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل کرلیے تھے۔ منہ بھی دھولیا تھا لیکن مٹے مٹے میک اپ کے اثرات اب بھی چہرے پہ موجود تھے۔ کیونکہ اسے ڈھنگ سے منہ دھونے کا ٹائم بھی نہیں ملا تھا کہ رحمت صاحب نے چائے کے لیے آواز لگادی تھی۔

پورا گھر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ خالی دیگیں سامنے دھری ہوئی تھیں۔ کچن میں گندے برتنوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ شاہدہ بیگم کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ سر درد کی گولی لے کر لیٹ گئی تھیں۔ چائے بنا کر اس نے رحمت صاحب کو دی اور اب اس کا ارادہ پہلے گھر کی صفائی کا تھا۔ اس کے بعد وہ کچن کی طرف جاتی۔ رحمت صاحب نے آواز بھی لگائی تھی۔

"رہنے دو۔ صبح ماسی آکر کرلے گی سب۔"

مگر ماربل پہ کرکراہٹ محسوس کرکے اس کی طبیعت نے اسے رکنے نہ دیا۔ ساری رات گندے گھر اور کچن کا خیال اسے چین سے سونے بھی نہیں دیتا۔ تب ہی وہ جت گئی تھی۔

آج انوش کی منگنی کی تقریب گھر کے ہال میں ہوئی تھی۔ گو کہ کم لوگ ہی تھے۔ مگر پچیس تیس لوگوں کو بھی ہینڈل کرنا' کھانا لگانا' اٹھانا۔ ان کی آؤ بھگت پھر رسم' سب نے اسے گھن چکر بنادیا تھا۔ صبح سے کئی بار گھر کی صفائی ہوچکی تھی مگر مہمانوں کے جانے کے بعد یوں لگنے لگا جیسے گھمسان کا رن پڑا ہو۔ انوش تو گنگناتے ہوئے سیلفی میں مگن تھی اس نے اکیلے ہی ہاتھ چلانا شروع کردیا تھا۔

"میری دو تین تصویریں تو بنادو۔" انوش نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھایا تو وہ جھاڑو رکھ کر اس کی تصویریں بنانے میں لگ گئی۔

"باقی تصویریں اوپر بنالو۔ اس کمرے کا ویو زیادہ اچھا ہے۔" سمرن نے سیل فون تھمانے کے ساتھ مشورہ بھی دیا۔

"گڈ آئیڈیا۔" انوش کے دل کو بھی بات لگی تو وہ اپنی میکسی سنبھال کر ٹک ٹک کرتی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ سمرن نے تیزی سے جھاڑو مار کر کچن کا رخ کیا۔

صبح ماسی آکر برتن دھودیتی۔ ایکسٹرا پیسے بھی اینٹھتی مگر رات بھر کا کروچ ان پہ مٹر گشت کریں یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ تب ہی برتنوں سے الجھ گئی۔ جب فارغ ہوئی تو رحمت صاحب بھی کمرے میں جاچکے تھے۔ مین گیٹ کا لاک چیک کرکے وہ اپنے اور انوش کے مشترکہ کمرے میں آئی تو وہ فون کان سے لگائے سرگوشیوں میں مصروف نظر آئی۔

یہ روز کا معمول تھا۔ لیکن آج چونکہ شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی تھی۔ اس لیے ان کی گفتگو طویل بھی ہوسکتی تھی۔ اس کی پرائیویسی کا خیال کرکے سمرن نے سرہانے سے اپنی کتابیں اٹھائیں اور دوسرے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ اس کا ارادہ تھا دو منٹ کمر سیدھی کرکے پڑھے گی مگر لیٹتے ہی جانے کب آنکھ لگ گئی اسے خبر نہ ہوئی۔

✡ ✡ ✡

"کتنی خوب صورت جیولری ہے' دیکھو یہ جوتی اور یہ ڈریس۔" صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر شاہدہ کی مدد کرنے لگی تھی۔ انوش دیر سے ہی اٹھی تھی۔ اٹھنے کے بعد اس نے سمرن سے لے کر ناشتا فرمایا تھا اور اس کے بعد سے وہ اپنی سسرال سے آئی چیزوں کا میلہ لگائے انہیں دیکھ دیکھ کر آنکھوں کو

ٹھنڈک پہنچانے کے بعد فیس بک پہ اپ لوڈ کرنے کے ساتھ دوستوں کو واٹس ایپ بھی کر چکی تھی۔

"تمہاری چوڑیاں بھی آئی ہیں اور سوٹ بھی، دیکھو۔" انوش نے مہندی لگے ہاتھ سے نیچے موجود ڈبا کھینچ کر سمرن سے کہا۔

"بہت اچھا ہے۔" سمرن اک نظر ڈال کر چاول صاف کرنے لگی۔ جو شاہدہ نے اسے تھما دیا تھا کہ وہ پلاؤ بنا رہی تھیں۔

"اچھا کیوں نہیں ہو گا، خضر کی پسند ہے۔ اس نے ہم سب کی شاپنگ خود کی ہے۔ اس کی ماں، بہنوں کو تمیز کہاں ہے فیشن کی۔ جل کے بیٹھی ہیں سب بہنیں، خصوصاً" ممی! خضر سے لڑیں بھی سب کہ وہ میری پسند سے سب کچھ کر رہا ہے۔" انوش اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔ لاؤنج سے ملحق کچن میں موجود شاہدہ بھی ساری گفتگو سن رہی تھیں۔

"ابھی سے برائی لو گی تو جینا مشکل کر دیں گی تمہارا۔ تم نے ان کے ساتھ ہی رہنا ہے، رخصت ہو کر۔" شاہدہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں، تم ذرا نرم پڑ جاؤ۔ چیزوں کا کیا ہے۔ کسی کی بھی پسند کی ہوں، خضر کی ماں، بہنوں کے بھی تو ارمان ہوں گے نا کہ وہ اپنی بہو، بھابھی کے لیے خود کچھ پسند کریں۔"

وہ دانائی سے سمجھا رہی تھی۔ مگر اس جیسی ہٹ دھرم نے کب کسی کی سنی تھی۔

"چھوڑو۔ بھاڑ میں جائیں وہ۔ خضر وہی کرے گا جو میں کہوں گی۔ اگر میں نے نہ کہا ہوتا تو منگنی میں یہ حسین جوڑا آتا میرے لیے۔ اس کی ماں بہن نے تو دو سال پرانا جوڑا پسند کیا تھا۔ وہ تو خضر نے مجھے سوٹ کی پک واٹس ایپ کی تو میں نے وہ کلاس لی کہ اس نے جوڑا واپس کر کے میری پسند سے لیا۔" انوش سمرن کی بات کاٹ کر اپنی ہانکنے لگی۔

اس نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ بھینس کے آگے بین بجانے والی بات تھی۔ جانے وہ کیوں ہر بار بین بجانے کھڑی ہو جاتی تھی۔

"چاول صاف ہو گئے؟" شاہدہ پوچھ رہی تھیں۔

"جی!" اس نے تھال تھمانے کے بجائے چاولوں کو پتیلے میں ڈال کر دھونے کے بعد بھگو دیے۔

"یہ وقت آ گیا مگر ماسی کا نام و نشان نہیں لگتا آنے کا، چھٹی مار لی ہے اس نے۔ سمرن ایسا کرو۔ جھاڑو پونچھا کر لو۔ ظہر کا وقت ہونے والا ہے۔ پتا تھا نا کل رسم تھی، کر لی چھٹی کام چور نے کہ برتن دھونے پڑیں گے۔" شاہدہ اسے کام بتا کر ماسی کی شان میں قصیدہ گوئی کرنے لگیں۔ سمرن نے شکر ادا کیا کہ رات ہی اس نے کچن سمیٹ دیا تھا ورنہ ابھی تک ماسی کے انتظار میں پھیلا ہوا ہوتا۔

وہ صفائی میں لگ گئی تھی کہ جمعہ کا دن تھا۔ نماز کی بھی تیاری کرنی تھی۔ انوش جوڑوں اور باقی چیزوں کی تصویریں فیس بک پہ اپ لوڈ کر کے دوستوں کے کمنٹس پڑھ پڑھ کر خوش ہو کر جواب دینے میں مصروف ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"خیر سے انوش کی تاریخ طے ہو گئی۔ چار ماہ بعد اس کی شادی ہو جائے گی۔ اگر سمرن کی بھی کہیں بات بن جاتی تو دونوں بیٹیوں کو ایک ساتھ بیاہ دیتے۔" رحمت یاسیت سے کہہ رہے تھے۔

"بات تو آپ کی بجا ہے لیکن نصیب میں ہی دیر ہے تو کیا کریں۔ کتنی ہی رشتے کروانے والیوں کو کہہ رکھا ہے میں نے۔ اللہ بہتر کرے گا۔" شاہدہ بھی فکر مند تھیں۔

"جانتا ہوں، اس کے لیے تو میں تمہیں الزام بھی نہیں دے رہا۔ سوتیلی ماں ہونے کے باوجود تم نے کبھی انوش اور سمرن میں فرق نہیں کیا۔" رحمت انہیں سراہ رہے تھے۔ شاہدہ کا خون بڑھ گیا۔

ایک سالہ سمرن ماں کی وفات کے بعد تنہا رہ گئی تھی۔ رحمت صاحب نے سمرن کی خاطر شاہدہ سے شادی کی۔ شاہدہ نے روایتی سوتیلی ماں کا سا سلوک تو روا نہیں رکھا مگر کبھی کبھی وہ اس ذمہ داری سے جھنجلا

سی جاتی تھیں۔ وہ اس کی وجہ سے خود کو قیدی محسوس کرتی تھیں۔ لیکن جب سال کے اندر ہی انوش بھی آ گئی تو انہیں احساس ہو گیا کہ ماں کا کردار نبھانا آسان ہے۔ ماں بننا بہت مشکل۔ دونوں ہی ساتھ بڑی ہوئیں۔ دونوں کی عمروں میں ڈھائی سال کا فرق تھا مگر قدبت سے یہ فرق نظر نہیں آتا تھا۔ انوش اپنی فربہ جسامت سے بڑی لگتی تھی۔ جب کہ سوکھی سڑی سمرن اس سے چھوٹی۔

ہوش سنبھالنے کے بعد سے اس نے بڑی خوش اسلوبی سے گھر کے امور اپنے ذمے لے لیے تھے۔ ایسے میں شاہدہ کو اس کے ہونے سے بہت تقویت ملتی تھی۔ محبت تو انہیں سمرن سے بھی تھی مگر انوش اپنا خون تھی سو اس کی طرف جھکاؤ قدرتی بات تھی۔

سمرن نے گریجویشن کیا تو رحمت نے اپنے دوست کے بیٹے سے رشتہ طے کرنے کا عندیہ دیا۔ لڑکے والے باقاعدہ آئے بھی مگر ان کے رشتہ پکا کرنے سے پہلے ہی لڑکے کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ سب کو بڑا جھٹکا لگا تھا۔

"تم تو بڑی منحوس ہو یار، رشتہ طے بھی نہیں ہوا تھا اور بے چارا لڑکا ہی مر گیا۔" منہ پھٹ سی انوش نے سمرن سے کہا تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ انوش جتنی منہ پھٹ اور مطلب پرست تھی' سمرن اتنی ہی فیاض اور صابر تھی۔

دونوں کو خبر تھی کہ وہ سوتیلی بہنیں ہیں انوش کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس کی ماں شاہدہ موجود تھیں۔ ہاں سمرن کو اک خلا کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ مگر قدرت سے شکوہ اس کا وطیرہ نہیں تھا۔

سمرن کی بات چل رہی تھی تو انوش کو خوشی ہوئی کہ اب اس کی فائل اوپر آجائے گی مگر لڑکے کی حادثاتی موت نے اس کے ارمانوں پہ اوس گرادی۔

اس کی سہیلی یمنیٰ کا بھائی خضر اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ وہ بھی اسے پسند کرنے لگی تھی اور اب یہ پسندیدگی اور دلچسپی محبت کا روپ دھارنے لگی تھی۔ پہلے پہل تو یہ محبت ڈھکی چھپی رہی۔ بعد میں انوش نے شاہدہ کو بھی بتا دیا کہ خضر اپنے گھر والوں کو بھیجنا چاہتا ہے۔ اسے خبر ہے کہ رحمت سمرن سے پہلے اس کا رشتہ قبول نہیں کریں گے سو بہتر ہے کہ جلد سے جلد سمرن کی بات کہیں طے کر دیں۔

"کیا رشتے' آسمان میں لٹکے ہوئے ہیں' اب وہ بے چارا مر گیا تو کیا کریں۔ بہرحال میں سمرن کو بھی کہہ دیتی ہوں تمہاری طرح سہیلی کا بھائی دیکھ لے۔" شاہدہ کو انوش کی بات بری لگی تھی۔ انہیں شاید انوش کا اعتراف محبت چبھا تھا تب ہی وہ جلی کٹی سنا گئیں۔

"مجھے نہیں پتا اماں' مجھے اس سال کے آخر میں منگنی کرنی ہے بس۔ میری ساری سہیلیاں اپنے منگیتر کے قصے سنا سنا کر مجھے احساس محرومی میں مبتلا کرتی ہیں۔" انوش ٹھنکی۔

"کون ہیں ایسی فضول سہیلیاں جو ایسی خرافات بھرتی ہیں تمہارے ذہن میں؟ تم سگی اولاد ہو' تمہاری تربیت' میں نے زیادہ جان مار کے کی مگر تم جانے کس راہ پر چل رہی ہو۔ سمرن کو ۔۔۔ دیکھو ۔۔۔ کبھی اس نے شکایت کا موقع نہیں دیا اور یہ خضر' تمہارے ابا کو کون بتائے گا کہ تم خضر سے محبت کرتی ہو اور وہ شادی کروا دیں گے۔" شاہدہ کو نئی فکر لگ گئی۔

"ہم نے پلان کیا ہے' خضر کی فیملی آئے گی تو آپ ابا کو یہ ہی کہیے گا انوش کی سہیلی ہے۔ اس کی فیملی نے خضر کے لیے انوش کو پسند کیا ہے۔ سمپل۔" وہ کل کی لڑکی شاہدہ کو پٹی پڑھا رہی تھی۔ وہ اسے گھورنے لگیں۔

پھر انوش کی سمرن سے جھڑپیں ہونے لگیں۔ کوئی رشتہ آگے نہیں دے رہا تھا اور اس کے چکر میں اسے بھی انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ اکثر انوش کی جلی کٹی کی زد میں رہتی تھی۔ اس کے روز روز کے ڈراموں سے سمرن بھی کبھی جواب دے دیتی' کبھی چپ ہو جاتی۔

"اماں' آپ میری فکر نہ کریں۔ جس دن میرا نصیب کھلنا ہو گا اس دن کھل جائے گا ۔۔۔ میرے انتظار میں آپ انوش کو نہ بٹھا کر رکھیں۔ آپ بلوالیں خضر کے گھر والوں کو' ابا کو بھی منالیں۔ کہہ دیں میں

نے کہا ہے۔" وہ انوش کی جلی کٹی سے اتنا عاجز آگئی کہ اک دن اس نے شاہدہ سے کہہ ہی دیا اور یوں شاہدہ نے رحمت صاحب کو مشکلوں سے منا ہی لیا۔

خضر کی بہن یمنیٰ یہ سنتے ہی انوش کو برا بھلا کہنے لگی کہ اس نے دوستی کی آڑ میں اس کے بھائی سے چکر چلایا۔ اور بہت کچھ.... انوش نے بھی اسے منہ بھر بھر کر باتیں سنائیں۔ پھر خضر کو رو رو کے اس کی بہن کی شکایت لگائی۔ دوستی تو ختم ہو گئی مگر خضر نے سب سنبھال لیا۔ یوں وہ لوگ جو پہلے ان کے گھر دوست کی حیثیت سے خوش ہو کر آ رہے تھے۔ رشتہ لے کر منہ بنا کر آئے۔

"بھاڑ میں جائیں وہ لوگ۔ مجھے ان سے کیا لینا دینا۔ مجھے خضر سے مطلب ہے۔ وہ تو میری سن رہا ہے نا!" شاہدہ کے سمجھانے پہ انوش نے ہٹ دھرمی سے انہیں بھی چپ کروا دیا۔

اسے خضر پہ بہت گھمنڈ تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھتا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے موقع پہ تحفے بھجواتا تھا۔ چند ماہ رشتہ رہنے کے بعد سب کو شادی کی تاریخ کی پڑ گئی۔ جس میں سب سے بڑا ہاتھ انوش کا تھا۔ رشتہ طے ہونے کے بعد بھی رحمت صاحب کو امید تھی کہ سمرن کا بھی اچھا رشتہ آجائے گا۔ وہ دونوں بیٹیوں کی شادی ساتھ کر دیں گے مگر انتظار انتظار ہی رہا۔

"جانے تم کیسا منحوس نصیب لکھوا کر لائی ہو۔ پیدا ہونے کے بعد ماں کو کھا گئیں۔ رشتے کی بات جس سے چلی اس لڑکے کو کھا گئیں اور اب بیٹھی میری خوشیوں کو کھا رہی ہو۔ تمہاری وجہ سے میری شادی کی تاریخ طے نہیں ہو رہی۔" انوش راشن پانی لے کر اس پہ چڑھ دوڑی۔ اور اس بار پھر اس نے شاہدہ کو رحمت صاحب کو منانے کا ٹاسک دے دیا۔ اور یوں رات منگنی کے ساتھ شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ پھر تو جیسے انوش کے پیر زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔

ایک دن سمرن کا رشتہ آگیا۔ شاہدہ نے بھی سکون کا سانس لیا کہ سمرن کا برا نہ چاہنے کے باوجود وہ بری بن رہی تھیں کہ سوتیلی ماں نے بڑی بیٹی کے بجائے اپنی بیٹی کی شادی طے کر دی۔

رشتہ مناسب تھا۔ سو طے کر دیا گیا۔ سمرن پہلے کب بولتی تھی جواب بولتی۔ عام سے لوگ، عام سا گھر اور اس کی معمولی تنخواہ پہ بھی اس نے کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ اس کے والدین کو منظور تھا۔

"اے بہن! تم کیسے اتنے کم میں گزارا کرو گی۔ اوپر سے پورا ٹبر ساتھ ہے۔ خضر کو دیکھو پہلے چند ہزار کماتا تھا۔ مگر میرے نصیب سے اسے دوسری نوکری مل گئی۔ رینٹ کی کار بھی چلا رہا ہے۔ مل ملا کر چالیس، پچاس ہزار ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا دماغ تھا جو وہ اتنا زیادہ کمانے لگا۔" انوش اپنی کارگزاری بتا کر داد پانے کے ساتھ اسے نیچا دکھا گئی۔

"میرا نصیب بھی دیکھ لیں گے۔" اس نے مسکرا کر بات آئی گئی کرنا چاہی۔

وہ چپ ہو گئی تھی مگر جب کبھی انوش، خضر کی باتیں، اس کے لائے تحفے اور کبھی کبھی اپنی اور خضر کی سنسر کی ہوئی گفتگو اس سے شیئر کرتی تو اسے خالی پن کا احساس ستانے لگتا۔ گو کہ رشتہ طے ہو گیا تھا مگر اب تک انس نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ فیملی بھی کچھ لیے دیے رہتی تھی۔ کوئی فون نہیں، کوئی آنا جانا نہیں۔ بلکہ اکثر تو انوش لاوارث رشتہ کہہ کر مذاق اڑاتی تھی۔ دھڑکا تو اسے بھی لگتا تھا مگر وہ سب نصیب پہ چھوڑ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ انوش کے مایوں کا دن آگیا تھا۔

رحمت صاحب نے چاہا تھا کہ سمرن کی شادی بھی اسی تاریخ کو ہو جائے مگر انس کی فیملی چند ماہ بعد کا ارادہ رکھتی تھی۔ رحمت صاحب نے چاہا تھا انوش کی شادی چند ماہ بعد ہو جائے مگر اس پہ انوش نے وہ ہنگامہ کیا کہ الامان الحفیظ۔

"نہ کیا گارنٹی ہے کہ میں شادی ڈیلے کروں تو تمہاری انس سے ہی شادی ہو گی۔ اگر جو عین شادی کے دن انس مر گیا.... تب میرا انتظار کرنا تو بے کار گیا نا۔"

✡ ✡ ✡

شادی کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ جب

سمرن نے بے حد دکھ سے اس کی باتیں سنی تھیں۔ کس قدر احساس و جذبات سے بے نیاز ہو کر وہ کہہ جاتی تھی۔

"تمہاری شادی فکس ڈیٹ پہ ہی ہوگی فکر نہ کرو۔ میں جلدی شادی کے لیے مر نہیں رہی۔" سمرن نے اک جتاتی نگاہ اس پہ ڈالی تھی۔ اور اس کے زور دینے پہ رحمت نے دونوں کی شادی ساتھ کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ یوں انوش اپنی سسرال سدھار گئی۔ اور سمرن کو بھی سکون نصیب ہوا کہ ہر وقت کے طعنے تشنوں سے تو نجات ملی تھی۔

آئے دن انوش، خضر کے ساتھ کبھی دن تو کبھی رات کو منہ اٹھا کر آجاتی اور وہ ان کی خدمت کرتی۔ ان کے لیے دعوتی کھانے پکاتی۔ بڑی ہو کر محروم ہونے کے باوجود اس کی خوشیوں سے نہ جلتی۔ انوش شادی کے بعد مزید نسخی خوری ہوگئی تھی۔

وہ چھوٹی سے چھوٹی بات، تحفے کو بھی بڑا کر کے دکھاتی تھی۔ وہ دن بھی آگیا جب سمرن کو رخصت ہونا پڑا۔ صحیح معنوں میں شاہدہ کو دن میں تارے نظر آگئے۔

چند ماہ پہلے انوش رخصت ہوئی تو انہیں کچھ فرق نہیں پڑا۔ مگر سمرن کے بعد تو جیسے پورا گھر ان پہ آرہا تھا۔ پہلے وہ سر درد کا کہہ کر دوپٹا لپیٹے پڑی رہتی تھیں۔ اور وہ سارے کام کر کے ان کے پاس آکر ان کا سر بھی دبا جاتی تھی۔ اب تو سر درد کے ساتھ ہی سارے کام خود کرنے ہوتے تھے۔

☆ ☆ ☆

انوش کو منگنی اور شادی کی بے حد جلدی تھی جس کے لیے اس نے چند ماہ انتظار کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ وہ سوچ رہی تھی، خضر ویسا ہی ہے جیسا وہ نظر آتا ہے لیکن بہت جلد اس پہ کھلنے لگا کہ محبوب اور شوہر میں کیا فرق ہے۔

خضر شوہر بن کر روایتی رنگ میں رنگ گیا تھا۔ وہی خضر جو پہلے اس کی باتیں، اس کے غصے میں کہی بات ہنس کر سنتا تھا۔ اب اس کی ذرا سی اونچی آواز برداشت نہیں کرتا تھا۔ وہ جس محبت بھری باتوں، تحفوں کی نمائش کرتی تھی۔ اب خضر کو تحفہ دینا بھی پیسے کا زیاں لگتا تھا۔ وہ گلہ کرتی تو جواب میں اس کے منہ سے انوش کے لیے صرف گالیاں نکلتی تھیں۔ اس کی ماں، بہنیں، باپ اسے جلدی شادی کرنے پہ باتیں سناتے تھے اور وہ اپنی ساری فرسٹریشن انوش پہ انڈیل دیتا تھا۔

"تم بہت خود غرض ہو انوش بیگم، کیا تھا جو تم چند سال انتظار کر لیتیں۔۔۔ تب تمہاری بہن کی بھی شادی ہو جاتی اور میں بھی اپنی بہنوں سے فارغ ہو جاتا۔ کتنا سمجھایا تھا تمہیں مگر تمہیں تو بلاوجہ کی جلدی تھی۔ بری کی ساری چیزیں تمہاری پسند کی خرید کر کنگال ہو گیا ہوں۔ کہاں سے لاؤں بہن کی شادی کے لیے پیسے نئی نوکری بھی چھوٹ گئی ہے۔ دوبارہ سے اسی چند ہزار والی نوکری پہ آگیا ہوں۔

تمہاری باتوں میں آکر میں نے اپنی ماں، بہنوں کے دل دکھائے۔ انہیں برا بھلا کہا آج احساس ہو رہا ہے کہ بیوی پانے کے چکر میں، میں نے کیا کیا کھو دیا۔" خضر تنفر سے کہہ رہا تھا۔ محبت لٹاتی نظروں میں حقارت لیے کھڑا تھا۔ انوش کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔

اسے تو لگا تھا۔ وہ شادی کر کے جیت گئی ہے۔ محبوب شوہر پا کر شانت ہوگئی ہے مگر کل جب سمرن اور انس کو اس نے خوش باش محبت بھرے انداز میں دیکھا تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"محبت اور بیوی سے!" خضر نے چند ماہ پہلے تمسخر اڑایا تھا۔

"جب تک محبوبہ تھیں تب تک اٹریکشن تھی، اب تو بے زاری ہوتی ہے تم سے۔"

انوش کو اس کی جلد بازی کا صلہ مل گیا تھا۔ اس نے سسرال میں عزت نہیں بنائی تھی۔ اس نے سب کچھ جلدی جلدی پانا چاہا تھا۔ اور نام نہاد محبت بھری شادی کے آفٹر شاکس اب اسے ساری زندگی برداشت کرنے تھے۔

☆

یہ جو ریگ دشت فراق ہے

نادیہ احمد

موسم کی پہلی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ تاحد نگاہ سفیدی کا راج تھا۔ روئی کے نرم گالوں سی سفید برف کا لبادہ اوڑھے ہر شے اداس نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف لگے خزاں رسیدہ درختوں کی شاخیں برف سے ڈھکی تھیں۔ سڑکیں اچانک برف کا میدان ہو گئی تھیں۔ گھروں کے دروازوں کے سامنے بھی برف کے ڈھیر لگے تھے۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے سر ٹکائے وہ سڑک پہ دوڑتی گاڑیوں کو غائب دماغی سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا زندگی یوں ہی گزرے گی؟ ان چاہی..... بے مول۔" چند گھنٹے پہلے کی باتیں دل کے زخموں کو مزید ہرا کر گئی تھیں۔ آنکھوں سے گرے آنسوؤں کی بوندیں رخساروں کو تر کرنے لگیں۔

"بوجھ".... وہ زیر لب بڑبڑائی۔ یہ لفظ نشتر کی طرح دل کو چھلنی کر رہا تھا۔ روتے روتے ایک بار پھر اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دودھیا چہرے پہ بکھری چند سنہری لٹوں کو اپنی مخروطی انگلیوں سے پرے ہٹاتے ہوئے وہ اس دکان میں موجود ہر شخص کی توجہ کا مرکز تھی۔ سیاہ ڈیزائنر ٹاپ اور نیلی ڈینم جینز میں اس کا خوب صورت سراپا بہت سوں کو گھائل کر رہا تھا۔ اس کے میک اپ سے لے کر پاؤں میں پہنے ہیل والے لانگ شوز تک ہر شے قابل ستائش تھی۔ وہ سر تا پا پرفیکٹ تھی۔ وہ اگر خوب صورت تھی' جاذب نظر تھی تو اس کا اسٹائل اس پہ چار چاند لگا رہا تھا اور وہ اس سے غافل ہر گز نہیں

مکمل ناول

تھی۔

"کیا خیال ہے تمہارا' یہ کچھ مناسب لگ رہی ہے؟" اپنا سفید نازک ہاتھ پھیلائے' اس پہ ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے' یہ سوال اس سے کم اور خود سے زیادہ کیا گیا تھا۔

"مجھے تو وہ پہلی دس انگوٹھیاں بھی پسند تھیں جنہیں پچھلی چار دکانوں پہ تم ریجیکٹ کر چکی ہو۔" وہ اپنی بے زاری چاہ کر بھی چھپا نہیں پایا تھا۔

"تم جانتے ہو' میں کسی معمولی چیز پہ سمجھوتا نہیں کرتی اور پھر یہ تو ہماری منگنی کی انگوٹھی ہے۔ مجھے سب سے بہترین کا انتخاب کرنا ہے۔" کارٹیئو Cartier کی شاپ میں بیٹھے اس نے اپنے کندھوں تک آتے تراشیدہ بالوں کو ایک ادا سے جھٹکتے' لاپروائی سے کہا۔ اس کا انتخاب لاجواب ہوتا تھا۔ اس بات کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ جس شخص کے ساتھ اس نے زندگی بتانے کا فیصلہ کیا تھا وہ بے مثال تھا۔ گورا رنگ اور کشادہ پیشانی' ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو۔۔۔ سیاہ گہری آنکھوں میں بلا کی چمک لیے وہ جینز اور ٹی شرٹ میں بھی انتہائی پر کشش دکھ رہا تھا۔

"تو پھر یہ فائنل ہے نا۔" اس سے پہلے کہ اس کا ارادہ بدلتا وہ جلد سے جلد اس پریڈ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آج کا دن فقط ایک منگنی کی انگوٹھی خریدنے کی نذر ہو چکا تھا۔ ٹیفنی (Tiffany) اور ٹیکوری (Tacori) جیسی بہترین دکانوں سے کئی اینگیجمنٹ رنگز کو ناپسند کرنے کے بعد اب جا کر اسے ایک انگوٹھی اپنے لیے مناسب لگی تھی۔ یہ اس کے ساتھ شاپنگ کا پہلا تجربہ تھا اور وہ پہلی بار میں ہی بوکھلا گیا تھا۔

اس کی جلد بازی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اب مخمل کے کیس میں موجود چند دوسری انگوٹھیوں کو جانچ رہی تھی۔

"میں پے منٹ کرنے لگا ہوں۔" وہ سنجیدہ مگر نرم لہجے میں بولا۔ اس کے انداز کو بھرپور انجوائے کرتے ہوئے اس ماہ رخ نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"اتنی جلدی گھبرا گئے ہو مجھ سے۔" اپنے بہت پاس اس کی شرارت بھری سرگوشی سنی۔

"تم سے نہیں تمہاری شاپنگ سے۔" وہ اسی کے انداز میں بولا۔ اپنے والٹ سے کارڈ نکال کر اس نے سیلزمین کی طرف بڑھایا۔ اس کی بات کو انجوائے کرتی وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"ڈنر پہ چلیں؟" اپنے سلکی بالوں میں انگلیاں چلاتے وہ اب اس کی طرف متوجہ تھی۔

"آج تمہاری کسی بات کو انکار نہ کرنے کا عہد کیا ہے میں نے۔" کرسی کی پشت سے اپنا گرم کوٹ اٹھاتے ہوئے وہ مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں خوشیوں کے چراغ ٹمٹمانے لگے۔ یہ چراغ کیونکر نہ ٹمٹماتے کہ کوئی چاند کی خواہش کرے اور وہ اس کے دامن میں آگرے تو خوشی بن کے آنکھوں سے چھلکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

پورے کمرے میں سرخ گلابوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی آرائش بھی اس کے روپ کی طرح سادہ تھی لیکن اس سادگی میں بھی اس کا حسن بے مثال دل کی دھڑکن کو بڑھاتا، آتش شوق کو بھڑکا رہا تھا۔ کمرے میں اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے اس کے اپنے دل کی حالت بھی غیر تھی۔ نازک ہاتھ پہ اپنے شریک حیات کے لمس کی گرمی سے اس کے اندر اتھل پتھل ہوئی تھی۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہمیں آج کتنا خوش ہوں۔ یوں جیسے زندگی کی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل ہوئی ہے۔" اس نے گھنی پلکیں اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔

"تم نہیں جانتیں، تم کتنی قیمتی اور انمول ہو میرے لیے۔ میں نے چاند کو پانے کا خواب دیکھا تھا اور آج چاند میرے روبرو ہے۔ مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب اور کون ہوگا۔" اس کے لہجے کی وارفتگی پہ اپنا آپ سمیٹتی وہ اس پل شرم سے لال ہو رہی تھی۔

"چاہتا تو یہ تھا آج اس حسین رات کو یادگار بنانے کے لیے تمہیں کوئی بیش قیمت نذرانہ دوں، لیکن ....." بہت چاہت اور محبت سے اس کی طرف سرخ گلاب کا پھول بڑھاتے اس کے ہاتھ تھم گئے۔ وہ اچانک افسردہ ہوا تھا۔

"آپ کا ساتھ ہفت اقلیم کی دولت سے کم نہیں میرے لیے۔ من چاہا ہم سفر ساتھ ہو تو زندگی خود بخود حسین لگنے لگتی ہے۔ کاش کہ میں لفظوں میں اپنی خوشی بیان کر پاتی جو آپ کو پا کر مجھے میسر آئی ہے۔" اس کے ہاتھ سے وہ سرخ گلاب لے کر، نامکمل بات کے جواب میں وہ بہت محبت سے بولی۔ ایک دوسرے کا ساتھ پا لینے کی خوشی بے پناہ تھی۔ پر دلوں میں اداسی بھی ایک طرفہ نہ تھی۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے اور ایک دوسرے کو پانے کے لیے ان دونوں نے بہت کچھ کھویا تھا۔

"تم سے وعدہ کرتا ہوں رباب! میں تمہیں اس دنیا کی ہر خوشی اور آسائش دینے کی کوشش کروں گا۔ تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے اسے یقین دلایا۔

"آپ میرے ساتھ ہیں زین! تو راہ میں بھلے لاکھ دشواریاں آئیں۔ آپ پہ پورا بھروسا ہے۔ جانتی ہوں آپ کبھی کسی دکھ کو مجھ تک پہنچنے نہیں دیں گے۔" مسکراتے ہوئے اس نے اپنے سامنے بیٹھے اس خوبرو شخص کو دیکھا کہ جس کا دل فقط اس کے لیے دھڑکتا تھا۔ دونوں کچھ اس طرح محبت کے حصار میں جکڑے تھے کہ راستے میں آئی کسی بھی رکاوٹ کی پروا کیے بغیر دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ چنا۔ محبت ہر آزمائش سے ٹکرا جاتی ہے۔ ہر مخالفت کا مقابلہ کر لیتی ہے۔ ان دونوں نے بھی اپنے حصے میں آئی آزمائش سے محبت کو ہارنے نہیں دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

زنیرہ بیگم لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی پہ کوئی پروگرام دیکھ رہی تھیں۔ وہ انہیں سلام کرتا اندر داخل ہوا۔ بیٹے کو

دیکھ کر محبت بھری مسکان نے ان کے چہرے کا احاطہ کیا۔

"کھانا لگواؤں۔" وہ شیریں لہجے میں بولیں۔

"نہیں ممی! میں ڈنر کر چکا ہوں۔" اپنا کوٹ اتار کر اس نے صوفے پر پھینکا اور تھکے تھکے انداز میں ان کے پاس ہی ڈھیر ہو گیا۔ زنیرہ بیگم نے ٹی وی کی آواز آہستہ کی اور ریموٹ کنٹرول واپس میز پہ رکھتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جو اب آنکھیں موندے ریلیکس پوزیشن میں پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔

"کیسا گزرا آج کا دن؟" اس کو خاموش دیکھ کر بات کا آغاز انہوں نے خود کیا۔

"ٹھیک۔" جواب مختصر آیا۔

"کیا بات ہے 'اتنے چپ چپ کیوں ہو؟ کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے۔" وہ اس کے خلاف معمول انداز اور خاموشی سے کچھ گھبرا گئی تھیں۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں' میں جھگڑا کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" آنکھیں موندے اسی پوزیشن میں صوفے پہ دھنسے مدھم آواز میں کہا گیا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے میرا بیٹا بہت سمجھ دار اور بہت ضبط والا ہے۔ لیکن پتا تو چلے' کس بات پہ اپ سیٹ ہو؟" اس کے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے انہوں نے اس پہ اپنی محبت نچھاور کی۔

"ممی! آپ کو نہیں لگتا آپ سے فیصلہ کرنے میں کوئی جلد بازی ہو گئی ہے؟" وہ ان کی طرف گھوما تھا۔ چہرے پہ الجھن سے بڑھ کر ناگواری جھلک رہی تھی۔ زنیرہ بیگم نے ایک گہرا سانس لیا۔ تو ان کا اندیشہ درست تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکی کے باہر لان کی سبز گھاس سنگ مرمری سفید ہو گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے موسم کی ایسی جھلک دیکھی تھی۔ یہ اس کے لیے نیا تجربہ تھا لیکن عجیب بات تھی کہ یہ سب دیکھ کر اسے کوئی خوشی یا جوش و خروش محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

جب کبھی اسے اخبار یا ٹی وی کے ذریعے شمالی علاقہ جات میں ہونے والی برف باری کی خبر ملتی یا وہ ایسی کوئی تصویر دیکھتی تو اس کا دل بے تحاشا مچل جاتا تھا۔ بھلے زبان سے نہیں کہتی تھی مگر ان مقامات کی سیر کرنے کا ضرور سوچتی تھی۔ خیالوں میں برف کے گولے بنا کر

ہوا میں اچھالتی اور خوش ہوتی تھی مگر حیرت تھی کہ پچھلے دو گھنٹوں میں ایک بار بھی اس کے دل میں اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ باہر جا کر اتنا ہی دیکھ لے کہ یہ برف چھونے سے کیسی لگتی ہے۔ کیوں اس کے احساسات منجمد ہو گئے تھے۔ اپنے چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی سے سامنے گرتی برف کو دیکھتے ہوئے اندر کی اداسی اور تنہائی مزید بڑھ گئی تھی۔ کمرے میں سینٹرل ہیٹنگ سسٹم چل رہا تھا' بڑھتا ہوا درجہ حرارت تھا یا اس کے اندر کی بے سکونی' اچانک اسے لگا جیسے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے۔ کمرے میں گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ یک دم اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ برفانی سرد ہوا کا جھونکا گالوں سے ٹکرا کر انہیں برف کر گیا۔ کمرے کی گرمائش دم توڑنے لگی اور یخ بستہ ہواؤں نے کمرے کو لمحہ بھر میں سرد کر دیا۔ برفیلی ہوا میں گہرے سانس لیتے وہ خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہی تھی۔

"اگر سوگ پورا ہو چکا ہو تو کمرے سے نکل آؤ مہارانی۔" سدرہ کی چنگھاڑتی ہوئی آواز پہ وہ یک دم ہوش میں آئی تھی۔

"یہ تمہارے باوا کا گھر نہیں جہاں مفت میں روٹیاں توڑو گی۔ باہر نکلو صبح سے سب کام ایسے ہی پڑا ہے۔"

یخ بستہ ہتھیلیوں سے کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے اسے سردی کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے دونوں ہاتھ پتھر کے ہو چکے ہیں۔ اس نے ہاتھوں کو رگڑ کر گرم کرنے کی کوشش کی اور دوپٹے کے پلو سے ناک اور آنکھیں پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

برف گرنے کے حسین منظر کا دورانیہ ختم ہو چکا تھا اور اب ہر طرف اس کی صفائی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سڑکوں اور گزرگاہوں کی صفائی ہو رہی تھی۔ لوگ اپنے گھروں کے داخلی دروازوں کو بیلچے کی مدد سے صاف کر رہے تھے۔ سردی اتنی شدید تھی کہ ہڈیوں میں گھس رہی تھی۔ ناکافی گرم کپڑوں میں اپنے ٹھٹھرتے وجود کو ہلکی سی گرم شال سے چھپائے وہ شدید سردی میں ——— سرد ہاتھوں سے بیلچہ تھامے ڈرائیو وے اور داخلی دروازے کی سیڑھیوں پہ گرتی برف صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب سے وہ آئی تھی گھر کی صفائی اور کچن کا سب کام سدرہ نے اسی کو سونپ دیا تھا۔ برف صاف کرنا اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ دن بھر کے کاموں سے چور بدن اس پہ ناکافی گرم لباس پہنے وہ سردی میں سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔

"ایک تو ہر کام رو رو کر کرتی ہو تم۔ بہت سست ہو بھئی۔" سدرہ ممانی نے دروازے کی اوٹ سے آواز لگائی۔ وہ جو لحہ بھر کو کمر سیدھی کرنے کھڑی ہوئی تھی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ گھر کے اندر کھڑی وہ اسے جلد کام ختم کرنے کی تاکید کرتے گھور رہی تھیں۔

"ممانی؟ بس دو منٹ میں ہو جائے گا۔" ہاتھوں کی جلد سردی سے نیلی ہو رہی تھی کہ بیلچہ پکڑنا بھی محال تھا مگر اس نے اپنی ساری قوت جمع کرتے ہوئے ایک بار پھر تیزی سے برف کھرچنا شروع کر دی۔

"سب سمجھتی ہوں تمہاری چالاکیاں بی بی' سوچ رہی ہو گی ماموں کے آنے تک کام کو کھینچتی رہوں تاکہ وہ آکر اپنی بھانجی پہ ظلم کرنے کے جرم میں مجھ پہ چلائیں۔ ورنہ یہ ذرا سا کام کرنے میں کون سے کئی گھنٹے لگتے ہیں۔"

وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے اپنا کام کرتی رہی۔ جانتی تھی اس کے کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بولا وہاں جاتا ہے جہاں کوئی سننے اور سدرہ ممانی بولتے ہوئے کسی کی نہیں سنتی تھیں۔ اگلے دس منٹ میں اپنا پورا زور لگا کر اس نے ڈرائیو وے اور سیڑھیاں صاف کر ہی دی تھیں۔ چہرے اور ہاتھوں کی رنگت سخت سردی سے نیلی ہو رہی تھی۔ چہرے پہ سوئیاں چبھ رہی تھیں اور کانوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اپنی شال کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے وہ جلدی سے گھر کے اندر چلی گئی۔

"ایک تو تم ہمارے اوپر مسلط کر دی گئی ہو اس پہ یہ ناز نخرے اور رونے کے ڈرامے مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔ یاد رکھو یہ میرا گھر ہے اور اگر اس گھر میں رہنا ہے تو میرے مطابق رہنا ہو گا۔" دروازہ بند کر کے وہ جلدی سے ہیٹنگ سسٹم کے پاس چلی آئی تھی۔ گرم ہوا ہاتھوں اور چہرے کی جلد سے ٹکرائی تو زندگی کا احساس بحال ہوا تھا۔ اسی وقت سدرہ ممانی کا لیکچر دوبارہ شروع ہو گیا۔

"میں کوشش کروں گی آپ کو مجھ سے شکایت نہ ہو۔" وہ آنسو پیتے ہوئے سر جھکائے کھڑی تھی۔

"شکایت تو اپنے مقدر سے ہے جو یوں اچانک ہمارے گلے آپڑی ہو۔ اب جاؤ یہاں سے میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔" صوفے پہ بیٹھ کر ریموٹ سے ٹی وی آن کرتے ہوئے وہ جھڑک کر بولیں۔ وہ ایک لمحے میں وہاں سے نکلی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آنسو جو بہنے کو بے تاب تھے کمرے میں آتے ہی پلکوں کے بند توڑ چکے تھے۔ بیڈ پہ سر ٹکائے وہ کارپٹ پہ بیٹھی مسلسل رو رہی تھی۔ جب رو کر دل ہلکا کر لیا تو کچھ سوچتے ہوئے اٹھی اور اپنی ٹیبل کی دراز سے ایک ڈائری نکال کر دیکھنے لگی۔ یہ ڈائری اس کا کل اثاثہ تھی۔

دھیرے دھیرے صفحات پلٹتے ہوئے وہ ایک صفحے پر آکر ٹھہر گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے اس میں رکھی تصاویر کو اٹھایا۔ وہ ان کو سینکڑوں بار دیکھی ہوئی تصویروں کو ایک بار پھر دیکھ رہی تھی اور ہر بار کی طرح دل کی وہی کیفیت تھی۔ بدن درد سے ٹوٹ رہا تھا اور اب تو ہلکا ہلکا بخار بھی ہو رہا تھا روتے روتے کب آنکھ لگ گئی اسے پتا بھی نہیں چلا۔

☆ ☆ ☆

تھکے تھکے قدموں سے چلتا وہ گھر میں داخل ہوا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پہ چونک کر وہ کمرے سے باہر نکلی اور اسے دیکھ کر ایک خوب صورت سی مسکراہٹ ہونٹوں پہ در آئی۔ تیز قدموں سے صحن عبور کرتی وہ اس کے پاس چلی آئی تھی۔

"آپ آگئے میں کب سے آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔" رباب کی آواز میں جتنا جوش تھا اس کے برخلاف وہ اتنا ہی خاموش تھا۔ چہرے پہ تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ بلا کی بے زاری تھی۔ کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ اب گھر کے اندر جا رہا تھا۔

"پانی۔" بیڈ پہ بیٹھا وہ اپنے جوتے اتار رہا تھا۔ اسی وقت وہ جلدی سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آئی۔ اس نے جوتے اتار کر ٹائلوں کے فرش پر پھینکے اور خاموشی سے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے پکڑ کر ایک گھونٹ میں پی لیا۔ وہ پاس کھڑی محبت سے دیکھتی رہی۔ یک دم نگاہ اس کے جوتوں پہ گئی اور رباب کا دل بھر آیا۔ یہ جوتے کئی ماہ پرانے تھے اور بے تحاشہ پیدل چلنے کے باعث اب بری طرح گھس چکے تھے۔

"یہ شخص کیا سے کیا ہو گیا۔" اس کو تاسف نے آگھیرا تھا۔

"کہیں بات بنی؟" وہ فرش پہ اس کے بالکل سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے زین نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ ان شاء اللہ جلد کوئی سلسلہ بن جائے گا۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔" زین کا ہاتھ رباب کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی تسلی کے جواب میں وہ ایک لفظ نہیں بول پایا اور بے بسی سے لب بھینچ لیے۔

"کھانا لاتی ہوں مجھے پتا ہے آپ صبح سے بھوکے ہیں۔" وہ مزید وہاں رکتی تو اپنے آنسو سنبھال نہیں پاتی۔ اس لیے جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ باورچی خانے میں آکر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نہ جانے کتنے پل یوں ہی آنسو بہاتے گزرے کہ اپنے پیچھے کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ وہ بنا مڑے بھی اس وجود سے اٹھتی بھینی بھینی مہک سے واقف تھی۔

"آپ کیوں آگئے یہاں؟ آرام کرتے، میں بس لا رہی تھی کھانا۔" تیزی سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے دیگچی کو چولہے پہ رکھا۔

"رباب۔" زین نے شانوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی سمت موڑا۔ رونے سے اس کی ناک اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"مجھے تسلی دیتی ہو اور خود یوں رو رہی ہو۔" وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ پھول سا شاداب چہرہ ان چند مہینوں میں کملا گیا تھا۔ زین کے دل کی اداسی کچھ اور بڑھی تھی۔

"میری وجہ سے آپ کیا سے کیا ہو گئے زین۔ کہاں وہ محل سا گھر اور کہاں یہ معمولی مکان۔" رکے ہوئے آنسو ایک بار پھر بہہ نکلے تھے۔

"عالی شان گاڑیوں کا شوقین آج سڑکوں پہ پیدل دھکے کھاتا ہے اس کے جوتوں کے تلوے گھس گئے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میرا دل کلستا ہے۔" دل کو یہ ملال تو ہر لمحہ گھیرے ہوئے تھا لیکن آج وہ خود کو یہ سب کہنے سے روک نہیں پائی تھی۔

"یہ ضیاع فقط میرے حصے میں ہی تو نہیں آیا رباب، تم نے بھی تو اپنا سب کچھ چھوڑ کر میری محبت کو ترجیح دی۔" انگلی کی پوروں پہ نرمی سے اس کے آنسو سمیٹتے وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"وقت ایک سا نہیں رہتا، کل جو تھا آج نہیں۔ جو آج ہے وہ بھی کل نہیں رہے گا۔ تم میری ہمت ہو روبی، تمہارے آنسو مجھے توڑ دیں گے۔" شکستہ لہجے میں بے بسی کی جھلک تھی۔

"میرے حصے میں کوئی ضیاع نہیں آیا۔ میرے پاس آپ ہیں، آپ کا ساتھ ہے، آپ کی محبت ہے اور یہ دولت کوئی نہیں چھین سکتا مجھ سے۔" وہ اسے تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ہمت تھے، انہیں ایک دوسرے کو کمزور نہیں کرنا تھا۔

"زندگی کا مقصد فقط مہنگے کپڑے اور زیورات تو نہیں ہیں نا۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں کہ میں نے ایک آسائش بھری زندگی کو چھوڑ کر آپ سے شادی کی ہے اور آپ بھی یہ سب مت سوچیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں زین اب کبھی آپ کو پریشان نہیں کروں گی' کبھی نہیں روؤں گی۔ ہم دونوں ہمت سے اچھے دنوں کا انتظار کریں گے۔" اس کے کشادہ سینے میں منہ دیے وہ اب مطمئن تھی۔

"بہت بھوک لگی ہے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" زین کے کہنے پر رباب نے دھیرے سے سر اٹھایا۔

"اوہ' میں تو بھول ہی گئی۔ آپ چلیں میں بس کھانا لا رہی ہوں۔" مسکراتا ہوا زین باورچی خانے سے نکل گیا اور وہ جلدی جلدی سالن پلیٹ میں نکالنے لگی۔

☆ ☆ ☆

زینب گھر پہنچی تو وہ اپنی اسٹڈی کی طرف جا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر وہیں ٹھہر گئے۔ وہ بے تکلفی سے ان کی طرف بڑھی اور بے ساختہ ان سے لپٹ گئی۔

"ڈیڈ۔" بہت محبت سے انہوں نے اس کے ماتھے پہ بوسا دیا۔

"بہت خوش لگ رہی ہو۔ لگتا ہے آج کا دن خوب انجوائے کیا ہے؟" زینب کی مسکراہٹ پہ ان کا اپنا وجود کھل جاتا تھا۔

"یس ڈیڈی.... بہت۔"

"پھر تو آج کا دن میرے لیے بھی شاندار ہوا کیونکہ میری بیٹی جو خوش ہے۔" اس میں ان کی جان تھی۔ وہ ان کی لاڈلی اکلوتی اولاد تھی جسے انہوں نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔

"آپ کو پتا ہے کہ آپ دنیا کے بہترین ڈیڈ ہیں۔" ان کے سینے پہ سر ٹکائے وہ لاڈ سے بولی۔

"زندگی میں جو بھی میں نے چاہا۔ آپ نے اسے میری جھولی میں ڈال دیا اور سب سے بڑھ کر حذیفہ۔ سچ بتاؤں تو میں اس وقت خود کو آسمان پہ اڑتا ہوا محسوس کرتی ہوں۔ تھینک یو ویری مچ ڈیڈ۔"

وہ ایسی ہی تھی اپنا ہر جذبہ' ہر احساس باآسانی کہہ دینے والی۔ اپنی پسند ناپسند جتا دینے والی۔ محبت ہو یا نفرت۔ وہ ان دونوں جذبوں میں شدت پسندی کی قائل تھی۔

"تمہاری ایک مسکراہٹ کے لیے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں میری جان۔ میرا ماننا ہے کہ اولاد کو ان کے شریک حیات کے انتخاب کا حق ہونا چاہیے والدین کو اولاد پہ اپنی مرضی زبردستی مسلط کر کے ان سے ان کی خوشیاں ہرگز نہیں چھیننی چاہئیں۔ اور حذیفہ تو مجھے بھی بہت پسند ہے۔" اس کا سر تھپتھپاتے انہوں نے محبت سے اسے خود سے الگ کیا۔ وہ ان کی بیٹی نہیں ان کی کل کائنات تھی۔ اس بھری دنیا میں ان کا واحد رشتہ جسے وہ اپنی جان سے بڑھ کر چاہتے تھے اور اس کی خوشی کی خاطر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اس کے چہرے پہ اداسی کی ہلکی سی پرچھائی دیکھنا بھی انہیں قابل قبول نہ تھا۔

"ہی از دا بیسٹ!"

ان کے لہجے میں پسندیدگی سے زیادہ محبت تھی۔ زینب کے لیے ان کے خیال میں حذیفہ سے بڑھ کر کوئی شخص بہترین لائف پارٹنر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پھر جب یہ خود زینی کی پسند تھی۔

"رات کافی ہو گئی ہے' میرا خیال ہے اب تمہیں سونا چاہیے۔" اسے شب بخیر کہہ کر وہ خود اسٹڈی کی طرف بڑھے۔

"آپ کو بھی سونا چاہیے' رات گئے تک کام کرتے رہتے ہیں' آپ کی صحت خراب ہو جائے گی ڈیڈ۔" زینب نے پیچھے سے آواز لگائی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ وہ اسے کیا بتاتے کہ کام کا تو محض بہانا ہے' یہ رت جگے تو ان کی زندگی کا حصہ ہیں جو قدرت نے ان کے مقدر میں لکھ دیے ہیں۔

☆ ☆ ☆

اس دنیا میں وہ اگر کسی سے نزدیک تھا' اپنے دل کی بات آسانی سے کہہ دیتا تھا تو وہ فقط اس کے پاپا تھے۔ اس کے ڈیڈی ذوالفقار حسین اس کے آئیڈیل تھے۔ وہ ایک بے حد شفیق باپ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک

محبت کرنے والے شوہر تھے۔ اس نے یہ بردباری اور صلح جوئی ان ہی سے سیکھی تھی۔ اس نے کبھی اپنے والدین کو جھگڑتے' ایک دوسرے پہ چلاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ امریکہ میں ایک بہت اعلا عہدے پہ فائز تھے مگر اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اپنے بیوی اور بیٹے کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ اس کی تعلیمی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ان کا بھرپور تعاون ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کے چھوٹے چھوٹے مسائل پہ بات چیت کرتے اور ان کا مناسب حل بتاتے۔ پھر جب ایک حادثے میں ان کا انتقال ہوا تو یہ واقعہ ان دونوں کو یکساں توڑ گیا تھا۔ زنیرہ بیگم کا غم اپنی جگہ لیکن وہ تو جیسے اپنی خود اعتمادی' اپنی ذہانت سب گنوا بیٹھا تھا۔ ان دنوں وہ بہت چپ رہنے لگا تھا۔ تعلیم میں اس کا دھیان دن بہ دن کم ہوتا جارہا تھا۔ زنیرہ تو خود غم سے نڈھال تھیں کہ ایسا چاہنے والا شریک حیات جدا ہو گیا۔ اتنے برسوں کی رفاقت ایک پل میں ختم ہو گئی لیکن اپنی اولاد کی خاطر اپنا غم بھلا کر انہوں نے اسے سنبھالا۔ اس نے بھی انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ ضد کرنا' اپنی بات منوانا اس وقت تک رہا جب تک ذوالفقار حسین زندہ تھے۔ وہ اپنی ماں کے اختیارات کو جانتا تھا۔ وہ آج اگر کامیابی کی بلندیوں پہ تھا تو اس کا کریڈٹ وہ اپنی ماں کو ہی دیتا تھا لیکن سچ تو یہ ہے وہ آج بھی اپنی زندگی میں اپنے پاپا کی کمی کو محسوس کرتا تھا۔

"کل رات تم کافی اپ سیٹ تھے۔ اس لیے مجھے لگا تم سے اس وقت بات کرنا مناسب نہیں۔ میرا خیال ہے اب ہم اس موضوع پہ تفصیل سے بات کر سکتے ہیں۔" ناشتے کی میز پر وہ جلدی جلدی اپنے سامنے رکھا ہوا چیز آملیٹ ختم کر رہا تھا۔ زنیرہ بیگم کو کل رات کی اس کی ادھوری باتوں نے سونے نہیں دیا تھا۔ حذیفہ اور زینی کی شادی ان کا فیصلہ تھا لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا حذیفہ اس رشتے سے اس حد تک ناخوش ہو گا۔

"میں اب ٹھیک ہوں ممی۔" بنا شکر کی بلیک کافی کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے لاپروائی سے کہا۔ جیسے وہ اس موضوع پہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"حذیفہ کیا تم اس رشتے سے واقعی خوش نہیں ہو؟ زینی پسند نہیں تمہیں؟" جو بات حذیفہ نہیں کہہ پایا تھا' زنیرہ بیگم نے کہہ دی تھی۔

"ممی زینی بہت اچھی لڑکی ہے لیکن یہ وہ لڑکی نہیں جسے میں اپنی شریک حیات کے روپ میں سوچتا ہوں۔ اس میں بہت بچپنا ہے۔ اس کی خود پسندی اور ضد دیکھ کر بعض اوقات میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ میرے اور اس کے مزاج میں ہم آہنگی نہ ہونے کے برابر ہے۔" کافی کا کپ واپس میز پہ رکھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔ اب اگر وہ بات شروع کر چکی تھیں تو اسے اپنا مؤقف بھی واضح کر دینا چاہیے۔ مختصراً" اس نے کل کا قصہ کہہ سنایا۔

"مجھے تم سے اس جلد بازی کی امید نہیں تھی۔ ایک دن اس کے ساتھ شاپنگ پہ گئے اور اس نے تمہارے چار گھنٹے کیا لگوا دیے تمہیں اس سے شادی کے فیصلے پہ پچھتاوا ہو رہا ہے۔ سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ مجھے تو یہ بات اتنی غیر مناسب نہیں لگی۔" ساری بات سننے کے بعد انہیں الٹا حذیفہ سے ہی شکایت ہو رہی تھی جو خواہ مخواہ چھوٹی سی بات کو سر پہ سوار کر رہا تھا۔ وہ لب کاٹ کر رہ گیا۔

"نتیجہ وہ نہیں جو آپ نے نکالا ہے ممی' میں کوئی ایک دن کی بات نہیں کر رہا۔ میں جب بھی اس سے ملا ہوں اس کا خود پسند رویہ' کسی دوسرے کے جذبات کی پروا نہ کرنا' اپنی ہر بات منوانا اور بے تحاشا بولڈ انداز مجھے پریشان کر دیتا ہے۔ اس کی اور میری طبیعت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا تھا۔

"میرا بیٹا تو بہت مصلحت پسند اور برداشت والا ہے' زینی ابھی کم عمر ہے۔ اس عمر میں لڑکیاں اکثر بچکانہ حرکتیں کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" اس کو چڑتا دیکھ کر زنیرہ بیگم نے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ کو لگتا ہے' وہ بدلنے والوں میں سے ہے۔ انکل نے لاڈ پیار میں اسے حد سے زیادہ ضدی اور خود سر بنا دیا ہے۔ دوسرے کی رائے کو تو وہ اہمیت ہی نہیں

دیتی ہے۔" اس کا تجزیہ ہر گز غلط نہیں تھا۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھیں لیکن اس رشتے سے پیچھے ہٹنا اب ممکن نہ تھا۔

"پلیز بیٹا! یہ وقت اب ان سب باتوں کا نہیں ہے' اگلے ماہ تم دونوں کی منگنی ہونے والی ہے۔ اور پھر بھائی صاحب کا سوچو' کتنا ساتھ دیا ہے انہوں نے ہمارا۔ تمہارے پاپا کے بعد......" وہ یہ سب نہ بھی کہتیں تو حذیفہ خود اس معاملے کی نزاکت کو سمجھتا تھا لیکن کیا کرتا کہ یہ اس کی پوری زندگی کا سوال تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بات بار بار اس کے ذہن میں آرہی تھی اور وہ ڈسٹرب ہو جاتا تھا۔

"ممی! کیا انکل کے احسان اتارنے کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا۔ انہوں نے ہماری مالی مدد کی' بزنس میں میری رہنمائی کی تو اس کے بدلے میں ان کی بیٹی سے شادی کرلوں۔ بھلے وہ شادی ناکام ہو جائے' کسی کو بھی دلی خوشی نہ دے سکے۔" زنیرہ بیگم نے نظریں چرائیں۔ حذیفہ اور زینی کے والد کی دوستی گہری تھی۔ دونوں کئی سالوں سے امریکہ میں مقیم تھے دونوں خاندان ایک دوسرے بہت قریب تھے۔ ان کے انتقال کے بعد دوستی کا فرض نبھاتے ہوئے نہ صرف انہوں نے زنیرہ بیگم اور حذیفہ کا بے حد خیال رکھا تھا بلکہ بہ وقت ضرورت مالی مدد بھی کی تھی۔ آج اگر حذیفہ ایک ویل ایجوکیٹڈ کامیاب بزنس مین کی حیثیت سے اپنے پیروں پہ کھڑا تھا تو اس میں جہاں زنیرہ بیگم اور اس کی اپنی ہمت اور کوشش تھی وہیں زینی کے والد کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

"تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟" ان کے لہجے سے ناراضی عیاں تھی۔ زینب اور حذیفہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں تھے لیکن یہ اور بات حذیفہ نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ صرف زینب کی خواہش تھی۔ وہ حذیفہ کو شریک سفر بنانے کی ضد لیے بیٹھی تھی اور اس کے والد کے لیے زینب کی خوشی اور مرضی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ اسی لیے وہ دنیاداری کی پروا کیے بغیر خود رشتہ لے کر زنیرہ بیگم کے ہاں چلے آئے تھے۔ اس امید کے ساتھ وہ اتنے پرانے تعلقات کا بھرم رکھیں گی اور زنیرہ بیگم نے بھی ان کا مان رکھا۔ حذیفہ کی مرضی جانے بغیر ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر انہوں نے زینب کے لیے ہاں کردی تھی۔ ان کے نزدیک تو یہ ان کی خوش قسمتی تھی جو زینب جیسی خوب صورت اور اونچے خاندان کی لڑکی ان کی بہو بن کر آئے۔ حذیفہ ان کے فیصلے پہ حیرت زدہ تھا لیکن دو لوگوں کی خوشی کی خاطر وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ نہ تو اپنی ماں کو ناراض کر سکتا تھا اور نہ ہی اپنے محسن کا دل دکھانا چاہتا تھا لیکن دل تھا جو بغاوت پہ اترا ہوا تھا۔ وہ خود غرض نہیں تھا لیکن اپنے جیون ساتھی کے روپ میں اس نے جس طرح کی لڑکی کی تمنا کی تھی وہ زینب تو بہر حال نہیں تھی۔

"میں کیا چاہتا ہوں اس کا اختیار آپ نے مجھے دیا ہی کہاں' مجھ سے پوچھے بغیر ہی انہیں ہاں کردی تھی آپ نے۔ آپ کے فیصلے پہ جب اس وقت خاموش رہا ہوں تو اب بھی اس کمٹمنٹ کو نبھاؤں گا۔ آپ فکر مت کریں۔" وہ ہار مان چکا تھا۔ اپنا کوٹ اور بیگ اٹھا کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

✲ ✲ ✲

اندھیرے کمرے میں اس کی سسکیاں وہ داخل ہوتے ہی سن چکے تھے۔ اندازے سے دیوار پہ لگے سوئچ بورڈ کو ٹٹول کر انہوں نے بلب جلایا۔ وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ لرزتا وجود اور وقفے وقفے سے اٹھتی سسکیوں کی آواز...... بنا کہے بھی وہ جانتے تھے عرشیہ یہاں خوش نہیں ہے لیکن وہ مجبور تھے کہ اس سے زیادہ وہ اس معصوم کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ دھیمے قدموں سے چلتے وہ بیڈ تک آئے اور جھک کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ماموں جان...... آپ۔" وہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ آگ کی طرح تپ رہی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ انہیں لگا وہ رو رہی تھی

لیکن وہ تو بخار میں جھلس رہی تھی۔
"اوہ میرے خدایا، تمہیں تو شدید بخار ہے۔" وہ تڑپ کر بولے۔ عرشیہ نے نظریں چُراتے ہوئے سر جھکالیا۔
"شاید موسم کا اثر ہے۔ آج سردی بھی تو کچھ زیادہ ہے نا۔ آپ پریشان نہ ہوں میں دوا لے لوں گی۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔
"مجھے معاف کردو عرشیہ! شاید میں انجانے میں تمہارے ساتھ بہت زیادتی کرگیا۔ جلد بازی میں مجھ سے درست فیصلہ نہیں ہوپایا۔" وہ بہت دکھی نظر آرہے تھے۔ بے بسی سے لب کاٹتی وہ چپ چاپ انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ خود تہی داماں تھی انہیں حرف تسلی کیا دیتی۔ سامنے بیٹھا تاسف میں ڈوبا یہ شخص عرشیہ جس کے وجود سے چند ماہ پہلے انجان تھی، آج اس کی کل کائنات تھا۔ اس کا سائبان تھا۔
"ایسا مت کہیں ماموں، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔" وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی، گلہ ان سے نہیں گلہ تو اپنی ماں سے تھا جو اسے بوجھ کی طرح ان کے سر پہ لاد گئی تھی۔ زندگی میں اس نے بہت سے دکھ بھرے لمحات دیکھے تھے۔ اس کی زندگی میں کئی مسائل تھے۔ پر وہ گھبرائی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اس کی ماں کی طویل بیماری نے بھی اسے اس انداز میں نہیں توڑا تھا۔ جتنا اس احساس نے توڑ ڈالا تھا کہ اس کا وجود کسی کے لیے بوجھ ہے۔ وہ کسی کی زندگی میں ان چاہی داخل کی گئی ہے۔ اس کی ذات پہ کیے گئے احسانات، اس کی روح پہ دھرا بوجھ اسے ہلکان کر رہا تھا۔
"تم پریشان مت ہو، میں آج ہی عفان سے بات کروں گا۔" انہوں نے اپنی طرف سے اسے تسلی دی تھی، لیکن وہ جانتی تھی جتنا وہ کرچکے ہیں اس سے آگے کچھ بھی ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ الٹا گھر کا ماحول مزید خراب ہونے کا اندیشہ ہے اور آخر میں سدرہ کی جلی کٹی باتیں اور طعنے بھی اسے ہی سننے ہوں گے۔
"نہیں ماموں پلیز، آپ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ میں نہیں چاہتی گھر میں میری وجہ سے کشیدگی ہو۔" اس کا لہجہ التجائیہ تھا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتے تھے کہ لڑائی جھگڑے سے مسئلہ حل ہونے کے بجائے بگڑے گا۔ عفان چھوٹا بچہ نہیں ہے اور درپردہ اسے سدرہ کی سپورٹ حاصل ہے۔ وہ اسے جتنا پریشرائز کرسکتے تھے کرچکے ہیں۔ اس سے آگے وہ بھی لاچار ہیں۔ پھر بھی عرشیہ کے ساتھ ہورہی اس زیادتی پہ کب تک خاموشی اختیار کی جاسکتی تھی۔
"میں تمہارے لیے دوا لاتا ہوں اور کچھ کھانے کو بھی۔ کوئی ضرورت نہیں بستر سے قدم نیچے اتارنے کی۔ بس آرام کرو۔" اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ عرشیہ کا دل آنے والی پریشانی کا سوچ کر بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ اس گھر کے لوگوں کی نظروں میں اپنے لیے مزید نفرت نہیں دیکھ سکتی تھی۔ پر وہ بے بس تھی۔ نڈھال سی ایک بار پھر بستر پہ لیٹ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اگر میری بات مان کر عرشیہ سے شادی کرہی لی ہے تو اسے نبھاؤ بھی۔ بیوی ہے وہ تمہاری اور تمہاری ذمہ داری بھی عفان۔" حسب معمول وہ دیر سے گھر لوٹا تھا۔ وہ بھی اسی کے منتظر تھے۔ اس نے بوکھلا کر ماں کی طرف دیکھا۔
"ہاں تو وہ کب پیچھے ہٹ رہا ہے، آپ ہی کی مانتا ہے ہمیشہ اور یہ ذمہ داری والی بھی خوب کہی آپ نے اب کیا بھلا سر پہ اٹھا کر گھومے آپ کی بھانجی کو۔" وہ تو خود اتنی دیر سے صوفہ پہ بیٹھی پریشان ہورہی تھیں کہ اب تک وہ سوئے کیوں نہیں ہیں۔ ورنہ تو عفان کے گھر پہنچنے تک وہ دوا لے کر سو جاتے تھے۔ اب جو انہیں جاگتے دیکھا تو انہیں یقین تھا آج عفان کی کلاس لازمی ہوگی۔
"کچھ خوف خدا بھی ہوتا ہے سدرہ، وہ اب فقط میری بھانجی نہیں اس کی بیوی اور تمہاری بہو بھی ہے۔ اسے اس گھر کی ملازمہ سمجھنا بند کرو۔" وہ غصے

سے بولے تو سدرہ نے برا سا منہ بنایا۔
"اپنے گھر کے کام کرنے سے کوئی ملازم ہو جاتا ہے کیا؟" تنک کر جواب دیا گیا۔
تو یوں کا رخ اپنی طرف کر کے وہ ہمیشہ عفان کو بچا لیا کرتی تھیں۔ بحث و تکرار ان دونوں میاں بیوی میں شروع ہو جاتی اور وہ چپکے سے کھسک جاتا۔
"جس طرح تم نے اس پہ کام کا بوجھ ڈال رکھا ہے ایسا سلوک تو یہاں کوئی ملازموں سے بھی نہیں کرتا۔ بخار میں جل رہی ہے معصوم۔"
"پاپا میں کوئی ڈاکٹر تھوڑی ہوں جو اس کا علاج کروں گا۔ وہ بیمار ہے تو بتا دیتی۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔" ماں کو بولتا دیکھ کر عفان کو بھی شہہ ملی تھی۔ اس سے پہلے وہ خاموشی سے اپنی کارگزاریوں میں مصروف رہتا تھا، لیکن اب وہ اس ساری صورت حال سے تنگ آچکا تھا۔
"اب ہمیں الہام تو ہونے سے رہا۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔
"ارے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی کیا ضرورت ہے میں دوائی دے دیتی ہوں۔ موسم بدلا ہے تو ہو گیا ہو گا ٹمپریچر۔ اس میں اتنا واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" سدرہ کے دل میں تو اس کے لیے اتنی بھی ہمدردی نہ تھی۔ ڈاکٹر کی فیس خواہ مخواہ بھری جاتی۔ انہیں عفان کے مشورے پہ بھی غصہ آیا تھا۔ اپنی کمائی تو سب باہر ہی اڑا دیتا تھا۔ اب بیوی کو ڈاکٹر کو دکھانے چل پڑا تو پلے سے پیسے بھی دینے پڑ جائیں گے۔
"ساری زندگی بیوی سے خدمتیں کرائیں، اس وقت خوفِ خدا نہیں تھا۔ میں جو پچیس سال ملازمہ بنی رہی تو کسی کو حقوق و فرائض یاد نہیں آئے۔ ان کی بھاجی سے دو کام کیا کروا لیے آ گئے فتوے لے کر۔" عفان ماں کی شکل دیکھنے لگا۔ پاس کھڑا باپ تو حیرت سے بیوی کی شکل دیکھ ہی رہا تھا۔
"اچھا بھئی، نہیں کرواتے اس شہزادی سے کام۔ مفت کی روٹیاں توڑے وہ جوان جہان ہو کر اور میں بوڑھی عورت اس گھر میں ہڈیاں گھساؤں۔ پر ان کے دل کو تو سکون مل جائے گا نا۔ میرا اللہ مالک ہے۔"
وہ اسی لیے اتنے عرصے سے خاموش تھے۔ جب بھی بات ہوتی یوں ہی بتنگڑ بن جاتا۔
"بات کو بلاوجہ مت بڑھاؤ سدرہ۔ میں تو بس اتنا کہہ رہا تھا کہ وہ اس گھر کا ایک فرد ہے، اسے توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔ زندگی میں بے تحاشہ دکھ جھیلے ہیں اس نے۔" ایک سال ہونے کو تھا، وہ اسے جس وعدے کے ساتھ بہو بنا کر لائے تھے اسے پورا کرنا اکیلے ان کے بس کی بات نہ تھی۔ عفان نے اسے کبھی بیوی تسلیم نہیں کیا تھا اور سدرہ کو تو اس کے وجود سے چڑ تھی۔ وہ اگر گھر میں رہ رہی تھی تو فقط اس لیے کہ بے دام کی غلام بنی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اس معاملے میں مصلحتاً خاموش تھے کہ جوان بیٹے پہ زیادہ سختی کرنے سے بات بگڑ جائے گی۔
"بہتر ہو گا میرا منہ مت کھلوائیں آپ، یہ تو میرا ظرف ہے اور میری اولاد کی تابعداری جو آپ کی خواہش کا احترام کر کے اسے گھر لے آئی ہوں ورنہ......" بس یہی وہ طعنہ تھا جو انہیں بے بس کر دیتا تھا۔
"چھوڑیں ماما، گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ پاپا کو میری اچھائی تو نظر ہی نہیں آتی۔" وہ دونوں ماں بیٹا ایک ہو گئے تھے۔ وہ لب کاٹتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

"مما میں آپ سے ایک بات صاف صاف کہہ چکا ہوں، مجھے اس عذاب سے چھٹکارا دلوائیں ورنہ میں خود کوئی انتہائی قدم اٹھا لوں گا۔" قدرے اونچی آواز میں وہ شدید غصے کے عالم میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔
ابھی کچھ دیر پہلے باپ کے ساتھ اچھی خاصی بحث کے بعد اب ماں کے سامنے اپنا سارا غصہ اگل رہا تھا۔
سدرہ نے جلدی سے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کرایا۔
"آہستہ بولو اگر تمہارے پاپا کے کانوں تک یہ بات

پہنچ گئی تو پتا ہے نا کتنا واویلا کریں گے۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں تھوڑا اور انتظار نہیں کر سکتے کیا؟" اس نے ناگواری سے سدرہ کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے سامنے رکھے کاؤچ پہ جا کر بیٹھ گیا۔

"صرف آپ کی وجہ سے اس مصیبت میں پڑا ہوں میں، نہ آپ درمیان میں آتیں نہ ہی یہ مشکل میرے گلے پڑتی۔" تیوریاں چڑھائے وہ خاصا بدگمان تھا۔

سدرہ اس کے پاس رکھی دوسری کرسی پہ جا کر بیٹھ گئیں۔ "دیکھو عفان، تم اچھی طرح جانتے ہو اگر میں نے تمہیں اس بات کے لیے مجبور کیا تھا تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ہیں تمہیں نوکری کرتے، ہائی اسکول ڈپلومہ سے آگے تم نے پڑھا نہیں، ایک ڈھنگ کی نوکری تم حاصل کر نہیں سکے۔ اس پہ چلے تھے اس منحوس فرنگن سے شادی کرنے۔" وہ دھیمی آواز میں اسے آئینہ دکھا رہی تھی۔ عفان نے ان کی بات سن کر پہلو بدلا۔

"ہاں تو حق بنتا ہے میرا اپنی مرضی سے شادی کرنے کا، زندگی مجھے گزارنی ہے تو پھر اپنے من چاہے ساتھی کے ساتھ کیوں نہیں؟" باقی باتیں تو نظرانداز کر دی تھیں کیونکہ وہ تو دکھتی رگ تھیں، لیکن اس بات پہ اپنا دفاع کرنا اس کا حق تھا۔

"کون سی زندگی؟ جیسے میں تو جانتی نہیں کہ یہ میمیں ساری زندگی ٹکتی نہیں ہیں۔ پاکستانی مردوں کو پھنسا کر ان کا استعمال کس انداز میں کرتی ہیں، یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں، ورنہ تم میں اسے کون سے سرخاب کے پر نظر آ رہے تھے۔ مجھے تو یوں بھی وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔" سدرہ نے ہاتھ جھٹک کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"ہاں تو یہ بہت پسند ہے نا آپ کو، مفت کی ملازمہ مل گئی ہے۔ پہلے جو کام خود کرتی تھیں اب اسے لگا دیا ہے۔ سارا دن اس سے نوکروں کی طرح کام کرواتی ہیں اور خود مزے سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھا جاتا ہے۔" طعنہ مارتے ہوئے وہ یہ بھول گیا تھا کہ سامنے ماں بیٹھی ہے جو اس کے ہر الٹے سیدھے کام پہ تمام عمر پردے ڈالتی رہی ہے۔

"بڑا دکھ ہو رہا ہے کہ تمہاری بیوی کو کام پہ لگا دیا۔" وہ منہ بنا کر بولیں تو وہ تلملا اٹھا۔

"دکھ مائی فٹ۔ میں نے اسے کبھی اپنی بیوی نہیں سمجھا اور نہ کبھی سمجھوں گا، میری طرف سے آپ اس سے گھر تو کیا پوری کالونی کا کام کروائیں، لیکن میں اسے اب مزید برداشت نہیں کر سکتا۔" ایک جھٹکے سے وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں صبر کرو، معاملے کی نزاکت کو سمجھو۔ کیوں اپنے پیروں پہ کلہاڑی مار رہے ہو؟" سدرہ نے اس کا اشتعال دیکھ کر اسے نئے سرے سے سمجھایا۔

☆ ☆ ☆

سدرہ نے اس سے بات چیت بند کر دی تھی۔ گھر کا سارا کام اس سے یہ کہہ کر واپس لے لیا گیا کہ وہ اب بس اپنے کمرے تک محدود رہے اور آرام کرے۔

"مجھے معاف کر دیں ممانی، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ آپ کو میری وجہ سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" کام کاج کر کے بھی وہ گناہ گار تھی اور یہاں تو کئی روز سے سدرہ نے اسے باورچی خانے کا رخ بھی نہیں کرنے دیا تھا۔ ایک طرح سے اس کا مکمل بائیکاٹ کر دیا گیا تھا۔ ایک ہی گھر میں اس رویے کے ساتھ رہنا تو ممکن نہ تھا۔ چار و ناچار اسے گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی معذرت کرنا پڑی۔

"معاف تو تم ہمیں کرو بی بی۔ اتنا لائق فائق شہزادوں جیسا بیٹا تمہیں سونپ دیا۔ بدلے میں تم سے یہی تمغہ ملنا تھا کہ اس عمر میں مجھے اپنے شوہر سے صلواتیں سننی پڑیں۔"

وہ شرمندہ سر جھکائے بے بسی سے لب کاٹتی رہی۔ کیا کہتی کہ ممانی جس بیٹے کا طعنہ مار رہی ہیں اس نے تو سال بھر میں کبھی اس کی طرف ہنس کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

"میں نے کبھی آپ سب کا برا نہیں چاہا۔ میں تو آج تک حرف شکایت زبان پر نہیں لائی۔ یہ گھر میری جائے پناہ ہے پھر میں بھلا کیوں آپ کے خلاف منہ کھولوں گی۔ وہ تو مجھے بخار میں مبتلا دیکھ کر ماموں.... پر میں سچ کہتی ہوں ممانی، میرا یقین کریں۔ آج کے بعد ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

سدرہ نک سک سے تیار بنی سنوری کہیں جانے والی تھیں۔ اپنا لانگ کوٹ پہنتے ہوئے انہوں نے ایک سخت نگاہ عرشیہ کے ستے ہوئے چہرے پہ ڈالی جہاں ہمیشہ کی طرح اداسی تھی۔

"ہمم.... جاؤ جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ۔ مجھے نکلنا ہے۔" انہیں بھو پہ ترس آہی گیا تھا۔

"گھر میں سودا سلف ختم ہے۔ میں جاتے ہوئے تمہیں وال مارٹ ڈراپ کردوں گی۔ تم یہ سب سامان لے کر گھر واپس آجانا اور وقت پہ کھانا تیار کرلینا۔"

ایک لسٹ اور کچھ ڈالر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ اب اپنا بیگ اٹھائے کمرے کی طرف جارہی تھیں۔

"لیکن مامی! میں یہ سارا سامان لے کر اکیلی کیسے آؤں گی۔" لسٹ پہ ایک نگاہ ڈال کر وہ حیران پریشان ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیوں؟ تم کوئی ننھی بچی ہو جو اکیلی واپس نہیں آسکتیں۔ جتنا یہ گھر میری ذمہ داری ہے اتنی ہی تمہاری بھی ذمہ داری ہے۔ اب اگر گھر میں سودا سلف لانا ہو تو تم کیوں نہیں جاسکتیں۔ جلدی کرو مجھے دیر ہورہی ہے۔" چاروناچار وہ سدرہ کے ساتھ چلی آئی تھی۔ پورے راستے وہ اسے مختلف ہدایات دیتی رہی تھیں۔

اس سپر مارکیٹ میں وہ کئی بار آچکی تھی اس لیے اپنی مطلوبہ اشیا خریدتے ہوئے اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ قدرے محتاط انداز میں قدم بڑھاتی باہر نکلی، لیکن سامنے سے آتے کسٹمر سے جا ٹکرائی۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ دونوں ہی اپنا بیلنس برقرار نہ رکھ پائے۔ سامان سمیت وہ پتھریلی زمین پہ بری طرح گری تھی جب کہ دوسرے شخص نے بہ مشکل خود کو گرنے سے روکا۔

"معذرت چاہتا ہوں غلطی میری ہے۔ جلدی میں دیکھ نہیں پایا۔" خوب صورت امریکی لب و لہجے میں اس سے معذرت کی گئی۔

کچھ خوف اور کچھ پریشانی سے وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جو اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ اسے اٹھنے میں مدد دے رہا تھا، لیکن اس کے ساہ مگر حسین چہرے پہ نظر پڑتے ہی اپنی اگلی بات کہنا بھول گیا تھا۔ وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ بھی اچانک سے ہوش میں آیا اور پھر وہاں پڑا اس کا بکھرا سامان جلدی جلدی اٹھا کر واپس رکھنے لگا۔

"میں ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں......"

گروسری کے بیگ اس کی طرف بڑھاتا ہوا وہ ایک بار پھر اس سے معافی مانگ رہا تھا۔

"سوری تو مجھے کرنی چاہیے، غلطی میری تھی۔"

اس کے ہاتھ سے لفافے پکڑتے ہوئے وہ شرمندہ سی کہتی ہوئی فٹ پاتھ کی طرف بڑھ گئی۔

"ایکسکیوزمی۔" اس کی پکار پر سنجیدہ چہرے کے ساتھ عرشیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دراز قد، ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اجلی رنگت والا وجیہہ مرد تھا۔ اس کا لباس شاندار تھا اور اس پہ جچ رہا تھا۔ قدرے فاصلے سے بھی اس کے کلون کی مسحور کن مہک فضا کو معطر کرتی عرشیہ تک پہنچ رہی تھی۔

"آپ کو کہاں جانا ہے....؟ میرا مطلب ہے اتنی سردی میں آپ یہ بوجھ اٹھا کر پیدل چل رہی ہیں اور آپ کو چوٹ بھی لگی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے گھر ڈراپ کردیتا ہوں۔"

"شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی۔" بہت روکھے انداز میں دو ٹوک جواب دے کر وہ واپس مڑ گئی۔ ایک تو وہ یوں بھی بہت لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ اوپر سے اس اجنبی سرزمین پہ کسی راہ چلتے کی مدد کی آفر قبول کرنا اس کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھا۔

"سنیں مس! یہ میرا کارڈ ہے۔ یقین مانیں میں ایک شریف انسان ہوں اور آپ کو بحفاظت آپ کے

گھر پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔" مؤدب انداز میں درخواست کرتا وہ اب اپنی مہنگی گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

"آپ کی شرافت کا اندازہ تو اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک اجنبی لڑکی کو بغیر جانے پہچانے یوں بے تکلفی سے لفٹ کی آفر کررہے ہیں' وہ بھی اپنا راستہ کھوٹا کرتے ہوئے۔" اس کی توقع کے برعکس وہ دھیمے مگر طنزیہ لہجے میں اس کی ہمدردی اس کے منہ پہ مارتی ہوئی اپنے راستے پہ چل پڑی تھی۔ اپنی عادت کے برخلاف پہلی بار اس نے کسی لڑکی کی طرف پیش قدمی کی کوشش کی تھی۔ کچھ دیر ندامت کے زیر اثر وہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

صبح سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ کھانے کی کوئی بھی چیز دیکھ کر متلی ہونے لگتی تھی۔ کچھ کھایا پیا نہیں تھا تو نقاہت بھی بہت زیادہ تھی' لیکن اس کا سارا دھیان دروازے کی طرف ہی تھا۔ بستر پہ اوندھے منہ لیٹی وہ زین کے آنے کا انتظار کررہی تھی۔

"شام کے سات بج گئے ہیں' اللہ خیر کرے' زین ابھی تک واپس نہیں آئے۔" دل میں سو طرح کے وسوسے آرہے تھے۔ یک دم دروازہ کھلنے کی آواز پہ وہ اپنی ساری ہمت جمع کرتی ہوئی بستر سے اٹھی اور تیزی سے باہر نکلی' لیکن اچانک سر چکرایا اور وہ گرنے ہی لگی تھی کہ زین نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

"دھیان سے روبی' کیا کرتی ہو۔ اگر میں نہ پکڑتا تو گرجاتیں تم۔"

"سات بج گئے زین! آج سے پہلے اتنی دیر تو نہیں ہوئی تھی آپ کو۔ میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔ دل میں عجیب عجیب قسم کے خیالات آرہے تھے۔" وہ اس کے کاندھے سے لگی اپنے خدشات بتانے لگی۔

مسکراتے ہوئے اس نے رباب کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور اسے بڑی محبت سے خود سے الگ کیا۔ "نیا نیا کام ہے' تھوڑی بہت دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے' تم خود کو پریشان کرتی رہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"پھر بھی کوشش کیا کریں گھر جلدی آجائیں' سارا دن اکیلے گھر میں میرا دل گھبراتا ہے اور آج کل تو اندھیرا بھی جلدی ہونے لگا ہے۔"

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ اس کی بات پہ مسکرایا۔ رباب کی فکر تو اسے بھی لگی رہتی تھی کہ وہ ان دنوں اس حالت میں اکیلی ہوتی ہے' لیکن وہ بھی کیا کرتا' نئی نئی ملازمت تھی اور اس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔

"بس اب تو چند ماہ کی بات ہے مائی ڈیئر! پھر یہ سارا دن اکیلے رہنے والی تمہاری شکایت تو دور ہو ہی جائے گی۔" زین کے شرارت بھرے انداز نے اسے سرخ کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

میری زندگی میں بس
اک کتاب ہے' اک چراغ ہے
ایک خواب ہے اور تم ہو!
اسی احتیاط میں ساری عمر گزر گئی۔
وہ جو آرزو تھی' کتاب و خواب کے ساتھ تم بھی شریک ہو' وہ مرگئی۔

عفان کی واپسی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ شاید ہر ویک اینڈ کی طرح آج بھی اس کا ارادہ گھر لوٹنے کا نہیں تھا۔ اس نے کمرے کی بتی بجھائی اور بستر پہ جا کر لیٹ گئی۔

"آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا امی۔" بچپن سے اس نے ماں کو کبھی چھپ کر' کبھی اپنے سامنے آنسو بہاتے دیکھا تھا اور اب یہ وہ سوغات تھی جو ماں مرتے ہوئے اسے جہیز میں دے گئی تھی۔

"خود آپ نے تمام عمر فقط محبت میں گزار دی۔ کسی کی چاہت میں اپنا آپ نچھاور کردیا پھر میرے لیے زبردستی کی زندگی کا انتخاب کیوں کیا امی؟" بے آواز روتی ہوئی وہ رات کے اس پہر اپنی تنہائی کا دکھ اپنی

مرحومہ ماں سے بانٹ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"ارے یہ اتنی ساری چیزیں کہاں سے لیے آرہے ہیں؟" وہ سامان سے لدا پھندا گھر میں داخل ہوا۔ بہت سے بڑے بڑے لفافے میز پہ رکھنے کے بعد وہ رباب کی طرف مڑا جو حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی بات کے جواب کی منتظر تھی۔ زین نے بہت نرمی سے اپنے ساتھ لگایا اور اس کا ماتھا چوما۔

"یہ سب شاپنگ ہمارے آنے والے بے بی کے لیے ہے۔" کرسی پہ بیٹھ کر اس نے ایک ایک چیز نکال کر رباب کو دکھانا شروع کی۔ اس کے چہرے سے بے پناہ چھلکتی خوشی دیکھ کر رباب کو اس پہ بے تحاشا پیار آیا تھا۔

"بے بی کے آنے میں تو ابھی خاصا وقت ہے' کیا ضرورت تھی اتنی فضول خرچی کرنے کی۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

جب سے زین کی جاب لگی تھی حالات میں بہتری آگئی تھی۔ اپنی چادر میں رہتے ہوئے وہ اب ایک مطمئن اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ اس پہ رباب کی طرف سے ملنے والی خوش خبری نے تو جیسے زین کو آسمان پہ پہنچا دیا تھا۔

"کہاں زیادہ وقت ہے' بس تھوڑے سے تو دن باقی ہیں۔ ویسے مجھے تو بہت بے تابی سے انتظار ہے اس کا' دن گن گن کر گزار رہا ہوں میں۔ بہت ایکسائٹمنٹ ہو رہی ہے یہ سوچ سوچ کر کہ اب ہماری فیملی مکمل ہو جائے گی۔"

رباب نے مسکراتے ہوئے سامان واپس لفافوں میں رکھنا شروع کر دیا۔ اسے معلوم تھا زین کو بچے کتنے پسند ہیں۔ "ویسے کتنا خرچا کر کے آرہے ہیں ان سب چیزوں پہ؟"

"جیب میں جتنے تھے سب خرچ کر دیے۔" مزے سے کہتا ہوا وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔

رباب کو اس کی بات نے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ شادی کے بعد جن حالات سے وہ دونوں گزرے تھے اور اب تک گزر رہے تھے' انہیں بہت سوچ سمجھ کر چلنا چاہیے تھا۔ اب تو ان کی فیملی میں ایک فرد کا اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے زین سے اس حماقت کی امید نہیں تھی۔

"زین پلیز۔ اس طرح بغیر سوچے سمجھے روپیہ مت خرچ کیا کریں۔ آپ جانتے بھی ہیں سب کچھ پھر سمجھتے کیوں نہیں۔ ڈاکٹر کی فیس' گھر کے اخراجات اور دوائیاں..... ابھی تو دو ماہ بعد مزید پیسوں کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں اسپتال میں کتنا خرچا ہو جائے۔" رباب کی پریشانی جائز تھی۔

"یار تم اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو' میں ہوں نا..... مجھ پہ بھروسا نہیں؟" زین نے اس کے ہاتھ کی پشت پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے کہا۔ وہ سامان اس کے ہاتھ سے لے کر الماری میں رکھ چکا تھا۔

"آپ پہ تو خود سے زیادہ بھروسا ہے' بھروسا نہ ہوتا تو سب چھوڑ کر آپ کے ساتھ چلی آتی؟" یہ لفظ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلے تھے۔ وہ اللہ کے بعد اس کا واحد سہارا تھا۔

ایک سال ہونے کو تھا' اگر اس نے پلٹ کر پیچھے کسی کی خبر نہ لی تھی تو انہوں نے بھی اسے اپنی زندگیوں سے نکال دیا تھا۔ بھائی تو خیر شادی کے بعد اپنی زندگی میں مگن تھا' لیکن اسے اپنے بابا سے اس لاتعلقی کی امید نہ تھی۔ وہ اکلوتی بیٹی تھی' ضدی تھی..... غلطیاں کرتی تھی اور وہ معاف کر دیتے تھے درگزر کر دیتے تھے۔ زین سے شادی کرتے ہوئے دل کے کسی کونے میں یہ یقین پنہاں تھا کہ بابا اسے ضرور معاف کر دیں گے۔ شادی کے بعد وہ ان سے معافی مانگنے اور منانے بھی گئی' لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے اسے ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا۔ ان کا خیال تھا وہ دونوں اپنے مالی حالات سے مجبور ہو کر ان سے مالی امداد مانگنے آئے ہیں۔ وہاں سے نکلتے ہوئے اس نے دل میں عہد کیا کہ وہ مر کر بھی ان کی دہلیز پہ دوبارہ نہیں

جائے گی اور پھر اسے پتا چلا کہ اس کے بابا پاکستان چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔
"تو پھر یہ پریشانی کیوں؟" اس کی آنکھوں میں چمکتے موتیوں کو اپنی انگلی کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔
"یہ کیا ہے؟" میز پہ رکھے چابیوں کے گچھے کی طرف دیکھ کر وہ اپنی اگلی بات بھول گئی۔
"یار یہ میری دراز کی چابی ہے۔ دراصل کیشیئر چھٹی پہ گیا ہے چند دن کے لیے تو زیدی صاحب نے اس کا چارج بھی ایک ہفتے کے لیے مجھے دے دیا ہے۔ بہت بھروسا کرتے ہیں مجھ پہ۔ تم دیکھنا' جلد ہی منیجر کی پوسٹ پہ پروموشن ہو جائے گی۔" چابی کا گچھا اس نے دراز میں سنبھال کر رکھ دیا تھا۔
"ان شاء اللہ......" رباب کی نظروں میں اچھے دنوں کی چاہ ابھری تھی۔

☼ ☼ ☼

عفان کی گھر واپسی عرشیہ پہ قیامت بن کر ٹوٹی تھی۔ ماموں کا عفان کے ساتھ زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ اپنے سابقہ رویے کے برعکس عفان نے کھل کر مزاحمت کی۔ سدرہ تو ہمیشہ بیٹے ہی کی حمایتی تھیں۔ وہ مستقل عرشیہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔
ماموں کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ انہیں فوری ایمرجنسی میں لے جایا گیا' مگر ان کی حالت تشویش ناک تھی۔ ڈاکٹروں کو کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ صبح سے کان ٹیلی فون کی طرف لگے تھے۔ خود سے تو خیر کسی کو کال کر کے پوچھنے کا اس میں حوصلہ ہی نہیں تھا۔ آگے سے جو جوابات ملتے انہیں سننے کی عرشیہ میں اس وقت ہرگز ہمت نہیں تھی۔ دعائیں مانگ مانگ کر اس کا حلق سوکھ گیا تھا اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ جو اگر وہ ہو گیا جس کا اندیشہ اسے اندر ہی اندر ہولا رہا تھا تو پھر اس گھر میں اس کا مقام کیا ہو گا؟ اس سوال پہ آگر اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

فون کی گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا سگریٹ کے کش پہ کش لگا رہا تھا۔ اس کے اندر ایک وقت میں کئی جنگیں چل رہی تھی۔ اس کے پلان کبھی فلاپ نہیں ہوتے تھے' لیکن یہ بازی پلٹ گئی تھی۔
"ہیلو۔" جب ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری بار بھی اس کے آفس میں رکھا پرسنل فون بجنے لگا تو چاروناچار اسے کال اٹینڈ کرنی ہی پڑی۔
"سر' آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔" دوسری طرف سے بہت جوش و خروش میں بولا جانے والا جملہ بھی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نہیں لا سکا تھا۔
"کام کی بات کرو۔" اسے بے جا تمہید سے چڑ تھی اور اس شخص پہ تو اسے ویسے بھی شدید غصہ تھا۔ وہ جانتا تھا' اب وہ اگر اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ نہ رکھتا تو یہ اس کی بات ہرگز نہ مانتا۔
"یہ تمہارے لیے خوشی کی خبر ہے۔ یہ اطلاع دے کر تم نے اپنی جان خلاصی کرالی ہے اس عذاب سے۔ جو تمہیں جلا کر راکھ کر دینے والا تھا۔" اس سے ساری بات سننے کے بعد اس نے استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے اسے اطلاع دی۔
کال منقطع کر کے وہ اب اپنا اگلا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بڑے بڑے منحوس دیکھے' لیکن اس جیسی سے واسطہ نہیں پڑا۔" ماموں کے انتقال کو آج تیسرا دن تھا۔ سر جھکائے لاؤنج کی دیوار سے ٹیک لگائے وہ خاموش بیٹھی تھی۔
"پیدا ہوتے باپ کو نگل گئی' جوان جہان ماں کو کھا گئی اور اب فقط چند مہینوں میں میرے گھر میں اندھیرا کر دیا۔"
سدرہ قہر آلود نظروں سے صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی اسے گھور رہی تھیں۔ عفان بھی پاس ہی

بیٹھا تھا۔ بہت مطمئن اور فریش۔ مغربی تہذیب کا پروردہ اس کے چہرے پہ غم کا شائبہ تک نہ تھا۔
"اللہ جانے ابھی اور کیا کیا سہنا پڑے گا اس منحوس کی بدولت؟" سدرہ دانت پیستے ہوئے بولیں۔ وہ سر جھکائے سب کچھ سن رہی تھی۔
"میں تو کہتی ہوں ہاتھ پکڑ کے نکال باہر کر۔" پہلی بار اس نے سر اٹھایا۔
"ممی؟" عفان بھی چونکا۔
"ارے کیا ممی؟" وہ بھڑکیں۔
"تین حرف کہہ اور چلتا کر۔ جب وہ اس کا نہیں رہا تو اس کو کیوں پالیں۔" صوفے سے اٹھتے ہوئے تنک کر بولیں اور ایک ہی جست میں عرشیہ کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔
"نہیں مامی! یہ ظلم مت کریں۔ میں کہاں جاؤں گی۔" اس نے درخواست کی۔
"اس کے کسی ڈھونگ میں آنے کی ضرورت نہیں عفان۔ چل فارغ کر اسے۔" ان کے چہرے پہ نفرت تھی۔
"میں ساری عمر آپ کی جوتیاں صاف کروں گی۔ جیسے رکھیں گے ویسے رہوں گی۔ شکایت کروں تو زبان کاٹ دینا میری۔" سدرہ سے مایوس ہو کر اس نے عفان کی طرف دیکھا۔
عفان جو ساری صورت حال میں ہونق بنا کھڑا تھا یک دم سارا کھیل سمجھ گیا۔
"پلیز مجھے مت نکالیں۔" اس کی آہ وزاری اس پتھر دل سے ٹکرا کر لوٹ آئی تھی۔ سدرہ نے اسے بازو سے پکڑا اور دروازے کی طرف گھسیٹتی ہوئی لے گئیں۔ عفان کمرے سے اس کا مختصر سامان اٹھا لایا تھا۔
میری طرف سے تم آزاد ہو۔" طلاق کے تین لفظ بول کر اس پہ گھر کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ وہ روتی رہی، پیٹتی رہی پر اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اسپتال کی انتظار گاہ میں وہ اس وقت سر پکڑے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹرز نے قبل از وقت پیدائش کا عندیہ سنایا تھا۔ لیکن کسی صورت آپریشن کرنے کے لیے راضی نہیں تھے جب تک زین ایڈوانس فیس کی ادائیگی نہ کردے۔ اس وقت جو بھی ہاتھ میں تھا وہ دوائیوں اور انجکشنوں کی نذر ہو چکا تھا۔ خالی جیب اور خالی الذہنی سے اسپتال کے کاریڈور میں بیٹھے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ آخر اتنی بڑی رقم کا بندوبست کہاں سے کرے۔
وہ اپنے دفتر سے کچھ رقم ایڈوانس لے سکتا تھا۔ اس کا باس اسے پسند کرتا تھا۔ وہ اس کی مجبوری اور پریشانی کو سمجھتے ہوئے اسے یہ رقم قرض دے سکتا تھا، لیکن صبح ہونے میں بہت وقت تھا اور رباب کا آپریشن جلد سے جلد ہونا ضروری تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ زیدی سے خود رابطہ کرے اور اس سے مدد کی درخواست کرے۔ زیدی سے اس کا رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ شدید اضطراب کے عالم میں لب کاٹتا۔
تیزی سے اسپتال کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنی جیب میں رکھی چابی کی تصدیق کی۔
"یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ اپنی اولاد اور بیوی کو موت کے منہ سے بچانے کے لیے چوری کر رہا ہوں۔" رات کے اس پہر اپنے دفتر کی دراز سے پیسے نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔
"نہیں..... میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں کسی کا پیسہ بغیر اجازت استعمال نہیں کر سکتا۔ میں چوری کا داغ اپنے ماتھے پر نہیں لگواؤں گا۔" اس نے وہ فیصلہ کیا جو اس کے ضمیر کی عدالت میں اسے معتبر کردے۔
اسپتال کی طرف واپس جاتے ہوئے اس کے قدم بوجھل تھے۔ وہ خالی ہاتھ دفتر سے نکل آیا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ رباب کے آپریشن اور ڈیلیوری کا بندوبست کیوں کر ہوگا۔ اچانک اردگرد کا ماحول روشن ہو گیا۔ تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ آنکھوں پہ ہاتھ کا چھجا بنائے حیرت سے اس تیز روشنی کے منبع کا سراغ لگانے کی سعی کرنے لگا۔ روشنی کے وہ گولے اس کا بالکل قریب آکر ساکت

ہو گئے تھے۔

✡ ✡ ✡

"ایک لڑکی کی اندھی محبت میں تم کیا سے کیا ہو گئے زین۔" وہ حوالات کے ننگے سرد فرش پہ ندامت اور احساس جرم سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اپنے نزدیک اس شناسا آواز پہ چونک کے اس نے سر اٹھایا۔

"پاپا پلیز مجھے یہاں سے نکالیں' یہ لوگ مجھ پہ جھوٹا الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے چوری نہیں کی ہے۔ مجھے کسی سازش کا نشانہ بنایا گیا ہے۔"

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رات کے اس پہر اس کا باپ وہاں آجائے گا۔ امید کا بجھتا دیا ایک بار پھر جل اٹھا تھا۔ اسے پورا یقین تھا شہزاد عالم اس کو اس مشکل سے نکال لیں گے۔ وہ ان کے اختیارات سے اچھی طرح واقف تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے حوالات میں پہنچانے والا اس سارے کھیل کا ماسٹر مائنڈ اس کا اپنا باپ ہی تھا۔

"تم مجھ سے مدد کی امید رکھتے ہو؟ یاد ہے اس معمولی لڑکی کی خاطر میری محبت اور وقار کو کیسے لات مار کے گئے تھے۔" شہزاد عالم' چہرے پر رعونت اور بے حسی اوڑھے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"پاپا! رباب اس وقت اسپتال میں ہے۔ اس کا آپریشن ہونے والا ہے میں نے اگر صبح تک آپریشن کے پیسے جمع نہ کروائے تو رباب اور میرا بچہ مر جائے گا۔ پلیز اسے بچالیں۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ اسے ہر حال میں یہاں سے باہر نکلنا تھا۔

"کیوں کروں میں تمہاری مدد' آخر اس سب سے مجھے کیا ملے گا؟ وہ لڑکی اپنی محبت کا جال پھیلا کر مجھ سے میرا اکلوتا بیٹا چھین چکی ہے' اولاد کھونے کا غم ذرا تم بھی جانو زین عالم۔ باپ کے رشتے کو تو تم ٹھوکر مار ہی چکے ہو۔ اس ناتے سے تو مجھ سے کسی ہمدردی کی امید فضول ہی ہے۔" ان کا لہجہ سفاکانہ تھا۔ الفاظ تھے یا نشتر۔ زین ان کے آخری الفاظ سن کر تو جیسے سکتے میں آگیا تھا۔

"پلیز پاپا' یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ میں آپ کا گناہ گار ہوں لیکن میری اولاد نہیں۔ اسے بچالیں' بدلے میں آپ جو چاہیں گے میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بس میرے بیوی اور بچے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں تمہاری مدد صرف ایک شرط پہ کرنے کو تیار ہوں۔ اپنے بیوی بچے کی زندگی بچانے کی قیمت دے سکو گے؟"

"میں ان دونوں کی زندگی بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں' آپ بس مجھے ایک بار ان سلاخوں کے پیچھے سے باہر نکال دیں۔" وہ جس اندھے کنویں میں تھا وہاں سے نکلنے کے لیے یہ سودا کرنا ضرورت بھی تھی اور مجبوری بھی۔

"سوچ لو۔ قیمت بہت زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔" سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بہت پرسکون لہجے میں پوچھا جانے والا یہ سوال اسے سلگا گیا تھا۔

"پلیز پاپا اس وقت مجھے ہر حال میں یہاں سے باہر جانا ہے اور رباب کے آپریشن کی رقم کا بندوبست کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر رباب اور اپنے بچے کی زندگی کی خاطر تمہیں ان دونوں کو چھوڑنا ہوگا۔" ان کی اگلی بات نے زین کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ ان سے اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔" ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس نے انکار کر دیا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ سڑتے رہو اس سیل میں اور صبح تک ان دونوں کی موت کی خبر کے لیے بھی تیار رہنا۔ اور اپنی باقی کی زندگی چوری کا داغ ماتھے پہ لے کر گزار دینا۔ زیدی تمہیں اتنی آسانی سے تو یہاں سے نکلنے نہیں دے گا۔" سگریٹ کا سلگتا ٹکڑا اپنے قیمتی جوتوں تلے مسلتے ہوئے وہ اس سے بھی زیادہ اونچی آواز میں چلائے۔

"بس کردیں' آپ انا پرست اور مغرور ہیں' یہ میں جانتا تھا لیکن آپ ظالم اور سفاک بھی ہوں گے میں

نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس دنیا میں آنے سے پہلے وہ جو بچہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اس سے صرف میرا ہی نہیں آپ کا بھی رشتہ ہے۔ وہ آپ کا بھی خون ہے اور آپ...." غصے سے زین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"مجھے رشتوں کی دہائیاں دے کر جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش بے کار ہے زین۔ یہ رشتے اس وقت کہاں گئے تھے جب تم نے اپنی بیوی کی خاطر اپنے باپ کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ باپ جس نے ساری زندگی تمہیں سوئی بھی نہیں چبھنے دی۔ اب تمہیں خونی رشتے یاد آرہے ہیں۔ تمہیں مانتا میں کسی رشتے کو۔ اب تو بس ڈیل ہوگی۔ تمہیں میرے ساتھ معاہدہ کرنا ہوگا کہ تم اس لڑکی اور اس کی اولاد سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔ اپنے گھر واپس آؤ گے اور نائمہ سے شادی کرو گے جیسا کہ میں نے حبیب صدیقی کو زبان دی تھی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں ساری زندگی ان دونوں کی کفالت کروں گا۔" وہ بہت سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اس تک پہنچے تھے۔ انداز دو ٹوک تھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ میں رباب کو نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ غصے سے چلایا۔

"ٹھیک ہے تو پھر جیسے تمہاری مرضی۔ رہو ان سلاخوں کے پیچھے۔" اس کے احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہزاد عالم نے کندھے اچکائے اور باہر کا رخ کیا۔ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ زین کی ہاری ہوئی آواز نے انہیں پلٹ کے دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"پاپا.... مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔" بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے اس نے سر جھکا لیا۔ شہزاد عالم کی آنکھوں میں فتح کی چمک چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو آنٹی"..... اس کا انداز ہمیشہ کی طرح بے تکلف تھا۔ اسٹیپس میں کٹے خوب صورت سلکی بال، دلکش انداز میں اس کے نقوش کو ابھارتا میک اپ، میرون رنگ کے لانگ اسکرٹ پہ آف وائٹ اسٹائلش ٹاپ جو اسے اور بھی پرکشش بنا رہا تھا۔

"ہیلو زینی، کیسی ہو بیٹا۔" اس کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے زنیرہ بیگم نے اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

"کتنا بے وقوف ہے یہ لڑکا۔ اللہ جانے اس کے ذہن میں کیا خرافات چل رہی ہیں..... اتنی خوب صورت اور خاندانی لڑکی سے شادی پہ اعتراض اٹھا رہا ہے۔ پتا نہیں اسے اور کون سی حور پری چاہیے۔" زینب کو نظر بھر کر دیکھتے ہوئے زنیرہ بیگم نے دل میں سوچا۔

حذیفہ کو زینی کا رویہ بچکانہ اور خود پسند لگتا تھا جبکہ خود زنیرہ بیگم کو حذیفہ کی یہ سوچ بچکانہ لگ رہی تھی۔ ان کے خیال میں وہ ایک بہترین انتخاب تھی لیکن وہ یہ نہیں سمجھ رہی تھیں کہ شادی فقط ظاہری خدوخال اور حسب نسب کی بنا پر نہیں کی جاتی۔ حذیفہ کے لیے ان تمام باتوں سے زیادہ اہم دل کا تعلق تھا۔ وہ زینی سے محبت نہیں کرتا تھا۔

"حذیفہ کہاں ہے آنٹی! میں کب سے اس کو کال کر رہی ہوں، آفس فون کیا تو پتا چلا وہ تو جلدی نکل گیا ہے۔" زنیرہ سے رسمی سلام دعا کے بعد اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

زنیرہ بیگم کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ "ہاں شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں، اس لیے آفس سے جلدی گھر آگیا۔ اپنی اسٹڈی میں ہے وہ..... تم جا کر مل لو۔" پچھلے ایک ہفتے سے حذیفہ کی خاموشی اور کچھ کچھ غائب دماغی انہیں بے حد پریشان کر رہی تھی۔ ان کے خیال تھا کہ شاید وہ ان سے اپنی ناراضی کا اظہار کر رہا ہے۔ حذیفہ کے دل کے حال سے بے خبر وہ اس کی اس کیفیت کو زینب سے اس ہونے والی منگنی سے منسوب کر رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے پھر میں اس سے مل کے آتی ہوں"۔ زنیرہ بیگم کی اجازت سے مسکراتے ہوئے وہ اسٹڈی کی طرف چلی گئی۔

"پلیز کم ان"۔ اپنی اسٹڈی میں پچھلے ایک گھنٹے سے وہ کمپیوٹر اسکرین کے سامنے غائب دماغی سے بیٹھا تھا۔ دروازے پہ ہونے والی ہلکی سی دستک پہ وہ ہوش میں آیا۔ دروازہ کھلنے پہ زینی کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے کوفت ہوئی لیکن خود پہ قابو پا کر وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"کہاں ہیں آپ اتنے دن سے؟ آفس کال کرو تو پتا چلتا ہے موصوف جلدی چلے گئے۔ موبائل پہ کال کر رہی ہوں تو میری کال ہی اٹینڈ نہیں کر رہے ہو۔" اندر داخل ہوتے بے تکلفی سے اس نے شکایات کی پٹاری کھولی۔ حذیفہ نے اس کی بات سن کر اپنے پاس رکھا سیل فون اٹھا کر ایک نظر اس پہ ڈالی جس پہ لاتعداد مسڈ کالز تھیں۔

"فون سائیلنٹ پہ تھا"۔ اپنے فون کا والیوم اونچا کرتے ہوئے حذیفہ نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ اس کے اندر اس وقت خود سے جو جنگ چل رہی تھی' وہ نہیں چاہتا تھا اس کا اثر زینی پہ پڑے۔ اس لیے بہتر تھا کہ جب تک وہ سنبھل نہیں جاتا زینب سے فاصلے پہ رہے۔ یوں بھی آج کل وہ جس مایوسی اور قنوطیت سے گزر رہا تھا ایسے میں اس کا کسی سے بھی بات کرنے کا موڈ نہیں تھا۔

وہ عارض و لب بھلائے نہ بھولتے تھے۔ ان آنکھوں میں موجود ڈر' وہ خوف۔ دل کو بے قرار کیے جاتا تھا۔ بس ایک ہی لگن لگی تھی کہ یہ آنکھیں صرف ایک بار پھر اس نازنین کو دیکھ لیں۔ اس کی بکھری ہوئی سیاہ گھنی زلفیں' اس کا شفاف روپ' بے ریا آنکھیں اور اس کا محتاط انداز۔۔۔ حذیفہ کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس دن وہ لومبارڈ میں تھا۔ ایک میٹنگ اٹینڈ کر کے نکلا تو سوچا کیوں نہ لنچ بھی کر لے اور اسی لیے اس نے قریبی مال کا رخ کیا۔ وہیں اس لڑکی سے سامنا ہوا جو چہرے اور خدوخال سے مشرقی لگتی تھی۔ نہ تو اس کا لباس شاندار تھا اور نہ ہی اس کے لبوں پہ لپ اسٹک کی مصنوعی لالی تھی پھر بھی اس کی معصومیت اور حسن نے حذیفہ کے دل کا چین چرا لیا تھا۔

"بیٹھنے کا وقت نہیں ہے' میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔" اس کے انداز میں عجلت تھی۔

"لیکن کہاں؟"

زینی کا ضدی انداز اسے ہمیشہ ہی ناپسند تھا اور اس وقت تو وہ ویسے ہی پریشان تھا۔ روزانہ اسی وقت اس علاقے کا چکر لگا رہا تھا۔ اس آس پر کہ شاید وہ اسے دوبارہ نظر آ جائے اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھ لے۔ گو کہ بے وقوفانہ سوچ تھی پر اس کا دل اسے اس بے وقوفی پہ آمادہ کر چکا تھا۔

"ایک پارٹی میں۔۔۔ میرے سب فرینڈز ہوں گے وہاں۔ بس اب تم جلدی سے ریڈی ہو جاؤ کیونکہ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" زینب جانتی تھی وہ پارٹیوں کا شوقین نہیں۔ اس کی طبیعت کی سنجیدگی سے وہ اچھی طرح واقف تھی پھر بھی اسے ہر حال میں حذیفہ کو اپنے ساتھ لے کر جانا تھا۔

"زینب میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔ میں اس وقت ایک بہت ضروری کام کر رہا ہوں۔" اپنے کمپیوٹر کی اسکرین پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے اس نے انکار کیا۔

"کیا یہ کام مجھ سے زیادہ اہم ہے حذیفہ؟" وہ اس کے بالکل سامنے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سوال کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد تھا کہ حذیفہ اس کا مان نہیں توڑے گا۔ یہ سننے کی چاہ تھی کہ زینب اس کے لیے دنیا کی ہر شے سے زیادہ اہم ہے۔

"نہیں۔ تم سے اہم نہیں۔" حذیفہ نے اس کا مان رکھا تھا۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تو کیا ہوا وہ اس کی برسوں پرانی دوست بھی تو ہے۔ وہ اگر اس سے محبت میں امیدیں وابستہ کیے بیٹھی ہے تو ان امیدوں کو اسے ہی پورا کرنا تھا۔ وہ زینب کو دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"میں نیچے آنٹی کے پاس ہوں۔ جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔" وہ یک دم خوش ہو گئی تھی۔ حذیفہ نے اسے کمرے سے جاتے ہوئے دیکھ کر اثبات میں

سرہلایا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنا لیپ ٹاپ بند کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں گھر سے نکلے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ صبح سے موسم خوشگوار تھا۔ دن میں ہلکی سی دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی لیکن اب اچانک برف باری پھر سے شروع ہو چکی تھی۔ پارٹی زینب کی کسی یونیورسٹی فیلو کے گھر پہ تھی۔ اس رہائشی علاقے میں پچھلے کئی دن سے لگا تار حذیفہ کا چکر لگ رہا تھا۔ آج بھی تو وہ یہاں سے گزرا تھا۔ اپنی ناکامی کی ٹیس کو سینے میں محسوس کرتا وہ سنجیدگی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر زینب کو یہی لگا کہ وہ چونکہ اسے زبردستی کھینچ کر لائی ہے تو اسی لیے خاموش ہے۔ اس کی سنجیدگی کو محسوس کرتے وہ لاپروائی سے سڑک پہ بنے دو رویہ گھروں کو دیکھنے لگی۔ سڑک پہ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

"حذیفہ ایک منٹ گاڑی روکو۔" زینب کی آواز پہ چونک کر اس نے سڑک کے کنارے گاڑی پارک کی۔ اس سے کچھ کہے بغیر وہ تیزی سے گاڑی سے اتری تھی۔ حذیفہ نے انتہائی حیرت سے اسے فٹ پاتھ پہ لگے درخت کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اسی پل اس کی نگاہ فٹ پاتھ پہ گئی اور زینب کا یوں عجلت بھرا انداز اس کی سمجھ میں آگیا۔

عرشیہ برفیلی زمین پہ اوندھے منہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا پورا جسم سردی سے نیلا پڑا ہوا تھا۔

زینب نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ "اف میرے اللہ پتا نہیں زندہ ہے یا..." وہ حذیفہ کی طرف دیکھ کر بولی جواب پاس آ چکا تھا۔

"نہیں، زندہ ہے۔" حذیفہ نے نبض ٹٹولی۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ اب تک حذیفہ کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔

"شاید کوئی ایشین ہے۔ اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔" اس نے چونک کر زینب کو دیکھا۔ اس لڑکی کی مدد وہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن دل میں یہ بھی تشویش تھی کہ پتا نہیں ہے کون۔ یوں بھی یہاں سڑکوں پہ لاتعداد بے گھر لوگ گھومتے ہیں۔ ان میں بہت سے مجرم اور بے شمار دماغی مریض ہوتے ہیں۔ اب اللہ جانے اس کا شمار کس کیٹیگری میں ہوتا ہے۔

"حذیفہ اٹھاؤ اسے۔" زینب اسے سوچ میں مبتلا دیکھ کر تقریباً" چلائی تھی۔ اسے ایک انجان لڑکی کے لیے اتنا پریشان دیکھ کر وہ اچھا خاصا حیران ہوا تھا۔ بہرحال اس نے وہی کیا جیسا زینب چاہتی تھی۔ زینب نے پاس پڑا عرشیہ کا بیگ اٹھالیا۔ حذیفہ اسے گود میں اٹھائے گاڑی تک پہنچا اس وقت تک زینب گاڑی کا پچھلا دروازہ تیزی سے کھول چکی تھی۔ احتیاط سے حذیفہ نے عرشیہ کو گاڑی کی پچھلی نشست پہ لٹایا اور اس دوران اس کی نگاہ پہلی بار عرشیہ کے چہرے پر پڑی۔ گاڑی کے اندرونی حصے میں جلتی روشنی کے باعث وہ اسے بخوبی پہچان گیا تھا۔ وہ سُن رہ گیا۔ یہ وہی تھی جو چند دن پہلے اس کا چین سکون لوٹ کر لے گئی تھی۔ جسے دیوانہ وار ڈھونڈتا وہ ساری دنیا تیاگ چکا تھا۔ وہ اسے یوں ملے گی اسے گماں بھی نہ تھا۔

زینب اگلی نشست پہ بیٹھ چکی تھی۔ حذیفہ نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ لب سختی سے بھینچے آندھی طوفان کی طرح ڈرائیو کرتے وہ اسے لے کر نزدیکی اسپتال پہنچا تھا۔ فوری طبی امداد کی بدولت اس کی طبیعت میں واضح بہتری آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گاڑی بلندو بالا گھر کے سامنے آکر رکی۔ ڈرائیو وے سے اندر داخل ہوتے اس نے حیرت سے اس پرشکوہ عمارت کو دیکھا اور پھر اپنے ساتھ بیٹھی اس بے حد ماڈرن اور خوب صورت لڑکی کی سمت جس کی ہر ادا میں شہزادیوں سی آن بان تھی۔

"آپ خواہ مخواہ میری وجہ سے پریشانی اٹھا رہی ہیں زینب"۔ گاڑی سے اترتے ہوئے عرشیہ نے شرمندگی سے کہا۔ وہ عجیب مخمصے میں تھی۔ پتا نہیں اسے زینب کی مدد کی آفر قبول کرنی چاہیے تھی یا

نہیں۔

"بلاوجہ فارمل ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں؟ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تم میرے ساتھ رہو گی میرے گھر' تو بس یہ فائنل ہے۔" وہ شان بے نیازی سے بولی۔

ہوش میں آنے پر عرشیہ کی ذہنی حالت بہت بری تھی۔

"آپ نے کیوں بچایا مجھے' اچھا تھا وہیں برف کی قبر میں دفن ہو جاتی۔" وہ خود کو اسپتال میں پاکر حیران بھی ہوئی تھی۔ اور مایوس بھی۔ زینب نے ہمدردی سے استفسار کیا تو وہ پھٹ پڑی تھی۔ حذیفہ جو ڈاکٹر سے مل کر واپس پلٹ رہا تھا' عرشیہ کی آواز پر چونکا۔

"مایوسی اچھی بات نہیں ہے۔ پریشانیاں ہر کسی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ انسان کو اللہ پہ توکل کرنا چاہیے۔ شکر ہے میں اور میرے فیانسی وقت پہ آپ کو اسپتال لے آئے اور آپ کی جان بچ گئی۔" وہ اسے پیار سے سمجھانے لگی۔

"کیا کروں گی ایسی زندگی کا جو خود میرے اپنے لیے بھی بوجھ بن چکی ہے۔" عفان اور سدرہ نے جو قہر اس پہ ڈھایا تھا' اسی غم کا ماتم کرتی وہ پردیس میں انجان سڑکوں پہ بھٹک رہی تھی۔ بھوک اور برفیلی سردی اس کی برداشت سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے لیے ایک قدم چلنا بھی محال تھا۔ ہمت جواب دینے لگی تو فٹ پاتھ پہ درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ برف باری شروع ہوئی تو رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے۔

زینب کو مختصر الفاظ میں اپنی کہانی بتا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زینب نے اسے گلے لگا کر دلاسا دیا۔ حذیفہ باہر کھڑا سب سن رہا تھا۔ اس کا سر گھوم گیا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا جس لڑکی سے وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محبت کرتا ہے وہ اتنے دکھ میں مبتلا ہو گی۔

فی الحال اس نے اس کے سامنے جانے سے بھی گریز کیا تھا۔ یقیناً" وہ اسے پہچان جاتی اور یہ بات زینب کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی تھی۔ وہ بلاوجہ اس سچویشن کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"آپ کے والد؟ انہیں بھی تو اعتراض ہو سکتا ہے۔" لب کاٹتے اس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"یو مین ڈیڈی؟ انہیں میری کسی بات پہ اعتراض ہو۔۔۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ویسے بھی میں انہیں کال کر کے ساری بات بتا چکی ہوں۔ انفیکٹ وہ تو بہت خوش ہوئے میرے اس فیصلے سے۔" زینب نے اپنے والد کے متعلق جس اعتماد سے کہا عرشیہ کے اندر کا احساس محرومی جاگ گیا تھا۔ زندگی میں اور بہت سی محرومیوں کے ساتھ وہ ایک اس رشتے کے لیے بھی ترستی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اچانک نمی اتر آئی تھی۔ زینب نے اسے اداس دیکھا تو محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"جو ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ آج سے ایک نئی زندگی شروع کرو۔" زینب کے ساتھ اس نے گھر کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ۔۔۔ سامنے کھڑے دراز قامت اور وجیہہ شخص کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ناقابل یقین حیرت سے پھیل گئیں۔ مقدر اسے وہاں لے آیا تھا جہاں وہ مر کر بھی نہیں آنا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

مشہور انڈسٹریلسٹ شہزاد عالم کا اکلوتا' اعلا تعلیم یافتہ اور لائق بیٹا' رباب قاسم کو ایک نظر دیکھتے ہی اس پہ دل و جان سے فدا ہو گیا۔ رباب اس وقت تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی جب پہلی بار اس کی ملاقات زین عالم سے ہوئی۔ وہ ان کی یونیورسٹی میں اقتصادیات پہ اعزازی لیکچر دینے آیا تھا۔ رباب بھی آڈیٹوریم میں موجود تھی اور سب سامعین کی طرح وہ بھی زین عالم کی شخصیت اور لب و لہجے کی فین ہو گئی تھی مگر اس بات سے بے پروا کہ زین تو بس ایک نگاہ میں ہی اپنا دل ہار بیٹھا ہے۔ جب دل نے ٹھان لی تھی تو محبوب تک بھی پیغام پہنچانا لازمی تھا۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے زین نے زندگی میں کسی کی نہ نہیں سنی تھی۔ وہ فطرتاً" ضدی تھا۔ رباب کم عمر تھی اور اکلوتی بیٹی ہونے کے سبب لاڈلی ہونے

کے ساتھ ساتھ وہ بھی ضدی تھی۔ رباب کو اپنی شخصیت کے سحر میں گرفتار کرنا اسے اپنی محبت کا یقین دلانا اور اسے شادی کے لیے رضامند کرنا زین عالم کے لیے ہرگز مشکل نہ تھا کیونکہ رباب خود بھی اس کی طرف مائل تھی۔ اصل مسئلہ تھا شہزاد عالم کو رباب سے شادی کرنے کے لیے راضی کرنا۔

رباب کا تعلق ایک کھاتے پیتے متمول گھرانے سے تھا۔ اس کا بڑا بھائی شہود قاسم کچھ سال سے امریکا میں مقیم تھا اور رباب اپنے والد قاسم علی کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار رہی تھی۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، لیکن ایک سرکاری ملازم کی بیٹی کو اپنے شہزادے کی بیوی کے روپ میں دیکھنا شہزاد عالم کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھا۔

بات فقط اتنی ہی ہوتی کہ اپنے سے کمتر خاندان کی لڑکی کو اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی کی خاطر بہو بنا کر لانا ہے تو شاید شہزاد عالم جیسا مغرور انسان اس پہ ایک بار غور بھی کرتا، لیکن بات اس وعدے کی تھی جو انہوں نے اپنے قریبی دوست اور بزنس پارٹنر سے کیا تھا۔ زین عالم کی شادی شہزاد عالم کے دوست حبیب صدیقی کی اکلوتی ناز و نعم میں پلی بیٹی نائمہ کے ساتھ طے تھی۔ بات چیت دونوں دوستوں کے درمیان تھی پر زین کو اس وقت تک اس رشتے پر اعتراض نہیں تھا جب تک وہ رباب سے نہیں ملا تھا۔ جب سے اس نے رباب کو دیکھا تھا اس کے دل کا قرار غارت ہو گیا تھا۔ اسے ہر حال میں رباب سے شادی کرنا تھی۔ باپ اور بیٹے کے درمیان کی جنگ شدت اختیار کر گئی اور زین عالم اپنا گھر، اپنا رتبہ یہاں تک کہ اپنے باپ کو بھی چھوڑ کر رباب کی چوکھٹ پہ آکھڑا ہوا۔

قاسم کے لیے بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا، لیکن بات اصول کی تھی۔ انہیں زین کا یوں اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر چلے آنا جذباتی پن لگ رہا تھا۔ شہود بھی اس رشتے کے حق میں نہیں تھا۔ زین عالم کو اندازہ نہیں تھا اس کی پہچان، اس کی آن بان شہزاد عالم کے نام سے جڑی ہے اور خالی جذبات اور محبت بھرے دل کو کوئی نہیں پوچھتا۔ قاسم علی نے اس شادی سے صاف انکار کر دیا، لیکن رباب نے بغاوت کر دی۔ وہ زین کے ساتھ اپنا گھر چھوڑ کر چلی آئی اور دونوں نے شادی کر لی۔

شروع کے دن محبت کی دنیا کی رنگینی میں بسر ہوئے اس وقت دو کمروں کا ٹوٹا پھوٹا کرائے کا مکان بھی جنت لگتا تھا، لیکن جوں جوں حقیقت کا سامنا ہوا تو زندگی کی سختیوں نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ زین کو اپنی تعلیمی قابلیت پہ اتنا ناز تھا کہ معمولی نوکری قابل قبول نہ تھی اور بہت بڑی ملازمت ملنا مشکل تھا۔ دوستوں کا ساتھ بھی اس وقت تک رہا جب تک زندگی میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ آہستہ آہستہ مالی حالات اتنے دگرگوں ہو گئے کہ کئی جگہ سے قرض لینا پڑا مگر واپسی کی صورت نہ تھی۔ کئی مہینوں کی جدوجہد اور خواری کے بعد آخر ایک ڈھنگ کی ملازمت مل ہی گئی تھی۔ تنخواہ بہت زیادہ نہیں تھی، لیکن ترقی کی امید تھی۔ ویسے بھی ان حالات میں یہ بھی غنیمت تھا۔ قرض دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ زین کا ڈپریشن بھی۔ ان ہی دنوں رباب امید سے تھی۔ زندگی میں امید کی روشنی بڑھنے لگی تھی۔ زیدی کے پاس زین اپنی ملازمت سے مطمئن تھا۔ اس بات سے انجان کہ اس کے رئیس باپ نے اس کے لیے کون سا گڑھا کھودنا شروع کر دیا ہے۔

شہزاد عالم ہر کام میں اپنا نفع سوچنے کا عادی تھا۔ زین کی نائمہ سے شادی میں بھی اس نے فائدہ سوچا تھا۔ حبیب صدیقی اس کا بزنس پارٹنر تھا۔ اس کی اکلوتی اولاد اس کی ساری جائیداد کی اکیلی وارث تھی۔ عالم انڈسٹریز میں سب سے بڑا انویسٹر حبیب صدیقی تھا جو زین اور رباب کی شادی کے بعد سے سخت غصے میں تھا اور اب اپنا پیسہ عالم انڈسٹریز سے نکالنے کی بات کر رہا تھا۔ اس کے شدید ردِعمل کی ایک بڑی وجہ نائمہ کا زین سے منسوب ہونے کے بعد اس سے جذباتی وابستگی رکھنا بھی تھا اور شہزاد عالم کو حبیب صدیقی کی ناراضی سے ہونے والا نقصان کسی صورت گوارا نہیں

تھا۔

زین سے رباب کی شادی کو شہزاد عالم نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ کسی صورت اس نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا جو زین کی حماقت کی بدولت اس کا ہونے جا رہا تھا۔ حبیب صدیقی نے اسے اپنی بے عزتی جانا تھا۔ زین نے اس کی بیٹی کو ٹھکرایا تھا۔ وہ شہزاد عالم کے لیے کئی مسائل کھڑے کر سکتا تھا۔ شہزاد جانتا تھا زین کس طرح کی زندگی گزارنے کا عادی ہے' جب فکر معاش سر پہ پڑتی ہے تو سب عاشقی ہوا جاتی ہے اور وہ اس محبت کے بخار کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ زین کی پوری مانیٹرنگ کروا رہا تھا۔ وہ آگے۔

مہینوں بے کار پھرتا رہا تھا تو یہ اس کے اپنے باپ کی مہربانی تھی۔

شہزاد عالم نے حبیب صدیقی کو پورا یقین دلایا تھا کہ وہ جلد زین کو واپس لے آئے گا اور اس کی بیٹی ہی ان کے گھر کی بہو بنے گی۔ کام صبر آزما تھا اور اب تک کی پلاننگ بے کار جا رہی تھی۔ زین کے دل میں رباب کی محبت کی جڑیں مضبوط تھیں اور اسے ایک شاندار زندگی چھوڑنے کا ہرگز ملال نہیں تھا۔ باقی کی کسر خاور زیدی نے پوری کر دی تھی جب اس نے فقط شہزاد عالم کو نیچا دکھانے کے لیے اس کے اکلوتے بیٹے کو اپنی کمپنی میں ایک معمولی سی پوسٹ پہ ملازم رکھ لیا۔ زین کو اس بات سے ہرگز فرق نہیں پڑتا تھا' لیکن زیدی کی یہ حرکت شہزاد عالم کو طیش میں لے آئی تھی۔

ہر کاروباری شخص کی طرح زیدی نے بھی کمپنی کے ٹیکس ریٹرن میں سالوں سے جو ہیرا پھیری کی ہوئی تھی وہ سب شہزاد عالم کی بدولت منظر عام پہ آنے والی تھی ۔ زیدی نے اگر زین کو ملازمت شہزاد عالم کو نیچا دکھانے کے لیے دی تھی تو شہزاد عالم بھی اسے منہ کے بل گرانا جانتا تھا۔

سر سری گردان کرتا زیدی آج کل اس کے تلوے چاٹ رہا تھا۔ اس کے ایک اشارے پہ کسی حد تک جا سکتا تھا۔ آخر اسے بھی تو اپنی جاگیر بچانی تھی اور پھر وہی ہوا۔ زین کو دفتر سے نکلتے ہی پولیس نے گھیر لیا۔ وہ چور نہیں تھا' لیکن تمام جھوٹے شواہد پہلے سے موجود تھے۔ ان حالات میں اس کے پاس شہزاد عالم کی بات ماننے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اپنی پوری زندگی میں' میں نے اتنی آزمائشیں اور مشکلات نہیں دیکھی تھیں جتنی فقط گزرے ایک ڈیڑھ سال میں دیکھی ہیں۔ یہ سچ ہے مجھے تم اچھی لگتی تھیں اور اپنی ضدی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اپنے پاپا کا گھر ان کی دولت اور عیش و آرام چھوڑ کر تمہیں اپنا لیا تھا۔ تمہیں پانا میرے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا اور اس کے لیے میں کسی حد تک بھی جا سکتا تھا۔ مگر بیتے دنوں کی سختی نے کم سے کم میرے سر سے اس عشق کا بھوت اتار دیا ہے۔ طلاق کے کاغذات کے ساتھ کچھ رقم بھیج رہا ہوں جو تمہارے اور اس بچے کے لیے ہے۔ پاپا نے مجھے معاف کر دیا ہے' صرف اس شرط پہ کہ میں تم سے مزید کوئی تعلق نہ رکھوں۔ تم بھی اپنے والد کے پاس چلی جانا۔ والدین اپنی اولاد سے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکتے۔"

لرزتے ہاتھوں سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے خاکی لفافے میں بند اس کاغذ کے پرزے کو نکالا جو ان دونوں کی ڈیڑھ سالہ رفاقت کی موت کا پروانہ تھا۔ لفافے میں رکھے نوٹوں پہ ایک بھی نظر ڈالے بغیر وہ ایک ٹک بس اسی اسٹیمپ پیپر کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کی نمی پلکوں کے بند توڑ کر رخساروں پہ بہنے لگی تھی۔ اپنے قریب لیٹے اس ننھے وجود کا رونا بلکنا بھی اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"میم..... میم۔" پاس کھڑی نرس اس کی ذہنی حالت سے انجان اس کی تین دن کی بچی کو گود میں لیے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہاں۔" اچانک وہ کسی خواب سے جاگی تھی۔

"آپ کے بل کلیئر ہو چکے ہیں۔ اگلے کچھ گھنٹوں میں آپ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔" اس کی گود میں

بردستی بچی تھما کر نرس اب وہاں سے جانے کے لیے تول رہی تھی۔ اسی نرس نے ابھی کچھ دیر پہلے رباب کو ایک بھاری بھر کم خاکی لفافہ لا کر دیا تھا جس میں زین کا خط اور طلاق کے کاغذات کے علاوہ ایک بڑی رقم بھی تھی۔

"یہ... یہ آپ کو... میرے شوہر نے دیا تھا؟" بے یقینی اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں چند بے ربط لفظوں سے اس نے تصدیق چاہی۔

"جی... جی وہ آئے تھے... وہ جی... وہ بل بھی انہوں نے ہی دیے تھے۔ ہاں جی وہ آپ کے شوہر ہی تھے۔" تھوک نگلتے ہوئے اس نے جھوٹ بولا۔ چور نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی وہ اگلے ہی پل وہاں سے غائب ہوگئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"کام ہوگیا؟" شہزاد عالم کو اسی کا انتظار تھا۔

"جی سر۔ وہ بس اب جانے ہی والی ہے۔" رباب سے جھوٹ بولنے کے لیے اسے ایک خطیر رقم ملی تھی۔ ایک چھوٹے سے کام کے بدلے اس کی چاندی ہوگئی تھی۔ شہزاد عالم کو اگر وہ انکار کر دیتی تو کوئی دوسرا یہ کام کرلیتا۔ پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے اور بے ضمیر لوگوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ شہزاد عالم کو معلوم تھا متوسط طبقے کی محرومیوں کا فائدہ کیسے اٹھا جاتا ہے۔ اسے ایمان داری اور سچائی کو خریدنا آتا تھا۔

"گڈ۔ یہ رکھ لو۔" نوٹوں کا ایک اور پیکٹ اس نے نرس کی طرف اچھالا۔ وہ بے یقینی سے ان روپوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا معاوضہ تو اسے پہلے ہی مل چکا تھا۔ پھر یہ مزید عنایت کیوں؟ پر شہزاد عالم اس فیاضی سے اس کے ہونٹوں کو ہمیشہ کے لیے سی دینا چاہتا تھا۔

✡ ✡ ✡

"مجھے پاپا کی شرط نہیں ماننی چاہیے تھی۔ مجھ سے واقعی بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ میں رباب اور اپنے بچے کے ساتھ اتنی بڑی زیادتی ہرگز نہیں کرسکتا۔" کمرے میں بے چینی سے ٹہلتا وہ خود کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

شہزاد عالم اسے اس شرط پہ اپنے ساتھ حوالات سے نکال لائے تھے کہ وہ رباب سے کبھی نہیں ملے گا۔ لیکن اس کا دل بری طرح بے چین تھا۔ وہ ایک نظر اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنے بچے کو اپنی گود میں اٹھا کر پیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ان دونوں کی زندگی بچانے کی خاطر بہت مجبوری میں کیا، لیکن پھر بھی اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔

"میں رباب سے مل کر اسے ساری بات سمجھا دوں گا۔ میں نے کس مجبوری میں پاپا کی شرط مانی ہے۔ یہ سب میں نے اس کی اور ہمارے بچے کی زندگی بچانے کے لیے ہی کیا ہے۔ وہ سمجھ جائے گی۔ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ میں اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتا بس کچھ وقت کی بات ہے پھر میں پاپا کو قائل کرلوں گا۔" وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اسے ہر حال میں آج ہی رباب سے ملنا تھا۔ شہزاد عالم اس وقت گھر پہ نہیں تھے اس لیے اس نے موقع غنیمت جانا۔ وہ جلد رباب سے مل کر واپس آجائے گا یہی سوچ کر وہ اسپتال پہنچا۔

وہ نہیں جانتا تھا اس کے باپ نے خط اور جھوٹے طلاق نامے کی بدولت رباب کو جیتے جی مار ڈالا ہے۔ وہ اسے وہاں نہیں ملی تھی۔ گھر پہنچا، مگر گھر لاک تھا۔ وہ وہاں بھی نہیں آئی تھی۔ وہ جا چکی تھی۔ کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ خالی ہاتھ شکست خوردہ واپس لوٹ آیا تھا۔

✡ ✡ ✡

ہیڈ نرس بانو کی ملازمت کا آج آخری دن تھا۔ کل سے اس کی ریٹائرمنٹ کا آغاز ہو رہا تھا۔ پچھلے بیس سال سے وہ گائنی ڈپارٹمنٹ کی انچارج تھی۔ رباب کے آپریشن کے بعد گاہے بگاہے وہ اس کی خیریت پوچھتی رہی تھی۔ شہزاد عالم کے بھیجے گئے خط اور طلاق نامے کو پڑھنے کے بعد رباب کی حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ رباب کی داستان سننے کے بعد وہ

کتنی دیر تو کچھ بول ہی نہیں پائی۔ چھوٹی سی بچی اور پھر وہ خود بھی بہت کمزور تھی۔ اللہ نے بانو کے دل میں رحم ڈالا وہ رباب اور اس کی بچی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی تھی۔

اندرون شہر دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ جوانی میں بیوگی کے بعد ابھی چند سال پہلے اس نے بیٹی کی شادی کردی تھی۔ وہ اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ پنڈی میں رہتی تھی۔ بانو نے بڑی محنت سے اس کی پرورش کی تھی --- اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اب اس عمر میں تنہا نہ رہے بلکہ اس کے پاس پنڈی آجائے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بھی اب بیٹی کے پاس جانے کا فیصلہ کیے بیٹھی تھی' لیکن رباب کی وجہ سے اس نے --- اپنا پروگرام موقتی طور پہ ملتوی کردیا تھا۔

''زندگی جائے امتحان ہے بیٹی' حوصلہ کرو۔ اگر تم ہی ہمت ہار بیٹھیں تو اس بچی کا کیا ہوگا؟'' رباب جب سے گھر آئی تھی' آنسو بہا رہی تھی۔

''تم کہتی ہو تمہارا شوہر تم سے بے تحاشا محبت کرتا تھا۔ دولت جائیداد سب چھوڑ چھاڑ کر آگیا تمہاری خاطر پھر یہ اچانک اسے واپسی کی کیا سوجھی؟''

''یہی پریشانی تو مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ مجھے یقین نہیں آتا زین میرے ساتھ ایسا کچھ کرسکتے ہیں۔ وہ مجھے کبھی طلاق نہیں دے سکتے۔''

رباب کی تو بس ایک ہی رٹ تھی کہ میرا دل نہیں مانتا کہ زین میرے ساتھ ایسا کرسکتا ہے۔ اسے زین پہ بہت بھروسا تھا۔ وہ اسے راستے میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یقین آتا بھی کیسے' ایک دو دن کی بات ہوتی تو وہ مان بھی جاتی' ڈیڑھ سال ان دونوں نے زندگی کی اونچ نیچ' بھوک اور مشکلات میں گزارے تھے۔ جب راہ محبت کی سختیوں میں اس پل قدم نہیں ڈگمگائے تو آج یہ کیسے ممکن تھا۔

''ابھی تو تمہیں آرام کی ضرورت ہے' ذرا حالت سنبھل جائے تو جاکر ملو اس سے' پوچھو تو سہی آخر اس نے اتنا ظلم کیوں کیا تمہارے ساتھ۔ پتا تو ہے نا اس کے باپ کے گھر کا تمہارے پاس؟'' بانو کو اس سے دلی ہمدردی تھی۔ وہ خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔

ویسے تو اس نے رباب کو اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا' لیکن اس نے صاف انکار کردیا۔ وہ ان حالات میں تو ہرگز اپنے باپ اور بھائی کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ زین کے لیے باپ کی محبت ٹھکرائی تھی' آج کس منہ سے ان کا سامنا کرتی' انہیں کیا بتاتی۔

''ایک ہفتہ ہوگیا رباب' ابھی تک بچی کا نام نہیں رکھا۔ کوئی نام سوچا کیا؟'' ننھی پری کو دیکھ کر اچانک بانو کو خیال آیا۔

''زین نے کہا تھا اگر بیٹا ہوا تو سمیر اور بیٹی ہوئی تو اس کا نام عرشیہ رکھیں گے۔'' اس ننھے وجود سے تو وہ خود بھی بے خبر تھی۔ وہ ساتھ ہوتا تو اس کی آمد کی خوشی مل کر مناتا۔ اسے زین کی خواہش کا خیال آیا۔

''عرشیہ زین عالم... نام تو بہت پیارا ہے۔'' شفقت سے ماتھا چومتے ہوئے بانو خالہ نے دہرایا۔

✵ ✵ ✵

تین ہفتے بڑی مجبوری میں گزرے۔ وہ تو ایک دن بھی نہ ٹھہرتی گر جسم میں اتنی توانائی ہوتی۔ بانو خالہ نے بڑی مشکل سے روکا' لیکن آج تو وہ ٹھان چکی تھی کہ ہر حال میں زین سے ملنے جائے گی۔ عرشیہ کو بھی ساتھ لے لیا حالانکہ بانو خالہ نے بہت سمجھایا کہ ابھی خود بیمار ہو اس معصوم جان کو کیسے سنبھالوگی پر وہ بچی کو وہاں چھوڑنے پہ رضامند نہ ہوئی۔ ایک عجیب سی بے اعتباری نے دل میں ڈیرے ڈال لیے تھے کہ جیسے اچانک زین سے جدا ہوگئی تو کہیں اولاد کی صورت بھی نہ دیکھ پائے۔ گو بانو خالہ ایثار و خلوص کا پیکر تھیں' مگر وہ اپنے اندر اٹھتے وسوسوں کا کیا کرتی جو حالات کی پیداوار تھے۔ محل نما کوٹھی کے داخلی دروازے پہ موجود چوکیدار نے اسے کوئی بھکارن سمجھ کر اندر نہیں جانے دیا۔ وہ ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھی تو مجبوراً اس نے انٹر کام پہ شہزاد عالم سے رابطہ کیا۔

''تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟'' وہ آتش فشاں بنے باہر

آئے تھے۔

"میرا تو سب کچھ آپ ہی کے پاس ہے۔" وہ بے اختیار بولی۔

زین اس وقت گھر پہ موجود نہیں تھا۔ شہزاد عالم نے اسے زبردستی آفس جوائن کرنے پہ راضی کر لیا تھا۔ اس دوران وہ رباب کو بھی تلاش کر رہا تھا، مگر اسے مستقل مایوسی کا سامنا تھا۔

"جسے تم بہکا کر مجھ سے چھین چکی تھیں، وہ تمہارا کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ سے میرا تھا۔ تمہارا ہوتا تو یوں دھتکار کر نہ آجاتا۔" تنی ہوئی گردن اور چہرے پہ بے تحاشا نفرت سجائے شہزاد عالم نے طنز کیا۔

"یہی تو پوچھنے آئی ہوں، راہ میں چھوڑ جانا تھا تو یہاں تک لایا کیوں۔ وفا نبھا نہیں سکتا تھا تو وفا کے وعدے کیوں کیے۔ اپنی اولاد کی شکل تک نہیں دیکھی۔" تڑپ کر بولی۔

"تم سے اور تمہاری اولاد سے میرے بیٹے یا اس گھر کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ سمجھیں تم!" شہزاد عالم نے دھتکارا۔ بہو کی گود میں اپنی اولاد کی اولاد دیکھ کر بھی دل موم نہیں ہوا تھا۔

"واسطہ تو آپ سے بھی ہے، لیکن اس وقت تو مجھے زین سے ملنا ہے۔" وہ بے سبب پتھر سے سر پھوڑ رہی تھی۔ اس شخص کا دل تو یوں بھی جذبات سے خالی تھا۔

"رئیس زادے جوانی میں ایسی غلطیاں کر گزرتے ہیں۔ چلو اچھا ہوا جلد عقل ٹھکانے آگئی۔" اسے یوں لگا جیسے اس کے منہ پر جوتا دے مارا ہو۔ "بیوی ہوں میں اس کی، اولاد ہے یہ زین کی کوئی غلطی نہیں۔" وہ حق دار تھی، بھکارن نہیں۔ شہزاد عالم کی باتوں سے اسے شدید دکھ ہوا تھا۔

"سنو لڑکی، ایک بات کان کھول کر سن لو۔ وہ تمہیں طلاق دے چکا ہے اور اتنا پیسہ بھی کہ اس بچی کی پرورش آسانی سے کر سکو گی۔ اس لیے یہاں اپنا اور میرا وقت ضائع کرنے کے بجائے دفع ہو جاؤ۔" اس کا اعتماد ایک پل کو شہزاد عالم کو ہلا گیا تھا۔ اس کی محبت کتنی زور آور تھی وہ اس کا تجربہ کر چکے تھے۔ زین اس کی زندگی بچانے کی خاطر اسے چھوڑنے پہ رضامند ہوا تھا اور اب اگر اپنی بچی کو دیکھ لیا تو یقیناً" اپنے وعدے سے پھر جائے گا۔ انہیں ہر حال میں رباب کو زین سے دور رکھنا تھا۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں آپ کی دولت پہ، نہیں چاہئیں مجھے یہ سونے کے سکے۔ اور میں زین سے ملے بغیر ہرگز واپس نہیں جاؤں گی۔" بیگ سے روپے نکال کر اس نے شہزاد عالم کے قدموں میں پھینکے۔ اور دروازے پہ رکھے سنگی بنچ پہ بیٹھ گئی وہ وہاں سے جانے کے لیے ہرگز نہیں آئی تھی۔ ٹھیک ہے جب تک زین نہیں آتا وہ یہیں اس کے گھر کے باہر بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گی۔ اس سے ملے بغیر اس سے اپنے سوالوں کا جواب لیے بغیر وہ نہیں جائے گی۔

"تم میری نرمی کا غلط مطلب نکال رہی ہو لڑکی۔ میرے بیٹے کو ورغلا کر پہلے ہی تم میرے بدترین دشمنوں کی فہرست میں شمار ہوتی ہو، میں نہیں چاہتا تم میرے عتاب کے زیر اثر آجاؤ۔ اب اگر زین سے ملنے کی ایک اور کوشش کی تو اپنی اولاد کی شکل پھر کبھی نہ دیکھ سکو گی۔" سیکورٹی آفیسر کو آنکھ کے اشارے سے پاس بلاتے ہوئے شہزاد عالم نے اعلانیہ کہا۔

باوردی اہلکار اسلحہ کی نال تانے اس کے سر پہ کھڑا تھا جب کہ اس کی بھوکی نظریں رباب کے جسم پہ گڑی تھیں۔ رباب کو ان نظروں سے گھن آرہی تھی۔ اپنی چادر درست کرتے اس نے نفرت سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ شہزاد عالم دھمکی دے رہا تھا پر اس کی آنکھوں میں دکھائی دیتی نفرت چیخ چیخ کر رباب کو بتا رہی تھی کہ اسے فقط دھمکی نہ سمجھا جائے۔ وہ شخص اپنے مفاد کی خاطر کچھ بھی کر سکتا تھا۔

"یہ آپ کا خون ہے۔" بے اختیار اس نے بچی کو سینے سے لگا لیا۔

"میرا خون اتنا گندا نہیں ہو سکتا۔ یہ تمہاری طرح نالی کی پیداوار ہے۔ تم نے اگر میری بات نہیں مانی تو یاد رکھنا، اس کا خون نالیوں میں بہتا ملے گا۔ زین سے دوبارہ ملنے کی کوشش کی تو اس کے اغوا کے جرم میں

تمہیں ساری عمر جیل میں سڑنا پڑے گا۔"

اسے واپس آنا پڑا۔ زین سے ملے بغیر' اس کی صورت دیکھے بنا وہ لوٹ آئی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ ان گزرے دنوں میں قیامت بن کر اس پہ ٹوٹا ہے اس کا ماسٹر مائنڈ شہزاد عالم ہے۔ زین اس کے ہاتھوں کا فقط مہرہ ہے۔ جو اس کے اشاروں پہ چل رہا ہے اور یقیناً" وہ اپنے باپ کے سامنے مجبور ہے۔ شاید آج رباب اس مجبوری کا پس منظر بھی جان چکی تھی۔ شہزاد عالم نے کھلم کھلا عرشیہ کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی' کیا پتا ایسی ہی کسی بات سے زین کو دباؤ میں لے رکھا ہو۔ دل پہ دھرا بوجھ کچھ اور بڑھا تھا۔ وہ موہوم سی امید کہ آج زین سے مل کر جدائی کی اذیت ختم ہو جائے گی ختم ہو گئی تھی۔ بوجھل قدموں سے گھر کو لوٹتی وہ بری طرح آنسو بہا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اللہ غارت کرے ایسے لوگوں کو' اتنی بے حسی' اتنا تکبر۔ میری تو روح کانپ گئی یہ سب سن کر۔" جس خوف اور تکلیف کے زیر اثر وہ واپس لوٹی تھی' اس کی صورت دیکھ کر بانو خالہ تو کانپ ہی گئی تھیں۔ بچی کو آگے بڑھ کر سنبھالا جو اس کی گود میں بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اسے پیار بھرے دلاسے دیے۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا نارمل ہوئی تو ساری بات روتے روتے ان کے گوش گزاری۔ ان کا تو اپنا دل دہل گیا تھا۔ کوئی ایسا سنگدل بھی ہو سکتا کہ اپنی پوتی کی جان لینا چاہے۔ وہ شہزاد عالم کو نہیں جانتی تھیں' وہ اس سے بڑھ کر خطرناک انسان تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ رباب کے ساتھ کیا گزرتا۔ اس سیکورٹی اہلکار کی نظریں وہ اب بھی فراموش نہیں کر پائی تھی۔

"رباب بیٹا' جو ہونا تھا ہو چکا' قسمت کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے۔ وہ اپنے گھر لوٹ گیا تو تم بھی اپنے ابا کے پاس چلی جاؤ۔" خالہ کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ان حالات میں اس بے سروسامانی کے عالم میں آخر یہ کم سن لڑکی جائے گی کہاں۔ وہ خود کوئی بہت رئیس نہیں تھیں پر غربت میں بھی دل وسیع تھا' لیکن انہیں بھی تو پنڈی جانا تھا اپنی بیٹی کے پاس اور یہاں جو حالات تھے ایسے میں رباب کو تنہا چھوڑنے پہ دل راضی نہیں تھا۔ کہیں وہ ظالم موقع دیکھ کر ان دونوں کو ختم ہی نہ کر دے۔

"اپنی خوشی کی خاطر انہیں دکھی کر کے چلی آئی تھی خالہ' آج اپنا دکھ لے کر ان کے پاس کس منہ سے جاؤں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"ماں باپ کے دل میں بہت وسعت ہوتی ہے۔ تمہیں معاف کر دیں گے۔" انہوں نے اپنے تئیں سمجھایا پر رباب نے فی الفور نفی میں سر ہلایا۔

"خالہ یہ ممکن نہیں' ایک بار پہلے بھی معافی مانگنے گئی تھی پر انہوں نے دھتکار دیا تھا۔ اس دن خود سے عہد کیا تھا دوبارہ اس در پہ کبھی نہیں جاؤں گی۔" اپنی ضد میں جس در کو خود پہ بند کر چکی تھی آج انا وہاں جانے سے روک رہی تھی۔ محبت نامی غلطی کرنے پر جو سزا پا چکی تھی اس کے بعد اس غلطی کا احساس دلاتی نظروں کی تاب نہ لا پاتی۔

"تو پھر اب تم کرو گی کیا۔ میرا مطلب تم تو جانتی ہو میں ریٹائر ہو چکی ہوں۔ اس ہفتے اپنی بیٹی کے پاس پنڈی جا رہی ہوں۔ پھر تم یہاں اکیلی کیسے رہو گی۔" بانو خالہ کی بات کو رد کر کے اس نے ان کی آخری امید بھی ختم کر دی تھی۔ بہتر تھا اب کھل کر بات کی جائے۔

"یہاں میرے لیے اب رکھا ہی کیا ہے۔ آپ نے پہلے بھی میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ میں آپ پہ بوجھ بالکل نہیں بنوں گی' ملازمت کر لوں گی۔"

رباب کی بات ان کے دل کو لگی تھی۔ ان چند ہفتوں میں یوں بھی انہیں عرشیہ سے بہت انسیت ہو گئی تھی۔ وہ دونوں کو لے کر پنڈی اپنی بیٹی کے گھر آ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"ویلکم' ویلکم۔ تو یہ ہیں آپ کی فرینڈ۔" آج سے

پہلے اس شخص کو اس نے تصویروں میں دیکھا تھا۔ وہ چند تصاویر جو اس کی ماں کی کل کائنات تھیں۔ جنہیں اس نے مرتے دم تک اپنے سینے سے لگائے رکھا تھا۔
"ڈیڈ یہ عرشیہ ہے اور عرشیہ' یہ میرے ڈیڈ ہیں۔ زین عالم!"
کتنی مدت بعد اس نے یہ نام سنا تھا۔ اس نام کی باز گشت وہ بچپن سے اپنے اردگرد سنتی آئی تھی۔ راتوں کو اس کی تصاویر سے باتیں کرتی اس کی ماں نجانے کتنی بار یہ نام دہراتی تھی۔ کبھی ہنستے' کبھی روتے ہوئے اس سے جانے کیا باتیں کرتی تھی۔ اکثر عرشیہ کو ان کی دماغی حالت پہ شک ہوتا تھا۔
"عرشیہ؟... بہت پیارا نام ہے۔" زین عالم کی آواز پہ چونک کر وہ ماضی سے نکل کر حال میں واپس آئی۔
ان کی آنکھوں میں گہری چمک اور چہرے پہ پُرسوچ سنجیدگی تھی جسے عرشیہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔
"صرف نام ہی نہیں' یہ خود بھی بہت پیاری ہے۔" زینب نے اسے محبت سے اپنے قریب کیا۔
وہ مسکرائے۔ "زینی نے مجھے آپ کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے' آپ کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیے جیسے زینی ہے ویسے ہی آپ ہیں۔ میں سمجھوں گا آج سے میری ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں۔"
عرشیہ نے اس پل ان کی طرف دیکھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ان کی مسکراہٹ آج بھی دل کو چھو لینے والی تھی۔ وہی شاندار شخصیت جو دل کی دھڑکن بڑھا دیتی تھی۔ وہ اپنی تصویروں میں بھی اتنے ہی شان دار لگتے تھے۔ کچھ بدلا تھا تو کنپٹیوں سے جھلکتے چند سفید بال جو ان پہ بہت سوٹ کر رہے تھے۔ ورنہ گزرے ماہ وسال کا شائبہ بھی نہ تھا۔
دولت اور خوشیاں انسان کو بوڑھا نہیں ہونے دیتیں' غربت اور غم وقت سے پہلے مار دیتا ہے۔ اسے اس پل اپنی ماں یاد آئی جس پہ ایک دم بڑھاپا آیا تھا۔
"زینب آپ کی اکلوتی بیٹی ہے کیا؟" وہ خود اس بے محل بے تکے سوال پہ حیران ہوئی تھی۔
"آف کورس۔ تمہیں بتایا تو تھا میں نے۔" ان سے پہلے زینب بولی۔ اعتماد اور یقین سے پُر لہجے میں ہنستے ہوئے اس نے عرشیہ کی طرف دیکھا۔
"اوہ ہاں میں بھول گئی تھی۔"
زین عالم خاموش رہے تھے۔ دل کو جس تصدیق کی آرزو تھی وہ پوری نہ ہو سکی تھی۔ وہ اس کے وجود سے غافل نہیں تھے بلکہ اسے مانتے ہی نہ تھے۔ وہ اسے اور اس کی ماں کو اپنی زندگی سے بیس سال پہلے نکال چکے تھے۔
"عرشیہ کو اس کے کمرے میں لے جاؤ زینی۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔" بہت سنجیدگی سے کہتے ہوئے۔ وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

اپنے کمرے میں آکر اس نے پاگلوں کی طرح اپنا سامان کھولا۔ بیگ میں اس کے چند معمولی کپڑے بھرے تھے جنہیں تیزی سے باہر نکالتے ہوئے اسے اپنی ڈائری مل گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے ڈائری کھولی اور چند صفحات پلٹے۔ دھندلائی آنکھوں سے اس نے ان تصویروں کو دیکھا اور انگلی کی پوروں سے اس شبیہہ کو چھوا۔ اتنے سال ان تصویروں میں باپ کو دیکھنے کے بعد آج اس نے اس کے جیتے جاگتے وجود کو دیکھا تھا۔
رباب نے شہر چھوڑنے سے پہلے اپنے اور زین کے گھر سے اپنا جو تھوڑا بہت سامان نکالا تھا اس میں یہ تصویریں بھی شامل تھیں۔ بانو خالہ کے ساتھ پنڈی پہنچ کر اس نے ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے تھے' اسے جلد ہی ایک اسکول میں نوکری مل گئی تھی' لیکن تنخواہ اتنی نہ تھی کہ وہ ایک بچی کا خرچا اٹھانے کے ساتھ ساتھ الگ گھر میں رہائش رکھتی۔ وہ تمام عمر بانو خالہ اور ان کی بیٹی پہ بوجھ نہیں بن سکتی تھی یہی سوچ کر اس نے ملازمت کے ساتھ نرسنگ کا کورس شروع کر دیا۔ بانو خالہ کی بدولت عرشیہ کی دیکھ

بھال بہت اچھے سے ہو رہی تھی۔ اسلام آباد کے اچھے اسپتال میں اس کی پہلی ملازمت کے ساتھ اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو گیا تھا۔ نرسنگ ہاسٹل میں عرشیہ کو ساتھ رکھنے کی اجازت اسے بانو خالہ کی سفارش کی بدولت ملی تھی۔ عرشیہ نے گزرے بیس سالوں میں اسے کبھی ہنستے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اکثر راتوں کو زین کی تصویریں نکال کر بیٹھ جاتی اور پھر ان سے باتیں کرتے کبھی ہنستی تو کبھی روتی۔ وہ اپنے غم سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی اور اسی غم میں گھلتے اس کے جسم کو کینسر جیسا گھن لگ گیا۔ عرشیہ سے یہ بات آخری وقت تک چھپائی گئی۔

"میں نے زندگی میں تمہیں ایسی کون سی خوشیاں دی ہیں جواب اپنی بیماری بتا کر غمگین کرتی۔" اس کے پوچھنے پہ کہ آخر اس نے اپنی بیماری کیوں چھپائی رباب نے عجیب توجیہہ پیش کی تھی۔ اپنی موت سے چند روز پہلے اس نے عرشیہ کو بتائے بغیر اپنے بھائی شہود سے رابطہ کیا تھا۔ ضد اور انا میں جن رشتوں سے بیس سال منہ موڑے رکھا تھا' انہیں اولاد کی محبت میں آواز دی تھی۔ شہود قاسم فوراً" پاکستان آئے تھے' عفان بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ بہن کو اس حال میں دیکھ کر تڑپ گئے تھے۔ وہ اس کا علاج کروانا چاہتے تھے' مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔ رباب کو بس عرشیہ کی فکر لاحق تھی کہ اس کے مرنے کے بعد عرشیہ اکیلی رہ جائے گی۔ یہی سوچ کر اس نے بھائی کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ عفان سے عرشیہ کا نکاح رباب کی مرنے سے پہلے آخری خواہش تھی جسے قاسم نے پورا کر دیا تھا۔ رباب کی موت کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ امریکا لے آئے تھے۔ رباب کی آخری یاد' اس کی اور زین کی تصویریں عرشیہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ یہاں آکر بھی زندگی اس کے لیے سہل نہیں تھی۔ ماں کی موت کا غم بھلائے نہ بھولتا تھا جب کہ دوسری طرف عفان کی بے رخی اور سدرہ ممانی کے مظالم اسے چین نہ لینے دیتے تھے۔ ماموں کی موت نے تو اسے دربدر کر دیا تھا۔ پر وہ قسمت آج اسے اس شخص کی چوکھٹ پہ لے آئی

تھی جس کی صورت سے بھی عرشیہ کو نفرت تھی۔ وہ اس کے ہر دکھ' ہر احساس کمتری کا ذمہ دار تھا۔ وہ اس کی ماں کا مجرم تھا۔ عرشیہ مرتے دم تک اس شخص کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور قسمت نے اسے زین عالم کے در پہ لا پہنچا تھا۔

"آپ میرے اور میری ماں کے مجرم ہیں میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" ان تصویروں کو سینے سے لگائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

✵ ✵ ✵

"کیا زینب آپ کی اکلوتی بیٹی ہے؟" دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔ یہ سوال خنجر کی طرح سینے میں پیوست ہوا تھا۔

کسی کی سسکیاں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔ اکیس سال سے وہ احساس جرم میں زندگی گزار رہا تھا۔ رباب اور عرشیہ کی زندگی بچانے کے لیے اٹھایا گیا قدم ان کی زندگیوں میں یہ قیامت لے آئے گا اگر وہ جانتا تو شاید اس معاملے کو خدا پہ چھوڑ دیتا۔ اپنے باپ کی بلیک میلنگ میں آکر اس نے رباب سے تعلق توڑنے کی حامی بھر تو لی تھی پر دل کو قرار نہیں آیا تھا۔

"اکیس سال ہو گئے تم سے بچھڑے رباب' یوں لگتا ہے ایک ایک پل ایک صدی بن کر گزرا ہے۔ دنیا کی اس بھیڑ میں نہ جانے تم اور میری بیٹی کہاں بھٹک رہے ہو گے۔" اس نے انہیں ہر جگہ تلاش کیا تھا لیکن وہ دونوں اسے نہیں ملیں۔ گھر کے تمام ملازمین شہزاد عالم کے وفادار تھے سو رباب کے گھر آنے کا قصہ بھی وہ آج تک نہیں جان پایا تھا۔ شہزاد عالم کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے اسے نائمہ سے شادی کرنا پڑی۔ رباب کو نہ ملنا تھی نہ ملی۔ وہ اس شہر میں ہوتی تو اسے ملتی۔

"مجھ سا بدنصیب کون ہو گا جو اپنی اولاد کی صورت بھی نہ دیکھ پایا۔" اپنے دل کا لاشہ اٹھائے وہ امریکا چلا آیا۔ شہزاد عالم نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا اس کے بعد ان کی موت تک زین نے ان سے بات نہیں کی۔ وہ

اولاد کی آواز سننے کو ترس گئے۔ نائمہ کی جذباتیت ہمیشہ ان کی زندگی میں زہر گھولتی رہی۔ "وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔" یہ وہ دکھ تھا جو نائمہ کی زندگی کا روگ بن گیا۔ ایک ایکسیڈنٹ میں چند سال پہلے اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ زینب اس کی زندگی کی واحد خوشی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں وہ اپنے غموں کو چند پل ہی سہی بھول جاتا تھا۔

زندگی بہت آگے نکل چکی تھی۔ عالم انڈسٹریز' بزنس کے آسمان کا چمکتا ستارہ بن چکی تھی۔ زین عالم نے خود کو کام میں غرق کر کے اس کاروبار کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں دنیا اسے رشک و حسرت سے دیکھتی تھی' مگر خود اس کی اپنی زندگی سکون سے خالی تھی۔ کھوکھلی تھی۔ ساری ساری رات جاگ کر وہ اپنی بے بسی کا ماتم کرتا تھا۔ سکون تو اسی دن زندگی سے جا چکا تھا جب رباب کا ساتھ چھوٹا تھا۔ اب تو بس رت جگے اور تاسف تھا۔

"جانتا ہوں' میں تمہارا گناہ گار ہوں' لیکن میں نے جو کچھ بھی کیا تم دونوں کی زندگی بچانے کی خاطر کیا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" بظاہر مطمئن اور کامیاب دکھائی دینے والے زین عالم کے اندر کا کرب کوئی جان سکتا تو پتا چلتا کہ اس کی زندگی میں کیا خلش اور کتنا ادھورا پن ہے۔

☆ ☆ ☆

آج اگر وہ شکاگو کی جگہ پنڈی میں ہوتی تو اپنے باپ کے احسان کا بوجھ اٹھانے کی بجائے اپنا کوئی بھی چھوٹا موٹا انتظام کر سکتی تھی۔ وہ اس کا شہر' اس کا ملک تھا جہاں کم ہی سہی' لیکن چند ایسے لوگ موجود تھے جن کی بدولت وہ اپنی رہائش و ملازمت کا کوئی نہ کوئی سلسلہ کر چکی ہوتی۔ ان ہی سوچوں میں گم وہ ٹیرس پہ کھڑی تھی جب اپنے پیچھے کسی کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔

"آپ؟" پلٹ کر دیکھا تو پیچھے حذیفہ کھڑا تھا۔ اتنے دنوں بعد بھی وہ اسے ایک نظر میں پہچان گئی تھی۔

"لچے لفنگے یاد رہتے ہیں آپ کو۔"

وہ اس بات کا مفہوم سمجھتی تھی۔ بے اختیار اس نے نچلا لب کاٹا۔

"طبیعت کیسی ہے آپ کی؟" اسے شرمندہ دیکھ کر حذیفہ نے فوراً" ہی بات بدل دی۔

"پہلے سے بہت بہتر ہے۔" وہ اسے یہاں دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

"حذیفہ تم یہاں ہو' میں سمجھی تم ڈیڈ کے پاس ہو۔" زینب اس کے پیچھے ٹیرس پہ چلی آئی تھی۔

"عرشیہ! یہ حذیفہ ہیں' میرے فیانسی۔ اس دن انہوں نے ہی تمہیں اسپتال پہنچایا تھا۔" ان دونوں کا مختصر تعارف کرواتے ہوئے زینب نے بے اختیار حذیفہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا حق جتاتا سا انداز عرشیہ واضح محسوس کر رہی تھی۔ دوسری طرف حذیفہ کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم غائب ہوئی تھی۔ ان دو دنوں میں اس کے متعلق سوچتے ہوئے وہ اپنے اور زینب کے تعلق کو تو سرے سے بھول ہی چکا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آرہا آپ کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کروں۔" اس کے لہجے میں احسان مندی کی جھلک تھی۔

"ڈونٹ بی سو فارمل۔ انسانیت نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" حذیفہ نے غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ زینب کے ہاتھ سے کھینچ کر پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ وہ لاپروائی سے پاس کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"ہوتی تو ہے پر لوگ اس کا مظاہرہ کم ہی کرتے ہیں۔ یہاں اپنوں سے مدد کی توقع کرنا عبث ہے۔" عرشیہ کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

وہ بہت سے رشتے ہونے کے باوجود دربدر بھٹک رہی تھی۔ شوہر نے نکاح جیسے پاک تعلق کی حرمت کو بھی پامال کر دیا' باپ تو اس کے وجود سے ہی انجان تھا۔

"پھر اس معاملے میں آپ کو میرا نہیں زینی کا شکر

گزار ہونا چاہیے کیونکہ سب کچھ اسی نے کیا۔" اس نے مسکرا کر سارا کریڈٹ زینب کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور یہ ایک طرح سے سچ بھی تھا۔ اس سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود فقط انسانی ہمدردی یا دوسرے معنوں میں خون کی کشش تھی جو زینب اسے سڑک سے اٹھا کر گھر تک لے آئی تھی۔

"اچھا اب تم دونوں بس بھی کرو۔ یہ اتنی پر تکلف اور مشکل باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔" وہ دونوں ہی زینب کی بات سن کر بے ساختہ ہنسے تھے۔ زینب سے اپنا تعلق جان کر بھی وہ اس کے لیے دل میں منفی جذبات کو جگہ نہیں دے پائی تھی۔ اس نے بے لوث ہو کر عرشیہ کی مدد کی تھی اور وہ احسان فراموش نہیں تھی۔

"ہاں تھوڑا ٹیکنیکل پرابلم تو ہے نا۔" حذیفہ نے اسے چھیڑا۔

"اچھا سوری۔" زینب نے منہ بنایا تو حذیفہ نے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ کر معذرت کی۔

"آپ پلیز بیٹھیں۔ میں چائے کا بندوبست کرواتی ہوں۔" وہ دونوں پکچر پرفیکٹ تھے۔ بہانے سے وہ اس منظر سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

رات کے پچھلے پہر وہ بستر پہ کروٹیں بدلتی مضطرب ہوئی۔ یہ چھت جو اس کا وقتی آسرا تھی ظاہر سی بات ہے ہمیشہ تو میسر نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی عدت پوری ہونے تک یہاں وقت گزار سکتی ہے، مگر اس سے آگے اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ مجبوری حالات اسے زینب کا احسان لینے سے روک نہیں پائے تھے ورنہ اپنے رئیس باپ کے گھر میں رہنا ننگے پاؤں سنگریزوں پہ چلنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ کمرہ کشادہ اور وسیع تھا جو جدید طرز کے قیمتی سامان سے آراستہ تھا پر اس پل در و دیوار اسے کھانے کو آرہے تھے۔ وہ پریشان سی ہو کر کمرے سے باہر چلی آئی۔ شاندار زینے سے لاؤنج کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ عرشیہ یوں ہی ایک اسٹیپ پہ جا بیٹھی اور یک ٹک دھیمی روشنی میں لاؤنج کو دیکھتی رہی۔ اچانک اس کی نگاہ زین عالم پہ پڑی۔ شب خوابی کے لباس میں وہ شاید اپنی اسٹڈی سے نکل کر کمرے میں جارہے تھے۔ وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تم سوئیں نہیں اب تک۔" زین عالم اسے دیکھ چکے تھے۔

"نیند نہیں آرہی تھی۔" چار و ناچار اسے نیچے آنا پڑا۔ ان کے قیمتی ڈیزائنر چشمے سے جھانکتی پر کشش آنکھوں کی چمک اس پل ماند پڑ گئی تھی۔

"اچھا! نیند کے ساتھ ویسے میری بھی کچھ خاص بنتی نہیں ہے۔" آواز بہت دھیمی تھی۔

"دامن میں سکھ ہی سکھ ہیں پھر بھی یہ رت جگے۔" عرشیہ زیر لب بڑبڑائی پر وہ سن چکے تھے۔

"جس طرح ہر چمکتی شے سونا نہیں ہوتی بالکل اسی طرح ہر آسودہ حال اور بظاہر پرسکون دکھائی دینے والے انسان کا دامن خوشیوں سے بھرا نہیں ہوتا۔" ایک زخمی مسکراہٹ نے زین عالم کے لبوں کا احاطہ کیا۔

"آپ کو بھلا کیا غم ہے۔" وہ متعجب ہوئی۔

"ہوتے ہیں کئی غم ایسے جن کا مداوا تمام عمر نہیں ہو پاتا۔ تم نہیں سمجھوگی۔" انہوں نے سر جھٹکا۔

"سکون کیسے آئے گا بابا۔ آپ کے ظلم کی زندہ مثال، آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ آپ کے دیے درد کو سہتی میری ماں کتنی تکلیف سے اس دنیا سے رخصت ہوئی ہے۔ وہ زہر جو آپ نے محبت کے نام پر اس کی زندگی میں گھولا تھا اسے قطرہ قطرہ پیتے ہوئے میں نے انہیں دیکھا ہے۔" اس نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اپنی اور ماں کی اذیت و تنگ دستی اس پل نگاہوں کے سامنے تھی۔

"عرشیہ!" وہ چونکی۔ "تمہارا نام کس نے رکھا تھا؟" اسے زین عالم کے سوال پہ حیرت ہوئی۔

"میری امی نے۔" جواب برجستہ آیا تھا۔

"بہت پیارا نام ہے۔ بہت بہت پیارا نام ہے۔" انداز کھویا کھویا اور خود کلامی والا تھا۔ عرشیہ کو لگا وہ اس پل یہاں موجود نہیں ہیں۔

"شکریہ۔" وہ جلدی سے واپس سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"بابا۔" خود کو کمرے میں بند کر کے اس نے کئی گہرے گہرے سانس لیے۔ جس گھٹن کو کم کرنے وہ وہاں گئی تھی زین عالم کی باتوں نے اس میں چار گنا اضافہ کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

واہموں کی شدت میں
وسوسوں کا میلہ ہے
ملگجی اداسی میں
ایک تن اکیلا ہے
ہجر کی سیاہ راتیں
اذیتوں کی برساتیں
زندگی کا تحفہ ہیں
عشق کی مداراتیں
کوئی ہمنوا ہے نہ
کوئی سائباں میرا
آج چھوڑ بیٹھا ہے
مجھ کو رازداں میرا
خواہشیں بھی بکھری ہیں
چند ٹکڑے دل کے ہیں
میرے پاس یادوں کی
اک حسین محفل ہے
رات کی یہ تاریکی
آسماں پہ طاری ہے
ایک ایک لمحہ بھی
جاناں، جاں پہ بھاری ہے
میں بھی جاناں تنہا ہوں
اک اداس کمرے میں
زندگی سسکتی ہے
اک اداس کمرے میں

کافی کا کپ تھامے وہ لان میں واپس آئی تو حذیفہ اس کی ڈائری کھولے کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ڈائری اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ چہرے پہ ناراضی لیے اس نے شکوہ کناں نظروں سے حذیفہ کی طرف دیکھا۔

"معذرت چاہتا ہوں" آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی ڈائری پڑھ لی۔" اس نے مسکراتے ہوئے معذرت کی۔

"بغیر اجازت کسی کی ذاتی ڈائری پڑھنا بد اخلاقی کہلاتا ہے۔" برسوں سے اس ڈائری میں اپنے جذبات تحریر کرتی آئی تھی۔ یوں کسی کے سامنے ان کا عیاں ہونا خود کو بے پردہ کرنے کے مترادف تھا۔

"میں اس جرم کے لیے پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں۔" اس نے جھک کر دوبارہ معذرت کی۔

عرشیہ کو اس کا انداز سلگا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں حذیفہ کی نظروں سے اسے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ وہ ان میں چھپے طوفان سے ڈرتی تھی۔ کم سنی میں زندگی کے نشیب و فراز سے گزری تھی۔ اتنا تو سمجھ ہی سکتی تھی کہ حذیفہ کی نظریں کیا پیغام دے رہی ہیں۔ گو اس کا انداز محتاط تھا پر عرشیہ کو سامنے پا کر اس کی بے اختیاری بڑھ جاتی تھی۔

"زینب گھر پہ نہیں ہے۔" اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"میں انتظار کر سکتا ہوں۔" لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر وہ بیٹھ چکا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تو مزید تپ گئی۔

"بہتر ہے۔ تو پھر آپ یہاں اس کا انتظار کیجیے، میں اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔" ایک ہاتھ میں ڈائری دوسرے میں کافی کا مگ تھامے وہ پیر پٹختی لاؤنج کی طرف بڑھی۔ ڈائری میں رکھی تصاویر سبز گھاس پہ بکھر گئی تھیں۔ وہ یک دم حواس باختہ ہوئی۔ تیزی سے جھک کر تصویریں اٹھاتے وہ حذیفہ کی نگاہوں سے انہیں پوشیدہ نہیں رکھ سکی۔

"زین انکل؟" اپنے قریب گری ایک تصویر کو جھک کر اٹھاتے ہوئے حذیفہ دم بخود رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے جلدی سے تصویر چھین کر اس نے واپس

ڈائری میں رکھی۔
"عرشیہ رکو"۔ حذیفہ نے اسے روک لیا تھا۔
"زین انکل کی تصاویر تمہارے پاس کہاں سے آئیں۔ کیا تعلق ہے تمہارا ان سے؟" یہ معمہ حل کیے بغیر وہ اسے کس طرح جانے دیتا۔
"میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ غصے سے بولی۔
"یہ تو کچھ پرانے زخم اور چند تلخ یادیں ہیں جو اب ناسور بن چکے ہیں۔" لان میں داخل ہوتے زین عالم کی سماعت سے ٹکراتی عرشیہ کی زہرخند آواز نے ان کے قدموں کو جکڑ لیا تھا۔
"اسے میری خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی پر یہ بھی ایک کڑوی سچائی ہے کہ وہ صرف زینب کے ہی نہیں میرے بھی باپ ہیں۔ یہ اور بات ہے انہوں نے میرے وجود کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔" لہجے میں بے بسی در آئی تھی۔
"اوہ۔ تو تم....." اس نے سر تھام لیا۔
"محبت کے نام پر ان کی عیاشی کی نشانی جسے وہ اکیس سال پہلے ٹھکرا چکے ہیں۔" ان کی وہاں موجودگی سے بے خبر وہ حذیفہ سے اپنی زندگی کی اس تلخ ترین سچائی کا اعتراف کررہی تھی جسے پچھلے کئی دن سے تنہا یہ جھیل رہی تھی۔
"یہ تو قسمت مجھے ان کی چوکھٹ پہ لے آئی ہے ورنہ انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ان کی مفلوک الحال بیوی اور بدقسمت بیٹی زندہ بھی ہیں یا مرگئیں۔"
اس ایک پل نے زین عالم کی برسوں کی تلاش ختم کردی تھی۔ جس اولاد کو جیتے جی دیکھنے کی امید چھوڑ چکے تھے وہ اتنے دن سے ان کے پاس موجود تھی۔ مگر جس محبت کرنے والی بیوی کی خاطر یہ زہر بھرے گھونٹ پیے تھے وہ ان کی جدائی کی تڑپ کو سینے سے لگائے دنیا سے جاچکی ہے' اس خبر نے انہیں بے موت مارا تھا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا اس وقت بیٹی کے ملنے کی خوشی منائیں یا جیون ساتھی کی جدائی کا ماتم کیا جائے۔
"عرشیہ! میری بچی"۔ اس سے زیادہ برداشت اب اس دل بے قرار میں نہیں تھی۔ وہ اسے سینے سے لگانے کو بے چین ہوئے تھے۔ عرشیہ اور حذیفہ دونوں ہی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ چہرے پہ دکھ اور خوشی ساتھ ساتھ جھلک رہی تھی۔ یقیناً" وہ ان دونوں کی گفتگو سن چکے تھے۔
"یہ میری بیٹی ہے۔ میری اور رباب کی عرشیہ۔" وہ بے اختیار اس کی طرف لپکے۔
"نہیں ہوں میں آپ کی بیٹی' کوئی تعلق نہیں ہے میرا آپ سے" ۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔
"ایسے مت کہو۔ یہ دل ناتواں اب مزید دکھوں کی تاب نہ لا سکے گا۔" انہوں نے التجا کی۔ پیار سے عرشیہ کا ہاتھ تھاما لیکن اس نے غصے سے جھٹک دیا۔ بیس سال کی شکایات بیس لمحوں میں ختم نہیں ہوسکتیں۔
"زین انکل سے تمہاری شکایات بجا ہیں پر تم ان سے بے وجہ بدگمان ہورہی ہو۔" وہ بانہیں پھیلائے کھڑے تھے پر عرشیہ نے منہ پھیر لیا۔ حذیفہ کو ان کی تذلیل گوارا نہ تھی۔ وہ اس وقت جتنے دل برداشتہ دکھائی دے رہے تھے ان سے تو ڈھنگ سے بات بھی نہیں ہوپارہی تھی۔ مجبوراً" حذیفہ کو ہی ان کے دفاع کے لیے میدان میں اترنا پڑا۔
"اور یہ بات آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟" اسے تعجب ہوا تھا۔
"اس لیے کہ ان کے ماضی کے حوالے سے میں اور میری فیملی سب کچھ جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ زینب بھی اس بات سے واقف ہے کہ زین انکل پہلے بھی ایک شادی کرچکے ہیں"۔ عرشیہ کے لیے یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی ماضی کی بھول تصور کرکے وہ اسے اور اس کی ماں کو بھلا چکے ہیں۔ اس ملک میں ان کی شناخت فقط وہی نئے رشتے ہیں جو ان کے اردگرد موجود ہیں۔
"پندرہ سال سے ہم فیملی فرینڈ ہیں۔ میرے پاپا اور انکل بہت نزدیک تھے۔ بظاہر بہت مضبوط اور پرسکون دکھائی دینے والا یہ شخص اندر سے کتنا ٹوٹا اور بکھرا ہوا ہے یہ ان کے اردگرد رہنے والے لوگوں کو نہیں

معلوم۔ یہاں تک کہ زینب کے سامنے بھی وہ خود کو کمزور ظاہر نہیں کرتے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ان سب باتوں کا کیا جواب دے۔ زین عالم سر جھکائے کھڑے تھے۔ آسرے کے لیے انہوں نے کرسی کی پشت کو تھام رکھا تھا۔ قطرہ قطرہ اترتی شام بھی ان کے چہرے کی وحشت کو چھپا نہیں پائی تھی۔

"ان کی خاموشی پہ مت جانا عرشیہ! ان کے اندر کے طوفان سے تم واقف نہیں ہو۔" زین نے سہارا دے کر انہیں کرسی پر بٹھایا۔

"اور آپ اس درد کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو میری امی نے سہا ہے۔" اس کے دل میں بہرحال اب بھی اس شخص کے لیے رحم کے جذبات نہیں تھے۔ تصویر کا جو رخ اس نے تمام عمر دیکھا تھا اسے سوچتی تو ان کے لیے دل میں فقط نفرت باقی رہ جاتی تھی۔

"ان کے سینے میں بھی اتنا ہی درد ہے جو سالہا سال تم اپنی والدہ کی آنکھوں میں دیکھتی رہی ہو۔" سینے پہ ہاتھ باندھے وہ منہ موڑے کھڑی تھی۔ زین عالم نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ پلٹی نہیں۔ انہوں نے بے بسی سے سر کرسی کی پشت پہ ٹکا لیا۔

"میں نہیں مانتی۔ میری ماں محبت کے نام پہ کھائے دھوکے کے باوجود زین عالم کے لیے تاعمر تڑپتی رہی۔ وہ جو لفظ الفت کے معنی بھی نہیں جانتا۔" عرشیہ اس پل کچھ بھی سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔ آنکھوں کے سامنے بس ایک ہی منظر تھا۔ اپنی ماں کا دکھوں سے چور وجود۔ اسے اس پل سامنے بیٹھے شخص کے اندر کا کرب کیسے نظر آسکتا تھا جب ماں کو پل پل تڑپتے دیکھا ہو۔

"تو تمہیں لگتا ہے یہ جذبہ یک طرفہ تھا؟ حذیفہ نے کہنی سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

صرف وہ ہی نہیں یہ شخص بھی ان کے فراق میں آہیں بھرتا رہا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے ترستا رہا ہے۔ خود کو اذیت دیتا رہا ہے۔" عرشیہ نے سامنے بے بس اور آبدیدہ بیٹھے زین عالم کو دیکھا۔

"مرتے دم تک امی انہیں یاد کرتی رہیں۔ فقط اس خوف سے کہ میں تنہا کیسے رہوں گی انہوں نے زندگی میں پہلی بار ماموں کو کال کی' ان سے مدد مانگی۔ اپنی انا کو کچل کر ان سے میرے لیے بھیک مانگی۔ آج جو کچھ میں نے سہا ہے اس کی وجہ صرف آپ ہیں"۔ گھٹنوں کے بل ان کے سامنے بیٹھی وہ اس پل ایک بچے کی طرح رو رہی تھی۔

"مت کرو مجھ سے اتنی نفرت میری بچی' اس جرم محبت کی اور کتنی سزا باقی ہے یارب؟" اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ کرب سے بولے۔

"تم نے اور رباب نے اپنی برداشت سے بڑھ کر دکھ سہا ہے۔ میرے جیتے جی میری اولاد یتیموں سی زندگی بسر کر رہی ہے یہ سوچ مجھے پل پل مارتی رہی ہے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ سے تم دونوں کے لیے دعائیں کرتا رہا ہوں۔ تمہاری تلاش میں میں کہاں کہاں نہیں بھٹکا"۔ زین عالم نے شروع سے آخر تک تمام قصہ کہہ سنایا۔ عرشیہ کچھ باتیں جانتی تھی اور کچھ سے ناواقف تھی۔ شہزاد عالم کی رکھی شرط اور زین کی بے بسی سے تو خود رباب بھی واقف نہیں تھی۔

وہ کہتے رہے' عرشیہ سنتی رہی۔ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

"اپنے اس بدقسمت معاف باپ کو معاف کردو میری بیٹی"۔ کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی زین عالم نے بے اختیار اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بابا"۔ عرشیہ نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ اکیس سال بعد اسے یہ لمحہ میسر آیا تھا۔ حذیفہ چند پل وہاں ان دونوں کو خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا اور پھر دبے قدموں لان سے نکل گیا۔ وہ باپ اور بیٹی کے اس ملن میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

رباب کے جانے کا دکھ' وہ اور زین دونوں ہی سہہ رہے تھے پر عرشیہ پہ زندگی یوں مہربان ہو گی اس نے

اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ باپ کی شفقت ملی تھی تو زینب نے بھی سگی بہنوں کی طرح سینے سے لگایا تھا۔ ایک لمحے کو بھی عرشیہ کو بھی اس سے اجنبیت یا سوتیلے پن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ اس سے چھوٹی تھی لیکن جس ماحول کی پروردہ تھی اس کے پاس اعتماد کی دولت تھی اس کے برعکس حالات کے دھکوں نے عرشیہ کو ڈرپوک اور دب کر رہنے والی بنا دیا تھا۔ اس کی تعلیم بھی اس سے کم تھی۔ زندگی نے بہت کم عمر میں اس پہ بہت زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا۔

زینب کی محبت نے اسے ان حالات میں بہت حوصلہ دیا۔ عرشیہ کی عدت چل رہی تھی۔ اسی لیے زینب نے اپنی اور حذیفہ کی منگنی کی تاریخ ہی آگے بڑھا دی تھی۔ زین عالم کو بھی ایک بیٹی کی اداسی میں دوسری کی خوشیاں منانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چند دن بعد زینب اور حذیفہ کی منگنی تھی۔ زینب کی اپنی مصروفیات تھیں۔ زین عالم نے حذیفہ سے اسے یونیورسٹی لے جانے کا کہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی پر زین عالم کو انکار کرنا مناسب نہ لگا۔ گاڑی واپس گھر کی جانب رواں دواں تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اسی نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

"آپ کو میری وجہ سے زحمت اٹھانا پڑی"۔ عرشیہ کا لہجہ بہت پُر تکلف تھا۔

"زین انکل کا حکم تھا سو میں حاضر ہو گیا۔ ان کے کہے کو ٹالنا مشکل ہے۔ ویسے میں خود کو خوش نصیب محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے کسی کام آسکا"۔

"وہ بہت بھروسا کرتے ہیں آپ پر، بہت مان ہے انہیں"۔ وہ اپنے گھر میں اس کی اہمیت سے بخوبی واقف تھی۔

"سالوں سے ہم ایک فیملی کی طرح ہیں۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد بہت ساتھ دیا ہے انہوں نے ہمارا۔ وہ نہ ہوتے تو شاید زندگی اتنی آسان نہ ہوتی"۔ حذیفہ کا ان سے لگاؤ اور عقیدت وہ اس دن بھی دیکھ چکی تھی جب وہ ان کے دفاع میں بولا تھا۔ وہ ان کا دل سے احترام کرتا تھا۔

"ویسے پڑھائی شروع کرنے کا فیصلہ قابل ستائش ہے آپ کا۔ گھر بیٹھے خواہ مخواہ کی سوچوں میں وقت ضائع کرنے سے بہت بہتر ہے انسان کچھ تخلیقی کام کرے"۔ یک دم اس نے بات بدل دی۔

"زندگی نے کم وقت میں کئی سبق دیے ہیں۔ میں اب خود کو اس مقام تک لے جانا چاہتی ہوں جہاں مجھے کسی آسرے کی ضرورت نہ رہے۔" اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی اور اس کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ وہ پڑھائی شروع کردے۔

"اور شادی... میرا مطلب شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟" زین عالم کی خواہش تھی زینب سے پہلے وہ عرشیہ کی شادی کردیں۔ وہ اس کا گھر بستا دیکھنا چاہتے تھے لیکن عرشیہ نے انہیں فی الحال منع کر دیا تھا۔

"میری زندگی میں اب ان سب باتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ لب بھینچے بولی۔ ایک سال اس نے جانوروں سے بدتر سلوک سہا تھا۔ ایک حسین زندگی بتانے کا ہر خواب آنکھوں میں ہی دم توڑ گیا تھا۔

"ایک غلط انسان سے اٹھائے گئے برے اور تلخ تجربے کی بنا پر خوشیوں کے دروازے مقفل کر لینا میرے نزدیک عقلمندی نہیں حماقت ہے"۔ وہ محتاط انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ نگاہ سڑک پہ تھی پر سارا دھیان عرشیہ کی سمت تھا۔

"خوشیاں تو یوں بھی مجھے راس نہیں۔ برسوں بعد بابا ملے ہیں بس میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ ویسے بھی ایک طلاق یافتہ لڑکی سے کون شادی کرے گا"۔ اس کے لبوں پہ ایک زخمی مسکراہٹ ابھری۔

"وہ جسے تمہاری چاہت ہوگی"۔ وہ برجستہ بولا۔

"میری چاہت بھلا کون کرے گا۔ کس کے پاس اتنا بے کار وقت ہے"۔ چلتے چلتے حذیفہ نے گاڑی نزدیکی پارکنگ میں روک لی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ وہ پورا کا پورا اس کی طرف گھوم گیا تھا۔

"عرشیہ کیا تمہیں واقعی اپنی اہمیت کا بالکل اندازہ

نہیں ہے؟" حذیفہ کی باتیں اس کا انداز اسے ذہنی طور پر پریشان کر رہا تھا۔

"میرے دل نے تم سے پہلے اتنی شدت سے کوئی آرزو نہیں کی"۔ وہ خود سے لڑتے لڑتے تنگ آچکا تھا۔ دو کشتیوں میں سوار زندگی کبھی پار نہیں لگ سکتی۔ عرشیہ کو دل میں بسا کر وہ زینب سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے کبھی خوش نہیں رکھ پائے گا۔ یہ اس کا ضمیر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کیونکہ عرشیہ کے بغیر وہ کبھی خوش نہیں رہ پائے گا۔ جو خود اندر سے خالی اور مضطرب ہو وہ کسی تشنہ کو کیسے آسودہ کر سکتا ہے۔

"حذیفہ! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ جس لمحے سے خوف زدہ تھی، آن پہنچا تھا۔ اسی لیے حذیفہ سے کتراتی تھی کہ کہیں اس کے کسی رویے سے حذیفہ کے جذبات کو بڑھاوا نہ ملے۔

"مجھے کہہ لینے دو۔ یہ وہ بات ہے جو میں اس دن سے تم سے کہنے کے لیے بے قرار ہوں جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک پل میری زندگی کا قرار لوٹ گیا تھا۔ اس دن سے سڑکوں پہ مارا مارا پھرتا تھا کہ شاید تم مجھے دوبارہ مل جاؤ۔ یہ تو قدرت کو ہی میرے حال پہ رحم آگیا اور تم سے یوں ملاقات ہو گئی"۔ حذیفہ کی آنکھوں میں لکھا پیام محبت، اس کی بے قراری اسے پہلی ملاقات سے یاد تھی۔

"فضول باتوں کی بھی حد ہوتی ہے۔ زینب میری بہن ہے اور آپ سے اس کا کیا رشتہ ہے 'یہ یقیناً' مجھے یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ شدید محبت کرتی ہے آپ سے"۔ وہ زینب سے خوشیاں چھین کر اپنے دامن میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

"لیکن میں نے اس سے کبھی محبت نہیں کی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو سچے دل سے چاہا ہے اور وہ تم ہو"۔ وہ آج سب کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔

"خوف آرہا ہے مجھے آپ کی باتوں سے۔ زینب کو یہ سب پتا چلے گا تو وہ کیا سوچے گی میرے متعلق۔ میں بہن ہو کر اس کے حق پہ ڈاکا ڈال رہی ہوں"۔ جس کی بدولت وہ آج آسودہ حال تھی، باپ کی شفقت، عزت و احترام اور گھر ملا تھا اسے دکھ پہنچانے کا تصور ہی اتنا بھیانک تھا کہ وہ سوچ کر کانپ گئی تھی۔

"اور جب وہ یہ جانے گی کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا فقط ممی کے دباؤ میں آکر اس سے شادی پہ رضامند ہوا ہوں۔ اس وقت وہ ہرٹ نہیں ہوگی کیا؟" وہ آج کوئی لحاظ رکھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ دل بغاوت پہ آمادہ تھا اور آج وہ بس دل کی سننا چاہتا تھا۔ عرشیہ سن سی رہ گئی۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں عرشیہ میں اس سے نہیں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ہم دونوں ایک ساتھ کبھی خوش نہیں رہ پائیں گے اور مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم زین انکل کی بیٹی ہو، زینب کی بہن یا کسی کی مطلقہ۔ میرے لیے تو تم سینے میں دھڑکتا دل ہو، میری سانسیں ہو کہ تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی ناممکن ہے۔" اس کی گود میں رکھا ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے عرشیہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ نگاہیں روح تک اترنے کی تاثیر میں رکھتی تھیں۔

"لیکن میں اپنے دل میں آپ کے لیے ایسے کوئی جذبات نہیں رکھتی۔ آپ سے میرا تعلق فقط زینب کے حوالے تک محدود ہے اور اس سے آگے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی۔" اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ وہ اب کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"عرشیہ! تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہیں۔۔۔" اس سفاکی پہ تڑپ کر حذیفہ نے اپنا ہاتھ اسٹیئرنگ پہ مارا۔ جو سب جان کر بھی انجان ہوا سے کیسے سمجھایا جا سکتا ہے۔

"پلیز حذیفہ مجھے گھر ڈراپ کر دیں ورنہ میں خود ٹیکسی لے کر چلی جاتی ہوں"۔ عرشیہ اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ مجبوراً" حذیفہ کو گاڑی گھر کی طرف موڑنی پڑی۔

☆ ☆ ☆

بہت دنوں سے دل میں دبا آتش فشاں باہر نکال تو لیا

تھا لیکن وجود کو خالی پن نے آ گھیرا تھا۔ وہ عرشیہ کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ چکا تھا لیکن وہ اس کی کوئی بات سننے اور سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ زینب کی خاطر اس نے حذیفہ کو دو ٹوک جواب دے دیا تھا۔ محبت کے شعلوں میں جلتا گھر پہنچا تو سامنے زنیرہ بیگم کو منتظر پایا۔

"زینی کیسی ہے؟" وہ بڑی مجبوری میں ان کے پاس بیٹھا تھا ورنہ اس وقت دل اتنا مضطرب تھا کہ کچھ کہنے سننے کی چاہ نہیں تھی۔

"ٹھیک ہی ہوگی۔" اس نے ٹکا سا جواب دیا۔ اس وقت زینب کا ذکر اسے مزید برہم کر گیا تھا۔

"کیا مطلب تم ملے نہیں اس سے 'بھائی صاحب کی طرف گئے تھے نا تم؟" وہ عرشیہ کے داخلے کے سلسلے میں یونیورسٹی گیا تھا۔ یہ بات زنیرہ بیگم کے علم میں تھی لیکن وہ اس خراب موڈ کی وجہ جاننے سے قاصر تھیں۔

"پتا نہیں میں باہر سے ہی واپس آگیا۔" اس نے جان چھڑائی۔

"حذیفہ چند دن میں تم دونوں کی منگنی ہونے والی ہے۔ تم ہو کہ دن بہ دن بے زار نظر آ رہے ہو۔ میں پوچھتی ہوں آخر ایسا کب تک چلے گا۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا آخر زینی میں کس بات کی کمی ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائیں۔ حذیفہ نے ماں کی طرف دیکھا جن کے چہرے سے ناراضی عیاں تھی۔

"کمی اس میں نہیں میرے جذبات میں ہے۔ آپ کیوں نہیں سمجھتیں میں اس سے محبت نہیں کرتا۔" وہ تقریباً" چلایا تھا۔ انکار کی اذیت سے گزر کر اب ماں کے سوال و جواب اسے مشتعل کر رہے تھے۔

"سب وقتی ابال ہے۔ شادی سے پہلے میں اور تمہارے پاپا ایک دوسرے کو ٹھیک سے جانتے بھی نہیں تھے۔ کیا ہمارے درمیان محبت نہیں رہی۔ تمہیں بھی ہو جائے گی۔" زنیرہ بیگم تحمل سے بولیں۔ ان کے نزدیک یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن حذیفہ کے لیے یہ ایسی جنگ تھی جو اس کے دل اور زنیرہ بیگم کے دماغ کے مابین چل رہی تھی۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا' دل میں کسی اور کی شبیہہ ہو تو نارسائی کا قلق وجود کے ٹکڑے ٹکڑے تو کر سکتا ہے پر آپ کسی اور شخص سے محبت نہیں کر سکتے۔" دل کسی صورت دماغ کے سامنے پسپائی اختیار کرنے پہ راضی نہیں تھا۔

"تم...... تم کسی اور میں انٹرسٹڈ ہو۔ یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ میں اسی دن بھائی صاحب سے معذرت کر لیتی۔" وہ شاکڈ تھیں۔ حذیفہ نے پہلو بدلا۔

"اس وقت میں بھی کہاں جانتا تھا وہ لمحہ بھر میں میرے وجود کو محبت میں جکڑ لے گی۔" کیسی بے بسی نے آ گھیرا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو حذیفہ 'خبردار تم اس سے پھر کبھی ملے۔ وہ جو بھی ہے بھول جاؤ اسے۔ یہ وقت اب ان باتوں کا نہیں ہے۔" ان کا تو سانس ہی رک گیا تھا۔ اس کا یوں الجھا الجھا پھرنا' زینی سے کترانا' سامنے ہو کر بھی غیر حاضر رہنا..... زنیرہ بیگم کو پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ جو بھی تھا انہیں اس میں حذیفہ کا ہی قصور نظر آ رہا تھا۔ رشتہ بھلے ان کی خواہش پہ پکا ہوا تھا لیکن کمٹ منٹ تو تھی نا پھر کیسے وہ کسی دوسری لڑکی سے مراسم رکھ سکتا تھا۔

"اسے بھولنا میرے اختیار میں نہیں ممی' تعلق نہ بھی رکھوں پھر بھی وہ نظروں کے سامنے رہے گی اور زینی سے شادی کے بعد تو وہ ہمیشہ قریب رہے گی۔"

"کس کی بات کر رہے ہو تم؟" وہ چونکیں۔

"عرشیہ!" اس نے بے بسی سے لب کاٹا۔

"او مائی گاڈ..... یہ سب کیسے؟..... کیا وہ بھی تمہیں؟" انہیں تو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو جانتی تھی کہ زینب اور حذیفہ کی منگنی ہونے والی ہے پھر اس نے حذیفہ کو اس پیش قدمی کی اجازت کیوں دی۔

"اسی بات کا تو رونا ہے۔ اپنے دل کے دروازوں پہ قفل لگا رکھا ہے اس نے۔ زینب کی خاطر میری

چاہت کو دھتکار رہی ہے۔" حذیفہ نے مختصراً" ساری بات بتادی تھی۔ عرشیہ سے پہلی ملاقات سے لے کر آج اس کے سامنے اپنا حال دل کہنے تک ہر بات۔ وہ خود کو بہت ٹوٹا اور بکھرا ہوا محسوس کررہا تھا۔

"سمجھداری کا تقاضا بھی یہی ہے۔ تم سے تو وہی لاکھ گنا سمجھ دار ہے۔ تم بھی بلاوجہ کی ضد سے باز آجاؤ۔" زنیرہ بیگم نے سکھ کا سانس لیا۔

"برسوں بعد اس گھر میں خوشیاں آئی ہیں۔ میں نہیں چاہتی تمہاری وجہ سے ان کو پریشانی ہو۔" انہیں سچ مچ فکر ہورہی تھی۔ حذیفہ کو حیرت ہوئی۔

"آپ میں سے کسی کو بھی میری فیلنگز کا احساس نہیں ہے۔ وہاں وہ اپنی ضد پہ اڑی ہے۔ زینب کے لیے میری سچی محبت کو ٹھکرا رہی ہے۔ میری جذبوں کی سچائی جان کر بھی انجان بنی ہے اور آپ...... ساری دنیا کی خوشیوں کی فکر ہے آپ کو سوائے اپنے بیٹے کے۔" حذیفہ اپنے اندر کے ادھورے پن کی بدولت تلخی کو روک نہیں پایا تھا۔ مضطرب سا وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ زنیرہ بیگم نے اپنا سر تھام لیا۔

✡ ✡ ✡

"ہیلو عفان!" کتنے دن بعد اس نے سدرہ کا فون اٹینڈ کرہی لیا تھا۔

"کیا بات ہے ماما' کیوں فون کیا ہے مجھے؟" لہجے میں بلا کی بے زاری تھی۔

"عفان پلیز! مجھے یہاں سے لے جاؤ' میرا دم گھٹتا ہے۔" وہ جلدی جلدی بولیں' خوف تھا کہیں وہ فون بند ہی نہ کردے۔

"ماما یہ ممکن نہیں۔" اس کا جواب دوٹوک تھا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں' تمہیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔" وہ منتوں پہ اتر آئی تھیں۔

"ماما جتنا میں آپ کو جانتا ہوں' آپ یہ سب عادتاً کرتی ہیں۔ پہلے عرشیہ اور اب ایلس...... لیکن ایلس عرشیہ نہیں ہے۔ آپ جب تک ہمارے ساتھ رہیں گی ہماری زندگی میں بے سکونی رہے گی۔" عفان نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"عفان! میں قسم کھاتی ہوں' میں تمہاری بیوی سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔ مجھے گھر واپس آنا ہے۔" وہ رونے لگیں۔

"پاپا کی سوشل سیکیورٹی آپ کو مل رہی ہے۔ اچھی خاصی صاف ستھری جگہ ہے۔ آرام سے رہیں اپنی عمر کے لوگوں میں۔ آخر یہ اولڈ ہوم اسی لیے تو بنے ہیں۔" وہ جتانے والے انداز میں بولا۔ سدرہ کو اس سے اس بے رحمی کی توقع نہیں تھی۔

"بوڑھے بیمار اور نفسیاتی لوگ بھرے پڑے ہیں یہاں۔ اردگرد موذی بیماریوں والے خون تھوکتے بڈھوں کو دیکھ کر مجھے لگتا ہے میں خود بھی کسی موذی مرض کا شکار ہوجاؤں گی۔" وہ بے ساختہ بولیں۔ عفان کی طنزیہ ہنسی ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

"کم آن ماما! یہ سب آپ کا وہم ہے۔ بلاوجہ مجھے پریشان کریں اور نہ خود پریشان ہوں۔ اور پلیز اب دوبارہ فون مت کیجئے گا۔ میرے پاس وقت ہوا تو خود ہی آپ سے ملنے چلا آؤں گا۔" فون بند ہوچکا تھا اور وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے بے یقینی سے کبھی اس اجنبی چار دیواری کو اور کبھی فون کو دیکھ رہی تھیں۔

اس کمرے میں تنہا رہتے ہوئے ان کا دم گھٹتا تھا۔ عفان اپنی من پسند لڑکی سے شادی کرکے آج اسی گھر میں رہ رہا تھا جہاں سے سدرہ نے عرشیہ کو دھکے دے کر باہر نکالا تھا۔ شادی کے چند دنوں بعد ہی ایلس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ سدرہ کے ساتھ نہیں رہے گی اور اس کی خوشی کی خاطر وہ ماں کو اس اولڈ ہوم میں چھوڑ گیا تھا جہاں اس شہر کے سنکی' بیمار اور زندگی سے اکتائے بے آسرا اور بے گھر بوڑھے اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہے تھے۔ زندگی جانے کتنی طویل تھی اور اس جہنم میں انہیں مرتے دم تک رہنا تھا۔

✡ ✡ ✡

پچھلے پانچ منٹ سے گاڑی میں بیٹھا وہ خود سے ایک جنگ کررہا تھا۔ زینب کی ضد تھی منگنی کا لباس لینے

اسے حذیفہ کے ساتھ ہی جانا تھا۔ زنیرو بیگم تو خود اب حذیفہ کے اس گھر میں جانے اور عرشیہ سے ملنے کے خلاف تھیں لیکن زینب کو انکار کرنا بھی مشکل تھا۔ خود کو سمجھاتے بجھاتے وہ گھر کے اندر داخل ہوا۔

"ابھی تو میں نے شاپنگ کرنا شروع بھی نہیں کی اور تمہارا چہرہ اتر گیا ہے۔" اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر زینب کو شرارت سوجھی۔ انگوٹھی خریدتے وقت بھی وہ کچھ ایسا ہی بے زار تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں میں تھوڑا ڈسٹرب ہوں"۔ حذیفہ اس وقت مذاق کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ اس کی ہلکی پھلکی شرارت کو نظرانداز کرتے اس نے انتہائی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"کیوں کیا ہوا؟" زینب بھی یک دم سنجیدہ ہوئی تھی۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ کچھ بزنس ایشوز ہیں۔ تم ریڈی ہو تو چلیں؟" اس نے موضوع بدلا۔

"میں ریڈی ہوں لیکن عرشیہ ابھی تک ریڈی نہیں ہوئی۔ کب سے کہہ رہی ہوں تیار ہو جائے اسے بھی ہمارے ساتھ جانا ہے آخر اسے بھی تو اپنی شاپنگ کرنی ہے نا لیکن وہ میری بات سن ہی نہیں رہی"۔ وہ چونکا تو کیا وہ بھی ساتھ چل رہی تھی۔

"یہ رہی میں" اسی وقت عرشیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح سادہ مگر دل کی دھڑکنوں کو بڑھاتی وہ حذیفہ کو قصداً اگنور کرتی فقط زینب کی طرف متوجہ تھی۔

"تم خود ہی بات کرو اس سے، اب کیا ہماری انگیجمنٹ یہ اس حلیے میں اٹینڈ کرے گی"۔ زینب نے ایک ساتھ دونوں کو مخاطب کیا۔

"اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں' یہ اپنی مرضی کی مالک ہیں" حذیفہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

وہ اگر اس کے وجود کی نفی کر رہی تھی تو پھر اپنا مان اور انا اسے بھی عزیز تھی۔ محبت میں مٹا جاسکتا ہے۔ خود کو فنا کیا جاسکتا ہے پر محبوب کے ہاتھوں تذلیل سہنا خود کو اپنی ہی نظروں میں گرائے جانے کے مترادف ہے۔

"لو وہ چلی بھی گئی"۔ اس نے ایک نگاہ حذیفہ کے سنجیدہ چہرے پر ڈالی۔ حذیفہ خاموش کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ زینب نے کندھے اچکائے۔

"میرا فون؟ شاید کمرے میں ہے۔ بس دو منٹ میں آتی ہوں"۔ اس نے یہاں وہاں نظر دوڑائی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ حذیفہ تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ کمرے میں تنہا رہ گیا۔

✵ ✵ ✵

کمرے میں آکر وہ سر پکڑ کر بیڈ پہ جا بیٹھی۔ کمرے میں کسی کے قدموں کی آہٹ پر اس نے سر اٹھایا۔ حذیفہ اس کے کمرے میں تھا۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا"۔ وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ہمارے درمیان کہنے اور سننے کے لیے کچھ نہیں ہے"۔ سینے پہ ہاتھ باندھے عرشیہ نے رخ موڑا۔

حذیفہ رکا نہیں۔ وہ اب اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ عرشیہ اپنے چہرے پہ جمی اس کی نگاہوں کی آنچ دیکھے بنا بھی محسوس کر رہی تھی۔

"تم اس لیے مجھ سے نالاں ہو کہ تم پہ اپنا حال دل کھول چکا ہوں۔ میرا گناہ اتنا ہے نا کہ پہلی بار تمہیں مال کے باہر دیکھ کر میں بے اختیار تمہاری طرف مائل ہو گیا۔ تمہیں چاہنے لگا"۔ اس نے بمشکل حذیفہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ کمرے کے اندر آتی زینب کے چہرے کا رنگ بدلا۔ حذیفہ کی آواز نے اس کے لبوں کی ہنسی چھین لی تھی۔

"دیوانہ وار سڑکوں پہ تمہارا سراغ ڈھونڈتے ہوئے مارا مارا پھرتا رہا اور تم ملیں بھی تو کہاں؟ اس شام تمہارے ادھ مرے وجود کو اسپتال لے جاتے ہوئے جانے کتنی بار مرا ہوں میں عرشیہ۔" وہ مزید بولا۔ عرشیہ نے نظریں جھکالیں۔ "اس سے بڑھ کر میرے ساتھ ظلم اور کیا ہوگا کہ میری بے بسی پہ ترس کھانے کے بجائے تمہیں مجھ پہ غصہ آرہا ہے۔"

خوف زدہ سی زینب نے کمرے کے اندر جھانکا۔ حذیفہ اس پل عرشیہ کے دونوں ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔

"میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب بھی وہی بات دہرا رہی ہوں۔ مجھے آپ کی داستان دل میں ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ کو میں فقط ایک حوالے سے جانتی ہوں۔ زینب کے حوالے سے۔ آپ میری بہن کے ہونے والے شوہر ہیں اس تعلق سے آپ میرے لیے باعث احترام ہیں"۔ عرشیہ نے اس کے ہاتھوں کو جھٹک دیا۔ بنا کسی ہچکچاہٹ کے وہ پختہ لہجے میں بولی۔ خود کو حذیفہ سے دور کرتے وہ چند قدم پیچھے چلی گئی۔ اس لمحے کمزور پڑ جاتی تو انجانے میں بہن کی نظروں سے گر جاتی۔

"اور اگر یہ حوالہ نہ رہے تو؟" اس کا انداز حتمی تھا۔

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے حذیفہ! وہ بہت چاہتی ہے آپ کو"۔ عرشیہ کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔

"لیکن میں تمہیں چاہتا ہوں عرشیہ۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"مت کریں مجھ سے ایسی باتیں۔ مدتوں بعد زندگی کی الجھنیں کم ہونے لگی ہیں تو آپ اسے ایک بار پھر الجھانے کی کوشش مت کریں۔ میری زندگی میں ان سب چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ دونوں ہاتھ باندھ کر اس نے منت کی۔

"محبت کے لیے انسان کے دل میں ہمہ وقت گنجائش موجود ہوتی ہے"۔ وہ ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔

"تو یہ گنجائش زینب کے لیے کیوں نہیں نکال لیتے۔ اپنے جذبات یک طرفہ محبت میں کیوں ضائع کر رہے ہیں"۔ اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔

"میری محبت اگر یک طرفہ ہوتی تو یہ دل کب کا پسپائی اختیار کر چکا ہوتا۔ میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں کہ تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جذبات نہیں۔" حذیفہ کے اس یقین پہ عرشیہ کی دھڑکن تیز ہوئی۔ عرشیہ نے نظریں چرائیں۔

"خواہ مخواہ باتوں کو الجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جائیے زینب آپ کی راہ دیکھ رہی ہوگی"۔ وہ چڑ کر بولی۔ "اور اگر مجھ سے واقعی محبت کرتے ہیں تو میری بات کا مان رکھیں، اسے کبھی اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے کہ آپ مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔ ہو سکے تو جلد زینب سے شادی کر لیں"۔ اس بار لہجہ التجائیہ تھا۔ زینب خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی۔ جو کچھ اپنے کانوں سے سن چکی تھی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی، اس کے بعد جانے وہ وہاں کھڑی بھی کیسے ہوئی تھی۔ عرشیہ کی بات سے وہ ہوش میں لوٹ آئی تھی۔

"لیکن میں اب حذیفہ سے شادی نہیں کرنا چاہتی"۔ زینب کی آواز پہ عرشیہ نے دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ خوف زدہ ہوئی تھی البتہ حذیفہ پر اعتماد تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی تم زینب؟" تیزی سے چلتی عرشیہ زینب کے پاس چلی آئی جو اس پل فقط حذیفہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ عرشیہ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"محبت بھیک کی طرح نہیں لی جاتی عرشیہ... یہ ایک اعزاز ہے اور یہ اعزاز تمہیں مل رہا ہے"۔ وہ دھیمے سے مسکرائی۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ قسم سے میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں"۔ عرشیہ کو اسے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی وہ پہلے ہی سب کچھ سن چکی تھی۔

"لیکن حذیفہ کے دل میں تو ہے نا۔ اس کی چاہت تم ہو، میں نہیں"۔ عرشیہ کے ساتھ حذیفہ نے بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ زینب کا ردِ عمل ان دونوں کی توقع سے یکسر مختلف تھا۔

"محبت چھینی جا سکتی تو ڈیڈ سے پاگلوں کی طرح محبت کرنے والی میری ماما ان کے التفات کو ترستی دنیا سے نہ چلی جاتیں۔ ڈیڈ نے زندگی میں فقط ایک عورت سے سچی محبت کی اور وہ تمہاری ممی تھیں۔ زور زبردستی میں

آکر انہوں نے گھر تو بسایا پر اپنے دل کا دروازہ سدا کے لیے بند کر لیا۔ ممی نے لاکھ سر پٹخا لیکن وہ در دل کبھی نہ کھلا۔" ایک مثال وہ اپنی زندگی میں دیکھ چکی تھی۔ زین عالم نے محبت کے سوا اس رشتے کو سب کچھ دیا لیکن نائمہ کو ان سے محبت کے سوا کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ انہیں پاکر بھی تشنہ رہی۔ زینب ایسی تشنگی اپنی زندگی میں نہیں چاہتی تھی۔

"آج اگر میں بھی وہی غلطی دہرا بیٹھی تو ایک بار پھر کئی زندگیاں بکھر جائیں گی۔ حذیفہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اسے میری پروا ہے' اس لیے وہ اس زبردستی کے بندھن کو ہمیشہ نبھائے گا پر مجھے ایسی کھوکھلی زندگی نہیں چاہیے جو محبت سے خالی ہو۔" وہ جانتی تھی یہ زبردستی کا سودا دونوں کو ہی مہنگا پڑے گا۔ یوں بھی چھین کر پایا تو کیا پایا۔

"تم جذباتی ہو کر سوچ رہی ہو۔ جو کچھ ہمارے والدین کے ساتھ ہوا اس بات کا اس قصے سے کیا تعلق۔ تم دونوں کی منگنی ہونے والی ہے۔ دعوت نامے بانٹے جا چکے ہیں۔ بابا کی سوچو' انہیں پتا چلے گا تو ان پہ کیا گزرے گی؟" عرشیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔ وہ خود یہ سوچ کر کانپ رہی تھی کہ وہ زین عالم کا سامنے کیسے کرے گی۔

"جذباتی تو پہلے ہوا کرتی تھی۔ آج تو عقل آئی ہے۔ حذیفہ ٹھیک کہتا ہے۔ یک طرفہ جذبات دیرپا نہیں ہوتے۔ جہاں تک بابا کی بات ہے تو مجھے پورا یقین ہے انہیں میرے فیصلے پہ کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ حذیفہ انہیں بہت پسند ہے۔ ان کی خواہش تھی حذیفہ ہی ان کا داماد بنے تو اب یہ خواہش تمہارے ذریعے پوری ہو جائے گی۔" زینب کا انداز انتہائی نارمل تھا۔ عرشیہ نے لاکھ سمجھایا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ مجبوراً" وہ کمرے سے چلی گئی۔

"ڈونٹ وری' اس کا یہ انکار زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ میں ڈیڈ سے بات کروں گی۔ وہ خود اسے سمجھا دیں گے۔" پہلی بار وہ حذیفہ سے مخاطب ہوئی۔

"آئی ایم سوری زینب' میں تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا لیکن....." حذیفہ آج بھی اس کا دل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"حذیفہ پلیز' اب شروع مت ہو جانا۔ محبت کرتے ہوئے یہ شرط تو نہیں رکھی جاتی کہ دوسرا بھی آپ کو اسی انداز میں چاہے۔ اور پھر میں سمجھتی ہوں کسی کو چاہنے کا پہلا اصول اس کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا ہے۔" وہ ائی آسانی سے اپنی چاہت سے دستبردار ہو جائے گی یہ حذیفہ کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا اور شاید ایسا ہی ہوتا اگر عرشیہ ان کی زندگی میں نہ لوٹی ہوتی۔

"جانتے ہو میں ہمیشہ تمہاری نظروں میں وہ وارفتگی اور جذبات دیکھنا چاہتی تھی جو میرے دل تمہارے لیے تھے۔ وہ چاہت میں نے ان آنکھوں میں عرشیہ کے لیے محسوس کی ہے۔ اس دن تمہاری وہ بے چینی جسے میں اپنی بے وقوفی میں انسانی ہمدردی سے تعبیر کرتی رہی۔ عرشیہ کی طبیعت سنبھلنے تک تمہاری بے قراری..... اس سے بڑھ کر اور کسی کی محبت ماپنے کا کوئی پیمانہ کیا ہوگا۔" حذیفہ کا سامنا پہلی بار اس سنجیدہ مزاج' میچور سی لڑکی سے ہوا تھا۔ یہ بدلی ہوئی زینی جو قربانی دینا جانتی تھی' محبت سے ہی نہیں محبت کے فلسفے سے بھی واقف تھی۔ فقط اپنا حال دل کہنے والی زینی کسی دوسرے کے جذبے بھی پڑھنے لگی تھی۔

"تم سمجھ سکتی ہو تو وہ کیوں نہیں۔ اسے یہ سب دکھائی کیوں نہیں دے رہا؟"

وہ اس کی تڑپ پہ مسکرائی۔ "سمجھ جائے گی' اگلی بار سمجھاؤ گے تو سمجھ لے گی۔"

عرشیہ کی زندگی کے نشیب و فراز اور تلخیاں سوچ کر زینب دل ہی دل میں شرمندہ تھی۔ اسے اپنا آپ مجرم لگتا تھا۔ زینب نے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر آنکھ کھولی تھی۔ زندگی میں جو چاہا وہ پایا اس کے برعکس عرشیہ نے اپنی ماں کے ساتھ تمام عمر دھکے کھائے۔ رباب اور زین کے ساتھ عرشیہ کتنی آسودہ اور مطمئن زندگی گزار رہی ہوتی اگر اس کی ماں ان دونوں کی خوشیوں کے درمیان نہ آجاتی۔ تمام عمر اس قلق کے

ساتھ زندہ رہنا کہ اس کے شوہر کے سینے میں دل کسی اور کے نام پہ دھڑکتا ہے اور وہ کوئی اور اس کی اپنی بہن ہے۔ ناقابل برداشت تھا' وہ زینب تھی' نائمہ نہیں بن سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت دیر سے اپنے کمرے میں مضطرب سی ٹہل رہی تھی۔ کئی بار فون اٹھایا' لیکن کچھ سوچ کر بیل جانے سے پہلے لائن کاٹ دی گئی۔ دل و دماغ میں جنگ جاری تھی۔ جیت دل کی ہوئی۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے نمبر ملایا۔

پہلی' دوسری' تیسری۔ لاتعداد گھنٹیوں کے بعد بھی۔۔۔ فون اٹینڈ نہیں کیا گیا تھا۔ تھک ہار کر اس نے آفس کا نمبر ملایا۔

"ہیلو! میں حذیفہ سے بات کر سکتی ہوں؟" اس کی سیکریٹری نے فون اٹھایا تھا۔

"سوری میم' سر نکل چکے ہیں۔" وہ ایک بار پھر مایوس ہوئی تھی۔ جھنجلا کر گھر کا نمبر ملایا تو فون زنیرہ بیگم نے اٹھایا۔ بے قراری سے سوال کیا' مگر جواب میں اس وقت جو کچھ انہوں نے کہا اس کی رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا۔

"عرشیہ اسے روک لو۔" وہ خود اس کے پاس التجا لے کر آئی تھی۔

"میرا اس پر کوئی حق نہیں زینب' تم روک لو۔" جان بوجھ کر انجان بنتے اس نے حد درجہ لاپروائی سے کہا۔ گو اندر ہی اندر طوفان برپا تھا پر بظاہر وہ بہت مطمئن اور پرسکون تھی۔

"وہ صرف تم سے محبت کرتا ہے۔ اسے تمہاری چاہ ہے میرے لیے اس کے دل میں ایک دوست سے بڑھ کر کوئی جذبہ کبھی تھا اور نہ ہی کبھی ہو گا۔" یہ بات پچھلے چند ماہ میں زینب بارہا دہرا چکی تھی۔

"اور میں اس احساس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی کہ اپنی ہی چھوٹی بہن کے ارمانوں کی قبر پہ اپنی دنیا بسالوں۔" عرشیہ کا جواب آج بھی وہی تھا۔

"دماغ خراب ہو چکا ہے تمہارا۔ میری ہزار ضدوں میں سے ایک ضد تھا وہ۔ بچے کو کھلونا خرید کر نہ دو تو دنیا ختم نہیں ہو جاتی اس کی۔" وہ غصے سے بولی۔ "حذیفہ کو بچپن سے جانتی ہوں میں۔ اس سے سینکڑوں ضدیں منوا چکی ہوں۔ وہ عام لوگوں سے بہت مختلف ہے ہر کسی سے اپنے دل کا حال نہیں کہتا۔ وہ پہلے ہی تنہا ہے اسے اور تنہا مت کرو۔" اس بار لہجہ التجائیہ تھا۔

"لیکن زینب۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا پر زینب اب مزید کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"اسے کال کرو عرشیہ۔" عرشیہ کا سیل فون اسے پکڑاتے اس نے التجا کی۔ پر شاید اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ کب سے وہ اسے بیسیوں کالیں کر چکی تھی مگر حذیفہ نے ایک بھی ریسیو نہیں کی۔ وہ آفس میں بھی نہیں تھا اور گھر سے بھی اسے ناامیدی ہی ملی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ دل بہت بے چین ہو رہا تھا۔ بے قراری عروج پہ تھی اور اس سے بڑھ کر تاسف تھا جو اسے بے سکون کر رہا تھا۔ زنیرہ بیگم کی رندھی ہوئی آواز اب تک اس کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ ایک ماں کی فریاد تھی جو اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ ان کے لہجے میں شکوہ تھا اور عرشیہ کو اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔

زین عالم نے اسے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق دیا۔ خود پہ لاپروائی کا ملمع چڑھائے اپنا آپ کتابوں میں غرق کیے وہ بہت آگے نکل چکی تھی۔ حذیفہ اس دن کے بعد اس سے کبھی نہیں ملا تھا۔ اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہ زینب کی مجرم نہیں بنی تھی پر دل کے نہاں خانوں میں وہ چپکے سے بسیرا کر چکا تھا۔ انجانے میں ہی سہی پر وہ اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ اور پھر جس طرح اس کی محبت میں وہ دنیا بھلا رہا تھا' ایسا کیسے ہو سکتا تھا اس کے دل پہ محبت کی چوٹ نہ پڑے' لیکن یہ سچ عرشیہ اپنے اندر دفن کر دینا چاہتی تھی کہ وہ بھی

حذیفہ سے محبت کرتی ہے۔

''عرشیہ!'' وہ یونیورسٹی سے نکل کر پارکنگ کی طرف جارہی تھی جب اس نے حذیفہ کی پکار پر پلٹ کر دیکھا۔ اتنے مہینوں کے بعد اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ سن رہ گئی تھی۔

''پلیز حذیفہ چلے جائیں یہاں سے۔ میرا مزید تماشا مت بنائیں۔'' اپنے اندر اٹھتے طوفان کو روکنے کی کوشش میں وہ اس پہ چلائی۔

''چلا جاؤں گا۔ ہمیشہ کے لیے اس شہر سے اور تمہاری زندگی سے بھی۔ جسے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا ہوں اس کی نفرت نہیں سہ سکتا۔'' حذیفہ نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ شکستہ خوردہ انداز عرشیہ کے ضمیر پہ پہاڑ سا بوجھ چھوڑ گیا تھا۔ وہ ملک چھوڑ کر جارہا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی پر الفاظ ساتھ دینے سے قاصر تھے۔ ائیرپورٹ پارکنگ میں پہنچ کر اس نے آخری بار اس کے فون پہ کال ملائی۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید اس بار رابطہ ہوجائے۔ اس کی امید بر آئی تھی۔ حذیفہ نے کال ریسیو کرلی تھی۔

''پلیز مت جائیں۔'' وہ اسے لاؤنج میں مل گیا تھا۔

''یہاں کیا رکھا ہے۔'' ایک زخمی سی مسکراہٹ نے لبوں کا احاطہ کیا۔ اس نے ایک نگاہ عرشیہ کے مایوس چہرے پہ ڈالی اور پھر اپنی کلائی میں بندھی گھڑی کو دیکھا۔

''یہاں سب ہیں۔ آنٹی' بابا' زینب اور....'' انگلیاں مروڑتے دو قدم آگے بڑھی۔

''اور؟'' وہ اس ''اور'' پہ اٹکا تھا۔

''اور میں۔'' عرشیہ نے نظریں جھکالیں۔

''تمہاری خاطر ہی تو یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم چاہتی تھیں ناکہ میں کبھی تمہارے سامنے نہ آؤں اور یہاں رہ کر خود کو تم سے دور رکھنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ عرصہ تنہا رہوں تو شاید تمہاری کشش سے نکلنے میں کامیاب ہوجاؤں۔'' لاؤنج میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگ افراتفری میں یہاں سے وہاں جارہے تھے۔ سب کو ہی منزل پہ پہنچنے کی بے چینی تھی یہ تو بس حذیفہ تھا جو سامنے نظر آتی منزل سے دور جارہا تھا۔

''میری خاطر مجھ سے دور جاسکتے ہیں تو میرے کہنے پہ رک بھی تو سکتے ہیں۔'' اس کا روپ ہی نہیں لہجہ بھی بدل چکا تھا۔ یہ وہ ڈری سہمی عرشیہ نہیں تھی جس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک حذیفہ کا قرار لوٹ گئی تھی۔ جس کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھانے پہ شکوؤں کی سرد سہ پہر کومات کرتے لہجے نے اسے پسپا کردیا تھا۔

''کیوں؟'' اگر محبت نے اسے اس موڑ پہ لاکر کھڑا کرہی دیا تھا تو وہ آزمانے پہ بضد تھا۔

''کیونکہ میں نہیں چاہتی آپ کی ذات میرے وجود کی کشش سے نکل پائے۔'' محبت اپنا آپ منوا رہی تھی۔ وہ بھی اس کے رنگ میں رنگی جاچکی تھی۔ یہ اس کے چہرے کی اداسی میں لکھا تھا۔ اس کی بے چینی میں چھلک رہا تھا۔

''اچھا جبر ہے۔ ہاتھ بڑھاؤں تو جھٹک دیتی ہو۔ دور جانے کی کوشش کررہا ہوں تو روک رہی ہو۔ بڑی ظالم ہو عرشیہ۔'' اس نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

''یہ ظلم نہیں محبت ہے۔ جس آگ نے آپ کے وجود کو سلگا رکھا ہے وہ میرے تن کو بھی راکھ کررہی ہے۔'' وہ کچھ اور آگے بڑھی۔ اسے پرے بھی خود ہی دھکیلا تھا اب یہ فاصلہ عرشیہ کو خود ہی کم کرنا تھا۔

''میں تو سلگ ہی رہا ہوں اچھا ہے نا اب تم بھی یہ آنچ محسوس کرو۔'' بہت تڑپا تھا وہ ان گزرے مہینوں میں۔ اتنی آسانی سے کیسے مان جاتا۔

''دور رہ کر تنہا جلنے سے بہتر ہے دونوں ساتھ ساتھ جلتے ہیں۔'' وہ مسکرائی' محبت کے دیے وہاں بھی روشن تھے۔ اس چراغاں کے بعد اب مزید کسی تصدیق کی ضرورت باقی کہاں بچی تھی۔ ہجر کتنا بھی طویل سہی' مگر جس طرح شام کے بعد امید صبح قائم رہتی ہے یوں ہی وصال کا پل خانہ دل میں سدا بہار کی صورت پنہاں ہوتا ہے۔ وہ خوش نصیب تھے۔ جو اس شام ہجر کی صبح دیکھ رہے تھے۔

صائمہ اکرم چوہدری

شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے' ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے' تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹڑی پار کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں' ان کے تین بیٹے وہاج' برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام درشہوار ہے۔

خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں' پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی' لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو' تو ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی

پرورش ندرت بیگم نے لی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور درشہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے' لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیورو کریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جارہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں' بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کردیا۔ شہرزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کردیا۔ طوبیٰ اور درشہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے' لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

درشہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ مناہل' ہادی کی بہن ہے۔ درشہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ مناہل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے انابیہ کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی' شہرزاد کے پاس سمجھوتے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا' سیفی کے
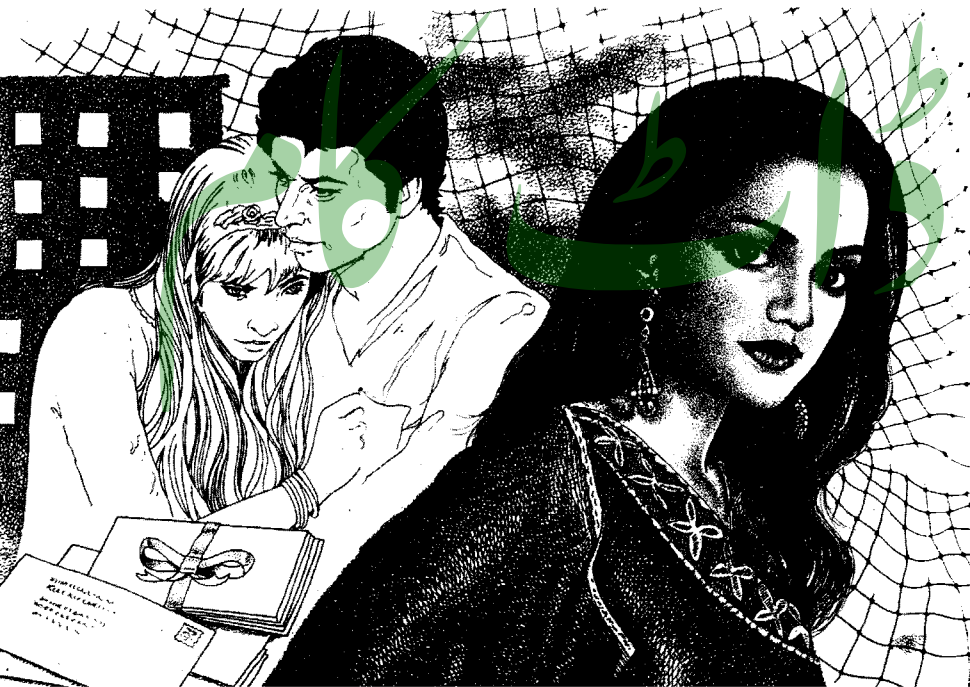
فون سے مشتعل ہو کر ٹینا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے۔ اس بات پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات وواقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کو نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

نویں قسط

رشیدہ کسی چیل کی مانند صندل کے ہاتھ کے لکھے رقعے پر جھپٹی۔

پانچ جماعت پاس رشیدہ کی نظریں جوں جوں اس کاغذ پر پھسل رہی تھیں، اس کی بیٹی پر گزری ہوئی قیامت اس کے اپنے دل پر قطرہ قطرہ اتر رہی تھی۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی رگوں کو پکڑ کر بڑی طرح کھینچ لیا ہو اور خون میں زہر کے ذرات شامل کر دیے ہوں۔ اسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''اوہ میرے خدایا، اتنا بڑا ظلم۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو قطار کی صورت میں بہہ نکلے۔

زمین کیوں نہ پھٹی، آسمان کیوں نہ گرا۔

محافظ ہی جب لٹیرے بن جائیں تو انسان کس سے منصفی چاہے۔

رشیدہ کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر زمین پر جا گرا اور وہ خود بھی صدمے سے نڈھال زمین پر بیٹھ گئی، اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایسے بین کرے کہ مری شہر کے سارے پہاڑ زمین بوس ہو جائیں۔

وہ جو سمجھتی تھی کہ صندل پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ اس نے اس بھوت کا مکروہ چہرہ وہاج کی شکل میں دیکھ لیا تھا اور اس کرب ناک حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے فی الحال دل و دماغ راضی نہیں تھے۔

''اماں! تجھے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں چھپی اذیت کیوں نظر نہیں آئی۔ مائیں تو بیٹیوں کے دلوں میں جھانک لیتی ہیں۔'' سندس بے آواز رو رہی تھی اور اس کے چھوٹے بہن بھائی الجھن بھری نگاہوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

رشیدہ کی تو لگتا تھا کہ قوت گویائی ہی چھن گئی تھی، اس نے پورا زور لگا کر بولنے کی کوشش کی لیکن گلا ساتھ چھوڑ گیا تھا، بے بسی کے گہرے احساس کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی نمکین پانی سے بھر گئیں۔

''اماں! تیری بیٹی تو بہت غیرت اور حیا والی نکلی، اس نے کسی اور امتحان میں ڈالنے کے بجائے، خود موت کا کفن پہن لیا۔'' سندس کی باتیں اس کی ماں کا کلیجہ چیر رہی تھیں، لیکن رشیدہ کی تو عمر بھر کی کمائی اس کے مالکوں نے لوٹ لی تھی، اس صدمے نے اسے گنگ کر دیا تھا۔

''اماں، تو بولتی کیوں نہیں ہے۔'' سندس بے ساختہ ماں کے گلے لگی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

''یہ تو سراسر ظلم ہے، وہاج صاحب نے کیا جو میری بہن کو کوئی مٹی کی بے جان مورتی سمجھ لیا تھا، ارے کچھ تو اتنے سالوں کی غلامی اور وفاداری کا خیال کیا ہوتا، انہوں نے تو کتوں سے بھی بدتر سلوک کیا ہمارے ساتھ۔''

وہ روتے ہوئے بے ربط انداز میں بول رہی تھی۔

''ان کو ذرا شرم نہیں آئی، اگر درشہوار بی بی کے ساتھ کوئی ایسا کرے، تو ان کے دل پر کیا گزرے۔''

سندس کا دل پھٹ رہا تھا اور اس کی باتیں اس کی ماں رشیدہ کے دل و دماغ کے پرخچے اڑا رہی تھیں۔

''اللہ کرے برباد ہو جائیں سارے کے سارے، کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں، کیڑے پڑیں ان کی قبروں میں۔'' وہ جذباتی ہو کر اب بددعاؤں پر اتر آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میر ہاؤس کے سارے مردوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے گولیوں سے اڑا دے۔

''اماں، بولتی کیوں نہیں ہے، کیا تیری زبان بھی صندل کے ساتھ ہی قبر میں دفنا دی کسی نے۔'' اس نے اپنی ماں کا کندھا جارحانہ انداز میں ہلایا اور رشیدہ ایسے جھٹکے سے جاگی، جیسے کسی نے گہری نیند میں ٹھنڈے پانی کا جگ اس پر انڈیل دیا ہو۔

''یہ سب گھٹیا لوگ ہیں، ابا سے بات کر، اب ہمیں یہاں ایک منٹ کے لیے نہیں رکنا۔'' سندس کو اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا، اس نے ایک دم ہی فیصلہ کیا اور کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

''کاکے جا، بھاگ کر ابا کو بلا کر لا۔'' سندس نے اپنے چھوٹے بھائی کو باہر دوڑایا۔

''ابھی لایا باجی۔'' وہ خوف زدہ ہو کر باہر نکلا، یہ دونوں اصل بات نہیں سمجھ سکے تھے لیکن ماں اور بہن کی حالت انہیں یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ ان کے خاندان پر کوئی بڑی قیامت گزر چکی ہے۔

سندس نے کمرے میں موجود واحد الماری سے کپڑے نکال نکال کر زمین پر پھینکنے شروع کر دیے، جب کہ رشیدہ نے چارپائی کے پائے کو پکڑ کر اٹھنے کی ناکام کوشش کی اور لڑکھڑا گئی، اسے لگا جیسے وہ ساری زندگی نہ تو اپنی اولاد کے سامنے اور نہ ہی زمین پر اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے گی۔

☆☆☆

وہ اوائل سردیوں کی ایک چمکیلی سی صبح تھی۔!!!

کرن اور انابیہ کی پہلی کلاس پروفیسر علوی کے نہ آنے کی وجہ سے ملتوی ہو گئی تھی اور وہ دونوں کیفے ٹیریا سے چائے لے کر پارکنگ کے پاس بنی چھوٹی سی منڈیر پر آن بیٹھیں۔

یہ ان دونوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ کرن کے ہاتھ میں گرما گرم فرنچ فرائز کی پلیٹ تھی جس کے ساتھ وہ دونوں ہی اس وقت بھرپور انصاف کر رہی تھیں۔

''بات سنو انابیہ۔'' کرن کے مخاطب کرنے پر اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''سر برہان جیسے ہی مائیکرو اکنامکس کا پیپر بنا لیں، کسی طرح ان کے کمرے سے اڑانے کی کوشش کرنا۔'' کرن کے شرارتی انداز پر انابیہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑی۔

''پیاری بہن! ابھی میں نے اپنی ٹانگوں کی انشورنس نہیں کروائی۔'' اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''دیکھو سینئرز بتا رہے تھے کہ وہ پیپر بہت مشکل اور ٹیکنکل سا بناتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ان ہی کے پیپر میں لڑھک جائیں۔''

کرن نے اسے ڈرانے کی کوشش کی تو وہ استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''تو پھر میں کیا کروں؟''

''ان سے اہم سوالات کا گیس لے لو، آفٹر آل کزن ہیں وہ تمہارے، اب اتنا حق تو بنتا ہے ناں۔'' کرن نے شوخی سے نظریں گھمائیں۔

وہ آج شرارت کے موڈ میں تھی اور برہان کے حوالے سے اس کی چھیڑ چھاڑ انابیہ کو ہمیشہ ہی اچھی لگتی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اسے نہیں بتا سکی کہ حق تو اس کا ساری دنیا سے زیادہ ان پر بنتا تھا لیکن یہ الگ بات تھی کہ وہ اس

بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔

"ایسی کوئی بات کم از کم میں تو ان کے سامنے منہ سے نہیں نکال سکتی۔" انابیہ کے صاف انکار پر وہ مایوس ہوئی۔

"منہ سے بات نہیں کرسکتیں تو سیل فون پر ٹیکسٹ کرکے یا ای میل کے ذریعے پوچھ لو۔" اس نے جھٹ سے مشورہ دیا۔

"کیوں میرا سر تڑوانے کا ارادہ ہے تمہارا، ان سے ایسی کوئی امید مت رکھنا، اس معاملے میں بہت سخت ہیں وہ۔"

"ماشاء اللہ کیا شیطانی اوہ سوری لمبی عمر پائی ہے، ابھی نام لیا اور ابھی حاضر ہوگئے۔" کرن کی بات پر انابیہ کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔

برہان کی گاڑی ابھی ابھی پارکنگ میں آکر رکی تھی۔ اس گاڑی کو تو وہ ہزار گاڑیوں میں سے بھی سیکنڈوں میں پہچان سکتی تھی۔

"سر برہان کے ساتھ یہ دوسری لڑکی کون ہے؟"

کرن کا حیرت میں ڈوبا جملہ انابیہ کی سماعت میں گونجا، تو اس نے سر اٹھا کر سامنے کا منظر دیکھا، برہان کی گاڑی سے مناہل قریشی کے ساتھ ساتھ درشہوار کا اترنا اسے خوش گوار حیرت میں مبتلا کرگیا۔

"ارے یہ تو درشہوار ہے، یہ کیا کرنے آگئی کیمپس؟"

"کون درشہوار؟" کرن حیران ہوئی۔

"برہان کی سسٹر۔" اس نے لاپروائی سے بتایا۔

"قسم سے خوبصورتی تو ختم ہے تمہارے خاندان پر، کتنی کیوٹ ہے ان کی سسٹر۔" کرن نے کافی فاصلے سے بھی درشہوار کے خدوخال کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ اس وقت ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں کھلتے ہوئے گلاب کی مانند تروتازہ لگ رہی تھی۔

"ایک منٹ کرن، میں ابھی اس چڑیل سے مل کر آتی ہوں۔" انابیہ کے لہجے میں اس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

وہ فوراً منڈیر سے اتر کر دبے قدموں درشہوار کی طرف بڑھی۔ وہ اور مناہل دونوں برہان کی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں اور انابیہ کی طرف ان کی پشت تھی، اس لیے درشہوار کی ابھی تک اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ برہان اپنے کسی کولیگ کے ساتھ کچھ فاصلے پر ہیلو ہائے کرنے میں مگن تھے اور وہ دونوں شاید ان کے فارغ ہونے کا انتظار کررہی تھیں۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ برہان کی بہن اتنی فرینڈلی اور مزے کی ہوگی۔" مناہل نے درشہوار کی کسی بات پر قہقہہ لگایا۔

"اور میں گمان بھی نہیں کرسکتی تھی کہ آپ کی برہان بھائی کے ساتھ اتنی زیادہ انڈراسٹینڈنگ ہوگی، وہ تو پورے خاندان میں کسی کو لفٹ نہیں کرواتے، بہت لکی ہیں آپ۔" درشہوار کے اس جملے نے انابیہ کے قدم وہیں روک کے۔

"کیوں، تمہیں اچھی نہیں لگی یہ بات؟" مناہل نے بڑے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"میری تو دعا ہے، آپ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ ہنستے مسکراتے رہیں۔" درشہوار کے اس جملے نے انابیہ کا

دماغ بھک کر کے اڑایا اور اسے پوری کائنات گھومتی ہوئی محسوس ہوئی، جبکہ درشہوار کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ اپنے مخصوص لاابالی پن میں انابیہ کے جیتے جاگتے دل کے ساتھ کھیل گئی تھی۔

''آپ آئیں ناں مری، میں آپ کو اپنی والدہ اور باقی خاندان والوں سے ملواؤں گی۔''

''ہاں برہان بھی اکثر کہتے رہتے ہیں، لیکن میرے خیال میں ابھی یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' مناہل نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئی تھی۔

''تو کب آئے گا وہ مناسب وقت ؟'' درشہوار نے شرارت سے پوچھا۔

''یہ تو حالات اور تمہارے بھائی پر منحصر ہے۔'' مناہل نے زوردار ہنسی کے ساتھ جواب دیا، اور اسی لمحے برہان نے پلٹ کر مناہل کی طرف دیکھا۔

انابیہ فوراً ایک درخت کے پیچھے ہوگئی، برہان کی آنکھوں کی چمک نے اس کے دل کی دنیا میں اندھیرا برپا کردیا۔ وہ بڑی محویت اور دلچسپی سے مناہل کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے اس سے اہم کوئی کام نہ ہو۔

انابیہ کے قدموں نے مزید چلنے سے انکار کردیا، وہ بڑی سرعت سے پلٹی، اس کی آنکھوں کے آگے آنسوؤں کا پردہ حائل ہوگیا، وہ بمشکل چلتے ہوئے کرن کے پاس پہنچی اور وہاں رکھی اپنی فائل اٹھا کر ڈپارٹمنٹ کی طرف چل دی۔

''انابیہ! کیا ہوا تمہیں ؟ بات کیوں نہیں کی تم نے اپنی کزن سے ؟''

''کچھ نہیں، ایک ضروری کام یاد آگیا تھا مجھے۔'' اس نے بے دردی سے اپنے بازو کی پشت سے نم آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کی۔ آنسوؤں پر اس کا زور نہیں چل رہا تھا، وہ بے اختیار امنڈتے چلے آرہے تھے۔

وہ ساری دنیا سے اس بے وفائی کی توقع کرسکتی تھی لیکن درشہوار سے نہیں۔

اس کے جملوں نے اسے آسمان سے زمین پر لا گرایا تھا، وہ اس کے جذبات و احساسات سے بخوبی واقف تھی۔ اس کے باوجود اگر وہ مناہل قریشی کے ساتھ اس طرح کی چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی تو یقیناً وہ برہان کے حوالے سے بہت کچھ جانتی تھی اور یہی بات انابیہ کو تکلیف دے رہی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے انابیہ! ایسے رو کیوں رہی ہو۔'' کرن ایک دم پریشان ہوگئی۔

''نہیں یار، آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔'' اس نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

''مجھے تو لگتا ہے، آنکھ میں کچھ پڑا نہیں بلکہ کسی کے چہرے سے کوئی پردہ ہٹا ہے۔'' کرن کے جتاتے ہوئے لہجے میں کچھ تھا۔ وہ نظریں چرا گئی۔ وہ چاہ کر بھی اسے نہیں بتاسکتی تھی کہ کچھ اپنوں کے بدلتے ہوئے رویے انسان کے دل پر کیسے غضب ڈھاتے ہیں۔

☆☆☆

شہزاد کے لیے وہ گھڑیاں خاصی کٹھن تھیں۔!!!

وہ ٹی وی لاؤنج میں لگی فل سائز کی اسکرین پر شجاع غنی کی پریس کانفرنس دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی، جب اس کے سیل فون پر ہمزاد کی کال آئی، اس نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے بے دلی سے کال ریسیو کی۔

دوسری طرف ہمزاد ٹی وی کی ہلکی آواز ہی سے سیکنڈوں میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اس وقت کس کام میں مگن ہے۔ وہ اس کے جذبات کا بخوبی اندازہ کرسکتا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو شجاع غنی کی کانفرنس دیکھ کر ؟'' ہمزاد کے اس جملے پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

"سوچ رہی ہوں، پیسہ اس دنیا کی سب سے بڑی تلخ حقیقت ہے، جو کسی بڑی سے بڑی سچائی کا گلا بڑی آسان سے گھونٹ سکتا ہے۔"

"لیکن یاد رکھنا، سچائی کو بہت دیر تک جھوٹ کے پردوں میں لپیٹ کر نہیں رکھا جا سکتا۔"

"کیا فائدہ، جب وقت ہی انسان کے ہاتھوں سے نکل جائے۔"

"یاد رکھنا، جو اس وقت "اوپر" ہے، اسے ہر حال میں "نیچے" بھی آنا ہوگا، تقدیر کا ہاتھ بہت بے رحم ہوتا ہے۔" وہ نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"فی الحال تو اس کی بے رحم حقیقتوں کو ہمیں ہی جھیلنا پڑ رہا ہے۔"

"اتنی جلدی مایوس ہوگئی ہو کیا؟" اس کے لہجے کی نرمی، ہم زاد کے دل پر پھوار بن کر برسی۔

"مایوسی کا لفظ شہزاد نے اپنی لغت سے نکال دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایک دفعہ پھر پوری قوت سے ان پر جھپٹوں گی۔" اس کے لہجے کا عزم گواہ تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی۔

"اور یقین مانو، اس پورے سفر میں، میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔" وہ مسکرایا۔

"مجھے دوبارہ سے سہاروں کی عادت مت ڈالیں۔" اس کی تلخی کی حد کو چھوتی صاف گوئی ہم زاد کا دل دکھا گئی۔

"تمہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بھی میں نے ہی سکھایا تھا، تم یہ بات کیوں بھول جاتی ہو۔" اس نے اس بات کو مذاق میں اڑایا۔

"ساری باتیں دل پر لکھی ہیں دکھ اسی بات کا تو ہے کہ کچھ نہیں بھولتا۔" وہ رنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"تو بھولنا کیوں چاہتی ہو تم؟"

"میں کسی سراب کے پیچھے بھاگ کر اپنی زندگی ضائع کرنا نہیں چاہتی۔" گفتگو کا موضوع لاشعوری طور پر تبدیل ہو گیا تھا۔

"میں سراب نہیں ایک جیتی جاگتی، سانس لیتی حقیقت ہوں، بالکل ایسے ہی جیسے تم ہو، جیسے یہ دنیا ہے اور تمہارے اردگرد کے لوگ۔" وہ مسکرایا۔

"وہ سب دکھائی دیتے ہیں اور تم صرف سنائی دیتے ہو۔" شہزاد کی زبان پھسلی۔

"جانتا ہوں، تمہاری بصارتوں کے بہت قرض واجب ہو چکے ہیں مجھ پر، لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ میں ایک ایک چیز کا حساب دوں گا۔"

"ہونہہ۔ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔" شہزاد نے صفائی سے طنز کیا۔

"فی الحال تو تم مجھے چھوڑو، اور شام تک ایک سرپرائز کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"کیوں، تم آرہے ہو میرے گھر؟" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"تم بلاؤ تو سہی، سر کے بل نہ آئیں تو بے شک پھانسی گھاٹ پر لٹکا دینا۔" اس کے شرارتی انداز پر شہزاد بے ساختہ ہنسی۔

"باتوں میں تو کوئی نہیں جیت سکتا تم سے۔"

"محبت میں بھی نہیں جیت سکتا، بے شک آزما کر دیکھ لو۔"

"تم کسی سرپرائز کی بات کر رہے تھے۔" شہزاد کو اچانک یاد آیا۔

"سرپرائز یہ ہے کہ رومیصہ دو چار گھنٹوں میں گھر پہنچ جائے گی۔" ہم زاد کی بات پر ایک دم ہی اس

کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں، لیکن اس نے اپنی بے اختیاریوں پر بند باندھنا سیکھ لیا تھا۔

"اگر ایسا نہ ہوا تو۔؟"

"تو پھر جو سزا تم دو گی، میں آنکھیں بند کر کے قبول کرلوں گا۔" وہ پراعتماد تھا اور اس کی یہی بات تو شہزاد کو بھاتی تھی۔ شجاع غنی کی کانفرنس کو دیکھ کر اندر ہی اندر پھیلنے والی مایوسی میں ایک جگنو چمکا تھا جس نے شہزاد کے اندر روشنیاں پھیلا دی تھیں۔

☆☆☆

آج کا سورج میر ہاؤس میں ایک نئے ہنگامے کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔!!!

پورے گھر میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی، بہادر علی، اور اس کی بیوی رشیدہ راتوں رات اپنے تین بچوں کے ساتھ خاموشی سے میر ہاؤس سے غائب ہو چکے تھے، اور کوارٹر سے ان کا ضروری سامان بھی غائب تھا۔

برہان صبح یونیورسٹی جانے کے لیے نکلے، تو گیٹ پر بہادر علی موجود نہ تھا، انہوں نے سرسری انداز میں مالی سے پوچھا اور نکل گئے۔

ناشتے کی میز پر رشیدہ کی عدم دستیابی پر تھوڑی ڈھنڈیا مچی تو تاجدار بیگم نے ایک ملازمہ کو سرونٹ کوارٹر میں دوڑایا، تاکہ وہ اسے بلا کر لائے اور وہ اس کی اچھی طرح کلاس لے سکیں، لیکن اسی ملازمہ کی بریکنگ نیوز کے انداز میں نشر کی جانے والی خبر نے پورے گھر میں ایک چھوٹے سے زلزلے کی کیفیت پیدا کر دی۔

تینوں خواتین گھبرا کر اپنے اپنے کمروں سے نکل آئیں، انابیہ نے آج یونیورسٹی سے چھٹی کی تھی، وہ بھی نمیرہ اور طوبیٰ کے ساتھ وہیں موجود تھی اور تاجدار بیگم نے باقی ملازموں کو لائن حاضر کر لیا۔

"ارے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا، کہاں دفعان ہو گیا راتوں رات صندل کا خاندان۔"

تاجدار بیگم کی پاٹ دار آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ اس وقت سب ہی ملازمین ایک قطار کی صورت میں ہال کمرے میں اکٹھے تھے۔ جہاں پر خواتین نے کھلی کچہری لگا رکھی تھی اور ابھی اس بات سے گھر کے مرد لاعلم تھے۔

"دیکھو ذرا، ایسی کون سی موت آن پڑی ان سب کو جو بیٹھے بٹھائے منہ اٹھا کر نکل گئے گھر سے۔" شارقہ بیگم بھی برہم انداز سے گویا ہوئیں۔

"رشیدہ، کل شام سے کچھ پریشان سی لگ رہی تھی بی بی جی۔" مالی کی بیوی نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"وہ کم بخت تو صندل کے مرنے کے بعد سے ایسی ہی بوکھلائی ہوئی گھومتی تھی، یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔" تاجدار بیگم نے اس بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔

"آخری دفعہ کب دیکھا تھا بہادر کو کسی نے گیٹ پر۔؟" ندرت بیگم نے بھی تفتیش میں حصہ لیا۔

"میں نے دیکھا تھا بیگم صاحبہ! تقریباً رات آٹھ بجے، وہ گیٹ پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔" مالی نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"اس کے بعد کیا کسی نے منتر پڑھ کر غائب کر دیا پورے کنبے کو۔" تاجدار بیگم ہلکا سا چڑ کر بولیں۔

ویسے بھی وہ جانتی تھیں کہ بہادر کے خاندان کے اس گھر سے جانے کے بعد میر ہاؤس میں کیسا بدنظمی کا طوفان آنے والا ہے، وہ لوگ بہت سالوں سے ان کی خدمت پر مامور تھے اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

"یہ کون سی عدالت سجی ہوئی ہے یہاں۔"

میر حاکم کی اچانک انٹری سے پورے ہال میں ایک ہلچل سی مچ گئی، وہاج میر بھی ان کے ساتھ تھے۔ سب خواتین نے بوکھلا کر اپنے اپنے دوپٹے سروں پر جمائے، اور تینوں لڑکیاں بھی چوکنا ہو کر بیٹھ گئیں۔

''میں پوچھ رہا ہوں، یہ ملازمین کی فوج کو کیوں اکٹھا کر رکھا ہے یہاں۔؟ ان کے تیز لہجے میں کوفت اور بیزاری کا عنصر نمایاں تھا۔

''آپ بیٹھیں اباجی! اصل میں تھوڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔'' تاجدار بیگم کی پریشان آواز پر وہ ہلکا سا چونکے۔

''کیوں، کسی نے حرام خوری کی ہے گھر میں کیا۔؟'' ان کا بات کرنے کا اپنا ہی مخصوص کاٹ دار انداز تھا۔

''جی اباجی! کچھ ایسا ہی سمجھیں۔'' ندرت نے تھوڑا بات کو گھمانے کی کوشش کی، جو انہیں خاصی مہنگی پڑی۔

''تو منہ سے کوئی پھوٹے گا تو پتا چلے گا ناں۔'' وہ کفن پھاڑ کر بولے۔ ان کے ایک دم غصے میں آنے پر سب ہی خواتین کا ایک ساتھ رنگ اڑا، وہ تو عام حالات میں کسی سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتے تھے اور یہاں تو اچھا خاصا مسئلہ چل رہا تھا۔

''بہادر علی کا خاندان بغیر بتائے نکل گیا ہے کہیں۔'' تاجدار بیگم کی بات پر وہاج نے بوکھلا کر اپنی ماں اور دونوں چاچیوں کی طرف دیکھا۔

''تم کہاں نکل گیا ہے۔؟''

''یہی تو پتا نہیں چل رہا، کوارٹر سے ان کا ضروری سامان بھی غائب ہے۔'' تاجدار بیگم نے نظریں چرا کر کہا۔

''دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تھا ان کا۔؟ کہاں جا سکتے ہیں وہ لوگ۔؟'' میر حاکم کو ایک دم ہی غصہ آیا۔

''لگتا ہے۔ کہیں اور سے اچھی نوکری کی آفر آ گئی ہو گی۔'' ندرت نے ایک بار پھر لقمہ دیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میر حاکم نے فوراً ہی ان کی بات کو رد کیا اور ندرت بیگم کا چہرہ پھیکا پڑ گیا، شارقہ بیگم کو دل ہی دل میں کمینی سی خوشی ہوئی۔

''پچھلے بیس سالوں سے ان کا خاندان ہم پال رہے ہیں، روٹی، کپڑا، مکان ہر چیز تو مل رہی تھی انہیں، چکر کوئی اور ہے۔'' ان کے دوٹوک انداز پر وہاج کا رنگ اڑا اور طوبیٰ نے طنزیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا، جو بار بار اپنے رومال سے اپنے ماتھے پر آیا نادیدہ پسینہ صاف کر رہے تھے۔

''اباجی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔'' تاجدار بیگم نے ہمیشہ کی طرح اپنے سسر کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ چکر کیا ہو گا آخر۔؟'' انہوں نے اپنی کنپٹی پر انگلی گھماتے ہوئے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی۔

''وہاج بھائی سے پوچھیں ناں، شاید انہیں کچھ پتا ہو۔''

طوبیٰ نے ایک دم ہی کمرے میں بم پھوڑا، وہاج کے چہرے پر بوکھلاہٹ چھلکی۔ سب ہی کی نظریں طوبیٰ کی طرف اٹھ گئیں۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔؟ وہاج کو کیوں پتا ہو گا۔'' تاجدار بیگم کو بڑوں کی موجودگی میں طوبیٰ کا بولنا سخت ناگوار گزرا تھا۔ تب ہی تو ان کی آنکھوں سے ٹپکتی ناگواری کو محسوس کر کے شارقہ بیگم بے چین ہوئیں۔

''میرا یہ مطلب ہے، صندل بھی تو نور محل میں رہتی رہی ہے، ہو سکتا ہے، وہ لوگ بھی وہیں چلے گئے ہوں۔'' طوبیٰ نے فوراً بات سنبھالی۔

''ایسے ہی اوٹ پٹانگ ہانکتی رہتی ہو، وہ لوگ بغیر بتائے کیسے جاسکتے ہیں وہاں، اور تم تینوں اٹھو اور جاؤ اپنے کمرے میں۔''

شارقہ بیگم نے سب کے سامنے اپنی بیٹی کو لتاڑا اور ساتھ ہی انہیں وہاں سے کھسکنے کا اشارہ کیا، وہ تینوں بادل نخواستہ انداز میں اٹھیں اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ طوبیٰ اور نمیرہ کا بڑا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ساری کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھیں لیکن شارقہ بیگم کے حکم کے بعد ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

''تم سب لوگ بھی جاؤ ادھر سے۔'' وہاج نے اپنی بوکھلاہٹ کو چھپانے کے لیے ملازموں پر برسنا شروع کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی ہال کمرہ خالی ہونے لگا، لیکن میر حاکم کے چہرے پر پھیلی تشویش میں کمی نہیں ہوئی، ان کی چھٹی حس کسی بڑی گڑبڑ کا اشارہ کر رہی تھی اور مصیبت یہ تھی کہ اس گڑبڑ کا فی الحال انہیں کوئی بھی سرا نہیں مل رہا تھا۔

☆☆☆

رومیصہ کی گاڑی بڑی تیزی کے ساتھ ایف سیکٹر کی طرف بھاگ رہی تھی۔

ایک بے نام سا اضطراب ان دونوں کے جسم میں چٹکیاں بھر رہا تھا۔

وہ اپنے دوست کے ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر تھا جبکہ رومیصہ افسردہ انداز میں پچھلی سیٹ پر براجمان تھی، اس نے اپنے چہرے کو دوپٹے سے ـــــ چھپا رکھا تھا، اور اس بات کی تلقین اس شخص کی طرف سے آئی تھی جس کی بات ماننے کو اس کا دل آمادہ ہو چکا تھا۔

''میرا خیال ہے انہیں کسی مرکز میں چھوڑ دیتے ہیں، وہاں سے ٹیکسی لے کر چلی جائیں گی اپنے گھر۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے فوراً ہی اس بات کی نفی کی۔

''دماغ چل گیا ہے تیرا، کیا گھر کے اندر تک چھوڑ کر آئے گا۔؟'' اس کا دوست جھنجھلا اٹھا۔

''کم از کم گیٹ تک تو چھوڑ سکتے ہیں ناں۔'' وہ رومیصہ کے معاملے میں اب کسی قسم کا بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔

''ٹینا ہاؤس کے باہر سی سی ٹی وی کیمرہ لگا ہوا ہے، یہ بات بھی ذہن میں رکھنا، ایسے نہ ہو داماد صاحب کو پہلی ہی رات حوالات میں گزارنی پڑ جائے۔'' اس کے دوست کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی، مگر اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

''شٹ اپ، میں اسے راستے میں نہیں چھوڑ سکتا، چاہے کتنا ہی رسکی کیوں نہ ہو۔'' اس کا ضدی انداز اور خیال رکھنا رومیصہ کو اچھا لگا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، گاڑی گیٹ کے سامنے لے جانا ٹھیک نہیں ہوگا، ہوسکتا ہے، ہمارے گھر کے باہر پولیس گارڈز بھی ہوں۔'' رومیصہ نے ہلکا سا جھجک کر گفتگو میں حصہ لیا۔

''بھابھی! یہ بات مجھے نہیں، اس بے وقوف کو سمجھائیں۔''

رومیصہ اس کے بھابھی کہنے پر ایک دم سرخ پڑ گئی، اور اسی لمحے اس نے بھی بیک مرر سے اس کی طرف دیکھا، دونوں کی نظریں ملیں اور رومیصہ کے دل کی دنیا میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے، تم گاڑی اسٹریٹ کے کارنر پر کھڑی کر دینا، میں رومیصہ کے پیچھے چلتا رہوں گا، جب تک وہ گھر کے اندر نہیں چلی جائے گی۔'' وہ بات جو اس کا دوست اتنی دیر سے نہیں سمجھا پایا تھا، وہ رومی کی ایک نظر نے

سمجھادی تھی اسے۔
اس نے ڈیش بورڈ کھول کر مختلف سی ڈیز دیکھنا شروع کر دی تھیں، اور سی ڈی پلیئر چلا دیا، پوری گاڑی میں مہندر کپور کی خوبصورت آواز گونجنے لگی۔

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے امید رکھوں دل نوازی کی ۔۔۔
نہ تم میری طرف دیکھو ، غلط انداز نظروں سے

اس گیت کا ایک ایک بول ان دونوں کے دل پر اتر رہا تھا، رومیصہ کو لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے سولی پر چڑھانے کے لیے لے جا رہا ہو۔ اس کے سیکٹر کی حدود جیسے ہی شروع ہوئیں، ان تینوں کے ہی اعصاب تن گئے۔
اس کے دوست نے گاڑی اس کی اسٹریٹ کے شروع میں ہی ایک سائیڈ پر کھڑی کر دی، اس نے تیزی سے اتر کر رومی کی طرف کا دروازہ کھولا، اس کا چہرہ دوپٹے میں چھپا ہوا تھا لیکن اس کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں لال ہو رہی تھیں۔
''دھیان سے جانا جگر۔'' اس کا دوست اس کے لیے فکرمند تھا۔
''ڈونٹ وری، چلو رومیصہ۔''
اس کے لہجے کی نرمی پر رومیصہ کا دل ایک دفعہ پھر پگھلا، اور اس کا ایک ایک قدم منوں وزنی ہو رہا تھا، وہ بمشکل چل رہی تھی، اور وہ اس سے کچھ فاصلے پر سر جھکائے بہت آہستگی سے بولتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت رومیصہ ضبط کی کڑی منزلوں سے گزر رہی ہے۔
''پریشان مت ہونا، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔'' رومیصہ کو اس وقت اسی دلاسے کی اشد ضرورت تھی۔ وہ چلتے چلتے بے اختیار مڑی، دوپہر کے اس پہر پوری گلی سنسان تھی۔ اس کے باوجود دونوں کے چہروں سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔
''ارسل۔!!!'' اسے لگا جیسے کائنات تھم گئی ہو۔ رومیصہ نے پہلی دفعہ، اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔
''اس طرح سے دیکھو گی تو پلٹ کر نہیں جا سکوں گا۔'' ارسل نے بے اختیار نظریں چرائیں۔
''مجھے نہیں جانا۔'' رومیصہ کی آنکھوں سے آنسو ایک ساتھ ٹپکے۔
''اچھا ادھر آؤ۔'' وہ نرمی سے اس کا بازو پکڑ کر ایک کوٹھی کی بوگن ویلیا کی گھنی بیل کے نیچے لے آیا۔
وہ دونوں اس گھنی بیل کے نیچے اس انداز سے کھڑے تھے کہ پاس سے گزرنے والا ابھی بمشکل ان کے چہرے دیکھ سکتا تھا۔ رومیصہ کے چہرے سے دوپٹہ ہٹ گیا تھا اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ شاید سارا راستہ روتی ہوئی آئی تھی، ارسل کے دل پر گھونسا سا پڑا۔
''پلیز رومی، مجھے ایگزام نکال دینے دو، میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔'' وہ بلا ارادہ اس کے تھوڑا قریب ہوا، اس کی آنکھوں سے چھلکتے جذبے اور لہجے کی سچائی کو کسی گواہی کی ضرورت نہیں تھی۔
رومیصہ کو پہلی دفعہ یقین آیا تھا کہ اللہ کی اس پر خاص رحمت تھی، جس نے اس کی بے انتہا غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس شخص کا ساتھ اس کی قسمت میں لکھ دیا تھا جس نے اسے اپنی مکمل ذمے داری کے طور پر قبول کیا تھا۔
وہ رو رہی تھی اور ارسل اپنے ہاتھوں کی نرم انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو چن رہا تھا، وہ دونوں کسی اور دنیا میں پہنچے ہوئے تھے، کہ سیل فون کی گھنٹی انہیں حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

"تم خود بھی مرو گے اور مجھے بھی مرواؤ گے۔"
اس کا دوست گاڑی میں بیٹھا ہوا اتنی زور سے چیخا تھا کہ سیل فون سے باہر اس کی آواز رومیصہ کی سماعت تک بھی پہنچی، اس نے بوکھلا کر ایک دفعہ پھر دوپٹے سے منہ چھپالیا۔
"آرہا ہوں میں۔" ارسل نے سنجیدگی سے جواب دے کر فون بند کر دیا۔ "چلو رومیصہ، تمہیں جانا ہوگا۔"
"تم جاؤ، میں چلی جاؤں گی۔" وہ ہونٹ کچلتے ہوئے آنکھوں میں تنی دھند کی چادر کو ہٹانے میں کوشاں تھی۔
"تمہیں پتا ہے ناں میں راستے میں نہیں چھوڑ سکتا تمہیں، یہ میری بھی مجبوری ہے۔" جملہ سادہ لیکن انداز خاصا معنی خیز تھا۔ وہ بوکھلا کر تیز تیز چلنے لگی، وہ اپنی وجہ سے اس شخص کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی، جو اس کے دل پر اپنے نام کا جھنڈا لگا چکا تھا۔
"ہم پھر ملیں گے رومیصہ اور یہ وعدہ ہے میرا تمہارے ساتھ۔"
"تم جاؤ ارسل! میں چلی جاؤں گی اب۔" وہ چلتے چلتے مڑی، ارسل کی سانس سینے میں اٹکنے لگی، اور اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ گئی۔
اسی وقت رومیصہ کے گیٹ کے اندر سے دو سیکورٹی گارڈ باہر نکلے، انہوں نے چونک کر اس لڑکی کی طرف دیکھا، جو بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ پر آن پہنچی تھی، ایک سیکورٹی گارڈ نے اسے پہچان لیا۔
"رومیصہ بی بی، آپ۔" سیکورٹی گارڈ پر جوش انداز میں چیخا۔
ارسل نے اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک سرسری نگاہ اس عالی شان بنگلے پر ڈالی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی آمد سے اندر ایک کھلبلی سی مچ جائے گی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مر جائے گی لیکن اس پر کوئی حرف آنے نہیں دے گی۔
وہ تیز تیز چلتا ہوا گلی کے اختتام پر پہنچ گیا، اس نے آخری دفعہ مڑ کر دیکھا، رومیصہ اندر جا چکی تھی اور ارسل کو لگا جیسے اس کے تن سے بھی روح نکل گئی ہو۔ اس کی جدائی اس قدر جان لیوا ہوگی، اس بات کا ادراک اسے ابھی ابھی ہوا تھا۔

☆☆☆

پاس آئے، دوریاں پھر بھی کم نہ ہوئیں۔
اک ادھوری سی ہماری کہانی رہی۔
ٹی وی اسکرین پر کسی انڈین مووی کا آخری جذباتی سین چل رہا تھا اور پورے کمرے میں انابیہ کی سسکیاں گونج رہی تھیں، وہ صوفے پر دونوں پیر اوپر رکھے مکمل طور پر اس دکھی منظر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پاس ہی ٹشو کا ایک ڈبہ رکھا ہوا تھا۔
برہان اور درشہوار ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے، انابیہ کو ان کی آمد کی بالکل بھی خبر نہیں ہو سکی، وہ تو اس وقت ہیرو کی موت اور ہیروئن کے غم میں نڈھال تھی، اور پورا گھر جانتا تھا کہ وہ اس معاملے میں کتنی جذباتی اور حساس ہے۔ اس وجہ سے اس کی باقی کزنز اس کا خوب مذاق اڑاتیں اور وہ چاہ کر بھی اپنی بے جا حساسیت سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔
"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں۔۔؟"
برہان کے سرد لہجے پر وہ ایک دم سٹ پٹا کر اٹھی۔ اس کی گود میں رکھا ریموٹ کارپٹ پر جا گرا۔ جسے برہان نے جلدی سے اٹھا کر ٹی وی اسکرین کو آف کیا، انہیں اس قسم کی موویز سخت کوفت میں مبتلا کرتی تھیں۔

السلام علیکم۔'' اس نے بوکھلا کر انہیں سلام کیا، درشہوار کے چہرے پر ایک محظوظ ہوتی مسکراہٹ تھی، وہ جانتی تھی کہ اس وقت انابیہ کے دل کی کیا حالت ہوگی اور وہ ہمیشہ ایسی سچویشنز کو انجوائے کرتی تھی۔

''یہ کیا ڈرامہ چل رہا تھا یہاں۔؟ آخر تم کس دن حقیقت کی دنیا میں جینا سیکھوگی۔'' انہوں نے بے رحمانہ انداز میں اسے جھاڑا۔

''مجھ سے زیادہ حقیقت پسند کم از کم میر ہاؤس کی تو کوئی اور لڑکی نہیں ہوسکتی۔'' انابیہ خود کو سنبھال چکی تھی، اس کے تلخ لہجے نے برہان اور درشہوار دونوں کو ہی چونکا دیا۔

''مطلب کیا ہے تمہارا اس بات سے۔؟؟؟'' ان کی تیوری کے بل گہرے ہوئے۔

''مطلب۔؟ اور وہ بھی آپ پوچھ رہے ہیں۔؟'' انابیہ کا طنز انہیں سلگا گیا۔

''ہاں۔ میں ہی پوچھ رہا ہوں۔''

ان کی گہری، سرد ـــــ نظریں انابیہ کی قوت برداشت کا امتحان لے رہی تھیں لیکن وہ اب زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا ہنر سیکھ رہی تھی۔ اس لیے اپنے قدموں پر مضبوطی سے ڈٹی رہی۔

''آپ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہوگا، کیونکہ جس دن انابیہ خاقان کی زبان کھل گئی، اس کے بعد آنے والا طوفان میر ہاؤس کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دے گا۔'' وہ اس دفعہ اپنے پراعتماد انداز سے برہان کے ساتھ ساتھ درشہوار کے بھی چھکے چھڑا گئی۔ تبدیلی کا یہ موسم بڑی تیزی سے آیا تھا۔

''یہ تم کس لہجے میں بات کررہی ہو مجھ سے۔؟'' وہ جیسے ہی لاؤنج سے نکلنے لگی، برہان نے بلاارادہ غصے سے اس کا بازو پکڑا۔ انابیہ کے چہرے پر ایک تمسخرانہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ درشہوار کا دل دہل گیا۔

''بس چند منٹوں میں ہی ضبط کھو دیا، میرا بھی تو حوصلہ دیکھیں، اتنے سالوں سے برداشت کررہی ہوں۔''

وہ ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر غصے سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''اسے کیا ہوا۔؟'' درشہوار نے حیرانی سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' چھوٹی بہن کے سامنے اس کا رویہ انہیں بہت ہتک آمیز لگا۔

''میں پوچھتی ہوں اس سے۔'' درشہوار تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے کمرے کی طرف گئی، دروازہ کھلا ہوا تھا، سامنے طوبیٰ استری اسٹینڈ پر اپنا کوئی سوٹ استری کررہی تھی، اسے دیکھ کر وہ بے تابی سے اس کی جانب بڑھی۔

''تھینکس گاڈ، تم آگئیں قسم سے پورے گھر میں عجیب سی وحشت اور اداسی کا راج تھا، ہم سب لوگ بہت مس کررہے تھے تمہیں۔'' طوبیٰ سے گلے ملتے ہوئے بھی اس کی نظریں انابیہ کو تلاش کررہی تھیں۔ طوبیٰ نے اس کی بے چینی کو بھانپ لیا۔

''کسے تلاش کررہی ہو۔؟''

''بیا کہاں ہے؟'' درشہوار کا جملہ ابھی منہ میں ہی تھا، انابیہ واش روم سے نکلی اور اس نے ہاتھ میں پکڑا تولیہ کرسی پر اچھالا، اس کی آنکھوں سے چھلکتا گلابی پن دونوں کو ہی باور کروا گیا کہ وہ اندر رو کر آئی ہے۔

''بیا، کیا ہوا آپ کو۔؟'' درشہوار نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا تو طوبیٰ بھی فکرمند ہوئی۔

''کچھ نہیں اور تم جاؤ یہاں سے۔''

انابیہ کے لہجے کی بے رخی پر درشہوار کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے بوکھلا کر اپنی اس کزن کو دیکھا، جس کی نرم مزاجی کی خاندان میں مثالیں دی جاتی تھیں، وہ کچھ لمحے غور سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر جھٹکے سے مڑ گئی۔ طوبیٰ گھبرا کر اپنی بہن کی طرف بڑھی۔

''فارگاڈ سیک طوبیٰ، مجھ سے کچھ بھی مت پوچھنا، میں اپنا ضبط کھو دوں گی۔''
وہ بیڈ پر لیٹی اور اس نے کمبل تان لیا، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اس لمحے کسی سے بھی بات کرنا نہیں چاہتی۔ طوبیٰ کو بے شمار اندیشوں نے گھیر لیا، وہ جانتی تھی کہ انابیہ کو کوئی چھوٹی موٹی بات پریشان نہیں کرسکتی۔

☆☆☆

''دیکھیں بیرسٹر صاحبہ! بندہ ہر بات برداشت کرسکتا ہے لیکن اپنی بہو بیٹیوں کی عزت کی طرف اٹھتا ہوا ہاتھ نہیں۔''
شجاع غنی کی اس بات نے شہرزاد کو کچھ لمحوں کے لیے سُن کردیا، اور وہ ہکا بکا انداز میں اس شخص کا چہرہ دیکھنے لگی، جو چند ہی دنوں میں اسے خاصا بوڑھا سا لگنے لگا تھا۔
وہ اس وقت ارتضیٰ حیدر کی مدد سے شجاع غنی کے نئے گھر پہنچ چکی تھی، اس کی پریس کانفرنس کے بعد اس کے گھر کا پتا تلاش کرنا اتنا بھی مشکل نہیں رہا تھا، بھی تو چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ اس کی بیٹھک میں موجود تھی۔
''آپ خود بتائیں، جب گھر کی خواتین کی عزت پر حرف آنے لگے تو ایک غیرت مند بندہ کیا کرے، ان کا تماشا بنوائے یا سچائی کا ساتھ دے۔''
شجاع غنی کے منہ سے نکلنے والے اس جملے نے اسے لاجواب کردیا، اس نے بے یقین نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس مجبور شخص کو دیکھا، جس کی جھکی گردن، مایوسی میں ڈوبا ہوا لہجہ اور بے بس انداز چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ اس نے یہ قدم کس مجبوری کے عالم میں اٹھایا ہوگا۔
''میں آپ کی بات سمجھی نہیں شجاع صاحب۔'' وہ جان کر بھی انجان بن گئی۔
''اب کیا بتاؤں، آپ کو۔'' وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوا۔
''میرے ساتھ آخری ملاقات تک تو آپ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔'' اس نے انہیں یاد دلایا۔
''کورٹ میں آخری پیشی کے بعد میں گھر آیا تو میری سب سے چھوٹی بیٹی کالج سے آتے ہوئے راستے سے غائب کردی گئی، ایسے عالم میں کون شریف انسان اپنے موقف پر قائم رہ سکتا ہے۔'' اس کے لہجے میں ٹوٹی کرچیوں کی سی چبھن تھی۔
''واٹ۔؟'' شہرزاد کے ساتھ ساتھ ارتضیٰ کو بھی شاک لگا۔
''آپ کو انفارم کرنا چاہیے تھا ہمیں۔'' ارتضیٰ ہلکا سا جھنجلایا۔
''دیکھیں ایس پی صاحب۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید بولنے سے روکا۔
''میں اتنا بہادر نہیں تھا کہ اپنی بیٹی کا میڈیا میں تماشا بنوا دیتا اور لوگوں کی انگلیاں اس کے کردار کی طرف اٹھتیں اور وہ ساری زندگی خاندان والوں کی چبھتی ہوئی نظروں اور بے ہودہ سوالوں کے جواب دیتے گزار دیتی۔'' شجاع غنی کے منہ سے نکلنے والی اس تلخ سچائی نے شہرزاد کو کچھ لمحوں کے لیے گنگ کردیا۔
''کیا میر حاکم علی کے خاندان نے یہ گھٹیا حرکت کی تھی۔؟'' اس نے ہلکا سا سنبھل کر پوچھا۔
''ان کے علاوہ کون کرسکتا تھا ایسا۔'' وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔
''صرف چند گھنٹوں میں انہوں نے میری ذات کا غرور چھین لیا، میری عزت نفس اور غیرت کا سودا کرلیا، میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی حل چھوڑا ہی نہیں، بہر حال میں بہت زیادہ شرمندہ ہوں آپ سے، ہوسکے تو مجھے معاف کردیجیے گا۔'' شجاع غنی حقیقتاً شرمندہ تھا۔
''آپ نے جو کیا، بالکل ٹھیک کیا۔'' ارتضیٰ حیدر نے ان کی شرمندگی کے احساس کو کم کرنے کے لیے کہا۔

"میرا خیال ہے شہزاد، اب ہمیں نکلنا چاہیے۔" وہ ایک دم کھڑا ہوا اس لیے شہزاد کو بھی اس کی پیروی کرنا پڑی۔

"آپ ٹینشن مت لیں، اللہ ظالموں کی رسی دراز ضرور کرتا ہے لیکن انہیں اسی دنیا میں اس کا حساب دینا پڑے گا۔" شجاع غنی نے شہزاد کے بجھے ہوئے چہرے کو دیکھ کر سنجیدگی سے کہا تو وہ زبردستی مسکرادی۔

وہ دونوں اس کی بیٹھک سے نکل کر سڑک پر آگئے جہاں ارتضیٰ کی جیپ کھڑی تھی، اس نے آگے بڑھ کر احتراماً شہزاد کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور وہ اپنی سوچوں میں گم چپ چاپ بیٹھ گئی، اس ملاقات نے اس کا میر فیملی کی طرف سے دل مزید کھٹا کردیا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں آپ...؟" ارتضیٰ نے اس کا کسی گہری سوچ میں گم چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"میرے خیال میں، شجاع صاحب کو اتنی جلدی ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں تھے۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"اس کی جگہ اگر میں ہوتا تو شاید یہی کرتا۔" ارتضیٰ حیدر کی صاف گوئی پر شہزاد کو تعجب کا جھٹکا لگا۔

"کم از کم آپ سے میں اس بزدلی کی توقع نہیں کرتی۔" شہزاد کے لبوں سے دل کی بات نکلی۔

"آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اولاد کی محبت کیا چیز ہوتی ہے۔"

"ہاں، آپ کے تو جیسے ایک درجن بچے ہیں۔" وہ جل کر بولی اور ارتضیٰ کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔

"بعض دفعہ ہمارے کچھ بولڈ فیصلے، دوسروں کے راستے میں کرچیاں بھی بکھیر سکتے ہیں، اس لیے میں اس کامیابی کو کامیابی نہیں سمجھتا، جو دوسروں کو امتحان میں ڈال کر حاصل کی جائے۔" وہ دوٹوک انداز میں اپنا موقف بتا رہا تھا۔

"کسی ایک جنریشن کو تو قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔" شہزاد کے اس معاملے میں اپنے اصول تھے۔

"آپ کی بہن کے ساتھ جو ہوا، اس کے باوجود بھی آپ یہی کہہ رہی ہیں کہ شجاع کو اسٹینڈ لینا چاہیے۔"

"ہاں..." وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

"شجاع غنی کی بیٹی کا کیا قصور ہے شہزاد۔" ارتضیٰ حیدر نادانستگی میں اس کی دکھتی رگ کو دبا گیا۔

"تو میری بہن کا کیا قصور تھا، اسے بھی تو جان بوجھ کر اس سارے معاملے میں ملوث کیا گیا، وہ ابھی تک اپنے ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہی ہے اور اللہ جانے کب تک بھٹکتی رہے گی۔" وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

"آئی ایم سوری، میرا مقصد ہرگز آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔" وہ بے چین ہوا۔

"آپ کا جو بھی مقصد تھا لیکن یہ بات ذہن میں رکھیے کہ میری بہن نے جسٹس محمود کے بیٹے کا مرڈر نہیں کیا۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی اور ارتضیٰ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"آئی تھنک، آپ نے میری بات کو مائنڈ کیا ہے۔" اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔ وہ اس کی ناراضی کسی بھی قیمت پر افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" شہزاد نے فوراً ہی اس کی بات کی نفی کی اور کھڑکی سے باہر دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔

"آئی ایم سوری۔" ارتضیٰ حیدر کی تسلی نہیں ہورہی تھی۔

''میں نے کہا ناں، آل رائٹ۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔
''تو ٹھیک ہے پھر ایک کپ کافی کا آپ کو میرے ساتھ پینا ہوگا۔ اس نے اپنی جیپ ''سیکنڈ کپ'' کافی شاپ کے سامنے روک دی۔
''ٹرسٹ می ارتضی، میرا قطعاً— موڈ نہیں ہے۔''
''چلیں، آپ میرا ساتھ دینے کو کچھ دیر کے لیے بیٹھ تو سکتی ہیں ناں۔'' وہ نرمی سے گویا ہوا۔
وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترا تو شہرزاد کو بھی مجبوراً اس کی بات ماننی پڑی کیونکہ وہ اپنی پروفیشنل مصروفیات کے باوجود ہر مشکل وقت میں اس کے ساتھ ہوتا تھا، اور وہ کم از کم احسان فراموش نہیں تھی۔
اسے کافی شاپ میں بیٹھے ہوئے بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے جب اس کی ٹیکسٹ ٹون کی بپ بجی۔ اس نے ایک لمبا سانس لے کر اپنے سیل فون کی اسکرین پر نظریں دوڑائیں، اسے ہلکا سا شاک لگا۔ سامنے ہم زاد کا میسج تھا۔
''زندگی میں مجھے آج سے پہلے کافی کبھی اتنی بُری نہیں لگی، تم جب جب اس شخص کے ساتھ ہوتی ہو، یقین مانو، میرے لیے کھل کر سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے، آخر کب تک تم میرے دل سے کھیلتی رہو گی۔''
اس نے بے اختیار گردن موڑ کر دائیں بائیں دیکھا، اس وقت کافی شاپ میں کافی رش تھا۔ ارتضی سیلف سروس کی وجہ سے کاؤنٹر پر کھڑا تھا اس کی پشت شہرزاد کی طرف تھی، اور ہم زاد کا یہ میسج شہرزاد کا سارا سکون برباد کر چکا تھا، تب ہی ارتضی واپس آیا تو وہ بے چینی سے پہلو پر پہلو بدل رہی تھی۔
''سب کچھ ٹھیک ہے ناں۔؟'' وہ اس کی بے چینی بھانپ چکا تھا۔
''ہاں۔'' وہ زبردستی مسکرائی، اسی وقت اس کے سیل فون کی مترنم گھنٹی بجی، دوسری طرف ٹینا بیگم تھیں۔
''شہرزاد! کہاں ہو تم، فوراً گھر پہنچو۔''
''کیا ہوا ممی! خیریت تو ہے ناں۔'' ان کا غیر معمولی انداز اس کا دل دھڑکا گیا۔
''رومیصہ واپس آ گئی ہے۔'' ٹینا بیگم کے اس جملے نے اس کی سماعت پر ٹھنڈی پھوار برسا دی۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کو سننے کے لیے اس کے کان ترس گئے تھے۔ وہ کافی کا مگ میز پر رکھ کر بے تاب انداز میں کھڑی ہوئی۔
''ارتضی، ہمیں نکلنا ہوگا، رومی گھر آ گئی ہے واپس۔'' اس کے ہر انداز سے خوشی چھلک رہی تھی۔
''دیٹس گریٹ۔'' اس نے بھی اپنا کافی کا کپ جوں کا توں واپس رکھ دیا تھا۔ اگلے ہی لمحوں میں وہ سب کچھ بھول کر بڑے مطمئن انداز میں ارتضی کی جیپ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ رومیصہ کی واپسی کی خبر نے اس کے اعصاب کو پرسکون کر دیا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں کس نے بتایا، شجاع غنی کو اس طرح ٹریپ کیا گیا تھا۔؟''
سعد نے ہادی کا چہرہ حیرانی سے دیکھا، جیسے وہ کوئی داستان امیر حمزہ سنا رہا ہو۔ دونوں اس وقت لان میں ٹہل رہے تھے۔ شام کے وقت مری کی ہواؤں میں مزید ٹھنڈک کا اضافہ ہو جاتا تھا اور یہ موسم ہادی کو بے انتہا پسند تھا۔
''ظاہر ہے کون بتا سکتا ہے، شہرزاد نے ممی کو بتایا تھا، اس کی ملاقات ہوئی تھی اس سے۔''
''یہ تو بہت بُرا کیا میر خاقان نے۔'' سعد کو بھی ٹھیک ٹھاک افسوس ہوا۔
''میں تو تم سے پہلے دن سے کہہ رہا ہوں کہ یہ خاندان اس قابل نہیں ہے کہ انہیں منہ لگایا جائے۔'' ہادی ٹہلتے ٹہلتے رکا۔

اسے اپنے اوپر کسی کی نظروں کا ارتکاز محسوس ہو رہا تھا، جس کی وجہ سے خاصی الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور کسی کو نہ پا کر اس کی نظر جیسے ہی میر ہاؤس کے ٹیرس پر پڑی وہ جی بھر کر بدمزا ہوا۔ سامنے درشہوار چائے کا کپ پکڑے بظاہر بے نیازی سے دوسری جانب دیکھ رہی تھی لیکن ہادی کو اس کی ایکٹنگ میں جھول دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے اس لڑکی کی ہر چیز ہی بہت بُری لگتی تھی، یہ شاید اس کے خاندان کے ساتھ اس کی ناپسندیدگی تھی یا پھر کوئی اور عنصر کارفرما تھا، اسے اس بات کی گہرائی میں جانے کا ابھی تک موقع نہیں ملا تھا۔

''کیا ہوا۔؟'' سعد نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا، جو غضب ناک نظروں سے میر ہاؤس کے ٹیرس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ درشہوار کو دیکھتے ہی سعد کو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔

''چلو اندر چلتے ہیں، اب کوئی شریف انسان اپنے لان میں ٹہل بھی نہیں سکتا۔'' ہادی کے ہونٹوں پر زہر ناک تبسم ابھرا۔

''کیوں، ہم کون سا کسی سے ڈرتے ہیں۔'' سعد وہیں لان چیئرز پر جم کر بیٹھ گیا۔

''یقین مانو، اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے ہائی بلڈ پریشر کی بیماری ہو جائے گی۔'' ہادی خاصا برہم تھا۔

''تم مٹی ڈالو اس پر اور یہ بتاؤ، بیرسٹر شیری اب کیا کرے گی۔'' سعد نے دانستہ موضوعِ گفتگو بدلا۔ ویسے بھی جہاں درشہوار موجود ہوتی، اس کا وہاں سے جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ ایک ایسی مجبوری تھی جس کا اظہار وہ کسی کے بھی سامنے نہیں کر سکتا تھا۔

''ظاہر ہے، اب وہ کیا کر سکتی ہے، سوائے صبر کرنے کے، چلو اٹھو تھوڑا باہر واک کر کے آتے ہیں۔'' اس کے حلق میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔ اسے درشہوار کی نگاہوں سے الجھن ہو رہی تھی۔

''میر خاقان نے یہ سب اچھا نہیں کیا۔''

''تو کون سا پہلی دفعہ کچھ غلط کیا ہے، ہمیشہ سے یہی تو کرتے آئے ہیں وہ لوگ۔''

ہادی نے ایک لاتعلق سی نگاہ درشہوار پر ڈالی اور سعد کے ساتھ باہر نکل آیا، وہ دونوں اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر ٹہل رہے تھے، جب ارسل کی گاڑی ان کے پاس آ کر رکی۔ وہ سعد کو دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرایا اور گاڑی سے اتر آیا، اس کی سعد کے ساتھ کافی دوستی تھی۔

''کیسے ہو ارسل۔؟ آج کل کہاں گم ہو، نظر ہی نہیں آتے۔؟'' سعد نے اس سے گلے ملتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''بس یار کچھ ماہ سے ہاسٹل شفٹ ہو گیا تھا، اس لیے کم کم آنا ہو رہا تھا ادھر، تم سناؤ، کیا سین چل رہا ہے۔'' ارسل کے ہر انداز میں تھکاوٹ کا عنصر غالب تھا اور آنکھوں کے نیچے حلقے بھی نمایاں تھے، ہادی ان دونوں کی گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا۔

''کچھ نہیں، وہی سرکاری نوکری، اور کام دھندا۔'' سعد نے سرسرا سے ٹالا۔

''آؤ ناں اندر، ایک ایک کپ چائے کا ہو جائے۔'' اس نے آدابِ میزبانی نبھائے۔

''فی الحال تو تم جا کر ریسٹ کرو، ایسا لگ رہا ہے جیسے صدیوں سے جاگ رہے ہو۔'' سعد نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں۔ اب تو لگتا ہے نیند مستقل ہی آنکھوں سے اڑ گئی ہے۔'' ارسل کی زبان پھسلی۔

''کہیں کوئی عشق وشق کا روگ تو نہیں لگا بیٹھے، مر جا کا کا، اے راہواں بڑیاں اوکھیاں نے۔'' سعد کے شرارتی انداز پر وہ ہنسا، اسی وقت میر ہاؤس کا گیٹ کھلا اور درشہوار باہر نکلی، جسے دیکھتے ہی ہادی کی تیوری چڑھ گئی،

وہ جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر باہر نکلی ہے شاید اس نے ٹیرس سے ان دونوں کو ارسل کے ساتھ کھڑے دیکھ لیا تھا۔
"السلام علیکم۔" اس نے کن انکھیوں سے ہادی کو دیکھتے ہوئے سلام جھاڑا۔ اس کی آمد پر ارسل ہلکا سا جھنجھلایا۔
"کیا پرابلم ہے درشہوار۔" وہ کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"مجھے کچھ ڈاکومنٹس فوٹو کاپی کروانے جانا ہے، چلو گے میرے ساتھ۔" وہ ارسل کی خفگی پر تھوڑا سنبھل کر گویا ہوئی۔
"یہ کام تو گھر کا کوئی ملازم بھی کر سکتا ہے، اینی ہاؤ، دو مجھے اور تم جاؤ اندر۔" اس نے بیزاری سے اس کے ہاتھ میں پکڑا لفافہ پکڑا اور ذرا سخت لہجے میں اسے اندر جانے کا اشارہ کیا، وہ پیر پٹختی ہوئی اندر کی طرف چلی گئی، سعد کی نظروں نے بڑی دور تک اس کا تعاقب کیا۔
"بھئی سعد! اب اجازت، پھر ملیں گے ان شاء اللہ۔" ارسل نے مصافحہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ باری باری دونوں کی طرف بڑھایا، اور پھر تھکے تھکے انداز میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا، میر ہاؤس کے نئے چوکیدار نے گیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

☆☆☆

"اللہ اکبر، اللہ اکبر، اشہدان لا الہ اللہ۔
اشہدان لا الہ الا اللہ۔"
عصر کی اذان کے یہ کلمات جیسے ہی مونیکا کے کانوں میں پڑے، اسے اپنے اندر طمانیت کی لہریں ابھرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے کچن کے سارے کام چھوڑ دیئے اور بڑے سکون سے ان کلمات کو سننے لگی۔
"پاپا کو جانا ہے۔ پلیز، جلدی کھانا تیار کرو۔"
اس کی بہن عجلت بھرے انداز میں گویا ہوئی، تو وہ جلدی جلدی ہاتھ ہلانے لگی، مغرب کے وقت سے تھوڑا پہلے اس کا کھانا بالکل تیار تھا۔
اس کے گھر والوں کو اس نئے گھر میں شفٹ ہوئے صرف چار دن ہوئے تھے لیکن مونیکا کی ماں کا مزاج مسلسل برہم تھا، اسے گھر تو اچھا لگا تھا لیکن پڑوس میں موجود مسجد سے آنے والی پانچ وقت کی اذان سے بڑی کوفت ہوتی اور اکثر اسی وقت اس کی جارج کے ساتھ لڑائی شروع ہو جاتی اور اب تو جارج بھی اپنی بیوی کی اس بات پر بُری طرح سے چڑنے لگا تھا۔
"پتا نہیں کس مصیبت خانے میں اٹھا کر لے آئے ہو ہمیں۔" مارتھا نے دھلے ہوئے کپڑوں کو تہ کرتے ہوئے اپنے شوہر کو سنایا، جو اس وقت ڈریسنگ کے سامنے کھڑا اپنے بال بنا رہا تھا۔
"تم ایک انتہائی ناشکری عورت ہو، ایسا لگتا ہے جیسے تمہیں نئے گھر میں نہیں جیل میں لے آیا ہوں میں۔" جارج بھی تپ گیا۔
"تم نے بھی تو یہ گھر اس طرح خریدا ہے جیسے دنیا کا کوئی آخری گھر ہو۔" مارتھا نے بھی دوبدو جواب دیا۔
"ہاں تو میرے پاس کون سا قارون کا خزانہ تھا، جتنی اوقات تھی' لے لیا۔" جارج نے ہاتھ میں پکڑا برش غصے سے بیڈ پر پھینکا۔ کمرے میں کھانے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوتی مونیکا نے پریشانی سے یہ منظر دیکھا، وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کو کس چیز سے مسئلہ ہے۔
"بے شک گھر کرائے کا تھا لیکن سکون تو تھا۔" مارتھا نے بھی جھنجھلا کر وارڈروب کا پٹ بند کیا۔
"یہاں کون تمہاری گردن پر انگوٹھا رکھے بیٹھا ہے۔؟" جارج غصے سے اپنی بیوی کے عین سامنے آن کھڑا

ہوا۔اسی وقت مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز
پر مارتھا نے بڑی طنزیہ نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔لاؤڈ اسپیکر کی آواز فل ہونے کی وجہ سے اب وہ دونوں صرف ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات ہی دیکھ سکتے تھے۔
''اب پتا چل گیا ناں، کون انگوٹھا رکھے بیٹھا ہے۔'' جیسے ہی اذان کی آواز بند ہوئی، مارتھا ایک دفعہ پھر شروع ہوگئی۔
''دماغ خراب ہے تمہارا، آج تک چرچ کے پڑوس میں واقع احمد صاحب کی مسز نے تو کبھی ایسی شکایت نہیں کی تھی۔'' جارج نے اپنی ایک جاننے والی فیملی کا حوالہ دیا۔
''ہمارے چرچ میں ہر وقت شور وغل تھوڑی ہوتا ہے۔'' مارتھا کے عقائد اپنے مذہب کے معاملے میں خاصے پختہ تھے۔
''پاپا، پلیز کھانا کھائیں، اور پھر آپ کو اکیڈمی بھی جانا ہے۔'' مونیکا نے پریشانی سے کھانے کی ٹرے سائیڈ میز پر رکھی۔
''یہ تم اپنی ماں کو کھلاؤ، جو ہر وقت میرا بھیجا چاٹتی رہتی ہے۔'' جارج غصے میں اپنی بائیک کی چابی اٹھا کر گھر سے نکل گیا۔مونیکا نے تاسف بھری نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا، جن کے چہرے پر ابھی بھی کوفت کا تاثر نمایاں تھا۔
''تم کب جا رہی ہو لاہور؟''
''کل رات۔''

''بس ٹھیک ہے اس دفعہ کچھ پیسے لیتی جانا اور وہاں سے اپنی شادی کی کچھ شاپنگ کر لینا۔''
ماں کی اس بات نے مونیکا کو بد مزا کیا، لیکن اس نے مصلحتاً اثبات میں سر ہلایا اور ٹرے اٹھا کر کمرے سے نکل گئی، مارتھا جھنجلا کر بیڈ پر بیٹھی، وہ چاہ کر بھی اپنے شوہر جارج کو نہیں بتا سکتی تھی کہ اسے اذان کے کلمات نہیں اس لمحات میں اپنی بیٹی کے چہرے پر چھایا ہوا سکون خوف زدہ کرتا ہے اور اسی بات نے اس کی رات کی نیندیں اور دن کا سکون برباد کر رکھا تھا۔

☆☆☆

''ممی! آپ نے کیوں سونے دیا اسے۔؟''
''حد کرتی ہو شیری، تم نے اس کی شکل نہیں دیکھی، کیسے چند دنوں میں مرجھا سا گیا ہے میری بیٹی کا چہرہ۔'' ٹینا بیگم کو آج بار بار رومی پر لاڈ آ رہا تھا۔
شہزاد کی گھر واپسی ہوئی تو رومیصہ کھانا کھا کر بڑی گہری نیند سو چکی تھی، جب کہ شہزاد کو اس سے بات کرنے کی بے تابی تھی، اس لیے وہ کرید کرید کر ان سے رومیصہ کے متعلق پوچھ رہی تھی۔
''اس نے کچھ تو بتایا ہوگا ممی۔'' شہزاد ٹہلتے ٹہلتے رکی۔
''بس یہی بتا رہی تھی کہ وہ چند لڑکے تھے اور اسے کسی فارم ہاؤس میں بند کر رکھا تھا، اور پولیس کے چھاپے پر گھبرا کر وہ اسے لے کر نکل آئے۔'' ٹینا بیگم نے سلاد کی پلیٹ سے کھیرا اٹھاتے ہوئے بڑے سکون سے بتایا، رومیصہ کی واپسی نے انہیں پرسکون کر دیا تھا۔
''انہوں نے خدانخواستہ اس کے ساتھ کچھ برا تو نہیں کیا۔'' شہزاد نے ڈھکے چھپے الفاظ میں پوچھا۔
''نہیں نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا الحمدللہ میں نے رومی سے بہت کرید کرید کر پوچھا تھا۔'' ٹینا بیگم کا پرسکون لہجہ اس بات کا گواہ تھا کہ رومیصہ نے انہیں مطمئن کر دیا ہے اور کچھ ہارون سے جان چھوٹنے پر بھی وہ ان دنوں خود

کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں۔
"وہ بہت زیادہ ڈپریس یا ٹینس تو نہیں تھی۔" شہزاد کی کسی صورت بھی تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔
"کم آن شیری۔" ٹینا بیگم ہلکا سا جھنجلائیں۔
"میں نے بتایا ناں، اس میں بہت پوزیٹو چینج آچکا ہے، ایسا کچھ نہیں ہے، جو تم سوچ رہی ہو، وہ تو بہت جذباتی انداز سے ملی تھی مجھ سے اور کافی دیر میری گود میں سر رکھے بھی لیٹی رہی ہے۔"
اسی وقت شہزاد کے سیل فون پر ہمزاد کا نمبر روشن ہوا، وہ کال اٹینڈ کرتے ہی لان میں چلی آئی اور ٹینا بیگم نے بھی سکون کا سانس لیا، وہ جانتی تھیں کہ جب تک شیری، خود رومیصہ سے بات نہیں کر لے گی مطمئن نہیں ہوگی اور نہ ہی انہیں چین سے بیٹھنے دے گی۔
"کیسی ہو تم، ایک بات تو بتاؤ۔" دوسری طرف اس کے لہجے میں خاصی گہری سنجیدگی تھی، شہزاد کا دل بے اختیار دھڑکا۔
"ہاں پوچھو۔"
"آج مجھے اپنی فیورٹ بلیک کافی کا ذائقہ اتنا بدمزا اور تلخ کیوں لگا ہے؟" ہمزاد کے جتاتے ہوئے انداز پر شہزاد کے چہرے پر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ آگئی، وہ جانتی تھی کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔
"تم نے کیا خفیہ کیمرے لگا رکھے ہیں میرے اوپر۔"
"تمہارا اور میرا تعلق خفیہ کیمروں پر نہیں کسی اور کنکشن پر چلتا ہے، یقین مانو، جذبات میں سچائی اور خلوص ہو تو ایک دل کی بات دوسرے کے دل پر وحی بن کر اترتی ہے، یقین نہیں آتا تو آزما لو۔" ہمزاد کی بات پر شہزاد کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ اس نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔
"تو پھر میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوتا۔" اس نے ہچکچا کر پوچھا۔
"کبھی میری والی پوزیشن پر آکر دیکھو، یا میری طرح سوچ کر دیکھو، الہام نہ ہونے لگیں تو نام بدل دینا۔" اس نے پراعتماد لہجے میں کہا۔
"فی الحال الہام کو چھوڑو، مجھے یہ بتانا تھا کہ۔"
"رومیصہ واپس آگئی ہے۔" ہمزاد نے اس کی بات کاٹ کر بے ساختہ کہا تو وہ ساکت ہوگئی۔
"ہاں۔"
"مبارک ہو۔ لیکن اس بات کو ابھی اپنے گھر تک ہی محدود رکھو تو بہتر ہوگا۔" اس نے مخلصانہ مشورہ دیا، جو شہزاد کو اچھا نہیں لگا۔
"میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ مجھے اس معاملے کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔" بات کرتے ہوئے شہزاد کی نظر گیٹ پر پڑی، جہاں اس کے گھر کا چوکیدار ایک میاں بیوی اور ان کے ساتھ تین ٹین ایج بچوں کو لیے اندر کی طرف جا رہا تھا۔
"ہاں تم، واقعی جانتی ہو کہ کس شخص کو کس طرح سے ہینڈل کرنا ہے اور کس کی نبض پر کیسے ہاتھ رکھنا ہے۔؟" اس کے طنزیہ انداز پر وہ مسکرائی۔
"تم خفا ہو مجھ سے۔"
"ایک دفعہ ہوا تھا یقین مانو پوری کائنات ہی بے رنگ لگنے لگی تھی۔" وہ جانتی تھی، باتوں میں اس سے کوئی نہیں جیت سکتا تھا۔
"میرا خیال ہے مجھے فون بند کر دینا چاہیے۔" اس کی باتیں شہزاد کے دل کو ایک دفعہ پھر گھیرنے لگیں، اس

نے بوکھلا کر فون بند کر دیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر آئی تو ٹینا بیگم سامنے ایک کھلی عدالت سجائے بیٹھی تھیں۔
"جمیل میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ ابھی اس گھر میں نئے ملازمین کی ضرورت نہیں ہے، تم نے پھر بلوا لیا انہیں۔"
"بی بی جی! یہ میرا پھپھی زاد بھائی ہے، یقین مانیں، بہت مجبور لوگ ہیں یہ۔" جمیل کے التجائیہ انداز پر شہرزاد چونکی۔
"تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تین افراد کے اس گھر میں چھتیس نوکر بھرتی کر لوں میں۔" ٹینا بیگم کے ایک دم چڑنے پر دونوں میاں بیوی کے چہرے پر ایک تاریک سایہ دوڑا، وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر آئے تھے اور ان کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔
"ایکسکیوزمی مام، مجھے بات کرنے دیں ان سے۔" شہرزاد ایک دم ہی سامنے آئی تو چوکیدار کی سانس میں سانس آئی، اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ شیری بی بی کا مزاج اس گھر میں سب سے مختلف ہے اور وہ ملازمین کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرتی ہیں۔
"پلیز شیری بی بی! ان کا کچھ کریں، یہ بے چارے تو مری چھوڑ کر مستقل آ گئے ہیں یہاں۔"
مری کے نام پر شہرزاد چونکی اور اس نے اس دفعہ ذرا غور سے اپنے سامنے کھڑے اس کنبے کو دیکھا، جن کے چہروں پر اتنی بے بسی تھی کہ شہرزاد کو بے اختیار ان سے نظریں چرانی پڑیں۔
"ٹھیک ہے، تم ہی ہینڈل کرو انہیں، میرے پاس تو وقت نہیں ہے۔"
ٹینا بیگم رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتے ہوئے کھڑی ہوئیں۔ "لیکن فار گاڈ سیک شیری! یہ ضرور دیکھ لینا کہ گھر میں مزید لوگوں کی گنجائش نہیں ہے۔" انہوں نے لاؤنج سے نکلتے ہوئے بڑے واضح الفاظ میں کہا اور ٹک ٹک کرتی ہوئی نکل گئیں۔
"اس سے پہلے کہاں جاب کر رہے تھے آپ لوگ۔؟"
شہرزاد کے اس سوال پر بہادر علی نے بے اختیار پریشانی سے اپنی بیوی رشیدہ کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے پر پھیلا ہوا خوف شہرزاد کی زیرک نگاہوں سے نہیں چھپ سکا۔ وہ کچھ کشمکش و پیچ کا شکار لگ رہے تھے، جیسے بتانا نہ چاہ رہے ہوں۔
"دیکھیں، آپ کو صاف صاف بات بتانا ہو گی، ورنہ ممی کا جواب تو آپ سن چکے ہیں۔" شہرزاد نے سختی سے کہا۔ "بی بی جی، جن کے گھر ہم پچھلے بیس سال سے کام کر رہے تھے، انہوں نے بہت برا کیا ہمارے ساتھ۔" رشیدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں اور شہرزاد کے کان کھڑے ہو گئے، اس کی چھٹی حس نے غلط الارم نہیں بجایا تھا۔
"ہمارے تو محافظ ہی لٹیرے بن گئے، ہمیں برباد کر دیا ان ظالموں نے، اللہ غارت کرے گا انہیں بھی ان شاءاللہ۔" رشیدہ اونچی آواز میں رونے لگی تو شہرزاد کو ہلکی سی پریشانی ہوئی۔
"کن کی بات کر رہی ہیں آپ۔؟"
"میر حاکم علی کے خاندان کی۔" اس دفعہ جواب اس کے چوکیدار جمیل کی طرف سے آیا تھا۔
شہرزاد کو ایک زوردار جھٹکا لگا، اور اس نے بے یقینی سے سامنے کھڑے چھوٹے سے خاندان کو دیکھا، ان سب کے چہروں پر پھیلی بے بسی اور بے چارگی ان کی سچائی کی گواہ تھی، وہ واقعی کسی بڑی قیامت سے گزر کر اس کے پاس آئے تھے یا پھر قدرت خود ان کا ہاتھ پکڑ کر اس کے در پر لے آئی تھی۔ شہرزاد کو شجاع غنی کی بات پر یقین آ گیا، وہ جو کہتا تھا کہ اللہ نے میر خاندان کی رسی دراز کر رکھی ہے اور کسی دن اچانک کھینچ کر ان سب کو اوندھے منہ گرا دے گا۔ شہرزاد کے ہونٹوں پر بڑی مبہم سی پراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ (باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

نظر میں عرشِ بریں ہے، کسی کو کیا معلوم
کہاں یہ خاک نشیں ہے، کسی کو کیا معلوم

تمام ہیچ ہے دُنیا، علائقِ دُنیا
جو نقش زیبِ جبیں ہے، کسی کو کیا معلوم

نہ در کُھلا نہ دریچے کبھی کُھلے دیکھے
مکاں میں کون مکیں ہے، کسی کو کیا معلوم

وہ ایک لفظ جو اُترا نہ زینۂ لب سے
ہمیں اُسی کا یقیں ہے، کسی کو کیا معلوم

پیامِ بر کی ضرورت نہ شرحِ دل کا خیال
وہ کس بلا کا ذہیں ہے، کسی کو کیا معلوم

سیما شکیب

کاش ایسے بھی یاد آؤں میں
تیری پلکوں پہ جھلملاؤں میں

پھر تجھے بھی تلاش کر لوں گا
پہلے خود کو تو ڈھونڈ لاؤں میں

کوئی بھی بات اَن کہی نہ رہی
کیا سُنوں اور کیا سُناؤں میں

خط بھی لکھوں اسے غزل کی طرح
کچھ کہوں اور کچھ چھپاؤں میں

وہ اگر پیار سے کہے عارف
چاند تارے بھی توڑ لاؤں میں

عارف شفیق

بے وفائی کی مشکلیں

جو تم نے ٹھان ہی لی ہے
ہمارے دل سے نکلو گے
تو اتنا جان لو پیارے!
سمندر سامنے ہوگا
اگر ساحل سے نکلو گے
ستارے جن کی آنکھوں نے
ہمیں اک ساتھ دیکھا تھا
گواہی دینے آئیں گے
پرانے کاغذوں کی بالکونی سے
بہت سے لفظ جھانکیں گے
تمہیں واپس بلائیں گے
کئی وعدے
فسادی قرض خواہوں کی طرح
رستے میں روکیں گے
تمہیں دامن سے پکڑیں گے
تمہاری جان کھائیں گے
چھپا کر کس طرح چہرہ
بھری محفل سے نکلو گے
ذرا پھر سوچ لو جاناں!
نکل تو جاؤ گے شاید
مگر مشکل سے نکلو گے

امجد اسلام امجد

خود اپنے آپ سے ہر شخص کچھ خفا سا ملا
رہِ حیات میں ہر اک لٹا لٹا سا ملا

نہ داستانِ محبت کہیں ملی پوری
کتابِ عشق کا ہر اک ورق پھٹا سا ملا

جو آدمی ہو اسے اب کہاں تلاش کریں
تیرے جہاں میں تو ہر آدمی خدا سا ملا

نگہ سے اشکوں کی زنجیر بن کے اترا ہے
وہ ایک چہرہ ہمیشہ ہمیں جدا سا ملا

وہ میری سوچ کے پھولوں پہ آگ پھینک گیا
جو ہاتھ راہی میرے ہاتھ سے ذرا سا ملا

سوہن راہی

قابل دید

ایک سرمایہ دار نے پاگل خانے کی انتظامیہ کو ایک بڑا تالاب تیار کرنے کے لیے ایک معقول رقم دی۔ اس کی خواہش تھی کہ پاگل خانے کے ذہنی مریض پیراکی اور مچھلی کے شکار کا حقیقی لطف اٹھائیں۔ تالاب کی تعمیر کے چند ہفتے بعد اس نے ایک منتظم سے پوچھا۔

"مریضوں نے تالاب کو پسند کیا؟"

"بے حد پسند کیا جناب۔" منتظم نے کہا۔ "کچھ تو کئی گھنٹے نہاتے ہیں۔ کچھ تیرتے رہتے ہیں اور کچھ مریض دن بھر ڈور ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کی دل چسپی کو دیکھتے ہوئے انتظامیہ سنجیدگی سے غور کر رہی ہے کہ تالاب میں کچھ مقدار میں پانی اور دو چار مچھلیاں بھی ڈلوادی جائیں۔"

لطیفہ یا حقیقت

بش اور اوباما ایک بار میں بیٹھے تھے۔ ایک مسلمان لڑکے نے ان سے پوچھا۔

"تم لوگ اب کیا پروگرام بنا رہے ہو؟"

بش بولا۔ "تھرڈ عالمی جنگ کا پروگرام ہے۔ اس مرتبہ ہم لوگ 140 ملین مسلمانوں کو ماریں گے اور ساتھ ہی کترینہ کیف کو بھی مار ڈالیں گے۔"

لڑکا: "کترینہ کیف کو کیوں مارو گے؟"

بش نے مسکرا کر اوباما کی طرف دیکھا اور بولا۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ مسلمانوں کو قتل کرنے کی وجہ کوئی نہیں پوچھے گا۔"

زبیدہ آپا

بہت عرصہ کی بات ہے کہ ایک امریکن عورت' ایک جاپانی عورت اور زبیدہ آپا ایک کشتی میں اکٹھی بیٹھی دریا کی سیر کر رہی تھیں کہ ایک جن نمودار ہوا اور بولا۔

"تم سب باری باری کوئی بھی چیز دریا میں پھینکو۔ میں نے اگر وہ چیز ڈھونڈلی تو اس عورت کو کھا جاؤں گا جس کی وہ چیز ہوگی اور اگر نہ ڈھونڈ سکا تو ہمیشہ کے لیے اس عورت کا غلام ہو جاؤں گا۔"

سب سے پہلے امریکی عورت نے اپنے موبائل فون میں چھوٹا سا میموری کارڈ نکالا اور دریا میں پھینک دیا۔

جن ایک منٹ سے بھی پہلے وہ ڈھونڈ کر لے آیا اور امریکی عورت کو کھا گیا۔ اس کے بعد جاپانی عورت نے اپنے پرس میں سے ایک چھوٹا سا نگینہ نکالا اور دریا میں پھینک دیا۔

جن ایک منٹ سے بھی پہلے وہ نگینہ ڈھونڈ کر لے آیا اور جاپانی عورت کو کھا گیا۔

آخر میں زبیدہ آپا نے اپنے پرس میں سے ڈسپرین کی گولی نکالی اور دریا میں پھینک دی اور جن سے بولیں۔

"چل بیٹا! گھر چل بہت کام پڑا ہے۔"

جن اب بھی کبھی کبھار زبیدہ آپا کی نظر بچا کر دریا کے اس حصے میں جاتا ہے اور ڈھونڈتا ہے کہ کسی طرح زبیدہ آپا کی پھینکی ہوئی وہ چیز مل جائے اور وہ زبیدہ آپا کی غلامی سے نجات حاصل کرلے۔

بم

ٹی وی کے رپورٹر نے زخمی لڑکی سے پوچھا۔

"جب اچانک بم پھٹا تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟"

زخمی لڑکی غصے سے۔ "وہ رینگتا ہوا میرے پاس آیا

اور پھر شرما کر بولا۔ باجی تھا۔"

ام ایمن خان اینڈ سیما خان۔۔۔ پشاور

سوا سیر

ایک سیلز مین نے ایک لڑکی کو سینڈل کی قیمت پانچ سو روپے بتائی' مگر لڑکی کے پاس صرف تین سو روپے تھے۔ لہٰذا اس نے وہی روپے سیلز مین کو دیے اور کہا۔
"باقی دو سو روپے کل آکر دے دوں گی۔" سیلز مین نے روپے لے کر سینڈل کا ڈبا لڑکی کے حوالے کر دیا اور وہ چلی گئی۔
دکان کے مالک نے سیلز مین پر غصہ کرتے ہوئے کہا۔
"تم بہت بے وقوف ہو' اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔"
"اس کے تو اچھے بھی آئیں گے۔" سیلز مین نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اسے دونوں جوتے بائیں پیر کے دیے ہیں۔"

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

تشویش

"ڈاکٹر صاحب! میں ساری رات سردی سے کانپتا رہا۔"
مریض نے نقاہت سے کہا۔
ڈاکٹر نے تشویش سے پوچھا۔
"کیا سردی سے دانت بھی بج رہے تھے۔۔۔؟"
مریض: "جناب مجھے اس بات کا علم نہیں۔"
ڈاکٹر حیرت سے۔
"وہ کیوں۔۔۔؟"
مریض: "کیوں کہ میں نے وہ نکال کر میز پر رکھ دیے تھے۔"

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

بھاری ذمہ داری

نجومی نے آدمی کا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔
"عنقریب تمہیں کامیابی کی صورت میں بہت بھاری اور بڑی ذمہ داری ملنے والی ہے۔"
آدمی نے خوش ہو کر پوچھا۔
"ذرا جلدی بتاؤ کہ وہ کیا ذمہ داری ہے؟"
نجومی نے جواب دیا۔
"آئندہ چند روز میں تمہاری شادی چھ من وزنی اور سات فٹ لمبی خاتون سے ہونے والی ہے۔"

پریشانی

احمد نے اخبار میں ایک سروے پڑھتے ہوئے سر اٹھا کر عبداللہ کو مطلع کیا۔
"آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں ساٹھ لاکھ ٹی وی اور چالیس لاکھ باتھ روم ہیں۔"
"اچھا۔۔۔! لیکن اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"
عبداللہ نے احمد کو گھورا۔
"یہی کہ بیس لاکھ آدمی بغیر نہائے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔"
احمد نے تشویش سے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

تلاش

مسافر ایک ایسے ہوٹل کے استقبالیہ پر پہنچا جسے تاریخی اہمیت حاصل تھی۔ اس نے کلرک سے سنگل روم کا کرایہ پوچھا۔
"پہلی منزل پر پچاس' دوسری پر چالیس اور تیسری منزل پر سنگل روم کا کرایہ تیس ڈالر ہے۔" کلرک نے جواب دیا۔
مسافر چند لمحوں تک غور کرتا رہا' پھر کلرک کا شکریہ ادا کر کے واپس جانے کے لیے مڑا تو کلرک پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
"کیا آپ کو ہوٹل پسند نہیں آیا جناب؟"
"نہیں ہوٹل تو بہت خوب صورت ہے۔" مسافر نے جواب دیا۔ "لیکن زیادہ اونچا نہیں ہے۔"

*

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے ایسا کام کیا جس کی بابت ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔"

فوائد و مسائل:
1۔ اس کی بابت "ہمارا حکم نہیں ہے" کا مطلب ہے کہ اس پر کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، یا نہ اس پر شریعت کی کوئی اصل ہی دلالت کرتی ہے۔
2۔ اس سے واضح ہے کہ بدعات اور خلاف شرع کام مردود ہیں۔ ایک مسلمان کا کام شریعت کا اتباع کرنا ہے۔ نہ کہ نئے کام کرنا (بدعت سازی) اور حکم عدولی۔

حلال رزق کے لیے محنت،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو دیکھا تو پوچھا۔
"تو کیا کام کرتا ہے؟"
عرض کی "عبادت کرتا ہوں۔"
پوچھا "روزی کہاں سے کھاتا ہے؟"
اس نے عرض کی "میرا ایک بھائی ہے، وہ مجھے روزی مہیا کر دیتا ہے۔"
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔
"تیرا بھائی تجھ سے زیادہ عابد ہے۔"

ایسے تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

ہرمز جوہر نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک قاصد بھیجا تاکہ دیکھے کہ آپ کیسے شخص ہیں اور آپ کی سیرت کیسی ہے؟

جب یہ شخص مدینہ منورہ پہنچا تو اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟
لوگوں نے کہا "ہمارا بادشاہ نہیں ہے، ہمارا امیر ہے اور وہ ابھی کسی کام سے باہر گیا ہے۔"
یہ خبر سن کر سفیر باہر نکلا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ درہ (کوڑا) تکیہ کی جگہ سر کے نیچے رکھے ہوئے دھوپ میں زمین پر سو رہے ہیں۔ آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا ہے۔ اور پسینہ سے زمین تر ہو رہی ہے۔
جب اس نے یہ کیفیت دیکھی تو اس کے دل میں عجیب ہی تاثر پیدا ہوا اور کہنے لگا۔
"عجیب بات ہے کہ وہ شخص جس سے تمام بادشاہ لرزتے ہیں، اس کا یہ حال ہے۔"
پھر وہ کہنے لگا۔
"اے امیر المومنین! آپ نے عدل فرمایا ہے، اس لیے آپ بے فکر ہو کر سوتے ہیں اور ہمارا بادشاہ چونکہ ظالم اور جابر ہے، اس لیے وہ ہمیشہ خوف زدہ اور ہراساں رہتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ دین برحق صرف تمہارا دین ہے۔"
وہ بعد میں دوبارہ آیا اور مسلمان ہو گیا۔

حضرت علیؓ کی فراست،

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ کے بازار میں چکر لگاتے اور فرماتے۔
"اے لوگو! تھوڑے تھوڑے نفع کو رد نہ کرو۔ زیادہ نفع سے بھی محروم رہو گے۔"
سلف صالحین کی عادت تھی کہ نفع کم لیتے اور لین دین زیادہ کرتے۔

شکستہ دل

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا۔
"بار الہا! میں تجھ کو کہاں تلاش کروں؟"
اللہ تعالیٰ نے فرمایا "شکستہ دلوں کے پاس۔"

کامل یکسوئی

ایک بار کسی نے اینڈریو کارنیگی سے پوچھا۔
"آپ لوگوں سے کس طرح معاملہ کرتے ہیں؟"
انہوں نے جواب دیا۔
"لوگوں سے معاملہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے زمین سے سونا نکالنا۔ آپ کو ایک اونس سونا نکالنے کے لیے ٹنوں مٹی کھودنی پڑتی ہے تاہم مٹی کھودتے وقت آپ مٹی کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ سونے پر توجہ مرکوز رکھیں۔
اس میں ایک اہم سبق ہے کہ ہمیں وہی کچھ ملتا ہے جو ہم ڈھونڈتے ہیں لیکن ہمیں اسے ڈھونڈنے کے لیے توجہ اسی طرف رکھنا پڑتی ہے۔

تعلیم

☆ یونیورسٹیاں تعلیم یافتہ دوندہ صفت افراد تیار کر رہی ہیں کیونکہ ہم نوجوانوں کو اقدار سے آشنا نہیں کروا رہے حالانکہ نوجوان اقدار کو جاننے کے خواہش مند ہیں۔
(سٹیون ملرجان پاپ کینٹربری یونیورسٹی)

☆ یونیورسٹی میں داخلہ تو دانش و حکمت کے حصول کے لیے تجارتی اصول اور تیکنیکی باتیں جاننے کے لیے نہیں۔
(ونسٹن چرچل)

☆ غیر تعلیم یافتہ ہونا بے حد شرم ناک ہے لیکن اس سے بھی زیادہ شرم ناک بات یہ ہے کہ انسان کسی کام کو ٹھیک طرح سے انجام دینا سیکھنے پر راضی نہ ہو۔
(بنجامن فرینکلن)

محنت

☆ میں قسمت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ قسمت پر تکیہ نہیں کیا اور میں ان لوگوں سے ڈرتا ہوں جو قسمت پر تکیہ کرتے ہیں میرے نزدیک محنت کا نام قسمت ہے۔
(لوسیل بال)

☆ اگر لوگوں کو پتا چلے کہ میں نے فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے کتنی محنت کی ہے تو انہیں میرا فن حیران کن نہیں لگے گا۔
(مائیکل انجلو)

☆ اوسط درجے کے لوگ اپنے کام میں صرف پچیس فیصد توانائی اور صلاحیت لگاتے ہیں۔ دنیا ان لوگوں کی تعظیم کرتی ہے جو اپنی پچاس فیصد توانائی اپنے کام میں لگاتے ہیں اور سو فیصد توانائی اپنے کام کے لیے وقف کر دینے والے چند لوگوں کی تو والہ و شیدا ہو جاتی ہے۔
(اینڈریو کارنیگی)

تنقید

رابرٹ ہوچنز نے روزی کمانے کے لیے بیرگیری، بڑھئی، نیچرا اور کپڑے فروخت کرنے کے مختلف پیشے اختیار کیے صرف آٹھ سال بعد تیس سال کی عمر میں وہ امریکہ کی چوتھی بڑی یونیورسٹی شکاگو کا صدر بن گیا تو ماہرین تعلیم نے اس کی کم عمری، اس کے تعلیمی نظریات اور نا تجربہ کاری پر سخت تنقید کی۔ اخبارات نے اس کے خلاف لکھا۔
رابرٹ کے باپ کے ایک دوست نے اس کے باپ سے کہا۔
"مجھے آج صبح اس اخبار کے اداریے کو پڑھ کر بڑا صدمہ پہنچا، اس میں تمہارے بیٹے کو خواہ مخواہ گالیاں دی گئی ہیں۔"
"ہاں۔" رابرٹ کے باپ نے کہا۔ "میں نے بھی پڑھا ہے۔ یہ بہت تلخ اور سخت ہے لیکن یاد رکھو کوئی بھی مردہ کتے کو ٹھوکر نہیں لگاتا۔"
نمرہ، اقرا۔ کراچی

موتی

- ہمیشہ ندی کے دوسرے کنارے پر اُگی ہوئی گھاس زیادہ سبز دکھائی دیتی ہے۔
- درست وقت پر درست فیصلہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ غلط موقع پر کیا جانے والا درست فیصلہ غلط فیصلہ بن جاتا ہے۔
- مثبت رویوں کا حامل شخص ایسا درخت ہوتا ہے جو ہر موسم میں سرسبز اور پھل دار رہتا ہے۔

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

وقت بدل سکتا ہے

- جب سانپ زندہ ہو تو وہ چیونٹیاں کھاتا ہے اور جب سانپ مر جائے تو چیونٹیاں اُسے کھاتی ہیں
- وقت کبھی بھی بدل سکتا ہے...!
- ایک درخت سے کئی لاکھ ماچس کی تیلیاں بنتی ہیں مگر ایک ماچس کی تیلی کئی لاکھ درخت جلا سکتی ہے۔
- اسی لیے زندگی میں کسی کو مت ستانا شاید آپ طاقت ور ہوں مگر مت بھولیں وقت آپ سے زیادہ طاقت ور ہے۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

اچھے لوگوں کے انمول موتی

- اگر انسان بننا چاہتے ہو تو ساری انسانیت کا احترام کرو۔

(ڈاکٹر علامہ محمد اقبال)

- خوبصورتی علم و ادب سے ہوتی ہے لباس سے نہیں۔

(خلیل جبران)

- دور سے آنے والی آواز بھی اندھیرے میں روشنی کا کام دیتی ہے۔

(واصف علی واصف)

- تم صرف مصیبت اور ضرورت کے وقت دعائیں مانگتے ہو۔ کیا خوشحالی اور فراغت کے دنوں میں بھی تمہارے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھتے ہیں؟

(خلیل جبران)

- جب دل اور زبان ایک ہو کر کوئی چیز مانگتے ہیں تو اس دعا کا جواب ضرور ملتا ہے۔

(پریم ہنس)

اقرا عائشہ ثمن۔ تلہ گنگ

زندگی کی قیمت

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک بچے نے اپنے دادا سے پوچھا۔

"زندگی کی کیا قیمت ہے؟"

دادا نے ایک پتھر دیا اور کہا۔ "اس کی قیمت معلوم کرو لیکن اسے بیچنا مت۔"

بچے نے وہ پتھر سبزی بیچنے والے کو دکھا کر قیمت معلوم کی۔ سبزی والے نے چمک دار پتھر کے بدلے آلو کی ایک بوری دینے کا وعدہ کیا۔

پھر وہ سنار کے پاس گیا۔ سنار نے کہا۔ "دو سونے کے سیٹ لے لو، یہ پتھر مجھے دے دو۔"

تھوڑا آگے بچے کو نایاب پتھروں کی ایک دکان نظر آئی۔ دکان دار نے بچے سے پوچھا۔ "تم یہ قیمتی ترین روبی کہاں سے لائے...؟ میں پوری دکان بیچ کر بھی اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔"

بچہ حیران رہ گیا۔ جا کر دادا سے پوچھا کہ مجھے زندگی کی قیمت بتائیں؟"

دادا نے جواب دیا۔ "جو جواب تمہیں سبزی والے، سنار اور قیمتی پتھروں کا کاروبار کرنے والے نے دیے ان ہی میں زندگی کی قیمت چھپی ہوئی ہے۔ تم ایک نایاب پتھر ہو سکتے ہو لیکن لوگ تمہاری قیمت اپنی حیثیت کے مطابق لگائیں گے۔"

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

خالدہ جیلانی

شمع خالد — جڑانوالہ

کبھی دیکھے ہیں خزاؤں میں جھلسے ہوئے درخت
ایسے ہوتے ہیں وفاؤں کو نبھانے والے

سونیا فوزان — کینیڈا

کہیں سر ہے، کہیں سودا، کہیں وحشت کہیں صحرا
کہیں میں ہوں، کہیں سامان، میرا جی نہیں لگتا

سارہ نوید — کراچی

یوں تو مرنا ہے ایک بار مگر
ہم کئی بار مرنے والے تھے

کوثر خالد — جڑانوالہ

بہت مجبور تھیں آنکھیں بہت بے ربط جملے تھے
ضرورت کو بیاں کرنے سے اک خوددار قاصر تھا

نجمہ اکرم — گاؤں گوئیکی

دل نہ چاہے تو اک ساتھ بسر کیسے ہو
لیکن اس بات کی اب اس کو خبر کیسے ہو
ساتھ رہنے کی اذیت درو دیوار سے پوچھ
دل نہ ملتے ہوں مکینوں کے تو گھر کیسے ہو

ریحانہ چوہدری — مدوکے

پہلے اک عمر ڈرانے میں لگ جاتی ہے
اور پھر سوچتے ہیں دو دیہ ڈر کیسے ہو

فوزیہ ثمر بٹ — گجرات

وقت کی رفتار پہ جھنجلا کے رو پڑے
کبھی اس کو کھو کے تو کبھی پا کے رو پڑے
کب تک کسی کے سوگ میں روئیں بیٹھ کر
ہم خود کو کتنی بار یہ سمجھا کے رو پڑے

فوزیہ ثمر بٹ — گجرات

اے رگ جاں کے مکین تو بھی کبھی غور سے سن
دل کی دھڑکن تیرے قدموں کی صدا لگتی ہے
گو بادِ گمی دل کو بہت ہم نے بچایا پھر بھی
جس جگہ زخم ہو وہاں چوٹ سدا لگتی ہے

سحر سہیل — کراچی

قتل چھپتے تھے کبھی سنگ کی دیوار کے بیچ
اب تو کھلنے لگے مقتل بھرے بازار کے بیچ

فاکہہ سہیل — کراچی

درو دیوار ہیں، مکان نہیں
واقعہ ہے، یہ داستان نہیں

ثوبیہ قطب — کراچی

دیوار یاد آگئی، در یاد آگیا
دو گام ہی چلے تھے کہ گھر یاد آگیا

نمرہ، اقرا — کراچی

روگ ایسے بھی غم یار سے لگ جاتے ہیں
در سے اٹھتے ہیں تو دیوار سے لگ جاتے ہیں

حمدہ واجد — کراچی

تیرے لہجے میں ترا جہل دروں بولتا ہے
بات کرنا نہیں آتی ہے تو کیوں بولتا ہے
تیرا اندازِ تخاطب، ترا لہجہ، ترے خط
وہ جسے خوفِ خدا ہوتا ہے، یوں بولتا ہے؟

سحر بدر — خانیوال

وہ نہ تھا ترکِ تعلق پہ پشیمان تو پھر
تم کو بھی چاہیے تھا کہ مکر جاتا تھا
عشق میں سوچ سمجھ کر نہیں چلتے سائیں
جس طرف اس نے بلایا تھا، ادھر جانا تھا

توقیر ہاشمی — منڈی بہاؤالدین

زرد پتے تھے ہمیں اور کیا کر جاتا تھا
تیز آندھی تھی مقابل سو بکھر جانا تھا

نوال افضل کمن — کراچی

آوارگی میں ہم نے اس کو بھی ہنر جانا
اقرارِ وفا کرنا پھر اس سے مکر جانا
جب خواب نہیں کوئی اس عمر کا کیا کرنا
ہر صبح کو جی اٹھنا ہر رات کو مر جانا

سیدہ نسبت زہرا ___ کہروڑ پکا
چاہتیں ختم ہوئیں سارے بھرم ٹوٹ گئے
اب کے یوں اس نے نوازا کہ ہم ٹوٹ گئے

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ___ گلستان جوہر
اس کو یاد رکھا ہے جسے دل سے بھلانا تھا
دل بھی کیا چیز ہے کہ اپنے بس میں نہیں

گڑیا شاہ ___ کہروڑ پکا
تضادِ جذبات میں نازک مقام آیا تو کیا کرو گے
میں رو رہا ہوں تم ہنس رہے ہو، میں مسکرایا تو کیا کرو گے
ابھی تو دامن چھڑا رہے ہو، بگڑ کے قابل سے جا رہے ہو
مگر کبھی دل کی دھڑکنوں میں شریک پایا تو کیا کرو گے

ناہید راشد ___ کراچی
اس کی وفا کے باوجود اس کو نہ پلکے بدگماں
کتنے یقین بچھڑ گئے، کتنے گماں گزر گئے

نادیہ یاسر ___ کراچی
ساگر سے صحرا بننے تک
جانے کیا کچھ کھو جاتا ہے
آنکھیں میری خالی پنجرے
چھوڑ دیے ان میں کیا رکھا ہے

حورین زینب ___ کہروڑ پکا
صلیبِ شاخ پہ رقصاں گلاب دیکھے ہیں
شرارِ حسن میں جلتے شباب دیکھے ہیں
ہماری سوچ پہ کوئی نہ ہو سکا حاوی
کہ ہم نے صرف تمہارے ہی خواب دیکھے ہیں

نوال افضل ___ کراچی
تم جو ٹھہر جاؤ کہ عنوان کی تفسیر ہو تم
تم سے تلخئ اوقات کا موسم بدلے
رات تو کیا بدلے گی حالات تو کیا بدلیں گے
تم جو ٹھہر جاؤ تو میری ذات کا موسم بدلے

ندا طارق ___ فیصل آباد
یہ بھی انداز ہمارے ہیں تمہیں کیا معلوم
ہم جیت کے ہارے ہیں تمہیں کیا معلوم
ایک تم ہو کہ سمجھتے ہی نہیں اپنا ہم کو
اک ہم ہیں کہ تمہارے ہیں تمہیں کیا معلوم

عظمیٰ غلام نبی ___ کراچی
رستے ویران ہوئے منزلیں سراب ہوئیں
راہِ وفا پر مسافر کب تلک قیام رکھے

ثمرہ عاقب ___ گرین سٹی
مجھے تھا زعم مگر میں بکھر گیا محسن
وہ ریزہ ریزہ تھا اور اپنے اختیار میں تھا

مدیحہ فہید، ایمان ___ مدینہ کالونی
اس شہرِ محبت میں عجب کال پڑا ہے
ہم جیسے سبک لوگ بھی نایاب بہت تھے
اب دیکھ یہ حسرت بھری اجڑی ہوئی آنکھیں
دنیا تیرے بارے میں میرے خواب بہت تھے

عائشہ، تحریم ___ گوجرہ
ہم مسافر یونہی مصروف سفر ہو جائیں گے
بے نشاں ہو گئے جب شہر تو گھر جائیں گے
کس قدر ہو گا یہاں مہر و وفا کا ماتم
ہم تیری یاد سے جس روز اتر جائیں گے

ثمرہ جاوید ___ بسم اللہ پور
سارے سخن، اس لب سخن کے اسیر
سارے موسم گلاب ہیں جیسے

فائزہ شاہد ___ شہداد پور
عشق میں قلب و جگر بھی نہ ہمارے نکلے
جو بھی نکلے طرف دار تمہارے نکلے

تبسم شام ___ آفیسرز کالونی
وہ ابھی میں تھا کہ سراپا سخن
یہ بھی میں ہوں کہ بولتا ہی نہیں

زوتاشہ شیرازی ___ جڑانوالہ
عجیب طرفہ تماشا ہے میرے عہد کے لوگ
سوال کرنے سے پہلے جواب مانگتے ہیں

گیلانی سسٹرز ___ کہروڑ پکا
احساس بڑھا دیتا ہے ہر درد کی شدت
جتنا محسوس کرو گے کسک اور بڑھے گی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
دعا ہے اللہ رب العزت ہم سب کو تاحیات صحت مند' سلامت اور شاد و آباد رکھے' دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں سے نوازے۔
ہمارے پیارے وطن کو اپنوں اور غیروں کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

سدرہ شبیر دو کوٹہ تحصیل ملسی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

پہلی بار خط لکھ رہی ہوں نہ لکھنے کی وجہ آپ کی ردی کی ٹوکری ہے۔ جس کے بارے میں اتنا پڑھا اور سنا کہ خط لکھنے کی ہمت ہی نہ ہو سکی۔ تینوں ڈائجسٹ ہر مہینے باقاعدہ پڑھتی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا گھر گاؤں میں ہے جو کہ شہر سے بہت دور ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ بذریعہ ڈاک ہمارے گھر ڈائجسٹ آیا کریں' مجھے اس کی سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے کا طریقہ بتا دیں۔

ج : پیاری سدرہ! یہ ہماری ردی کی ٹوکری کب سے اتنی مشہور ہو گئی کہ آپ نے اتنا کچھ اس کے بارے میں سن لیا اور ہمیں خبر ہی نہ ہوئی۔ حد ہو گئی ہماری بے خبری کی بھی۔
آپ جو بھی پرچا جاری کرانا چاہتی ہیں۔ اس کے لیے 720 روپے درج ذیل ایڈریس پر منی آرڈر کر دیں۔ ایک سال تک آپ کو گھر بیٹھے پرچا ملتا رہے گا۔ منی آرڈر اس ایڈریس پہ کریں۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37' اردو بازار کراچی

اقراء جٹ..... منچن آباد سے لکھتی ہیں

ٹائٹل زبردست لگا صائمہ جی سسپنس یار پتا ہے.... "خواب شیشے کا" عفت سحر جی مہرماہ بے چاری کے ساتھ کیا کر رہی ہیں۔ "سنہری دھوپ" سلویٰ جی کیا کر دیا دعا بے قصور کے ساتھ۔ "میرا راج دلارا" ہاہاہا مصباح جی' بہت ہنسایا "وقت سے پہلے" ویل ڈن' سپر' ایکسلینٹ' بہت سبق آموز۔ کبھی ہجر لکھو تو ہر بار کی طرح فرزانہ صاحبہ آپ کی تحریر بھی زبردست تھی۔ افسانے تمام زبردست تھے۔ کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ۔ انفف نام اتنا بڑا ہے۔ کوئی چھوٹا سا رکھ لیں۔ "خط آپ کے" مہوش بلوچ گروپ اپنے ناموں کے معانی بھی بتا دیتیں۔ آئی لائیک بلوچ۔

ج : پیاری اقراء آپ کا خط تاخیر سے موصول ہوا اس لیے شامل نہیں ہو سکا۔ ہمیں ردی کی ٹوکری سے نہیں اپنے قارئین سے محبت ہے۔ ہماری تو کوشش ہوتی ہے کہ ہر خط کو جگہ ملے مگر خط بروقت بھی تو ملے۔ اشعار کے سلسلے کا عنوان ایک شعر کا مصرعہ ہے' پورا شعر یہ ہے۔
کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

عائشہ رباب کراچی سے لکھتی ہیں

"کہنی سنی میں" آخری سطر اتنی اپنائیت سے لکھی ہوتی ہے۔ لگتا ہے گویا محض میرے لیے ہی لکھی ہے۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" یہ لفظ شیریں قطرے نگاہوں کے راستے دل کی بنجر زمین کو سیراب کر گئے۔ "اللہ ہمیں خوف خدا رکھنے والا دل عطا کرے۔" آمین۔
بندھن' سیما مناف کی ملاقات خوب رہی۔ بہت رشک آیا پڑھ کر۔ "دستک" یا سرنواز کو پہلی بار پڑھا ہے۔

"عیدالاضحی اور آپ" سروے کے جوابات تو بہت ہی مزے دار تھے۔ اس کی ڈشنز کی طرح۔ "شہرزاد" اس ماہ کی قسط کچھ پسند نہیں آئی۔ "خواب شیشے کا" کچھ متاثر نہیں کر سکا۔ کہانی رکی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ ناولٹ میں "میرا راج دلارا" عمر صاحب تو کسی کے بھی راج دلارے نہیں لگتے۔ مکمل ناول "وقت سے پہلے" بہت اچھی تحریر تھی۔ اختتام میں بختاور کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ "سنہری دھوپ" اس ماہ کی قسط بھی اچھی رہی۔ عمیر کا کردار پرجوش نہیں ہے۔ عمیر سے زیادہ عمر کا کردار جان دار لگتا ہے۔ عمیر کے کردار میں امپروومنٹ کی ضرورت ہے۔

ج : پیاری عائشہ! آخری سطر آپ ہی کے لیے لکھی جاتی ہے۔ آپ کو اسی لیے اپنائیت محسوس ہوتی ہے آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔

ثناذوالفقار...... نورے والی رحیم یار خان

ستمبر کا ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ بس چوڑیاں اچھی تھیں۔

عفت سحر طاہر ہمیشہ بہت اچھا لکھتی ہیں' مجھے ان کا ناول "بن مانگی دعا" بہت پسند ہے۔ "خواب شیشے کا" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ ناول "وقت سے پہلے" بس ٹھیک ہی تھا۔ کہانی اتنی جان دار نہیں تھی۔ فرزانہ کھرل کا ناول "کبھی ہجر لکھو تو" بہت خوب صورتی سے لکھا گیا ناول۔ خوب صورت جملے' خوبصورت انداز تحریر "میرا راج دلارا" پڑھ کر مزہ نہیں آیا۔ مصباح علی کو اس کی سیریز نہیں بنانی چاہیے اگر مزاح لکھنا ہے تو کسی اور موضوع پر بھی لکھ سکتی ہیں۔ "سنہری دھوپ" یہ قسط اچھی تھی۔ افسانوں میں معذرت کے ساتھ بس ایک افسانہ "زندگی یا بندگی" ہی پسند آیا۔ اشعار بہت اچھے تھے۔ کیا ایمل رضا اور سائرہ رضا بہنیں ہیں۔

ج : پیاری ثناء! ہماری ماڈل کو بھی چوڑیاں بہت پسند آئی تھیں تب ہی تو ہاتھ بھر کر پہنی ہیں۔ ایمل اور سائرہ میں صرف رضا مشترک ہے باقی تخلیق کار ہونے کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ایک اور بات بھی مشترک ہے کہ دونوں ہی بہت خوب لکھتی ہیں۔

عفت بتول بھاگٹانوالہ ضلع سرگودھا سے شرکت کر رہی ہیں۔ لکھا ہے

میں بی اے۔ بی ایڈ ہوں اور ایک نیم سرکاری ادارے میں ریاضی کی ٹیچر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہی ہوں۔

"خواب شیشے کا" عفت سحر طاہر (واہ! میری ہم نام) کیا لکھتی ہیں۔ ناول بہت دلچسپ ہے۔ دوسرا نمبر "شہرزاد" کا ہے۔ صائمہ اکرم کے موضوعات ہمیشہ توجہ کھینچتے ہیں۔ مکمل ناول "کبھی ہجر لکھو تو" فرزانہ کھرل تو چھائی ہوئی ہیں۔ فرزانہ جی کی کہانیوں میں روایتوں کے امین کردار اچھے لگتے ہیں۔

"وقت سے پہلے" دل کو نہیں لگا۔ الفاظ کا چناؤ اور لکھنے کا انداز اچھا تھا۔ "سنہری دھوپ" کب ختم ہوگا؟

"میرا راج دلارا" پڑھ کر بے حد ہنسی آئی۔ تمام افسانے اچھے تھے۔ لیکن "خوشبو بھری ساعتیں" بہت پیارا تھا۔ پرانے وقتوں کی دلکشی اجاگر کرتا۔ جب سب کی خوشیاں اور غم سانجھے تھے۔

قانتہ رابعہ نے اپنے مخصوص خوب صورت انداز میں لکھا۔ اب میں آپ سے اور قارئین سے ایک استدعا کرنا چاہوں گی کہ میرے لیے دعا کریں۔ مجھے برین AVM ہے۔ جس کے علاج کا پہلا سیشن گزشتہ سال ہوا تھا۔ اب ڈاکٹرز 15 اکتوبر کو میری اینجیو گرافی کریں گے۔

ج : پیاری عفت! آپ کی بیماری کا جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کاملہ عطا فرمائے آمین۔ قارئین سے بھی دعائے صحت کی درخواست ہے' تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

نارڑ صاحب کا انٹرویو خواتین میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی فرمائش پر شعاع میں بھی شائع کریں گے۔

شاہ گل نے سبی سے لکھا ہے

حال کیا بتائیں' مصباح علی کے ایکسیڈنٹ کی خبر نے تو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس دن کھانا اندر نہیں اترا۔ پرانے درد یک دم تازہ ہوئے۔ شدت سے شازیہ چوہدری' فرحانہ ناز پروین شاکر یاد آئیں۔

خبر سنتے ہی میں نے جائے نماز سنبھال لی' اللہ سے گڑگڑا کر دعا کی۔ مصباح کو میری طرف سے بہت سلامتی صحت کی دعائیں ضرور پہنچایئے گا۔

اب آتی ہوں عید نمبر کی طرف۔ سب سے پہلے خواب شیشے کا عفت سحر کا ناول پڑھا۔ اس بار تینوں پرچوں میں

سلسلے وار کوئی ٹاپ کلاس نہیں لگ رہا۔ اس سے بہتر تو قسط وار ہیں۔ انتظار بھی ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رسالہ مارکیٹ میں آیا نہیں اور پیجز پر اپ لوڈ ہو جاتا ہے۔ سلویٰ سیف کا ناول سنہری دھوپ واقعی ہلکی ہلکی دھوپ کی مانند چمکتا دل میں گھر کر رہا ہے۔

مکمل ناول فرزانہ کھرل کا "کبھی ہجر لکھو تو" شروع کیا میں تو آٹھویں نویں صفحے پر ہی سو گئی۔ فرزانہ اچھا لکھ تو سکتی ہیں لیکن ان کی کہانی میں اتنا الجھاؤ ہوتا ہے کہ بندہ تنگ آ کر رسالہ رکھ ہی دے۔ ناولٹ ایک ہی تھا اور جاندار۔ راج دلارا ہاہاہا موڈ بحال کر دیتی ہیں مصباح صاحبہ۔ افسانوں میں شام کے مسافر بائے تہمینہ چودھری ٹاپ آف دی لسٹ رہا۔ حاجرہ ریحان کے افسانے میں پولیس بھائی بھی پسند آیا۔

ج: پیاری گل! ہم نے بھی مصباح علی کے لیے بہت دعائیں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے' وہ اب بہتر ہیں۔ آپ کا کہنا صحیح ہے۔ رسالہ مارکیٹ میں آنے سے پہلے اپ لوڈ نہیں کرنا چاہیے یہ ان لوگوں کی بھی اخلاقی ذمہ داری ہے، جو یہ کر رہے ہیں۔

فرزانہ کھرل تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ فرزانہ کھرل بہت باصلاحیت ہیں اور اچھا لکھتی ہیں لیکن بیشتر قارئین کو ان سے وہی شکایت ہے، جو آپ کو ہے۔ ہم نے ان سے گزارش کی ہے کہ وہ کہانی کو سادہ انداز میں لکھیں۔

کوثر خالد جڑانوالہ سے شریک محفل ہیں

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

جونہی احساس ہوا ہم نے آنے میں دیر کر دی رضوانہ نے سب سے پہلے ہمیں یاد کیا (لکھ کر) تو ہم نے بھی آنے کو رفتار پکڑی۔ کل 10 ستمبر کو شعاع دسترس میں آیا ہے اتوار تھا۔ سہیلی زاہرہ نے چند ننھے منے کپڑے سلائی کرنے کا آرڈر دیا تھا فوراً"۔ مگر ہم نے پائے پکا کر رضا کے دوستوں اور چچا کو کھلانے تھے۔ آدھا دن گزر گیا۔ تھک گئے تو آرام کی غرض سے شعاع پکڑا تو شام ہو گئی ماں بیٹی رات تہجد کے قریب سوئیں۔ میں نے شعاع ختم کر کے چھوڑا (کبھی کبھار جاگتی ہوں جب دن کو کام تھوڑا کروں) مگر بیٹی تو ہر رات تقریباً" پیپر چیک کرتی ہے۔ اب صورت حال یوں ہے کہ فجر کی نماز پڑھ کر وہ پھر پیپر لیے بیٹھی ہے۔ اور ہم خط۔۔۔ اور بیٹے نے پوچھا ہے۔ "ممی جی بادام بھگو دیے تھے ہمارے لیے؟" (پہلی بار لایا بہن کے لیے "اپنے لیے") ہم نے کہا۔ "اوہ نہیں۔" ابھی کچھ طنز کرنے چلا تھا تو ہم نے کہا۔ "اپنی دفعہ تو ہر بات بھول جاتے ہو۔ نئی ڈیوٹی ہے آہستہ آہستہ عادت ہو گی۔ اور آج ایسے ہی کھا لو۔ بلکہ روز ہی' یونہی کھا لو تو اچھا ہے۔" (دیکھا ہم سرورق۔ نیلے سوٹ والی کے بال اور فیس میری بیٹی جیسے۔ اور پیلے والی کے آدھے میری جوانی جیسے (گھنگریالے)۔ بھئی 'اس بار تو ہم نے خدائی تقسیم کر دی۔ کسی کو زیادہ کسی کو کم۔ کسی کو کلیجی 'کسی کو ران' کسی کو مکس۔ کسی کو پکا ہوا مگر جو در پر آیا خالی نہ گیا اس دن۔ ریڑھی والوں کو بھی دیا۔ ایک بکرا' بڑی برکت۔ بیٹی تو کھاتی نہیں۔ میرے اور دادی کے لیے۔ جٹھانی نے گائے کا گوشت دیا۔ اس کا قیمہ اور دو ہانڈیاں کافی ہیں۔ بیٹے نے دوستوں کے ساتھ اڑا لیں۔ بلکہ روز ہی مل جل کر کھاتے ہیں۔

اور ہاں میری دیورانی نے اپنی مرضی سے صلح کر لی ہے۔ مگر سننے میں آیا ہے' میری بہن ناراض ہے۔ کیونکہ میں نے بھائیوں کو ڈانٹا نہیں کہ اس کا حصہ پورا دیں۔ جھلی نہ ہو تو میرا بس چلے تو ساری ایسی بہنوں کو خود کما کر دے دوں اور بھائیوں کو بھی نئے گھر لے دوں مگر خود کچے کی جھونپڑی میں رہ کر دیکھوں اور قدرت کے نظارے لوٹوں۔ مگر یہ تقدیر تو ہماری سوچ کے زیر اثر ہے مگر اتنا احتساب کون کرے؟ بندھن۔۔۔ سیما مناف پیارا نام' کام۔۔۔ بھئی یاد آیا ہم ایک اور پوتے کی دادی بن گئے۔ نام رکھا بیٹی نے "محمد علی" اور بہو نے پسند کر ہی لیا۔

سنہری دھوپ سلوی تمہارے نمکین قلم نے دو جگہ رلایا۔

قانتہ کا نام خوشیوں کا جام "کبھی تم ہجر لکھو تو" فرزانہ (دانا) تو تم ہو ہی مگر اب زیادہ ہی آگے ہو۔۔۔ اتنی کہ سمجھنے کے لیے عمر چاہیے۔ "خواب شیشے کا" آخر ٹوٹنا ہی تھا۔

"شام کے مسافر" ہمارا بس چلے تو ہر محبت کرنے والے کو ملا دیں۔۔۔ مگر پھر سوچتے ہیں کہ پیچھے تو ہاتھ اللہ کا ہی ہوتا ہے۔ تو گلہ کیسا۔ ہائے علیم ہمارا بڑا بھائی جو ہم سے بھی بات ہی نہیں کرتا۔ بچپن میں ایک بار پوچھ بیٹھا۔ امی کہاں ہیں؟ ہم برجستہ بولے۔ "امی سے بات تو کرتے نہیں۔ پوچھ کے کیا کرنا ہے جہاں بھی جائیں۔" شرمندہ۔ تاریخ تو سب سے دلچسپ "تجھ سے ناتا" آرزو گلا لئی نام پیارا۔ حالات۔ خوب صورت لڑکو! ڈرو نہیں' بہادر بنو علم اور ہنر

پاس ہو تو ڈر کیسا۔ ڈرنا صرف اللہ سے ہے اور کسی سے نہیں۔

ج : پیاری کوثر! بکرے میں واقعی برکت ہو گئی۔ واقعی اچھی نیت ہو تو اللہ تعالیٰ اسی طرح برکت ڈال دیتا ہے اور بھئی آپ روز تشریف لائیں۔ اطمینان رکھیں قدر میں کمی واقع نہیں ہو گی۔

آپ کے بغیر تو ہماری محفل سونی رہتی ہے۔ آپ باقاعدگی سے شرکت کریں آپ کے خط ہماری سب ہی قارئین پسند کرتی ہیں سب سے اچھی بات آپ کی تحریر کی بے ساختگی ہے یوں لگتا ہے جیسے سامنے بیٹھی باتیں کر رہی ہوں۔ ایک بات کرتے کرتے کہیں سے کہیں نکل جاتی ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کنیز فاطمہ نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

خاندان میں پے در پے اموات نے ہمیں بوکھلا کر رکھ دیا۔ آپ بس دعا کیجیے گا کہ ہمارے خاندان پر جو سختی آئی ہے اللہ پاک اس کو ٹال دے۔ (آمین)

سب سے پہلے خواب شیشے کا پڑھا۔

سنہری دھوپ کی لگتا ہے۔ اگلے ماہ آخری قسط ہو گی۔

سلویٰ نے بہت خوب صورتی سے ناول کو آگے بڑھایا ہے۔

قانتہ رابعہ کا افسانہ بہت دل کو بھایا حس نگاہ بھی اچھا سبق دے گیا شام کے مسافر اور میرا راج دلارا اچھی کاوش رہی سیما مناف سے مل کر بہت اچھا لگا اسی طرح آپ دوسری رائٹرز کے بھی انٹرویو کریں خاص طور پر فائزہ افتخار' رخسانہ نگار' رخ چودھری' نمرہ احمد بمعہ تصاویر پلیز پلیز۔

ج : پیاری فاطمہ! اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آئندہ ایسی اچانک حادثاتی اموات سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ نمرہ احمد اور رخسانہ نگار تصاویر شائع کرانا پسند نہیں کرتیں اس لیے معذرت۔ رخ چودھری کی تصاویر متعدد بار شائع ہو چکی ہیں۔

فائزہ شاہد شہداد پور سے لکھتی ہیں

عید نمبر مسکراہٹوں سے سجی ماڈل بہت پسند آئی شعاع کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہر تحریر منفرد اور سبق آموز لگتی ہے "سنہری دھوپ" نام دعا پر کچھ زیادہ ہی اثر دکھاتا ہے آزمائش اور گرمائش "وہم سے بڑھ کر کون" نازیہ جیسی عورتوں کے لیے آئینے جیسی کہانی لگی "وقت سے پہلے" نصیب سے زیادہ کیا زبردست مصرعہ ہے سچ دل میں گھر کر گیا۔ پچھلے شمارے میں "پیا ملن کی رت" اور اس شمارے کا "میرا راج دلارا" جیسی کھٹی میٹھی تحریر ضرور ہونی چاہیے کس کی تعریف کریں اور کس کو چھوڑیں۔

ج : پیاری فائزہ! شعاع آپ کو پسند آیا۔ تہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی شرکت کرتی رہیں گی۔

آمنہ میر نے جڑانوالہ سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

جڑانوالہ کی کالونی ڈیفنس ویو میں (نئی نئی) رہائش پذیر ہوں۔ (پرانی) میونسپل کالونی میں گرلز کالج کے قریب رہتی تھی۔ کیا خوب صورت لوکیشن تھی۔ واللہ کبھی نہ بھول پائیں گے۔

گھر کے پیچھے واٹر ورکس جو کہ آج کل جناح پارک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے تھا۔

جب برکھارت کی جھڑی لگتی تو ہم اپنی کھڑکی سے باغ کا نظارہ کرتے۔

واہ کیا منظر ہوتا۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں دبکے ہوتے۔ پودے نہا رہے ہوتے۔ لہلہا رہے ہوتے۔ پاس ہی اسٹیڈیم تھا۔ جب جی چاہا میچ دیکھ لیا کوئی میلہ دیکھ لیا۔

عید شبرات پر تو لوگوں کا سماں بندھ جاتا۔ سب کہتے ہیں میں بہت بولتی ہوں فیصلہ آپ کریں۔ ستمبر کا شمارہ ملا تو یوں لگا جیسے بجلی بند ہو اور اچانک ٹھنڈی ہوا چلے۔ جیسے کراچی میں بارش جیسے سعودیہ میں کسی نے سویٹر پہن لیا ہو۔ جیسے لندن میں کسی نے لان کے کپڑے پہن لیے ہوں۔

"سنہری دھوپ" دوسروں کے ساتھ برا کرنے والوں کے ساتھ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ ویسے مجھے ایک بات نہیں سمجھ میں آتی۔ کہ جب ہمارے ساتھ کوئی برا کرتا ہے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کے ساتھ کچھ برا ہو جاتا ہے تو ہم یہ کیوں کہتے یا سوچتے ہیں کہ دیکھا اس نے میرے ساتھ برا کیا تھا نا اب خود کے ساتھ ہو گیا۔

بندگی یا زندگی بھی اچھی تھی۔

اور کبھی تم ہجر لکھو تو کوئی خاص سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا مقصد نہیں سمجھ پائی (کہانی کا) شام کے مسافر میں ثمن سے ایگری کرتی ہوں۔

ج : پیاری مریم! زیادہ بولنا بری بات نہیں ہے۔ فضول

اور بے حل بولنا بری بات ہے۔ خط جتنا طویل ہے اگر آپ اتنا ہی بولتی ہیں تو واقعی زیادہ ہی بولتی ہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ فضول اور بے محل نہیں بولتی ہیں۔ آپ نے بہت جامع اور خوب صورت تبصرہ کیا ہے۔ شعاع کے ہر سلسلے پر اپنی رائے دی ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کسی کے ساتھ برا کرنے والوں کے ساتھ برا ہوتا ہے یا نہیں تو یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہو۔ انسان اپنی تقدیر کا لکھا بھگتتا ہے۔ کچھ لوگ اگر کسی کے ساتھ برا کرتے ہیں تو اچھا بھی کرتے ہیں۔ اچھائیوں کو یاد رکھنا چاہیے برائیوں کو بھول جانا چاہیے۔ شعاع پر تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

روبی امجد نے جھنگ سے شرکت کی ہے لکھا ہے

میں تقریباً" بیس سال سے شعاع، خواتین پڑھ رہی ہوں اسپیشلی شعاع میرا فیورٹ ہے۔ میری دو بیٹیاں ہیں ام مریم اور مومنہ، ایک بیٹا دیا اللہ پاک نے 10 ماہ کا ہو گیا ہے محمد بلال۔ میرا دل میری سوچ بہت اچھی ہو گئی ہے، میرے میکے میں اکثر کہتے ہیں کہ روبی کافی اچھی ہو گئی ہے بدل گئی ہے تو یہ سب شعاع کی بدولت ہے اللہ اجر دے شعاع سے وابستہ لوگوں کو آمین۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا میں دکھی خواتین کے لیے دعا کرتی ہوں ایک بار ایک قاری نے لکھا تھا کہ میں لے کر نہیں بیٹھی رہتی پرانی باتوں کو وغیرہ تو جناب جس پر گزرتی ہے بس وہی جانے حال۔ موسم کے پکوان میں کھنڈویاں بنانے کی ترکیب دیں پلیز "تاریخ کے جھروکے" واہ جی واہ جی واہ۔

آپ سب میرے لیے دعا کیجیے گا۔ میں اس وقت بہت پریشان ہوں تکلیف میں ہوں، بیمار ہوں، میری بیٹی 6 سال کی ہے اس کو مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔

ج : پیاری روبی! آپ کی فرمائش پر اس بار ہم جھلسی ہوئی جلد کے مسائل کے بارے میں دے رہے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ بہت کم پڑھی لکھی ہیں۔ اس کے باوجود قابل تعریف بات یہ ہے کہ آپ کی لکھائی بہت عمدہ اور صاف ہے۔ خط بھی آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔

مرگی ناقابل علاج مرض نہیں ہے۔ اس کا علاج ہو سکتا ہے اور زیادہ مہنگا علاج بھی نہیں ہے۔ آپ پہلی فرصت میں کسی اسپتال میں دکھائیں۔ انشاء اللہ آپ کی بیٹی ٹھیک ہو جائے گی۔ تاخیر یا غفلت سے نقصان ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر جو بھی دوا تجویز کریں، ان کو باقاعدگی سے استعمال کرنا بہت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی بیٹی کو صحت دے۔ قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

لاہور سے وجیہہ آصف لکھتی ہیں

میری ماما نویں جماعت سے آپ کے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں۔ خالہ بھی خاص طور پر خواتین ڈائجسٹ منگواتی ہیں۔ اور اب میں اور میری بہن اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں نے آپ کو اپنا ناولٹ "بس تم" بھی بھیجا تھا۔ مگر آپ نے کوئی رسپونس نہیں دیا۔

ج : پیاری وجیہہ! آئندہ خط لکھیں تو اپنا فون نمبر ضرور لکھیں۔ ہم فون کرکے کہانی کے بارے میں بتا دیں گے آپ کسی بھی مہینے کی پانچ تاریخ کو فون کرکے کہانی کے بارے میں دریافت کر سکتی ہیں۔ فون نمبر یہ ہے۔

021-32721666

اپنی ماما اور خالہ کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیجیے گا۔

حرا ملک نے وہاڑی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

السلام وعلیکم! ستمبر کا شمارہ عید نمبر ہاتھ میں ہے۔ اور میں نے اسے صرف 15 گھنٹوں کے اندر پڑھا ہے۔ اگر تسلسل سے پڑھتی تو شاید ایک یا دو گھنٹے میں ختم کر دیتی۔ سلسلے وار ناولز دونوں ہی زبردست ہیں لیکن "خواب شیشے کا" بیسٹ ہے۔ مجھے بہت زیادہ پسند ہے میرے بڑے بھائی محترم نے میرا مذاق اڑایا کہ صرف اسی لیے ڈائجسٹ منگواتی ہو تاکہ دیکھ سکو کہ خط شائع ہوا یا نہیں۔ میں نے کہا ہو یا نہ ہو، دیگر کہانیاں تو پڑھنی ہیں ناں مکمل ناول میں "وقت سے پہلے" بہت اچھی کہانی تھی "سنہری دھوپ" اچھا جا رہا ہے۔ اور "میرا راج دلارا" مصباح علی سید اچھی سیریز ہے۔ افسانے مجھے اس بار کچھ متاثر نہ کر سکے۔

"دستک" میں سویرا ندیم سے ملاقات اچھی لگی۔ اس مہینے میرا یونی ورسٹی میں ایڈمیشن ہو رہا ہے۔ ماسٹرز کے لیے میرے B.A میں 68% مارکس آئے ہیں تو میں نے سوچا کہ اپنی اس خوشی کو میں آپ کے ساتھ شیئر کروں۔

آپ کو پچھلے خط میں FM-99 کے آر۔ جے کے

انٹرویوز کا کہا تھا۔ زیشان ناصر اور فہد عباسی۔ مگر میرا تو خط ہی شائع نہ ہو سکا.....

میری بڑی بہن "ثمینہ عمر" نے اشعار بھجوائے تھے۔ اس کا ایک شعر شائع تو ہوا ہے مگر تہمینہ عمر کے نام سے۔

ج : پیاری حرا! بھائی کے کہنے پر دل چھوٹا نہ کریں۔ خط نہ لگنے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں نے اچھا نہیں لکھا تھا' وجہ صفحات کی کمی ہوتی ہے مگر آپ کی رائے واقعی ہمارے لیے قابل احترام ہوتی ہے۔ یہ بات ہم اپنے تمام قارئین سے بھی کہہ رہے ہیں جو اس ضمن میں جذباتی ہو جاتی ہیں۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی ہے۔ بہن کا نام غلط شائع ہونے پر معذرت چاہتے ہیں۔

یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہونے پر مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔

آپ کی تینوں بہنوں کو شعاع اچھا لگتا ہے۔ ان کو ہماری طرف سے پیار۔ آپ کو ہر ماہ کچھ نہ کچھ کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کی نشان دہی ضرور کریں تاکہ ہم اس کمی کو پورا کر سکیں ہم تنقید کا برا نہیں مانتے۔ تعریف حوصلہ بڑھاتی ہے تو تنقید اصلاح کرتی ہے۔

مریم امداد نے سکرنڈ سے لکھا ہے

زبردست ٹائٹل' خوب صورت ماڈل اور قابل تعریف ہماری رائٹرز۔ ان سب کو ملا کر ہی ایک خوب صورت شعاع بنتا ہے۔ شعاع کو پڑھتے ہوئے چار سال گزر گئے ہیں پر خط لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کیوں کہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کن لفظوں میں تعریف کروں سچ پوچھیں تو ابھی بھی الجھی ہوئی ہوں۔

ج : پیاری مریم! جذبے سچے ہوں تو لفظوں سے فرق نہیں پڑتا۔ آپ کے جذبات ہم تک پہنچ گئے۔ یہی کافی ہے۔

گل ریحان چترالی تحصیل چترال سے لکھتی ہیں

سب سے بڑا مسئلہ ہمارے لیے ڈائجسٹوں تک رسائی ہے' آپ کو کیا پتا ہے کہ ہم قاری کس طرح مشکل اور مشقت کے بعد ڈائجسٹ حاصل کر پاتے ہیں۔ سب سے پہلے چھوٹے بھائی کو منانا کہ وہ میرے لیے ڈائجسٹ لے کر آئے۔ پورے تیس' چالیس روپے لینے کے بعد ڈائجسٹ لے کر آتا ہے۔ بھائی کو پیسے تو میں کبھی نہ دیتی اگر بازار میرے گھر کے نزدیک ہوتا۔ دوسرا مسئلہ پیسوں کا ہے۔ اس کے لیے مجھے دوسرے بھائی کی خوشامد کرنی پڑتی ہے' دو تین دن خوشامد کرنے کے بعد اللہ اللہ کر کے مجھے پیسے دیتا ہے اگر کم دے تو میں امی سے لے لیتی ہوں تاکہ پورے ہوں۔ جس دن میں چھوٹے بھائی کو پیسے دوں اس دن واپسی تک بھائی کی راہ دیکھتی رہتی ہوں' اسکول سے واپسی پر وہ کہے کہ ابھی رسالے آئے ہی نہیں تو میری بھائی سے جو لڑائی ہوتی ہے' وہ پورا محلہ مل کر دیکھتا ہے۔ میرا بیچارا بھائی لاکھ اپنی صفائی دے میں مان کے نہیں دیتی پھر وہ بے چارا بہت کوشش کر کے مجھے لا دیتا ہے۔ ڈائجسٹ ملتے ہی میرا موڈ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ کہانیاں پڑھ کر مجھے ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ میں ایک طلسماتی دنیا میں ہوں جہاں نہ کوئی مسائل ہیں اور نہ ہی کوئی ٹینشن۔ سب کچھ اچھا ہے۔ ان ہی کہانیوں کی وجہ سے ہم نے جینا سیکھا وہ تمام باتیں سیکھی ہیں جو ایک ماں اپنی بیٹی کو سکھاتی ہے۔ جو ایک خیر خواہ بہن یا سہیلی اپنی دوست کو بتاتی ہے۔

ج : پیاری گل ریحان! آپ نے کیسے سوچا کہ ہمیں اپنی قارئین کے مسائل کا اندازہ نہیں ہو گا۔ ہمیں پتا ہے کہ ہماری قارئین کو پرچے کے حصول کے لیے کتنے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ کوشش کریں گے کہ پرچا وقت پر آ جائے اور آپ کو مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ویسے آپ اپنے بھائی کو پیسے دیں تو بھائی سے کہیں کہ پہلے وہ بک اسٹال والے کو فون کر کے پتا کر لے۔ کہ پرچے آ گئے ہیں یا نہیں' اس طرح اس کا چکر بچ جائے گا۔

آپ کی شعاع سے اتنی محبت کو ہم اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں۔ اتنی محبت کے جواب میں تو ہمارے پاس الفاظ بھی نہیں ہیں۔ آئندہ خط لکھیں تو پرچے پر تبصرہ ضرور کیجیے گا۔

طاہرہ یاسمین انصاری نے فیصل آباد سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ اپنی کہانی نہ پا کر دل تھوڑا سا برا سا ہوا مگر پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ کے مصداق صبر کا کڑوا گھونٹ میٹھا سمجھ کر پی گئے۔ حمد و نعت سے مستفید ہو کے پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں' جس میں خشیت الٰہی

بھسم اور عذاب سے پناہ مانگی۔
بندھن میں سیما مناف کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔
عیدالاضحیٰ اور آپ' میں تمام بہنوں کے جوابات پسند آئے۔ سبز مٹن ہانڈی بہت اچھی لگی اور ٹرائی بھی کی' شہزادی کی اسٹوری عجیب موڑ پر پہنچ گئی ہے۔ مجھے رومیصہ سمجھ میں نہیں آرہی جس نے کڈنیپ کیا اس کے ساتھ ہی پیار کی پینگیں' حاجرہ ریحان کی "ہمدرد" بہت منفرد اسٹوری لگی' ہم سے بڑھ کر کون بھی اچھی کاوش تھی۔
"وقت سے پہلے" صباحت یاسمین کا ناول دل کو چھو گیا ویل ڈن صباحت اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میرا راج دلارا بھی دلچسپ تحریر تھی' سنہری دھوپ میں دعا کے ساتھ جو کچھ ہوا دل رو پڑا سچ مچ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بندگی یا زندگی بہت پسند آئی بس تم ہجر لکھو فرزانہ کھرل کا ناول تھوڑا الجھا الجھا لگا۔ شام کے مسافر میں داداجی کی زندہ دلی اچھی لگی' دل جوان ہو تو عمر کا فرق معنی نہیں رکھتا' حسن نگاہ بھی سبق آموز تحریر تھی۔

ج : پیاری طاہرہ! اگر رومیصہ آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تو پریشان نہ ہوں۔ سائنس دانوں نے برس ہا برس کی تحقیق کے بعد پتا چلایا ہے کہ عورت کو سمجھنا ناممکن ہے۔ جب اتنے عالی دماغوں نے ہاتھ اٹھالیا ہے تو ہم اور آپ کس گنتی میں ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

ہنزہ چوہدری ہری پور ہزارہ سے شرکت کر رہی ہیں لکھا ہے

میں نے بہت کم عمری سے شعاع' خواتین پڑھنا شروع کیے۔ اب میں اٹھارہ سال کی ہوں۔ مجھے دل و جان سے آپ کے پرچوں سے عشق ہے۔ راحت جبیں' نمرہ احمد' رخسانہ نگار' ثمرہ بخاری میری فیورٹ ہیں۔ کنیز نبوی تو جان ہیں۔ میں بھی مصنفین کی لائن میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ دو افسانے بھیج رہی ہوں۔ سنا ہے لیٹ ملنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے۔ پلیز میرے خطوط کو ردی کی ٹوکری میں نہ ڈالیے گا۔

ج : پیاری ہنزہ! پہلے آپ کا افسانہ پڑھ لیں پھر پتا سکیں گے کہ آپ کو ناول بھیجنا چاہیے یا نہیں اور سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کیا کریں۔ کچھ باتیں لوگ زیب داستان کے لیے بھی بڑھا دیا کرتے ہیں۔
آپ فی الحال مطالعہ کریں۔ پھر تھوڑا اور بڑی ہو جائیں تو کہانیاں لکھیں۔

چوک اعظم سے ناظمہ زیدی شریک محفل ہیں لکھا ہے

ٹائٹل خوب صورت۔ عید کے حوالے سے بھاری جوڑے۔ سیما مناف کا انٹرویو اچھا لگا۔ عیدالاضحیٰ کا سلسلہ اچھا لگا۔ ثمینہ اکرام کی تراکیب پسند آئیں ایک جیسے اجزائے ترکیبی سے مختلف ڈشز تیار واہ بھئی واہ۔ شازیہ الطاف کے جوابات لطف دے گئے (ہاؤ من' پاؤ من چاؤ من ہاہاہا) ٹھہری جو رائٹر۔
شہزادا اچھا لگا' خاص کر رومیصہ کا رومینس' در شہوار کی حرکتیں چیپ لگیں۔
"ہمدرد" اچھا لگا۔ ہاجرہ جی ایک بات کی نشان دہی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے لکھا کہ ساڑھے چھ بجے ایسے لگ رہا تھا جیسے آدھی رات ہو۔ نہایت ادب سے عرض کرنا چاہوں گی کہ بات ہو رہی ہے برطانیہ کی تو برطانیہ چونکہ ایکویٹر پہ واقع ہے تو وہاں دس بجے تک سورج کی روشنی موجود رہتی ہے' اسی وجہ سے روزے کا دورانیہ بھی قریباً" 18 سے 22 گھنٹے کا ہوتا ہے۔ کہانی بہت اچھی تھی بس ہیروئن کا نام پتا نہ چلنے کا قلق ہے۔ صبا آصف کی کہانی اچھی تھی۔ کیا یہ صدف آصف کی بہن ہیں یا آپ لوگ بطور خاص ملتے جلتے ناموں والیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔
(سوچ رہی ہوں زیدی ہٹا کر بخاری لگالوں' ایک آدھ موجود ہیں فرح بخاری' حیا بخاری..... کیا خیال ہے؟)
صباحت یاسمین بہت اچھا ناول لکھا آپ نے۔ ایک ایک حرف جانچا' پرکھا اور ناپا تلا گویا کہ ادب کے میزان سے نکلا ہوا نہ کم نہ زیادہ۔ ایک دم متوازن۔
"خواب شیشے کا" اینڈ پڑھ کر بے تحاشہ ہنسی آئی۔ معذرت کے ساتھ۔ ایسی رخصتی تو دیکھی نہ سنی۔

ج : پیاری ناظمہ! عالیہ بخاری' ثمرہ بخاری اور ہما کو کب بخاری کو بھول گئیں آپ؟ ویسے ایک بات ہے کہ بخاری لکھتی خوب ہیں سب ہی اپنی جگہ ماشاءاللہ آفتاب ہیں۔ لیکن ہم نام کو نہیں کام کو اہمیت دیتے ہیں۔ آپ میں صلاحیت تو ہے مگر ذرا اس طرف توجہ دیں۔ نا نا ضرور

لکھیں۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اس کا حشر کہانیوں والا ہو گا۔

اقراء عزیز گاؤں دریا خان جلبانی سے شرکت کر رہی ہیں لکھا ہے

آپ کے چاہنے والے لاکھوں' ایک ہمارے نہ ہونے سے آپ کو تھوڑی فرق پڑے گا اس دفعہ خط لکھنے کی وجہ آپ ہیں۔ آپ ہم سب (قاری بہنوں) کو اتنے پیارے پیارے جوابات دیتی ہیں مختصر لفظوں میں پوچھی گئی بات سمجھاتی ہیں وہ بھی ہمیشہ ایک ہی پیار بھرے موڈ میں' کیا کہنے مجال ہے جو آپ کو غصہ آئے اب اس دفعہ اگست کے شمارے میں ہی دیکھ لیجئے سب کو کھا کے جوابات دیے۔ ناظمہ جی آپ کو کس سال کے ڈائجسٹ چاہئیں میں بھیجوں گی۔ ساتھ میں ایڈریس بھی بتایئے گا۔ صدف مہر آپ کس دنیا میں رہتی ہیں ہمارے گاؤں میں دو سو بچوں کے سوٹ کی سلائی ہے آپ پچاس میں پورا سوٹ سلائی کر رہی ہیں۔

اس دفعہ ٹائٹل بہت بہت ہی پیارا تھا۔ ایسے ٹھنڈے ٹھار ـــــ دیا کریں نا کہ اتنے بھاری بھر کم کپڑے جیولری ماڈل کم چھمک چھلو زیادہ لگتی ہے۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" پڑھ کے بہت دکھ ہوتا ہے۔ ساس تو ساس آج کل نندیں بھی ساس بنی ہوئی ہیں۔ ویسے بھی عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے پر آج کل مرد بھی حیوان بنے ہوئے ہیں کوثر خالہ کی کمی محسوس ہوئی۔ خالہ آپ ٹھیک تو نہیں نا۔ آخر میں وہی ہمیشہ والی گزارش پلیز کہیں سے کنیز نبوی اور بنت سحر کو ڈھونڈ لائیں۔

ج : پیاری اقراء کیا ہم نارمل انسان نہیں ہیں جو ہمیں غصہ نہ آئے۔ لیکن اپنی اتنی پیاری قارئین پر غصہ آسکتا ہے۔ اگر چھمک چھلو کپڑے اور جیولری نہ پہنے تو پھر چلے گی؟ اور یہ حیوانوں نے آپ کی بات کا بہت برا مانا ہے۔ اور ایک بات یہ آپ نے کوثر خالد کو خالہ کس رشتے سے لکھا ہے؟ اس محفل میں صرف دوستی کا رشتہ چلتا ہے۔

عالیہ حسین نے کھیوڑہ سے لکھا ہے

آپ بتائیں گوشت کھا کھا کر کیا حال ہے۔ مجھے تو ہر چیز سے گوشت کی خوشبو چڑھ رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا سارا بکرا میں ہی کھا گئی۔ اخبار میں گوشت پکانے کے طریقے' رسالے میں گوشت' ٹی وی میں گوشت اور تو اور ملنے ملانے والے بھی اسی قصے سے بھرے ہیں۔ جب کچھ فرصت نصیب ہوئی تو مصباح کا راج دلارا پڑھ لیا۔ قسم سے ہنسی میں بھی گوشت۔ آپ نے بتایا تھا۔ مصباح شعاع کے لیے طویل ناول لکھ رہی ہیں۔ کیا بنا اس کا؟ ام طیفیور کا پامٹن مزے کا لگا۔ شہرزاد کی یہ قسط پہلی والی سے بہتر تھی۔ عفت آپی کے خواب لمبے ہو گئے۔ کوئی سنگل قسط کا لکھوائیں۔ از میریٹ جیسا افسانوں میں ہاجرہ ریحان کا ہمدرد سب پر بازی لے گیا۔

ج : پیاری عالیہ! گوشت کو سب کھانوں کا سردار کہا گیا ہے گوشت کی قدر ان لوگوں سے پوچھیں جنہیں یہ نعمت سال کے سال صرف عید الاضحیٰ پر ہی میسر آتی ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ کرم ہے کہ اس نے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کے دستر خوانوں کو یونہی بھرا رکھے۔ آمین۔ سیاست دانوں کا انٹرویو۔۔۔ اللہ اللہ آپ لوگوں کی فرمائشیں۔

صابرہ عزیز شیخوپورہ سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

عمر کے لمحے جوں جوں سرکتے ہیں جانے یادداشت کو کون سی بیماری لگ جاتی ہے۔ بیس بیس سال پرانے واقعے ایسے آنکھوں میں آبستے ہیں جیسے چند لمحے پہلے کا واقعہ ہو اور چند دن پہلے کی بات بچے ہزار طرح سے یاد کرواتے ہیں مگر نہیں۔ اب بہوؤں کا دور ہے۔ ایمان سے ان کے سامنے سب کی ہنسی کے ڈر سے خود بخود ہی ہاں ہاں کر دیتی ہوں۔ ورنہ کہیں گی' بڑھیا ڈرامے کرتی ہے۔ پیدائش کی باتیں یاد ہیں کل کی بھول گئیں۔

میں تو آج بھی عصمت چغتائی' بانو قدسیہ کو یاد کرتی ہوں کس دلیری سے لکھتی تھیں۔ خیر آج کل کی نئی بچیاں بھی بہت اچھی گرفت رکھتی ہیں۔ سائرہ رضا' مصباح علی' ایمل رضا' فرزانہ کھرل' عطیہ خالد' ایک اور بھی ہے لو اب دماغ سے نام نکل گیا۔ تم بھی کہو گی بڑھیا کے ڈرامے شروع۔۔۔۔

وہ جس میں ہرجائی میاں باہر سے ٹوٹا پھوٹا آیا اور بیوی انتظار میں مر گئی۔ وہ لڑکی بھی اچھا لکھتی ہے۔ باقی تو ہو گئیں پیسے کے پیچھے پاگل۔ چلو انت بھلا سب بھلا۔

عید کا پرچہ بھی خوب محنت کا غماز تھا۔ مکمل ناول سنہری دھوپ سلوی بیٹی کچھ عرصے بعد آئیں مگر اچھا لائیں۔ پلیز سلوی بچے دعا کو عمیر سے ہی ملوا دیں۔ اچھا بچہ ہے۔ شہزاد تو چھچھورا سا ہی لگ رہا ہے یا شاید میری عمر نہیں اب اس طرح کا پڑھنے کی، نہ جملے مزے کے نہ منظر دھماچوکڑی سی لگا۔

مصباح علی کا راج دلارا اپنے سارے کرداروں کے ساتھ ہمیشہ کی طرح چھا گیا سچ لکھا ہے بڑھاپے کی اولاد رلتی بہت ہے۔ ایک ماں باپ نہیں ساری دنیا روک ٹوک کو ماں باپ بن جاتی ہے اچھا موضوع ہے۔ لکھ کر ہی عقل دیتی رہنا۔ افسانے بہت اچھے تھے۔ قانتہ رابعہ کا زندگی بندگی بہت پسند آیا۔ تجھ سے ناتا جوڑا پڑھ کر اپنا وقت بھی یاد آتا ہے۔ مگر آج کل کی بچیاں صرف ساس نند کی زیادتیاں لکھتی ہیں۔ پچھ نہ کچھ تو بہن ان کا بھی قصور ہوتا ہے بے شک تھوڑا سہی۔ میری جیسے جیسے عمر بڑھی تو ساس کی زیادتیوں میں اپنی غلطیاں بھی واضح دکھنے لگیں۔ اللہ سب کو ہدایت دے آمین۔

ج: محترمہ صابرہ عزیز! آپ کا خط بے حد اچھا لگا۔ ہمیں اچھا لگے گا اگر آپ ہمارے سلسلے ناتا کے لیے لکھیں گی۔ اپنی غلطیوں کا ادراک ہونا بہت اچھی بات ہے۔ آپ کے تجربات، تجزیے سے ہم اور ہمارے قارئین ضرور مستفید ہونا پسند کریں گے۔

وقت کے ساتھ اکثر لوگوں کو یہ مسئلہ ہو جاتا ہے کہ پرانی باتیں یاد آتی ہیں لیکن کل کی بات بھول جاتی ہے۔ یوسفی صاحب نے کہا ہے ناں کہ جب انسان مستقبل کے بارے میں سوچنے کے بجائے ماضی کو سوچنا شروع کر دے تو بڑھاپے کا آغاز ہوتا ہے، ویسے کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ذہن میں بہت ساری باتیں جمع ہو جاتی ہیں تو ذہن تھکن کا شکار ہو جاتا ہے اور باتیں بھولنے لگتی ہیں۔

مریم عنصر شیخوچک ڈنگہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

لکھوں کیسے لکھوں، لکھوں کہ نہ لکھوں؟ بلبل، فاختہ چڑیاں، مینا حل کر کہنے لگیں تم لکھو۔ لیکن پہنچے گا کیسے؟ کبوتر نے کہا میرے گلے میں باندھو۔ گلاب نے کہا۔ مجھے ساتھ بھیجو۔ جھیل میں بہتے پانی نے کہا۔ میرے سپرد کرو۔ جب اتنا مجبور کیا جائے تو ہم لکھنے سے انکاری کیوں ہوں۔

لکھنے بیٹھی تو ہائے اللہ اتنی پیاری ہوا چلنے لگی جیسے خوشی سے ناچ رہی ہو۔ کہ درخت کے نیچے بیٹھی لڑکی پیغام لکھنے کے لیے رضامند ہو گئی ہے۔ آپی سمیرا پہلے ہی کہتی ہیں۔ تم فلسفیوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ اب تو رائٹرز بھی پھولوں بارشوں، پرندوں کی باتیں نہیں کرتیں۔ (ویسے کیا یہ بات ٹھیک ہے پلیز آپی سمیرا کو ضرور جواب دینا)

اگر شعاع کی بات کریں تو میری بیسٹ اسٹوری شہزاد اور اس سے بھی زیادہ خواب شیشے کا ہے۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ کراچی آؤں۔ کیونکہ ہم پہلے کراچی رہتے تھے۔ جب حالات خراب ہونا شروع ہوئے تو ہم اپنے آبائی صوبہ پنجاب آ گئے۔ لیکن ابھی تک ہم یہاں ٹھیک سے ایڈجسٹ نہیں ہو پائے۔ ویسے ہم بلدیہ ٹاؤن کراچی میں رہتے تھے۔ ہمارے اسکول کا نام پائلٹ سیکنڈری اسکول تھا۔ اور مدرسے کا نام رحمتہ العلوم فتحیہ تھا۔ اگر اس ٹاؤن اسکول، مدرسے کی لڑکی رابطہ کرنا چاہے تو خوش آمدید۔

ج: پیاری مریم! جب اتنے اصرار پر لکھنے ہی بیٹھ گئی تھیں تو تھوڑا سا تبصرہ شعاع پر بھی کر دیتیں۔ آپ کی آپی سمیرا ٹھیک کہتی ہیں، وجہ یہ ہے کہ موبائل، نیٹ، فیس بک وغیرہ نے زندگی کو بہت تیز رفتار بنا دیا ہے۔ فطرت کا مطالعہ اور اس سے محبت اور اس سے شریک محفل ہیں گفتگو کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہے اب کہاں وہ فرصت کہ بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے۔

کراچی کے حالات اب اللہ کے کرم سے بہت بہتر ہو گئے ہیں آپ کراچی آسکتی ہیں۔

فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران اور آمنہ رئیس گجرات

سرورق اچھا لگا۔ بندھن میں سیما مناف سے ملاقات پسند آئی۔ اپنے دل کی طرح چہرے سے معصوم لگتی ہیں۔ شہزاد نے اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے۔ شہزاد کے بعد خواب شیشے کا پڑھا۔ قسط کے اینڈ میں تو میرا صدمے سے برا حال تھا۔ تو کیا موحد آغا فیملی سے مخلص نہیں اور کیا ثمرہ بیگم بھی موحد کے ساتھ شامل ہیں۔ عفت جی کو مہ پارہ سے ایسی کیا پرخاش ہے جو ہر بار اس کو ہی تختہ دار پہ لٹکاتی ہیں۔ موحد پہ بے حد غصہ ہے مجھے۔

سنہری دھوپ اک ادنیٰ سی درخواست ہے پلیز ٹیکسٹ منتہا لاسٹ۔ قسط کردیں اس کی حد ہوتی ہے بکنے پن کی یعنی کہ ماموں اتنا خود غرض ہوگیا۔ پیسوں کی خاطر بھانجی کا سودا کردیا۔ لعنت ہے عمر اور ماموں پہ۔

تمام کا تمام شعاع اچھا تھا۔ باتوں سے خوشبو آئے۔ حسد اچھا لگا۔ واقعی یہ حسد ہی ہے جو گھروں کو برباد کررہا ہے۔

خوب صورت بنیئے' میں بھی آج کل اپنا بیوٹی پارلر کررہی ہوں۔ دعا کریں۔ چل جائے۔ دستک میں سویرا ندیم سے ملاقات اچھی لگی۔ بولتی بہت پیارا ہے۔

میرے حق میں بھی دعاؤں میں کوئی چھوٹی موٹی دعا کردینا کوثر خالد جی کو سلام کہنا میرا۔ آپ خود ہی کہتی ہیں کہ آنٹی نہیں کہنا۔ ویسے جو دادی بن جائیں۔ ان کو تو کہنا چاہیے ہم نے کون سا عمریں دیکھ رکھی ہیں ویسے اندازے اور مشاہدے بھی اسی دنیا کے رسم و رواج ہیں۔

ج : پیاری فوزیہ! اگر کوئی آپ کی نقل کرتا ہے تو یہ بات آپ کے لیے باعث فخر ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ آپ کی شخصیت اور عادات سے متاثر ہے' آپ نے نوٹ نہیں کیا۔ دلیپ کمار اور وحید مراد کے بالوں کے اسٹائل کی آج تک کاپی کی جاتی ہے۔ وجہ ان کی پسندیدگی اور مقبولیت ہے۔ ویسے بھی ہمیشہ دوسروں کے لیے اچھا گمان رکھنا چاہیے۔ اس سے کم از کم اپنا دل خوش رہتا ہے۔ آپ اپنا دل نہ جلایا کریں۔ خوش رہا کریں۔ بیوٹی پارلر ضرور کھولیں۔ اگر کوئی ہنر آپ کے پاس ہے تو اسے ضرور کام میں لگانا چاہیے۔

اگر کوئی خاتون بڑی عمر کی بھی ہیں تو جن کی آنٹی ہیں' وہ آنٹی کہیں تو ٹھیک ہے باقی سب کو کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ نام سے پکارنا چاہیے۔ دوستی کا رشتہ سب سے اچھا اور میٹھا ہوتا ہے۔ خونی رشتوں کے علاوہ کسی سے کوئی رشتہ قائم کریں تو دوستی کا رشتہ رکھیں اور دوستوں کو آنٹی نہیں کہا جاتا۔ انہیں نام سے پکارا جاتا ہے۔

مہوش شہزادی' آزاد کشمیر راولاکوٹ سے لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ سلویٰ سیف اللہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اس میں دعا اور عمیر کی حالت پر رحم آتا ہے اور اس الیاس احمد میرا تو دل کرتا ہے' اس کا خون کر دوں۔ "خواہشوں کی مسافت" بھی زبردست ناولٹ تھا۔ پیا ملن کی رت بھی ٹھیک تھا۔ آسیہ رزاقی کی تحریر بھی زبردست تھی۔ "ایک تھی ملکہ" کچھ خاص نہیں تھا۔ جو سب سے زیادہ پڑھتی ہوں وہ ہیں "خط آپ کے"۔

ج : پیاری مہوش! ایک بنانے کی ترکیب ہم کئی بار دے چکے ہیں۔ آپ کی فرمائش پر اس ماہ پھر دے رہے ہیں۔ ہمارے ہاں سے آپ کو رینٹ پر ناول نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے آپ کسی لائبریری سے رجوع کریں۔

ہما ظہیر نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے

میں 6th کلاس میں تھی جب شعاع سے دوستی ہوئی جو آج تک قائم ہے اب میں گریجویشن فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ اتنے سارے عرصے میں شعاع کی ہر تحریر نے متاثر کیا۔ ان تحریروں نے ہر جگہ رہنمائی کی۔ شعاع کے لیے بس اتنا ہی کہ شعاع از آل ویز دی بیسٹ۔

ٹائٹل سمیت ستمبر کا پورا شمارہ زبردست تھا۔ صائمہ اکرم کا نیا ناول بھی متاثر کن ہے۔ افسانے بھی سارے زبردست تھے۔ فرزانہ کھرل کی تحریر نے میلہ لوٹ لیا۔ "وقت سے پہلے" بھی بہت ہی زبردست ہے۔

ج : پیاری ہما! بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ کا شعاع سے پرانا رشتہ ہے اور شعاع نے آپ کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ آپ جیسی قارئین کا پیار ہی ہے کہ ہم آج بھی شعاع کا معیار قائم رکھے ہوئے ہیں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	صائمہ انصار
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

زمین پر انسانی زندگی کا آغاز

ابلیس فرشتوں کے اس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا جسے جن کہا جاتا ہے۔ اس قبیلہ کے فرشتوں کو آگ کی گرم لو سے پیدا کیا گیا تھا۔ (یہ لو شعلے میں نظر نہیں آتی۔ صرف محسوس کی جا سکتی ہے اور تمام حدت اس میں ہوتی ہے۔) اس کے علاوہ باقی تمام فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے۔ جبکہ انسان کو کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ ابلیس فرشتوں کا سردار تھا اور اس کا قبیلہ ان سب میں معزز و محترم تھا۔ اس کے علاوہ بہشت کے باغات کا نگران بھی تھا۔

آغاز میں زمین پر جنات ہی رہتے تھے۔ انہوں نے زمین پر فساد برپا کیا۔ ایک دوسرے کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکوبی کے لیے ابلیس کو فرشتوں کے ایک لشکر کے ساتھ بھیجا اور یہ وہی لشکر تھا۔ جسے جن کہا جاتا ہے۔ ابلیس نے اپنے لشکر کے ساتھ ان سے جنگ کی اور انہیں سمندری جزیروں اور پہاڑوں کی طرف بھگا دیا۔ اس کارنامے نے ابلیس کے دماغ میں غرور و تکبر پیدا کر دیا۔

ابلیس دنیا، زمین اور اس کے درمیان تمام علاقے کا منتظم تھا۔ وہ جنت کا محافظ اور نگراں بھی تھا۔ وہ عبادتِ الٰہی میں بہت زیادہ مشقت اٹھاتا تھا اور اسی وجہ سے خود پسندی کا شکار ہو گیا اور اپنے آپ کو بہت اعلا، ارفع اور کامل و فاضل سمجھنے لگا۔ حتیٰ کہ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو کچھ عطا کیا ہے وہ میری ذاتی ریاضت کا ثمر اور انعام ہے۔

احمد بن خمیثہ کی روایت میں ہے کہ ابلیس نے کہا۔ "مجھے فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ "ابلیس گناہ کا مرتکب ہونے سے پہلے فرشتوں میں سے تھا۔ اس کا نام عزازیل تھا اور وہ زمین کا باشندہ تھا اور وہ ریاضت و مجاہدے میں سب سے زیادہ تھا۔

درست اور صحیح بات وہی ہے جو اللہ کریم نے قرآن میں ارشاد فرمائی ہے۔

"یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ وہ جنوں میں سے تھا۔ اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔"

لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ ابلیس جنات میں سے تھا۔ (جن کے اندر سرکشی اور بغاوت کا مادہ غالب ہوتا ہے۔) ابلیس کے دل میں غرور و تکبر آیا تو اللہ تعالیٰ جو دلوں کا حال جاننے والا ہے۔ اس نے جان لیا اور فرشتوں سے کہا۔

"میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

فرشتوں نے جواب میں کہا۔ "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزی کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔"

مفہوم اس کا یہ تھا، میں ابلیس کے فخر و غرور اور اس کی سرکشی کو جانتا ہوں اور اس بات کو بھی جانتا ہوں کہ اس کے نفس میں باطل گھر کر گیا ہے۔

تخلیق آدم

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا، جس کو تمام زمین سے لیا گیا۔ یعنی ایک ہی جگہ سے مٹی نہ لی، بلکہ مختلف مقامات سے سرخ، سفید اور سیاہ رنگ کی مٹی لی۔

یہی وجہ ہے کہ بنی آدم اس مٹی کے موافق پیدا ہوئے ہیں۔ بعض ان میں سے سرخ بعض سیاہ بعض سفید اور بعض گندمی رنگ کے ہیں۔ اسی طرح خوش اخلاق' بد اخلاق اور نیک و بد ہر قسم کے لوگ ہیں۔

اس کے بعد اس مٹی کو چھوڑ دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس میں بو پیدا ہو گئی' پھر اسے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ خشک ہو کر ٹھیکرے کی شکل بن گئی۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کی مٹی لانے کا حکم دیا۔ وہ مٹی آسمان کی طرف لے جائی گئی۔ پھر آدم علیہ السلام کو لیس دار مٹی (طین لازب) سے بنایا گیا جو اس سے قبل بدبودار مٹی کی شکل میں تھی اور اس سے قبل وہ خشک مٹی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور چالیس راتوں تک ان کے پتلے کو ایسے ہی پڑا رہنے دیا۔ فرشتوں کا ادھر سے گزر ہوا تو وہ اسے دیکھ کر گھبرا گئے اور سب سے زیادہ گھبراہٹ ابلیس پر طاری ہوئی۔ ابلیس جب بھی اس کے پاس سے گزرتا اس کو پاؤں سے ٹھوکر مارتا' جس کی وجہ سے اس میں آواز پیدا ہوتی' جس طرح ٹھیکرے پر ٹھوکر لگنے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔

ابلیس ٹھوکر لگاتے وقت کہا کرتا۔ ''تجھے کس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟''

وہ منہ کی طرف سے اس پتلے میں داخل ہوتا اور نیچے سے نکل جاتا اور فرشتوں سے کہتا۔

''تم اس سے مت ڈرو' تمہارا رب بے نیاز (صمد) ہے۔ جبکہ یہ انسان اندر سے کھوکھلا ہے۔ اگر مجھے اس پر مسلط کیا گیا تو میں اس کو ہلاک کر دوں گا۔''

جب یہ مٹی ٹھیکرے کی طرح آواز دینے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونکنے کا ارادہ فرمایا تو پتلے کو فرشتوں کے سامنے کیا اور کہا کہ جب میں اس میں روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدے میں گر جانا۔

اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر روح پھونکی تو روح سر میں داخل ہوئی' جس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو چھینک آ گئی۔ جس پر فرشتوں نے کہا کہ ''الحمدللہ'' کہیں۔

الحمدللہ کہنے پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''رحمک ربک۔'' (تمہارا رب تم پر رحمت کرے)

اس کے بعد روح آنکھوں میں داخل ہوئی تو حضرت آدم علیہ السلام نے جنت کے پھل اور میووں کو دیکھا۔ جب روح پیٹ میں پہنچی تو کھانے کی خواہش پیدا ہوئی اور حضرت آدم علیہ السلام روح کے ٹانگوں میں پہنچنے سے قبل ہی ان پھلوں اور میووں کی جانب بڑھے۔

اس کے بعد تمام فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر سجدہ کیا' لیکن ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کا اظہار کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا۔ ''اے ابلیس! تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکے رکھا' جبکہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا ہے۔''

ابلیس نے غرور و تکبر کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ مٹی سے ہے اور میں آگ سے' آگ مٹی سے بہتر اور قوی ہے۔''

ابلیس کی اس گستاخی پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا اور جنت سے نکلنے کا حکم دیا۔

حضرت حوا کا ظہور

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھکانہ دیا تو وہاں انہوں نے تنہائی محسوس کی۔ جب وہ ایک رات سوئے تو اپنے سرہانے ایک عورت کھڑی دیکھی' جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی سے پیدا فرمایا تھا۔ فرشتوں کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ دیکھنے کے لیے آئے اور کہا۔

''اے آدم! اس کا نام کیا ہے۔''

حضرت آدم علیہ السلام نے کہا۔ ''حوا!''

انہوں نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ نام کیوں رکھا؟''

حضرت آدم علیہ السلام نے کہا۔ ''اس لیے کہ وہ

حی" (زندہ) آدم (علیہ السلام) سے پیدا کی گئی ہے۔
پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت حوا کا نکاح کر دیا اور ان سے کہا۔
"اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو فراخی سے کھاؤ، لیکن اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ تم ظالم قرار دیے جاؤ گے۔"
ممنوعہ درخت کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور فرشتے اس کا پھل کھاتے تھے۔ مگر حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا کو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا تھا۔

ابلیس جنت میں

ابلیس ان کا دشمن تھا۔ اس نے ان دونوں کے پاس جنت میں جانے کا ارادہ کیا، لیکن محافظ فرشتوں نے اسے روک لیا۔ پھر ابلیس ایک سانپ کے پاس گیا۔ وہ سانپ اس وقت چار ٹانگوں والے جانور کی شکل میں تھا اور اونٹ کے برابر تھا۔ ابلیس نے اس سے کہا۔
"تو مجھے اپنے منہ میں چھپا کر جنت میں لے جا تاکہ میں آدم علیہ السلام تک پہنچ سکوں۔" سانپ نے ایسا ہی کیا۔
ابلیس نے سانپ کے منہ میں بیٹھے بیٹھے حضرت آدم علیہ السلام سے گفتگو کی، مگر انہوں نے توجہ نہ دی۔ اس پر وہ باہر نکل آیا اور ممنوعہ درخت کا پھل لے کر حضرت حوا کے پاس آیا۔
محمد بن اسحاق کہتے ہیں۔ "جب آدم علیہ السلام جنت میں داخل ہوئے اور وہاں کی آسائش اور نعمتیں دیکھیں تو کہنے لگے کہ کاش مجھے یہاں ہمیشہ رہنا نصیب ہو جائے۔ شیطان نے ان کی یہ کمزوری پکڑ لی۔ وہ ان دونوں کے پاس آکر اس انداز سے رویا کہ وہ دونوں غم زدہ ہو گئے۔
انہوں نے پوچھا۔ "کیوں روتے ہو؟"
ابلیس کہنے لگا۔ "میں تمہاری وجہ سے روتا ہوں کہ تم کبھی نہ کبھی ضرور مر جاؤ گے اور یہ تمام نعمتیں تم سے چھن جائیں گی۔" پھر کہا۔ "اے حضرت آدم ہم اس درخت کا پھل کھالو۔ جس سے تمہارے رب نے تمہیں منع کیا ہے۔ فرشتے بن جاؤ گے اور ہمیشہ کی زندگی پالو گے۔"
حضرت آدم علیہ السلام نے ابلیس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ جبکہ حضرت حوا آگے بڑھیں اور پھل کھا لیا اور کہا۔
"اے آدم (علیہ السلام) تم بھی کھالو، دیکھو میں نے کھایا ہے اور کچھ بھی نقصان نہیں ہوا۔"
اس پر حضرت آدم علیہ السلام نے بھی وہ پھل کھا لیا۔
حضرت آدم علیہ السلام کے پھل کھاتے ہی دونوں کے جسم سے جنت کے لباس اتر گئے اور وہ جنت کے درختوں کے پتوں سے جسم ڈھانپنے لگے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلایا۔
"کیا میں نے تمہیں اس درخت کے قریب جانے سے منع نہ کیا تھا اور کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔" پھر اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ہمیشہ کے لیے دھتکارا ہوا اور ملعون قرار دے دیا۔
سانپ کو کہا۔ "تو اپنی ٹانگیں کاٹ دے اور پیٹ کے بل رینگ کر چلا کر اور جو بھی (ابن آدم علیہ السلام) تجھے دیکھے گا۔ تیرا سر پتھر سے کچل دے گا۔"
اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو جنت سے نکال دیا اور ان سے تمام نعمتیں چھین لی گئیں۔ ان کو اپنے دشمن ابلیس اور سانپ کے ساتھ زمین کی طرف اتار دیا اور کہا۔
"اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔"
علما کہتے ہیں۔ "تم ایک دوسرے کے دشمن ہو سے مراد حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حوا، ابلیس اور سانپ ہیں۔"

آدم علیہ السلام زمین کے کس حصہ میں اترے

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ہوا کے اعتبار سے زمین کا سب سے بہترین خطہ ہند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت آدم علیہ السلام کو اتارا اور یہاں کے درختوں کا جنت کی ہوا سے تعلق چھوڑا۔ حضرت حوا کو جدہ میں اتار آگیا۔ پھر آدم علیہ السلام ان کی تلاش میں نکلے' یہاں تک کہ دونوں اکٹھے ہوگئے۔ حضرت حوا ان کی طرف میدان مزدلفہ میں آگے بڑھی تھیں۔ اسی لیے اس کا نام مزدلفہ پڑ گیا۔

اہل توریت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کو ہند میں واسم نامی پہاڑ پر اتار گیا اور حضرت حوا کو جدہ میں اتارا' ابلیس کو ابلہ کے دریا کے کنارے اور سانپ کو اصفہان میں اتار آگیا۔ یہ حدیث سے ثابت نہیں ہے کہ انہیں زمین پر کہاں اتار اگیا۔

پاکیزہ اشیا کیسے وجود میں آئیں

حضرت آدم علیہ السلام جب زمین کی طرف اترے تھے تو ان کے سر پر جنتی درخت کے پتوں کا تاج تھا۔ مگر زمین پر آتے آتے وہ خشک ہوگیا اور اس کے پتے گرنے لگے جس سے مختلف اقسام کی چیزیں زمین پر اگنے لگیں۔

کچھ علما کا کہنا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین کی طرف اتارے گا تو وہ جنت کے جس درخت کے پاس سے گزرتے اس کی ایک شاخ توڑ لیتے۔ لہٰذا جب وہ سرزمین ہند پر اترے تو یہ تمام شاخیں ان کے پاس تھیں۔ جب یہ شاخیں خشک ہوگئیں' تو ان کے پتے گرنے لگے۔ پھر ان پتوں سے تمام نباتات جو ہند کی زمین پر اگتی ہیں۔ زمین پر پیدا ہوئیں۔

جنت کی گندم

کہا جاتا ہے جب آدم علیہ السلام جنت سے آئے تو ان کے ساتھ گندم کی ایک تھیلی تھی۔ بعض علما کہتے ہیں گندم کی تھیلی حضرت جبریل علیہ السلام لائے تھے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کو بھوک لگی اور انہوں نے اپنے رب سے کھانا مانگا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے اس تھیلی میں سے سات دانے نکال کر حضرت آدم علیہ السلام کی ہتھیلی پر رکھے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

حضرت جبریل علیہ السلام نے جواب دیا۔ "یہ وہی ہے جو آپ کے جنت سے نکالنے کا سبب بنا ہے۔"

ان دانوں میں سے ہر ایک دانے کا وزن ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم کے برابر تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا۔ "میں ان دانوں کا کیا کروں؟"

حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا۔ "ان کو زمین میں پھیلا دو۔"

تب حضرت آدم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک گھڑی میں ان کو اگا دیا۔

پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا۔ "فصل کو کاٹو۔" آدم علیہ السلام نے کاٹی۔

پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا۔ "اس کو جمع کرو اور اپنے ہاتھوں سے رگڑو۔"

انہوں نے ایسا ہی کیا۔

پھر کہا "پھونک مار کر اس کے بھوسے کو اڑا دو۔" حضرت آدم علیہ السلام نے پھونک مار کر اس کا بھوسا اڑا دیا۔ صرف دانے باقی رہ گئے۔ اس کے بعد وہ پتھروں کے پاس آئے اور ایک کو دوسرے پر رکھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ان دانوں کو پیسا، پھر حکم کے مطابق آٹے کو گوندھا۔ اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام ایک پتھر اور لوہا (توا) لائے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ان دونوں کو رگڑا تو آگ نکلی۔ پھر حکم کے مطابق روٹی بنائی۔

یہ آگ پر تیار ہونے والی سب سے پہلی روٹی تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول اس کے برعکس ہے اور وہ زیادہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ "وہ درخت جس سے آدم علیہ السلام و حوا کو منع کیا گیا تھا۔ وہ گندم کا درخت تھا۔ جب دونوں نے اسے کھایا تو ان کے جنت کے لباس اتر گئے اور وہ جلدی جلدی اپنے اوپر جنت کے پتے ڈالنے لگے اور وہ پتے انجیر کے درخت کے تھے۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ چپک جاتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ایک درخت کے اندر پناہ لی۔

اللہ تعالیٰ نے پکارا۔ "کیا تم مجھ سے بھاگتے ہو؟" انہوں نے کہا۔ "نہیں اے میرے رب، میں آپ سے حیا کرتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے کہا "کیا وہ چیزیں جو میں نے تمہیں عطا کی تھیں اور تمہارے لیے مباح تھیں اور ان سے زیادہ نہ تھیں جن سے منع کیا تھا۔"

حضرت آدم علیہ السلام نے کہا۔ "کیوں نہیں اے میرے رب، لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ کوئی آپ کا نام لے کر جھوٹ بولے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "مجھے میری عزت کی قسم میں ضرور تمہیں زمین کی طرف اتاروں گا۔ جہاں تم زندگی بھر تلخیاں اور مشقتیں برداشت کرو گے۔"

پھر انہیں زمین کی طرف اتار دیا گیا۔ اس سے قبل وہ جنت میں فراخی سے کھاتے تھے۔ مگر اب انہیں ایسی جگہ اتار دیا گیا جہاں کھانے پینے کی اشیا کی فراخی نہ تھی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں لوہے کی صنعت سکھائی اور کھیتی باڑی کا حکم دیا۔ انہوں نے زمین کو تیار کیا۔ کھیت بویا، پھر اسے سیراب کیا۔ یہاں تک کہ اس کی فصل کٹنے کے وقت کو پہنچ گئی۔ پھر بالترتیب اسے کاٹا، چھانا، پیسا، گوندھا، پھر روٹی پکائی اور تب کھائی۔

حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اترے تو ان کے ساتھ حجر اسود بھی نازل ہوا اور وہ اس وقت برف سے زیادہ سفید تھا۔ آدم علیہ السلام اور حوا جنت کی کھوئی ہوئی نعمتوں پر سو سال تک روتے رہے اور چالیس دن تک کچھ نہ کھایا۔ چالیس دن گزرنے کے بعد کھانا پینا شروع ہوئے۔

جب حضرت آدم علیہ السلام سرزمین ہند سے نکلے تو ان کا ارادہ بیت اللہ کی طرف جانے کا تھا، جس کی طرف جانے کا حکم انہیں اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ وہ یہاں تک آئے۔ اس کا طواف کیا۔ تمام ارکان حج بجا لائے۔ میدان عرفات میں حضرت آدم علیہ السلام و حوا کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ مزدلفہ میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حوا کے قریب ہوئے، پھر حوا کو ساتھ لے کر ہند کی طرف واپس ہوئے۔ ہند واپس آکر انہوں نے ایک غار بنایا، تاکہ اس میں رہائش اختیار کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا، جس نے ان کو وہ چیز سکھائی جو ان کی ستر پوشی اور لباس کی ضرورت پوری کرے، جبکہ بعض کے بقول یہ لباس تو ان کی اولاد کا تھا، خود ان کا لباس تو وہی جنت کے پتے تھے جو انہوں نے اپنے تن پر لپیٹے ہوئے تھے۔

(تاریخ طبری سے)

خوش فہمی

ماڈل ماہ رخ ملک کا کہنا ہے کہ "مجھے شروع ہی سے اداکاری کا شوق تھا اور میں چاہتی تھی کہ اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنا نام پیدا کروں۔ میرے ساتھ والدین اور مخلص دوستوں کی دعائیں شامل ہیں۔ زندگی میں ہر چیلنج کا سامنا کرنا جانتی ہوں۔ میں پاکستانی ٹی وی ڈراموں سے بہت متاثر ہوں (چلو تمہیں تو کام مل گیا ناں...؟) اور پاکستانی فلموں کا روشن مستقبل دیکھ رہی ہوں (آہمم! کیا کہا روشن...؟ چلیں خیر اچھی سوچ تو رکھنی ہی چاہیے) ہر دن کے ساتھ ہم بہتری کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ (ہاہاہا! ماہ رخ! فلموں پر چند مخصوص لوگوں کی اجارہ داری ہے۔ وہاں کام ملنا...؟) اس میں اچھے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کا اہم کردار ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ شوبز میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ (اچھا...؟ کام ملے بغیر اندازہ...؟) فلم اور ڈرامے کے حوالے سے کور میں امید کرتی ہوں کہ اپنے ساتھیوں کے تعاون سے میں بہت جلد ایک اچھے کردار میں اپنے مداحوں کو اپنی طرف متوجہ کر لوں گی۔" (ساتھیوں کا تعاون...؟)

کردار

ارمینا خان کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ جی جی' وہی ارمینا خان جو پاکستانی ڈراموں میں ایک مظلوم عورت بنی روتی دھوتی نظر آتی ہیں۔ ان کے بارے میں خبر ہے کہ وہ برطانوی فلم میں کام کر رہی ہیں۔ (بلکہ فلم تقریباً" مکمل ہو چکی ہے اور تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔ دی اچلیس پروٹوکول کے نام سے بننے والی اس برطانوی فلم کے بارے میں ارمینا خان کا کہنا ہے کہ "میں اس بات کا اعلان کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہی ہوں کہ میری فلم پوسٹ پروڈکشن میں ہے اور جلد ریلیز ہونے والی ہے۔ (تو...؟) اس فلم میں میں آرٹی فیشل انٹیلی جنس کا کردار ادا کر رہی ہوں (ہیں...؟ کیا...؟ اچھا...!) جو دنیا کو تباہ کرنے کے لیے کیمیائی ہتھیار چلائے گی۔ (واہ ارمینا! پاکستانی ڈراموں میں اتنی مظلومیت اور رونا دھونا جبکہ باہر کی فلموں میں اتنا خطرناک کردار؟ کیا بات ہے بھئی۔)

جوہر

پچھلے دنوں آپ نے سجاد علی کا گانا کوک اسٹوڈیو میں دیکھا ہو گا۔ بیگم اختر کی گائی ہوئی مشہور غزل "عشق میں غیرت جذبات نے رونے نہ دیا۔" کو سجاد علی نے اپنی بیٹی ضو علی کے ساتھ 'مشرقی اور مغربی انداز میں ترتیب دی ہوئی دھن میں پیش کیا۔

ضوعلی کی یہ پہلی میوزک انٹری تھی۔ جو دھما کے دار رہی۔ ضوعلی اس سے پہلے ہدایت کاری کرتی تھیں انھوں نے سجاد علی کے گانے ناخن کی وڈیو کی ہدایات بھی دی تھی۔ اس کے علاوہ "تماشا" کی ہدایات بھی ضوعلی نے ہی دی تھی۔ لیکن سجاد علی کے ساتھ سر سے سر ملاتے ہوئے ضوعلی نے سننے والوں کو بیگم اختر کی یاد دلادی۔ اور ضوعلی نے ثابت کر دیا کہ وہ سجاد علی جیسے لیجنڈ کی ہی بیٹی ہیں۔

مبارک باد

پچھلے دنوں ہم نے آپ کو اریج فاطمہ کی منگنی کی خبر دی تھی۔ جی ان کے بچپن کے دوست عزیر علی کے ساتھ۔ اب خبر ہے کہ ان کی شادی ہو گئی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس شادی میں شوبز سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کو نہیں دیکھا گیا۔ (بھئی بلایا نہیں ہو گا ناں۔) حتی کہ اریج فاطمہ کی بہترین دوست عائزہ خان بھی اس شادی کے کسی فنکشن میں نظر نہیں آئیں۔ (بھئی اپنے ڈراموں میں مصروف ہوں گی۔ سب ہی ہوتے ہیں بھئی خوش اور کیا۔) ہماری طرف سے اریج فاطمہ کو شادی کی مبارک باد۔

ادھر اُدھر سے

☆ کامیاب شخص کوئی بھی دعوا کر سکتا ہے۔ اور ناکام شخص بے چارہ صرف سر جھکا کر سنتا ہے۔ جو طریقۂ کار کامیاب لوگ زندگی میں اپناتے ہیں۔ وہی طریقہ لاکھوں لوگ اور بھی اپناتے ہیں مگر اپنے "مقدر" کی وجہ سے ناکام رہتے ہیں کیا اس مقدر کا کوئی حل ہے؟

(یاسر پیرزادہ۔ ذرا ہٹ کے)

☆ فلمی اسٹوڈیوز دوبارہ سے آباد ہو گئے ہیں۔ نئی نئی کہانیوں پر کام ہو رہا ہے لیکن سب سے زیادہ جو فلمی پلاٹ کامیاب جا رہا ہے وہ "انصاف کا بول بالا" ہے۔ ہر فلم میں سیاہ چغوں کی ڈیمانڈ بڑھ رہی ہے کیونکہ ہر فلم کے ہیرو کا ایک کردار انصاف کا بول بالا کرنا بھی ہے۔ جس فلم سے سب سے زیادہ بزنس کی توقع کی جا رہی ہے اس کا نام "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" اس کی ہیروئین کے لیے "میرا" کا انتخاب فائنل ہے۔

(سہیل وڑائچ۔ فیض کام)

☆ چلتے چلتے میاں صاحب کے "دوستوں کے لیے" بری خبر اور وہ یہ کہ ان کی ایک بڑی خواہش نواز شریف کے دامن پر کرپشن کی کالک ملنا تھی اور وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے۔ میں نے ایک پٹیلے میں قورمہ بیچنے والوں کو سات آٹھ برسوں میں ارب پتی ہوتے دیکھا ہے اور یہ خاندان ستر برس سے ایک صنعتی ایمپائر کا مالک ہے۔ آپ کو اس کے ارب پتی ہونے پر اتنی حیرت اور اتنی تکلیف کیوں ہے؟

(عطاء الحق قاسمی۔ روزن دیوار سے)

☆ کوئی مانے یا نہ مانے اس وقت ملک میں سب سے زیادہ تذکرہ باپ بیٹی کا ہی ہے شاید ہی کوئی کالم ہو جو ان کے ذکر سے عبارت نہ ہو۔ کوئی تو وجہ ہے کہ نقاد اپنا بیشتر وقت مریم نواز صاحبہ کی مخالفت میں ضائع کر رہے ہیں۔

(اجمل خٹک کثر۔ جنگ)

خالدہ جیلانی

نمکین تکہ

ضروری اشیا:

چکن تکہ بریسٹ	ایک عدد
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:

تکے پر تین سے چار کٹ لگا کر اسے اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں۔ اس پر نمک اور لیموں کا رس لگا کر تیس سے چالیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالے میں سرکہ، لہسن، ادرک پیسٹ، سیاہ مرچ پاؤڈر اور تیل ڈال کر مسالا تیار کر لیں اور اس مسالے کو تکے پر اچھی طرح لگا کر فریج میں تین سے چار گھنٹے میرینٹ ہونے کے لیے رکھیں۔ پھر کسی برتن میں تھوڑا سا تیل ڈالیں اور یہ تکہ رکھ دیں۔ تھوڑی دیر بعد پلٹ دیں۔ مزیدار تکہ تیار ہے۔

چکن یخنی پلاؤ

ضروری اشیا:

یخنی کے لیے:

مرغی کا گوشت	ایک کلو
سونف	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن، ادرک پیسٹ	دو چائے کے چمچے
جائفل، جاوتری پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد

چاول کے لیے:

چاول (بھگو دیں)	تین پاؤ
تیل	ایک چوتھائی کپ
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
دہی	ایک کپ (پھینٹ لیں)
کالا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	دو عدد
ہری مرچیں	پانچ عدد
زرد رنگ	دو چٹکی
کیوڑا	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

ایک دیگچی میں تین گلاس پانی، سونف، دھنیا، زیرہ، گرم مسالا کی پوٹلی بنا کر ڈالیں اور جائفل، جاوتری پاؤڈر، پیاز، لہسن، ادرک پیسٹ، نمک اور مرغی کا گوشت ڈال کر پکانے رکھ دیں۔ گوشت گل جائے تو چولہا بند کر دیں۔ تھوڑا ٹھنڈا کر کے یخنی چھان لیں اور گوشت الگ کر لیں۔

ایک بڑی دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز فرائی کر کے نکال لیں اور زیرہ، ہری مرچیں، لہسن، ادرک پیسٹ اور گوشت ڈال کر فرائی کریں اور دہی ڈال کر بھون لیں۔ تیل الگ ہو جائے تو یخنی ڈالیں۔ اگر یخنی کم ہو تو پانی ڈال دیں۔ ابال آنے پر چاول ڈالیں۔ درمیانی آنچ پر پکائیں یخنی خشک ہو جائے تو چاول مکس کریں۔

زرد رنگ، دودھ میں گھول کر ڈالیں اور کیوڑا چھڑک کر پانچ منٹ دم پر رکھیں۔ رائتے کے ساتھ

پیش کریں۔

چکن 65 ود زیرہ رائس

ضروری اشیا :

چکن (بون لیس)	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
چاول کا آٹا	دو کھانے کے چمچے
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	تلنے کے لیے

ساس بنانے کے لیے:

تیل	حسب ضرورت
لہسن (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
کڑی پتے	آٹھ عدد
ہری مرچیں	چار عدد
گارلک ساس	آدھا کپ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
پانی	ایک چوتھائی کپ

زیرہ رائس بنانے کے لیے:

چاول (بھگو دیں)	دو کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
چکن کیوب	ایک عدد
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب :

پتیلی میں تیل گرم کریں' اس میں زیرہ ڈال کر کڑکڑائیں۔ چاول' نمک' پانی اور چکن کیوب ڈال کر ابالیں اور پانی خشک ہونے تک پکائیں پھر دم پر لگا دیں' مزے دار زیرہ رائس تیار ہیں۔ (نوٹ: چاول میں اتنا ہی پانی ڈالیں کہ چاول گلنے تک وہ پوری طرح خشک ہو جائے۔)

چکن 65 بنانے کے لیے:

چکن کے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ پیالے میں چکن' نمک' لال مرچ' ہلدی پاؤڈر' چاٹ مسالا' سیاہ مرچ پاؤڈر' لہسن پیسٹ' دھنیا پاؤڈر' چاول کا آٹا اور کارن فلور ڈال کر مکس کر کے ایک گھنٹے تک میرینٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ اب ایک برتن میں تیل گرم کر کے چکن کی بوٹیاں ڈال کر چار سے پانچ منٹ تک فرائی کریں۔ بوٹیوں کو برتن سے نکال کر الگ کر کے رکھ دیں۔

برتن میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے لہسن ڈال کر فرائی کریں۔ کڑی پتہ' ہری مرچیں' گارلک ساس' سویا ساس اور پانی ڈال کر ایک منٹ تک پکائیں۔ فرائی کی ہوئی چکن کی بوٹیاں ساس میں ڈال کر اچھی طرح سے مکس کر دیں۔ زیرہ رائس کے ساتھ سرو کریں۔

منی بریڈ پزا

ضروری اشیا :

چکن (بون لیس) (ابال کر ریشہ کریں)	ایک پاؤ
ڈبل روٹی سلائس	چھ سے سات عدد
کالی مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک چائے کا چمچہ
چلی ساس	ایک چائے کا چمچہ
پیاز (لچھے کاٹ لیں)	ایک عدد
کیچپ	دو کھانے کے چمچے
موزریلا چیز	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

پیالے میں چکن' کالی مرچ پاؤڈر' سرکہ' چلی سوس

اور نمک ڈال کر مکس کرکے دس سے پندرہ منٹ میرینیٹ کریں۔ فرائی پین میں تیل گرم کرکے میرینیٹ چکن ڈال کر پانچ منٹ پکائیں اور چولہے سے اتار لیں۔

ڈبل روٹی کے سلائس گول شیپ میں کاٹ لیں۔
اس پر چکن ڈال کر کیچپ اور موزریلا چیز ڈالیں' اوپر سے پیاز کا سلائس رکھ دیں۔ گریس کی ہوئی بیکنگ ٹرے میں رکھ کر 180.c پر چار سے پانچ منٹ بیک کرلیں اگر اوون نہ ہو تو توے پر ہلکی آنچ پر رکھ کر ڈھک کر ایک منٹ پکائیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

سادہ کیک

ضروری اشیا:

میدہ	ایک کپ
انڈے	تین عدد
شکر (پسی ہوئی)	ایک کپ
دودھ	ایک کھانے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
مکھن یا تیل	ایک کھانے کا چمچہ (پگھلا ہوا)
ونیلا ایسنس	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

ایک پیالے میں انڈے کی سفیدی اور تین چائے کے چمچے شکر ڈال کر اتنا پھینٹیں کہ خوب جھاگ بن جائے۔ ایک دوسرے پیالے میں انڈے کی زردیاں اور بقیہ شکر ڈال کر اتنا پھینٹیں کہ شکر حل ہوجائے۔
دودھ میں ایسنس ملا کر اسے بھی زردی والے مکسچر میں ڈال کر پھینٹیں۔
میدے اور بیکنگ پاؤڈر کو چھان کر اسے زردی والے مکسچر میں ڈالیں۔ مکھن اور انڈے کی سفیدی بھی شامل کرکے ہلکے ہاتھ سے سیدھے چمچے سے مکس کریں۔
آمیزے کو چکنے کیے ہوئے کیک ٹن میں ڈال کر پہلے سے گرم اوون میں 220.c پہ رکھ کر پندرہ منٹ تک بیک کریں' اس کے بعد اوون سے نکال کر کیک کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ یہ کیک دیگچی میں بھی بنایا جاسکتا ہے' کسی بڑے پتیلے میں اسٹینڈ رکھ کر کیک کاٹن رکھ دیں اور اسے ڈھک دیں۔ آنچ ہلکی رکھیں' 20 منٹ کے بعد چیک کریں۔ تیار نہ ہونے کی صورت میں مزید کچھ دیر پکائیں۔ سادہ کیک تیار ہے۔

بیسن کے لڈو

ضروری اشیا:

بیسن	دو کپ
میدہ	آدھا کپ
گھی یا تیل	3/4 کپ
چینی	ایک چوتھائی کپ (پسی ہوئی)
الائچی (پسی ہوئی)	چھ عدد
بادام' پستے	حسب پسند (کٹے ہوئے)

ترکیب:

کڑاہی یا دیگچی میں گھی گرم کرکے اس میں میدہ اور بیسن ڈال کر ہلکی آنچ پر بھونیں۔
ہلکا سا کلر بدل جائے اور خوشبو آنے لگے تو پستا' بادام اور الائچی مکس کرکے ڈش میں نکال لیں۔ نیم گرم ہوجائے تو پسی ہوئی چینی ڈال کر مکس کرلیں' اس آمیزے سے لڈو تیار کریں۔ پستے' بادام سے سجا کر پیش کریں۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

تر و تازہ اور خوب صورت چہرہ

صحت مند، تر و تازہ اور شگفتہ جلد ہماری خوب صورتی میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔

خوب صورت جلد کے حصول کے لیے سب سے اہم چیز جلد کی صفائی ہے۔ اگر آپ اپنے چہرے کو صاف نہیں کریں گی تو آپ کی جلد کے مسام بند ہو جائیں گے اور اس سے چہرے پر کیل مہاسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ چہرے کی صفائی کے لیے۔ کلینزنگ ملک یا کلینزنگ کریم استعمال کریں، جلد کی صفائی کے لیے اگر آپ کلینزر نہیں خرید سکتیں تو ایک چمچہ دودھ میں لیموں کا رس ملا کر اس سے جلد پر مساج کریں۔ چہرہ صاف ہو جائے گا۔

ہفتہ میں ایک بار بھاپ ضرور لیں۔ بھاپ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک برتن میں گرم ابلتا ہوا پانی لیں۔ پھر ایک بڑے تولیے کے ذریعے اس برتن اور اپنے چہرے کو ڈھانپ لیں۔ بھاپ لیتے وقت دونوں آنکھوں اور منہ کو بند کر لینا چاہیے۔ دس منٹ بعد چہرہ دھولیں۔ اب چہرے پر فیس پیک لگائیں۔ یہ بازار میں تیار شدہ ملتا ہے، لیکن آپ کے لیے اس کی حصول دشوار ہو تو گھر میں بھی تیار کر سکتی ہیں۔ گھر میں اس کو تیار کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

1۔ ایک چمچہ بیسن میں دو چمچے دہی ملا کر پیسٹ بنالیں۔

2۔ ایک انڈے کی زردی لے کر پھینٹ لیں۔ اس میں ایک چمچہ شہد اور ایک چمچہ عرق گلاب ملالیں۔

3۔ ملتانی مٹی میں عرق گلاب ملا کر پتلا سا پیسٹ بنالیں۔ اسے بیس منٹ تک چہرے پر لگا رہنے دیں۔ اس کے بعد چہرے کو صاف پانی سے دھولیں۔

اپنی سہولت کے مطابق آپ ان میں سے کوئی سا بھی طریقہ استعمال کر سکتی ہیں۔

چہرے کا مساج

جلد کی خوب صورتی میں نکھار لانے کے لیے مساج بہت ضروری ہے۔ مساج سے دوران خون میں تیزی اور بہتری آتی ہے۔ جو جلد کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مساج میں گالوں کو انگلیوں کی پوروں سے تھپتھپائیں۔ ناک کے دونوں طرف کی جلد کو انگلیوں کی پوروں سے کنپٹیوں کی طرف لے جائیں۔

چہرے کی جھریاں

چہرے کی جھریاں دور کرنے کے لیے ایک چمچہ شہد میں لیموں کا عرق ملا کر چہرے پر لگائیں۔ دس منٹ بعد چہرہ دھو لیں۔ جھریوں میں فرق پڑے گا۔

دھوپ سے چہرہ جھلس جانا

دھوپ کے باعث چہرہ جھلس جائے تو اس کے لیے مندرجہ ذیل علاج کریں۔

سوکھی ہوئی خوبانی کو پانی میں بھگودیں۔ پھر اس کو پیس کر پیسٹ بنالیں۔ اس میں ٹماٹر کا پسا ہوا گودا اور دہی ہم وزن ملالیں اور اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اس آمیزے کو چہرے پر لگانے سے جلد چکنی ہو جاتی ہے۔

دو چمچے ٹماٹر کا رس اور دو چمچے دودھ کی کریم دونوں کو اچھی طرح پھینٹ کر فریج میں رکھ دیں۔ اس مرکب کو چہرے پر لگائیں اور دس منٹ بعد چہرہ ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

ایک چمچہ کھیرے کا رس لیں، اس میں آدھا چمچہ گلیسرین اور ایک چمچہ عرق گلاب ملالیں۔ اس محلول کو چہرے پر لگائیں۔ دھوپ سے جھلسی ہوئی جلد ملائم ہو جاتی ہے۔ یہ مرکب ایک طرح سے بلیچنگ کا کام کرتا ہے۔

السی کا تیل اور لیموں کا رس ہم وزن لے کر محلول بنالیں اسے بھی جھلسی ہوئی جلد پر لگائیں۔ فائدہ ہوگا۔

یہ سب علاج اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ جلد کی خوب صورتی میں سب سے اہم کردار آپ کی صحت کا ہے۔ اپنی غذا کا خصوصی خیال رکھیں۔ ثقیل، بادی، تلی ہوئی اور بیکری کی اشیا کم سے کم استعمال کریں۔ پیدل چلیں اور دن میں کم از کم آٹھ سے دس گلاس پانی پئیں۔

☆